خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

سسپنس ڈائجسٹ

ستمبر 2016

نگران اعلیٰ
معراج رسول

سسپنس ڈائجسٹ

مدیراعلیٰ: معراج رسول

جلد 46 • شمارہ 09 ستمبر 2016 • زرسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پرو پرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

ابتلا

جہاں تم ہو وہاں انسانیت گندی اور گھناؤنی بیماریوں میں پڑی سڑ رہی ہے، افلاس اس کی پٹی سے لگا بیٹھا ہے اور اس کا لہو چوس رہا ہے اور محرومی اس پر جھکی ہوئی اس کے پھوڑوں سے رستی ہوئی پیپ چاٹ رہی ہے اور اس کے تیمار دار ہیں کہ اپنے سانس روکے ہوئے دور کھڑے ہیں اور اگر کوئی پاس سے گزرتا بھی ہے تو اپنی ناک پر ہاتھ رکھ کر۔ اطراف و جہات میں سمیت سرایت کر چکی ہے۔ ایسے میں کسی احتیاط سے بھلا کیا ہوگا؟ تم بدروزگاری میں مقیم ہو اور بیماری میں متوطن۔ جہاں فضا کو عارضہ لاحق ہو اور ہوا علیل ہوگئی ہو وہاں کس کی خیریت مزاج، دریافت کی جائے گی۔ مہلکے میں سانس روکا تو کیا اور سانس لیا تو کیا؟

یہ بیماریاں نسلوں سے پالی جاتی رہی ہیں اور یہ پھوڑے زمانوں سے پک رہے ہیں۔ جنہوں نے اس کیفیت کا رونا رویا انہیں ہمیشہ عافیت دشمن کہا گیا اور کہا گیا کہ یہ تو مقسوم ہے اور مقسوم سے کس نے سرتابی کی ہے اور یہ بھی کہ صحت کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پہلو میں بیماری بھی پائی جاتی ہو اور ایسے بھی جالینوس ہیں جنہیں جو نسخے بہت زیادہ عزیز ہیں وہ صرف انہی کو استعمال کرانا چاہتے ہیں، خواہ بیماری کی نوعیت کچھ بھی ہو۔

بے لاگ تشخیص، بے باک تجویز اور بے لوث علاج کے بغیر بیمار کی صحت اور اپنی عافیت کی امید باندھنا ہوسناکی ہے۔ قریب ہے کہ یہ ہوسناکی خود تمہیں اس حال تک پہنچا دے کہ دنیا تمہاری عیادت کرے، یہاں تک کہ تعزیت فرض ہو جائے مگر تم ہو کہ اصل علاج کو طرح طرح سے ٹالنا چاہتے ہو اس لیے کہ اس علاج میں بیمار سے زیادہ تیمارداروں کو پرہیز کرنا پڑے گا۔ پس وہ کچھ ایسے نسخے استعمال کرانے پر زور دیتے ہیں جن میں بیمار کو پانی کے ساتھ سفوف پھانکنے اور تیمارداروں کو معجونیں اور مربے چاٹنے کی ہدایت کی گئی ہو۔ وہ فرض تشخیص کیا گیا ہے جس کے علاج سے بیمار کو شفا ہونے کے بجائے تیمارداروں کی تومندی میں اضافہ ہو۔

پر کیفیتِ حال کچھ ایسی ہے کہ اگر اب بھی بیماری کا صحیح صحیح علاج نہ ہوا تو پھر سب ہلاکت میں پڑیں گے اور یہ دامن دراز ابتلا سب کو چاٹ جائے گا۔

☆☆☆

آپ کے خط

عزیزانِ من

السلام علیکم!

ماہِ ستمبر 2016ء کا شمارہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ لیجیے جناب ہماری قومی یادگار تاریخوں میں سے 6 ستمبر یوم دفاع اور 7 ستمبر یوم فضائیہ تاریخی لمحات کی یادیں لیے ایک بار پھر حاضر ہیں اور ہم پھر سے صرف دن منانے کا فریضہ انجام دیں گے...... گزشتہ دنوں جشنِ آزادی کی تیاریاں اپنے عروج پر تھیں کہ اچانک 8 اگست کو بلوچستان کے صوبائی دارالحکومت کوئٹہ کے سول اسپتال میں انسانیت کے دشمنوں نے دہشت گردی کا مظاہرہ کر کے پاکستانیوں کے دلوں کو لہولہان کر ڈالا۔ جس سے یوم دفاع کے بنیادی مقصد پر بھی ایک سوالیہ نشان بن گیا ہے۔ اس سے پہلے کراچی میں آرمی کے جوانوں پر کھلے عام قاتلانہ حملہ...... جس میں دو جوان شہید ہوئے۔ کیا اس سے تحفظ فراہم کرنے کے دعوے ریت کی دیوار ثابت نہیں ہو رہے۔ ایک طویل عرصے سے پاکستان دہشت گردی کی زد پر ہے...... ایسے میں تو حفاظتی انتظامات کا وہ معیار ہونا چاہیے تھا کہ کسی کے ایک قدم کی لڑکھڑاہٹ سے ہی اس کی غلط سمت کا احساس ہو جائے مگر ہم صرف باتیں ہی کر سکتے ہیں اور کارروائی کرنے والے اپنا کام کر گزرتے ہیں...... اب چاہے یہ دھماکا اپنوں نے کیا ہو یا غیروں نے...... یہ سانحہ تو بہت سارے گھروں میں صفِ ماتم بچھا چکا...... جو تعلیم، قابلیت اور مقام لوگ سالوں میں حاصل کرتے ہیں انہیں یوں چند لمحات میں تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔ یہ لمحۂ فکریہ نہیں تو کیا ہے۔ عوام سراپا احتجاج ہیں کہ ایسا آخر کب تک ہوتا رہے گا......؟ مجرمانہ کارروائیوں کو اگر نچلی سطح پر ہی کچل دیا جائے تو شاید جرائم پرورش پا کر بڑے پیمانے پر ایسے سانحات کی وجہ نہ بنیں۔ پچھلے دنوں پاکستان کے کئی مقامات پر تیز بارش نے بااختیار طبقے کے دعوؤں کی بھی حقیقت کھول دی۔ یہ قدرت کی رحمت تھی جسے بدانتظامی اور نااہلی نے عوام الناس کے لیے زحمت بنا ڈالا اور بعض مقامات پر یہ رحمت سیلابی تباہی کی شکل میں بدل گئی۔ اللہ نے انسان کو عقل و شعور سے صرف اپنے مفادات کے منصوبے بنانے کے لیے ہی نہیں نوازا بلکہ دوسروں کے لیے بھی آسانیاں پیدا کرتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں منصفانہ اصولوں پر ادا کرنے کے لیے بھی اسے استعمال کرے اور...... جب ایسا نہیں کیا جاتا تو نتائج اتنے ہی خطرناک نکلتے ہیں۔ یہ ناقص پالیسیوں کا ہی نتیجہ ہے کہ ایک طرف سیلابی صورت حال ہے اور دوسری طرف صاف پانی روڈ پر بہہ رہا ہوتا ہے اور گھروں میں بوند بوند کو ترسنے والے شہری ابلتے گٹروں کے تعفن کو برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ اب دیکھیے صوبائی سطح پر وزرا کی تبدیلی حالات و ماحول میں کوئی مثبت بدلاؤ بھی لاتی ہے یا ''میں تیرا حاجی بگویم تو میرا حاجی بگو'' والی کیفیت برقرار رہتی ہے کیونکہ سیاسی جماعتوں کی مخالفتیں اپنی جگہ مگر ''کھاتے وقت تمام انگلیاں برابر ہو جاتی ہیں۔'' حقائق کی تلخیوں سے انکار ممکن نہیں مگر ہم اپنی محفل کی مٹھاس کیسے بھول سکتے ہیں تو چلیے جناب پھر دیر کس بات کی......

✠ **محمد مرتضیٰ**، جھنگ سٹی سے بڑی امیدوں کے ساتھ تبصرہ لے کر حاضر ہو رہے ہیں ''خوبصورت کہانیوں سے سجے ڈائجسٹ کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لیے گھر پہنچے تو اطمینان کا سانس لیا۔ سرورق پر بڑے غور سے نظر ڈالی تو مردانہ وجاہت کا کوئی شاہکار نظر نہ آیا۔ صنفِ نازک، حسینہ ماہ جبینہ کی موٹی موٹی خوب صورت آنکھیں اداسیوں کی داستان سناتی ہوئی نظر آئیں۔ اس کے بعد جون ایلیا کا انشائیہ دل و دماغ کو آنکھیں بنا کے پڑھا۔ انشائیہ کیا تھا ایک المیہ تھا پھر بوجھل اور سوگوار قدموں کے ساتھ اداریہ پڑھا۔ دہشت گردی کی بہت بڑی سنگین اور سنگدلانہ واردات امجد صابری کے بہیمانہ قتل کی خبر نے پورے ملک کے ہر طبقۂ فکر کو کربناک درد میں مبتلا کر دیا اور پھر عبدالستار ایدھی کی وفات نے تو جسم و جاں پہ غم کے پہاڑ گرا دیے۔ اس کے بعد قیصر اقبال کچہ فرام بھکر کو کرسی صدارت کی ہاٹ سیٹ پر براجمان پایا۔ دل کی پرخلوص گہرائیوں کے ساتھ مبارک باد۔ اس کے بعد صادق معاویہ سعیدی فرام خان پور ضلع رحیم یار خان بجلی اور واپڈا والوں کو کوستے اور سسپنس ڈائجسٹ سے پرخلوص اور کبھی نہ مٹنے والی محبتیں نبھاتے نظر آئے۔ آپ کا مشورہ انتہائی مناسب ہے مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ محمد صفدر معاویہ ہمارے پڑوسی ضلع خانیوال سے اپنی بھرپور توانائیوں کے ساتھ ایک مکمل اور دلکش تبصرے کے ساتھ دل کی دھڑکنوں میں خوشیوں کے ارتعاش جگانے میں کامیاب رہے۔ سید عبادت کاظمی ڈیرہ اسماعیل خان سے اپنے دکھوں اور اداسیوں کو الفاظ میں ڈھال کر بیان کرتے نظر آئے۔ طاہرہ گلزار صاحبہ کو دل کی گہرائیوں سے پرخلوص جذبوں اور بے پناہ دعاؤں کے ساتھ سالگرہ مبارک۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ آمین۔ رمضان پاشا اللہ تعالیٰ آپ کو مکمل صحت دے اور آپ اسی طرح سسپنس ڈائجسٹ سے اپنی گہری وابستگی کا اظہار کرتے آتے رہیں۔ اس کے بعد دلوں میں ہلچل مچاتی داستانوں اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھیرتی کہانیوں کی جانب دھیمے دھیمے بڑھے۔ داستان رزم و بزم، الیاس سیتاپوری اپنے منفرد اور جداگانہ انداز میں تاریخ کے جھروکوں سے سبق آموز واقعات لے کے آئے۔ خالی پن، تنویر ریاض اپنی کہانی میں سسپنس اور دلچسپ موڑ لے کے آئے۔ سسپنس ڈائجسٹ کے صفحات سے ابھرتی اور ظہور ہوتی ہوئی یادگار اور مروت و محبت سے بھری داستان شیش محل اسما قادری کے تلاطم خیز قلم سے نکلے محبت کے موتی دل کے فرش پہ بچھا کے آنکھوں کے آنسوؤں سے چنے۔ گرمیوں کی حبس زدہ راتوں میں اور دن کی پگھلتی دھوپ میں ٹھنڈک بھرا امرِ ہم بن کے شیش محل کے الفاظ ہماری زندگی کو جلا بخشتے ہیں۔ عمدہ منظر نگاری، زبردست تحریر دل کے تاروں کو چھیڑنے میں کامیاب رہی۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی ایک جانا پہچانا اور اپنا لوہا منواتا ہوا نام، ان کے پرسکون قلم سے آتش فشاں کو کوزے میں بند کرتی کہانی ''وصیت'' سسپنس ڈائجسٹ کے صفحات پر جلوہ افروز ہوئی۔ جس میں دو سچی اور لازوال محبت کے امینوں کو جدا کرنے کے عذاب میں مبتلا کرنے کی پوری کوشش کی گئی اور آخر میں دنیاوی آزمائشوں کا مقابلہ کرتی طوبیٰ نے اپنے شوہر کی وصیت پر عمل کر کے اپنے سسر کو بتا دیا کہ رشتوں کی اہمیت مال و دولت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ ''حکمِ ربی'' میں ملک صفدر حیات نے ہمیشہ کی طرح اپنی خداداد صلاحیتوں

سے کیس کو حل کرلیا۔ ''بند گلی'' میں مصنف اختر علی نے ایک مجبور، لاچار اور بے بس غریب گھرانے کی لڑکی کے انتقام کا واقعہ بیان کیا۔ رشید جو کہ نہایت چالاک، کینہ پرور اور مطلب پرست انسان تھا۔ دوسروں کے حالات سے ناجائز فائدہ اٹھاتا اور بلیک میلنگ کرکے اپنا مطلب نکالنا اس کا پیشہ تھا۔ آخر کار اپنی خراب اور بری عادتوں کے باعث قتل ہوگیا۔ محفل شعروسخن میں محمد زاہد سیال، سیدہ ثانیہ کاظمی، ہادیہ ایمان، ماہا ایمان، افضل خان اور محمد قاسم کے انتخابات دل کی دلکشی اور رومانیت بڑھانے میں کامیاب رہے۔ ''دھماکا'' کہانی میں عظیم جمال نے اس قول کو سچ ثابت کردکھایا۔ ''جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے خود اس میں جاگرتا ہے۔'' محی الدین نواب صاحب مرحوم کے پراسرار اور بے چین قلم سے نکلی داستان ماروی آہستہ آہستہ قارئین کے دل کی دھڑکن بنتی جارہی ہے۔ جس طرح سورج کی کرنیں دھند کو ختم کرکے انسان کی راحت کا سامان بنتی ہیں، اسی طرح ماروی کہانی تنہا اور اداس راتوں میں رات کی رانی کی خوشبو بن کے ہمارے دل کی فضا کو معطر کررہی ہے۔ منظر امام صاحب کی آگ کا دریا محبت جیسے نازک اور سلگتے موضوع پر لکھی گئی کہانی بہت عمدہ پیرائے میں لکھی گئی تھی۔ روحانی سلسلے کی ایک اور عظیم کڑی شیخ نجیب الدین متوکل، حضرت بابا فرید گنج شکر کے برادر محترم جن کے ایمان افروز واقعات نے روح کو تسکین پہنچائی۔ ڈھونگ سلیم انور ہمارے لیے ادب سے تحفہ لے کے آئے۔ پولیس نے اپنی حکمت عملی سے زیویئر بیلی جیسے خطرناک مجرم سے اعتراف کروایا اور آخری صفحات پر مرحوم کاشف زبیر صاحب جن کے نام کے ساتھ مرحوم لکھتے ہوئے ہاتھ کانپ جاتے ہیں۔ اسیر خیال ایک ایسے انسان کی داستان جو خونی رشتوں کا ڈسا ہوا تھا۔ بڑے دلچسپ موڑ دے کے کہانی کے رموز واوقاف کو بیان کیا گیا۔ اگر قیصر کو ڈاکٹر عزیز جیسا فرشتہ صفت انسان نہ ملتا تو اس کا کامیاب نفسیاتی علاج ممکن نہ تھا۔ آخر میں یہی کہوں گا کہ سسپنس ڈائجسٹ کی ہر سطر دل اور دماغ کے حسین امتزاج کو ملا کے اور اپنے لاشعور میں خوشیوں اور امیدوں سے بھری دنیا بنا کے پڑھی جاتی ہے۔ برائے مہربانی نئے تبصرہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ اپنے پرانے چاہنے والوں کو مت بھولیں۔''
(آپ کی بات سے سو فیصد ہم اتفاق کرتے ہیں۔ یہ محفل اور یہ رسالہ آپ سب کے لیے ہی تو ہے۔ یہاں سب اپنے ہیں، کوئی غیر نہیں)

☒ محمد صفدر معاویہ، ضلع خانیوال سے دوڑے چلے آرہے ہیں ''اگست کا سسپنس 16 کو سرور بیس کراچی میں ملا۔ اس دفعہ انکل نے سرورق کو خزاں کے مانند دکھایا۔ ماڈل کو سانولی سی صورت دے کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک دیکھی جیسے آنے والے وقت کی امید میں ہو کہ شاید ہمیں بھی بہار دیکھنا نصیب ہو۔ انشائیہ میں جون ایلیا کی ایک آرزو تک پہنچے جہاں پر محترم اپنے اندر کا درد و کرب اپنے قلم کے ذریعے باہر نکالتے نظر آئے۔ اندر کا دکھ واقعی بہت دردناک ہوتا ہے۔ اداریہ میں آپ تک آئے سچ کہا، دن منانے کا کیا فائدہ، جس مقصد کے لیے ہم نے پاکستان حاصل کیا۔ وہ مقصد دور دور تک کہیں نظر نہیں آتا، بے روزگاری، دہشت گردی، بے راہ روی، ظلم و ستم کی وجہ سے ہم دنیا میں بدنام ہوئے۔ ذہنی طور پر میں خود کو آج بھی غلام دیکھتا ہوں۔ جو شخص صرف اقتدار اور روپے پیسے کا غلام ہو وہ خاک اچھا سوچے گا۔ پاکستان کے بارے میں۔ اللہ رحم فرمائے ہم پر۔ بے آسراؤں کا آسرا، بے سہاروں کا سہارا، بیواؤں کا سر ڈھانپنے والا یتیم کو آغوش میں لینے والا خدا کا عظیم تر تحفہ عبدالستار ایدھی اس فانی دنیا سے کوچ کر گئے۔ ایسا انسان صدیوں میں کوئی ایک ملتا ہے۔ جب میں نے یہ خبر پڑھی کہ انہوں نے اپنی آنکھیں بھی عطیہ کردیں میرا ہاتھ خود بخود سیلیوٹ کو اٹھ گیا۔ قیصر اقبال کو عمدہ تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر براجمان پایا۔ آپ آئے اور چھا گئے بہت مبارک ہو۔ مسز صدیقی آپ کی دعاؤں کا بہت شکریہ آپ نے مجھے بیٹا کہا، اگر میں آپ کو ماں جی کہہ لوں تو آپ کو برا تو نہیں لگے گا، ماں کو گزرے اس جہاں سے بارہ برس بیتنے کو آئے، زبان ترس گئی ماں کہنے کے لیے۔ اللہ پاک آپ کو صحت اور تندرستی کے ساتھ لمبی عمر نصیب فرمائے۔ کاشف زبیر کی اسیر خیال بہت عمدہ تحریر تھی۔ قیصر جمال کی زندگی بہت کٹھن گزری پھر کچھ بہتری آئی پھر ایک حادثے نے اسے خیالوں کی دنیا میں پہنچا دیا مگر ڈاکٹروں کی محنت سے وہ اپنی دنیا میں واپس آیا اسے شیمال گئی جو خود بھی ایسی ٹریجڈی سے گزر چکی تھی۔ کہانی کے دو حصوں کو آخر میں جس طرح ملایا یہ کاشف زبیر کی مرہون منت تھا آپ کو میرے ڈھیروں سلام۔ پھر شیش محل پہنچے جہاں فاروق کی واپسی، ربن دادا کا ولیم سے حساب چکتا کرنا، آغا کو انجام تک پہنچانے کے لیے دادا کا محو سفر ہونا، بملا کا چاند بانو پر حملہ کرانا، ماجد علی کا فاروق سے ٹکرانا اور زندگی کی بازی ہارنا آخر میں اکبر کی مدد کرنا دیکھتے ہیں اگلی قسط میں کیا ہوتا ہے اکبر اور پارو کا۔ ماروی تک پہنچے جہاں گھمسان کا رن پڑا ہے۔ سیر پر کوئی سوا سیر آنا چاہتا ہے پر ابھی سیر بھاری پڑ رہا ہے۔ ماریہ کی موت کا دکھ ہوا۔ الیاس سیتاپوری کے قلم سے تاریخی تحریر داستان رزم و بزم پڑھی۔ یہ حقیقت ہے دشمن کبھی اتنا طاقتور نہیں ہوتا جتنا خود بادشاہ کی بے راہ روی اور اپنوں کی غداری کی وجہ سے مات کھانی پڑتی ہے شاید درداغ کے دل پر اسلام اثر کررہا ہے یا پھر علیہ۔ تنویر ریاض کی خالی پن بھی اچھی تحریر رہی۔ کرداروں کو صحیح طریقے سے ڈھالتے رہے۔ ڈاکٹر عبدالرب کی خوب صورت تحریر وصیت۔ اگر میں اس کو سبق آموز تحریر کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ جو کچھ نثار احمد نے افتخار کے ساتھ کیا وہ اچھا تو نہ تھا ہمیشہ کبھی بھی رتبہ اور پیسا ایک کے پاس نہیں ٹھہرا۔ ملک صفدر حیات حکم ربی کے ساتھ جاوید کے قاتلوں کو ڈھونڈنا مشکل تھا پر ملک صاحب کے لیے نہیں۔ علی اختر کی بند گلی میرے خیال میں زویلا نے جو کچھ کیا بہت اچھا کیا کیونکہ جس قسم کا رشید کا کردار تھا اس کی سزا ایسی بنتی تھی۔ محفل شعروسخن کو بہترین اور عمدہ اشعار سے مزین دیکھا۔ عظیم جمال دھماکا لے کر آئے۔ مل ٹابوں اور جینی کو نرہاورڈ کو بم سے اڑانا چاہتے تھے۔ وہ ان دونوں کو اکٹھے دیکھ کر مارنے کے چکر میں پڑ گیا تو پھر گئے تینوں جان سے۔ منظر امام آگ کا دریا لے کر آئے، مولوی صاحب کے کردار نے متاثر کیا وہیں اسلم کی ہمت کی داد دینی پڑے گی۔ شیخ (نجیب اللہ) نجیب الدین متوکل کے بارے میں پڑھ کر دل کو منور کیا۔ اگست کا پورا شمارہ عمدہ اور بہترین تحریروں سے مزین تھا۔ اللہ پاک آپ کے ادارے کو اور زیادہ ترقی نصیب کرے۔ (آمین)'' (پسندیدگی کا بے حد شکریہ)

☒ رضوانہ قریشی، راولپنڈی سے کتھا لیے چلی آرہی ہیں۔ ''خطوط کی محفل میں اپنے خط کا جواب دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ سب نے میرے خط کے جواب پر بہت خوب صورت تبصرہ کیا ہے۔ سب پڑھ کر بہت خوش اور حیران ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے محمد خواجہ کو کرسی صدارت اور آنکھ کے آپریشن کی کامیابی کی مبارکباد۔ آپ صحیح کہتے ہیں کہ مرد حضرات کو ہر صورت غم روزگار کی تکلیفیں سہنی پڑتی ہیں۔ اشفاق شاہین، تحریم شاہ آپ نے جو اردو زبان کی

اہمیت کو سمجھا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ جو خوب صورتی اردو زبان میں ہے وہ کسی میں نہیں۔ اردو دنیا کی سب سے آسان زبان ہے جسے کسی کو سمجھانے کے لیے دوسری زبان کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔ آپ سب کی تعریف بہت حوصلہ دیتی ہے۔ اس دفعہ محفل میں طاہرہ گلزار کا نام نظر نہیں آیا۔ رضوان تنولی کیوں غیر حاضر ہیں۔ ہم رسالوں میں ان کے اور رمضان پاشا کے اقتباسات اور شعر ضرور تلاش کرتے ہیں۔ مرحا گل، آپ نے خود کو ٹائٹل گرل سے کیوں ملایا۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں اپنا لکھا خط محفل میں نظر نہ آئے تو دنیا ویران لگنے لگتی ہے۔ محمد صفدر معاویہ آپ کا تبصرہ پڑھا سب کے بارے میں خوب صورت تبصرہ کرنے والے خود کتنے دکھی ہیں، پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ آپ کا دل بہت اچھا ہے اپنا دکھ درد چھپا کر دوسروں کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں۔ عبدالجبار رومی، جے ڈی پی میں مقام آپ سب کی وجہ سے ہے۔ آپ نے جو محبت اور عزت دی ہے کسی خزانے سے کم نہیں۔ آپ سب کی طرح تبصرہ لکھنے کی کوشش کروں گی۔ سسپنس میں اسلامی اور تاریخی خزانہ موجود ہوتا ہے۔ ماروی کی اقساط احساس دلاتی ہیں کہ نواب صاحب ہمارے درمیان موجود ہیں اور ساتھ ہی ڈاکٹر ساجد امجد کی تاریخی، اسلامی اور دوسری مشہور شخصیات کی کہانیاں لاجواب ہوتی ہیں۔ ثمر عباس کی کہانیاں لاجواب ہوتی ہیں۔ مختصر ہونے کے باوجود کوئی نہ کوئی راز ان میں ہوتا ہے۔ ہم سب چاہتے ہیں کہ ملک صفدر حیات کی کہانیاں ہر ماہ ہونی چاہئیں، عورتوں کی عزت کرنے والا انسپکٹر کاش پولیس کے ہر محکمے میں ہو۔ مرزا امجد بیگ کے مقدمات دلچسپ ہوتے ہیں، سب کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ عزت کا سوال، ناواقف اور گونگوں کی داستان چونکا دینے والی کہانیاں تھیں۔ ہمارے یہ رسالے، کتابیں ہمارے مصنفین کی وجہ سے شہرت پا رہے ہیں۔ سسپنس کی 2 اہم شخصیات بے شک دنیا سے چلی گئی ہیں لیکن ان کی کہانیاں انہیں تا قیامت زندہ رکھیں گی۔ ہم کتنا ہی اچھا لکھ لیں ان کی تحریروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور نہ میرے قلم میں اتنی طاقت ہے۔'' (آپ کا تبصرہ عمدہ رہا...... ایک بات کہنا چاہتے ہیں کہ رسالے سے متعلق بات چیت ادارے اور ایڈیٹر تک محدود رہے تو اچھا لگتا ہے، نگران اعلیٰ کو ذاتی طور پر پریشان کرنا ہرگز بھی مناسب بات نہیں۔ آپ کا پچھلا خط لیٹ ملا دوسرا وقت پر لہٰذا جگہ مل گئی۔ امید ہے آئندہ چند باتوں کا خیال رکھا جائے گا)

✠ مرحا گل، دراہن سے محفل میں معاونت فرما رہی ہیں ''گرمی سے بے حال حسینہ پیاسے کوے کی طرح منہ کھولے درخت کو امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ شاید ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔ جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا یوں لگتا ہے کہ میرے تمام خیالات کو جون ایلیا نے الفاظ کا روپ دے دیا ہے۔ اس لیے تو قلم کار کو معاشرے کا نباض کہا جاتا ہے۔ پھر خطوط کی محفل میں پہنچے۔ وہی ہنگامے کھٹی میٹھی باتیں، چٹ پٹے فقرے اور خوب صورت تبصرے کہ مزہ آگیا اور یوں لگتا ہے کہ جیسے ایک بے کیف ماحول سے اٹھ کر رونق اور زندگی سے بھرپور ماحول میں آگئی ہوں۔ وکٹری اسٹینڈ پر اقبال گچہ رونق بڑھا رہے تھے۔ مبارکباد بھئی، کبھی کبھی دھرنا دینا پڑتا ہے۔ مسز صدیقی کی محبت ایک بار پھر اچھی لگی۔ آپ جیسی ماں پر بھی ہم بیٹیوں کو فخر ہے۔ آپ کی دعائیں ہمارے لیے شجر سایہ دار ہیں۔ معاویہ تو بہت بڑھ گئے ہیں محفل میں۔ وارث علی ملاح ہمیں بس ایک دفعہ سرورق پر چھا تا اچھا لگا دوسری مرتبہ آپ کی 'وہ' ہوگی۔ ہم پر ابھی اتنا برا وقت نہیں آیا۔ ویسے آپ نے کیا خوب مراسلہ لکھا قسم سے کچھ سمجھ نہیں آئی۔ سب سے پہلے شیش محل کی طرف چھلانگ لگائی۔ ٹانگ البتہ سلامت رہی...... ہم تو سسپنس کے انتظار میں ایسے لٹک جاتے ہیں جیسے گورا افسر ولیم بہرحال 20 کو مل ہی جاتا ہے۔ جوزفین کو محبت کی سزا حویلی سے بے دخلی پر ملی جس پر کافی افسوس ہوا۔ پلیز یہ فاروق کو کہاں پھنسا دیا۔ اب جلد از جلد اسے ممبئی لاکر جولیٹ سے ملائیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا تحفہ پڑھا۔ ایسی وصیت جسے سن کر روح کانپ اٹھی۔ اچھا ہوا اس سے بہتر سزا کوئی اور نہیں ہوسکتی تھی۔ ویلڈن جناب، علی اختر کی بندگلی ایک یادرہ جانے والی تحریر تھی۔ شاید نئے رائٹر ہیں۔ اس کے بعد بہترین سلسلہ ماروی پڑھی جہاں سب کچھ ہو جانا ممکن ہے نواب صاحب کی مہربانی سے معصوم عابی پر کافی ظلم ہوا...... ماریہ کو مار کر اچھا نہیں کیا۔ منظر امام ایک بار پھر محبت بھری تحریر لائے۔ اسلم اور ناجو کے ملاپ نے دل خوش کر دیا۔ جگ جگ جیو میرے پیارے رائٹر...... پہلی تاریخی کہانی کے بعد کاشف زبیر کی جگہ تنویر ریاض نے لے لی...... جگہ پر ہوگئی۔ (جگہ پر ہو جاتی ہے مگر...... دلوں میں خلا کبھی نہیں بھرتا...... محبتیں ہیں آپ کی) ہمیں تو کاشف زبیر صاحب کی کہانی دیکھنے کی عادت ہے۔ کاشف زبیر صاحب کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اب مریم کے خان سے امید ہے کہ مغربی اسٹوری لے کر آئیں ورنہ ہمارا گزارہ ناممکن ہے۔ خالی پن بھی زبردست تحریر تھی، واقعی محبت کی سچائی سے کس کو انکار ہے۔ جب کاشف زبیر کی تحریر دیکھی تو دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ ہمارے دلوں میں تو ہمیشہ رہیں گے۔ اسیر خیال ایک اچھوتی منفرد تحریر تھی۔ سمیر اور قیصر کی مشابہت نے دل کو سکون دیا۔ جیسے بھی ہو شیما کو تو سمیر کا ہم شکل ہی سہی کوئی تو مل گیا محبت کرنے والا ویلڈن جناب۔ شعروں میں قیصر اقبال گچہ اینڈ محمد زاہد چھائے رہے۔ (تبصرہ دلچسپ رہا...... بہت عمدگی سے لکھا...... شکریہ)

✠ سید عبادت کاظمی، ڈیرہ اسماعیل خان سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ''گرمی نے ہوش اڑائے ہوئے ہیں لیکن گرمیوں کی لمبی دوپہروں میں سسپنس کی ورق دانی شروع کی۔ سرفہرست ٹائٹل پر نظر دوڑائی۔ حسینہ مجھے کاظمی بھائی کی شگفتہ کی کاپی لگ رہی تھی جو کہ نئی دریافت ہوئی ہیں۔ سسپنس کا ٹائٹل ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ جون ایلیا گلہ کرتے نظر آئے مگر مجال جو کسی کے کان پر جوں تک رینگی ہو۔ جانے پہچانے سے قیصر اقبال کافی عرصے کے بعد تبصروں کی محفل میں نظر آئے اور آتے ہی صدارت پر قبضہ کر لیا جناب زرین آفریدی کو ہمارے پاس چھوڑنے پر بضد ہوئے مگر ہم نظر بچا کے نکل پڑے بھی آخر ہماری وہ اگر دیکھ لیتی تو پھر...... صادق معاویہ بجلی کا رونا روتے نظر آئے۔ نادر سیال رہائی کی مبارک ہو...... محمد صفدر معاویہ شاندار تبصرے کے ساتھ شریک محفل تھے۔ طاہرہ گلزار کی دھواں دھار انٹری پسند آئی۔ داستان رزم و بزم شمس الدین کی داستان حیات اچھی لگی۔ شیش محل میں کافی تبدیلیاں نظر آئیں۔ فاروق محبت کرنے والوں کا مسیحا ہے۔ میرا پسندیدہ کردار چاند بانو کا ایکسیڈنٹ بملا نے ہی کروایا ہوگا۔ جولیٹ کا اس ماہ ذکر نہیں تھا۔ جوزفین اور نواب اسد اللہ کی اولاد ہی ہے جولیٹ، گولو کا کردار اچھا لگتا ہے۔ ماروی تو سر سے گزر جاتی ہے۔ وصیت اچھی کہانی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے قلم سے طوبیٰ اور افتخار در بدر ہوئے لیکن سیٹھ کو عمر بھر کے لیے بے سکون کر گئے۔ پچھلے ماہ دو تبصرہ نگاروں سے ملاقات کی خوب صورت پرسنالٹی کے مالک کبیر عباسی جن

سے ملنے کی بہت خواہش تھی اور سو برسے شکیل کاظمی اچھی شخصیت کے مالک تھے۔ آخری صفحات پر کاشف زبیر کی کہانی دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ قیصر کے کردار نے کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔ شیما اچھی رہی ماہر نفسیات پر مبنی کہانی اچھا تاثر چھوڑ گئی۔ اگست میں ہمارا رزلٹ ہے یعنی ستمبر کے سسپنس آنے تک ہم دیکھ چکے ہوں گے۔ محفل شعر و سخن میں اپنی کزن ثانیہ کاظمی، مہتاب احمد کے انتخابات اچھے لگے۔'' (اللہ تعالیٰ آپ کو ڈھیروں کامیابیاں عطا فرمائے۔ آمین)

⌘ مرزا طاہر الدین بیگ، میرپور خاص سے محفل میں شریک ہیں۔ ''اگست کا سسپنس اور جون ایلیا صاحب کی ایک آرزو دونوں زبردست اور نٹ کھٹ محفل میں قیصر اقبال صاحب سرفہرست ہیں۔ ظاہر ہے تبصرہ بھی خوب ہوگا۔ صفدر صاحب اور طاہرہ گلزار نے بھی اچھے تبصرہ لکھے۔ داستان رزم و بزم تاریخی داستان آہستہ آہستہ اپنے انجام کی طرف رواں دواں ہے۔ گوت جیسے کردار ہیں جنہوں نے تاریخ کو اپنے گھناؤنے کردار سے داغدار کیا، ایسے ہی لوگ جنہوں نے مسلمانوں کی بربادی میں اہم کردار ادا کیا۔ تاریخ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گی میر صادق ہو، میر جعفر ہو یا کوئی اور یہ سب مجرم ہیں۔ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو آج تاریخ کچھ اور کہتی۔ ڈاکٹر صاحب کی وصیت کا بھی جواب نہیں۔ نثار جیسے کردار آپ کو افسانوں یا فلموں میں ہی نہیں بلکہ اصل زندگی میں جیتے جاگتے کردار بھی ملیں گے۔ انجام خوب رہا، جیسے کو تیسا۔ ملک صاحب نے بھی قتل کی گتھی بڑی جانفشانی سے سلجھائی۔ مجرم کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو کہیں نہ کہیں غلطی ضرور کرتا ہے، ساجد صاحب مارے گئے۔ بند گلی بھی خوب صورت تحریر اور انجام بھی خوب صورت مگر عظیم جمال صاحب بازی لے گئے، کیا بدیسی کہانی کو زبردست اسکرین پلے کے ساتھ حیران کن انجام بہت خوب عظیم صاحب بہت خوب۔''

⌘ محمد قمر صائم، قائد آباد، خوشاب سے پسندیدگی لیے حاضر ہیں۔ ''لیجیے...... ایک سال کی طویل غیر حاضری کے بعد دوبارہ آپ کی دوستوں کی محفل میں شرکت کی جسارت کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ خوش آمدید کہیں گے۔ (کمال ہے سال بھر غیر حاضری کے بعد اتنی دیدہ دلیری کہ خوش آمدید بھی کہا جائے) دراصل کچھ ہوا یوں کہ پچھلے جولائی کے بعد یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوا اور پھر سمیسٹر سسٹم میں یوں مصروف ہوئے کہ رابطوں میں کمی آ گئی مگر سسپنس پڑھنا نہیں چھوڑا۔ ہر ماہ کی 18 تاریخ کو رسالہ ایجنسی سے طلب کر لیا کرتا تھا۔ تادم تحریر، شام کا وقت ہے، ساون کی بارش تھل کے تپتے ریگزاروں پہ برس کے گویا چہار سو گل و گلزار کر گئی۔ موسم انتہائی بہترین ہے۔ ورنہ آج صبح کی گرمی! الحفیظ والامان......! چلتے ہیں تبصرے کی جانب۔ خدا لگتی کہوں تو جس طرح کسی وقت میں مسافر پسندیدگی کے بام عروج پر تھی آج کل شیش محل ہے۔ شمارہ ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے شیش محل کو بغور پڑھا کہ پچھلے واقعات سے تعلق بھی قائم رکھنا تھا۔ اگر سب سے پہلے شیش محل پڑھ لی جائے تو باقی شمارہ روکھا پھیکا لگتا ہے۔ ماروی میں اتنے کردار ہو گئے ہیں کہ...... بس اباقی کترنیں بہت مزے کی تھیں۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ اپنی محفل میں اس دفعہ کسی بھی اسیر زنداں کی زندہ دلی نہ تھی۔ اب کوشش کروں گا کہ باقاعدہ حاضری دے سکوں۔'' (یہ ہوئی نا بات)

⌘ غلام یسین نوناری، چوک سرور شہید سے محفل میں شریک ہیں۔ ''ماہ آزادی کا شمارہ 16 جولائی کو دستیاب ہوا۔ سرورق سے نگاہیں چراتے ہوئے جون ایلیا کی پر مغز تقریر و تحریر سے مستفید ہوئے۔ جون ایلیا کا دل احساس سے لبریز تھا اور اس احساس نے انہیں ایسی شاہکار تخلیق کا خالق بنا دیا۔ ان کی پر معنی گفتگو ذہن کے دریچوں میں احساس کے کئی در وا کر گئی۔ محفل یاراں میں قدم رکھا، ماہ آزادی کے حوالے سے بھرپور اور جامع اداریہ پڑھنے کو ملا۔ حالات پاکستان کی منظر کشی خون کے آنسو رلا گئی۔ محفل کی صدارت فیس بک سے بہت اچھے دوست اور خلیق انسان قیصر اقبال کر رہے تھے۔ تبصرے میں سادگی اور بے ساختگی چار چاند لگا گئی...... بہت ہی عمدہ لکھا۔ پشاور والی بہن طاہرہ گلزار مری میں بیٹھ کر خط لکھا تو موسمی اثرات خط میں بھی نظر آئے۔ نفرت بھرے جملوں کی جگہ چاشنی نے لے لی لیکن خط میں کہیں بھی ہمارا ذکر نہ پا کر ہم بہت ناراض ہوئے۔ رمضان پاشا نے دلچسپ انداز میں لکھا۔ بہت خوب۔ رضوان سلطان تنولی کریزدی کی گمشدگی معنی خیز ہے۔ بھئی لوٹ آؤ نا...... دیکھو، محفل کتنی اداس ہے۔ ورنہ ہم ہوئے ناراض...... جب سے ماروی شروع ہوئی، ایک معمول سا چلا آ رہا ہے کہ کہانیوں میں سب سے پہلے ماروی کو ہی پڑھنا ہے۔ اس ماہ بھی ماروی سے کہانیوں کا آغاز کیا...... داستان مراد و ماروی طلسم ہوشربا داستان بن چکی ہے۔ عابد علی منگی کم عمری میں جناتی مہمات سر کرتے ہوئے حقیقت سے دور کسی ہوشربا داستان دلگداز کا شہزادہ لگا۔ ویسے ماروی اپنے اصل پلاٹ سے ہٹ چکی ہے۔ اب تو ہوا کے رخ پر اڑی جا رہی ہے...... آخری صفحات پر محبوب مرحوم مصنف کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی مگر دل غم سے بھر گیا۔ ان کی یاد نے افسردہ کر دیا۔ آہ...... کمال کا لکھتے تھے۔ ہر شمارے میں ان کی تحریر نظر آتی تھی۔ اب اتنے ماہ بعد ان کی کہانی شامل دیکھ کر غم و خوشی کے امتزاج سے آنسو بہہ نکلے...... کہانی بے مثال تھی۔ ہمیشہ کی طرح...... عمدہ اور مضبوط پلاٹ...... دلچسپ سچویشن اور خوب صورت منظر کشی...... شیش محل کی یہ قسط بہت پسند آئی...... اب تو اس پر اعتراض کرنے والے بھی اسے پسند کرنے لگے ہیں اور ہمیں تو خیر شروع سے ہی ناپسند نہیں رہی۔ داستان رزم و بزم (الیاس سیتاپوری) وصیت (ڈاکٹر عبدالرب بھٹی) آگ کا دریا (منظر امام) بیسٹ کہانیاں تھیں۔'' (شکریہ جناب! محفل میں شرکت کا)

⌘ علی رحمان، سندلیانوالی سے دیکھتے ہیں کیا فرما رہے ہیں۔ ''سرورق کو دیکھ کر خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ پہلی مرتبہ آسمانی رنگ سرورق دیکھا۔ دل کو نہایت بھایا۔ لڑکی کو دیکھ کر ہمارے معصوم سے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی لیکن ایک اور چیز کو دیکھ کر زیادہ تیز ہو گئی۔ وہ تھی لڑکی کا پوز یہ تو ہمارے پوز کرنے کا انداز ہے۔ ارے باپ رے آپ کو ہماری خواہش...... چلیے چھوڑیں۔ ذاکر انکل کمال کے سرورق بناتے ہیں۔ کہانی کی فہرست دیکھی اور مطمئن ہو کر آگے بڑھے اور خطوں کی محفل میں داخل ہوئے۔ اداریہ پڑھا۔ کافی اچھا تھا۔ ہم آپ کی تمام باتوں سے اتفاق کرتے ہیں۔ قیصر اقبال صاحب کرسی پر اکبر بادشاہ کی طرح اکڑ کر اپنی پوری شان و شوکت پیش کر رہے تھے۔ آپ کا تبصرہ اچھا تھا۔ مبارک ہو قیصر بھائی۔ آپ سب کو چکر دے رہے ہیں خیریت ہے۔ مسز صدیقی نے کافی اچھا تبصرہ لکھا اور دعاؤں کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، امید ہے کہ آئندہ ہمیں بھی ملیں گی۔ رانا بشیر احمد طاہر انکل تو سب

کے دل کے تار ہلا دیتے ہیں۔ ہم تو ان کے عاشق ہیں۔ محی الدین نواب مرحوم کی ماروی اچھی لگی۔ یہ قسط نہایت تیز اور پسندیدہ پانچ قسطوں میں سے ایک ہے۔ ان نون کی ٹیلی پیتھی نے متاثر کیا۔ مسٹر ٹیلی پیتھی نے جہاں ہمیں حیران کیا وہاں یہودی خاص کر مسٹر ہوسٹن کو پریشان کیا۔ آگ کا دریا منظر امام کی یادگار اور اچھی تحریر تھی۔ اسلم کی محبت اور سولوی صاحب نے کافی متاثر کیا۔ محفل شعر و سخن یوں تو تمام شعرا اچھے تھے پر سیدہ ثانیہ کاظمی، محمد قدرت اللہ نیازی، سید عبادت کاظمی وغیرہ کے شعر اچھے لگے۔ دھما کا نہایت اچھی تحریر تھی۔ عظیم جمال کی تابوت اور جبین نے بلکہ ہاورڈ نے بھی حیران کیا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا سب گئے کام سے۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔ ایک گزارش ہے کہ طاہر جاوید انکل سے آخری صفحات پر کہانی ہونی چاہیے۔'' (جی جناب آپ کی فرمائش پہنچا دی گئی ہے طاہر جاوید مغل کے پاس...... اب دیکھیے کیا ہوتا ہے) محمد صفدر معاویہ نہایت اچھا، عمدہ تبصرہ، آپ کا دوستوں کو ویلکم کرنے کا انداز ہمیں پسند آیا۔ سید عبادت کاظمی نہایت افسردہ تھے۔ طاہرہ آپی کا تبصرہ جاندار تھا۔ ایک بات آپی کچھ قلم کار حقیقت بیان کرتے ہیں زندگی کی تلخیاں جیسا طاہر انکل۔ ویسے آپی Happybirthday مجھے بھی گلہ ہے کہ مجھے بھی کسی نے Birthday وش نہیں کیا۔ حسب معمول شیش محل سے آغاز کیا۔ ولیم کو دادا نے اچھی سزا دی لیکن دادا جیل سے رہائی پا گیا۔ اب ہمارا شک یقین میں بدلتا جا رہا ہے کہ جولیٹ نواب اسد اللہ کی اولاد ہے۔ اس کے بعد چاند بانو کے زخمی اور زمرد بانو (سوری گرمی میں نام بھی غلط ہو رہے ہیں) زمرد بائی کی موت کا افسوس ہوا۔ بملا کی چالاکی سامنے آ گئی۔ جوزفین پر الزام لگنے سے ہمیں دکھ سا ہوا۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی وصیت پڑھی۔ نہایت اچھی کہانی تھی۔ نثار نے اچھا نہ کیا اپنے بیٹے کے ساتھ۔ آخر میں مرنے کے بعد بھی افتخار نے اس کے ساتھ بدلہ لے لیا۔''

✠ طاہرہ گلزار، پشاور سے محفل کی زینت بنی ہیں ''آپ سب کو یوم آزادی بہت بہت مبارک ہو۔ میرا خط بہت تفصیلی شائع ہوا ہے۔ اس بار اپنے فیورٹ عبدالرب بھٹی اور اپنے بہت ہی سویٹ بھائی کاشف زبیر کا نام دیکھ کے خوشی بھی ہوئی لیکن کافی دیر تک سسپنس ہاتھ میں لے کر اور موبائل میں کاشف بھائی کی تصویر کو دیکھ کر دیر تک روئی۔ میں نے ابھی تک ذہنی طور پر کاشف زبیر بھائی کی موت قبول نہیں کی۔ انشائیہ میں جون ایلیا ایک آرزو کو آرزو بنانے پہ لگے رہے اور اس دنیا سے یہ آرزو لے کر چلے گئے منوں مٹی میں کہ شہر کراچی پھر سے امن کا شہر بن جائے۔ کب یہ ملک ظلم و جبر کے اندھیروں سے نکل کر امن کی روشنی سے منور ہو جائے لیکن ہائے افسوس۔ مدیر اعلیٰ کی دل سوز اور کھری کھری سچی باتیں پڑھ کے سوچ میں پڑ گئی کہ حیرت کا مقام ہے کہ یہ ہمارے حکمران بے حس اور خود غرض زیادہ ہیں یا بے شرم زیادہ ہیں۔ چلتے ہیں اپنے دوستوں کی محفل میں۔ پہلے نمبر پر قیصر اقبال گجر اتنے عرصے کے بعد آئے تو انکل نے رحم کھا کے کہ چلو مہمان ہیں کرسی صدارت پہ بٹھا دیا ورنہ تبصرہ اتنا اچھا نہیں تھا۔ ان سے اچھا تبصرہ تو صفدر معاویہ اور ابرار وارث کا تھا چلو پھر بھی دل پہ ایک، ایک کلو کا پتھر رکھ کے مبارک باد دیتے ہیں۔ (بہت بری بات ہے بھئی یہ تو) مسز صدیقی کا تبصرہ بہت مختصر لیکن محبت بھرا اور دعاؤں سے پر تھا۔ سید عبادت کاظمی بھائی یہ دنیا ہے یہاں دکھ زیادہ اور خوشیاں بہت کم ہیں، مرنا جینا ہم سب کے ساتھ لگا ہے، ہمت و حوصلہ سے کام لو۔ پلیز تمام پرانے تبصرہ نگار حاضر ہوں۔ حسب عادت اسما قادری کا شاہکار ناول شیش محل دیکھا۔ شیش محل پہ کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے لیکن تنقید کرنا بھی ضروری ہے۔ بملا نے چاند بی بی پہ حملہ کیا، اتنا سخت چاند بی بی کے چہرے پہ صرف چند زخم آئے۔ جوزفین کی کہانی البتہ بہت دلچسپ جا رہی ہے۔ ربن داوا بہت ہی اسٹرانگ کردار میں سامنے آ رہے ہیں۔ سسپنس کے آخری صفحات پر ہم سب کے فیورٹ کاشف زبیر کی آخری تحریر اسیر خیال پڑھی۔ مجھے اللہ پر مکمل بھروسا ہے کہ اس نے اسی وقت میرے کاشف بھائی کو بخشا ہوگا۔ بہت ہی زبردست تحریر انسانی رویوں اور نفسیاتی الجھنوں میں ایک شاہکار تحریر جو برسوں نہیں بھلائی جا سکے گی۔ ایک ایک لفظ سے یوں لگ رہا تھا جیسے کاشف زبیر خود کو کتنی مشکل سے نفسیاتی تکلیف سے بچاتے رہے ہوں گے۔ کتنی بہادری سے اس نے زندگی گزاری۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں سب سے اونچا مقام عطا کریں۔ آمین۔ سلیم انور کی مختصر تحریر ڈھونگ پڑھ کے بہت ہنسی آئی۔ بے چارے بیلی کو خوش فہمی میں رکھ کے اس سے حقیقت اگلوالی...... اسلامی صفحات پر عرصے سے ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریریں پڑھ کے دل و دماغ منور کرتے ہیں...... منظر امام صاحب اس بار پھر ایک انوکھے اور بہت ہی حساس موضوع پر تحریر آگ کا دریا لے کر آئے۔ اپنے فیورٹ رائٹر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے بھی اپنی تحریر وصیت پڑھی میں ڈاکٹر صاحب نے بہت ہی نازک موضوع پر قلم اٹھایا۔ افتخار نے بہت اچھا کیا اور بیوی کو ایسی انوکھی وصیت پوری کرنے کا کہا۔ اس بار ملک صفدر حیات ایک اور نرالا کیس حکم ربی لے کر آئے۔ جاوید جیسے شوہر کے ساتھ ایسا ہونا چاہیے اور رحمت بی بی اور خالدہ جیسی کم بخت عورتوں کے ساتھ بھی ایسا ہوا تو بہت اچھا ہوا۔ اس بار الیاس سیتاپوری داستان رزم و بزم میں داستان طوسی لے کر حاضر ہوئے۔ یہ ان کے قلم کی جادوگری ہی تو ہے کہ قاری کو جس دور میں چاہیں اپنے ساتھ وہیں پہنچا دیتے ہیں...... تنویر ریاض کی تحریر خالی پن رائٹرز کے بارے میں بہت اچھی اور معلوماتی تحریر، بل جتنا مشہور شخصیت تھی اندر سے اتنا ہی چھوٹا انسان نکلا۔ کہانی کا ہیرو آخر کامیاب ہو گیا...... اپنے تمام پرانے تبصرہ نگاروں سے ایک بار پھر التجا دوستوں واپس آ جاؤ۔'' (اتنا بڑا تبصرہ لکھنے کا شکریہ مگر کبھی کبھی اختصار سے بھی کام لینا پڑتا ہے)

✠ صادق معاویہ سعیدی، رحیم یار خان سے کھٹی میٹھی باتیں کرتے چلے آ رہے ہیں ''اگست 2016ء کا سسپنس زیب نگاہ ہے۔ سرورق کی دوشیزہ مرحا گل کی دھرنا دھمکی پر، پریشانی محسوس ہوئی۔ خوب صورت فہرست میں کاشف زبیر کا نام دیکھ کر آنکھیں بھیگ گئیں۔ حق تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ جون ایلیا شہر قائد کے دکھ جھیلنے کی نوکری اور زخم دھونے کی چاکری بغیر تنخواہ کرتے رہے۔ جون ایلیا تو ہمارے اور لاکھوں پاکستانیوں کے دل میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ آپ کا اداریہ ہمارا تو دل دہلا دیتا ہے لیکن آپ کے مخاطب صُم بُکم عُمی اور دل، انسانیت، عقل و خرد سے تہی دست و تہی داماں ہیں۔ اپنی محفل میں حاضری دی۔ قیصر اقبال گجر کرسی صدارت پر جلوہ فگن ہیں۔ مبارکاں سرکار۔ پوری بزم دوستاں سے یکسر مختلف، نہایت نفیس اور دل کو چھوتا تبصرہ خوب مزہ دے گیا۔ ہمیں یاد کرنے

کا شکریہ اور اس دفعہ تو صدارت ہم سے ایک قدم کی دوری پر رہ گئی۔ خیر پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔ طاہرہ گلزار جی اور وارث علی ملاح ہمارے احتجاج کا اندازہ غلط تھا، ہم اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے پوری بزم دوستاں اور ادارے سے معذرت خواہ ہیں۔ محمد صفدر معاویہ آپ نے ٹھیک کہا کہ ہمارے سیاسی بازی گر الگ الگ نظریات کا ڈراما کر کے ہمیں کچلنے اور برباد کرنے کے لیے قطعی متحد و متفق ہیں۔ اللہ کرے پاکستان کو مخلص اور پاکستان کی ہمدرد قیادت میسر آئے، آمین صفدر معاویہ آپ کو دیکھ کر ہمیں بھی لکھنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ سدا سلامت رہو۔ عظیم مسلمان سماجی قائد عبدالستار ایدھی کے لیے پوری امت سے تعزیت۔ ایسی نابغۂ روزگار شخصیت شاید کبھی دیکھنے کو ملے۔ سب سے پہلے اپنے محبوب کاشف زبیر کی اسیر خیال پڑھی۔ تبصرہ کی گستاخی نہیں کرتا۔ شیش محل اسما قادری آپ تو کمال کرتی ہیں۔ فاروق کو واپس آلینے دیں۔ اتنا تڑپانا اچھا نہیں ہوتا اور لگتا ہے ربن دادا اگلی قسط میں دلدار آغا کو چھاپ لے گا اور منظر امام کی آگ کا دریا، فلسفہ محبت کو دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا اور مولوی کے کردار کو مثبت اور صحیح انداز میں اجاگر کیا گیا۔ باقی ڈائجسٹ زیر مطالعہ ہے۔'' (تبصرہ کرنے کا شکریہ)

✠ **محمد خواجہ**، کورنگی، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ''برکتوں کا مہینا گزر گیا۔ جون کی گرمی رمضان کے روزے، بے تحاشا مہنگائی، بجلی کا شدید بحران، سحری میں بجلی نہیں، دن بھر بار بار بجلی جاتی رہی۔ گھنٹوں کے انتظار کے بعد نقص دور ہو کر بجلی آئی تو پھر لوڈ شیڈنگ کا وقت ہو گیا۔ ڈھائی گھنٹے پھر بجلی کے انتظار میں کٹ جائیں گے۔ بڑے بڑے دعوے کیے تھے خادم اعلیٰ نے 3 سال میں بجائے سہولت کے مصیبتوں کے پہاڑ کھڑے کر دیے جو غریب پینشن یافتہ یا ریٹائرڈ لوگوں کے مختلف آمدنی کے ذرائع سے نان نفقہ چلتا رہا اس میں بے تحاشا کمی کر دی گئی۔ نوجوان کو روزگار نہیں۔ آخر کوئی قانون ہے کہ جو ہمیں ایسے مسائل سے نکال سکے۔ سرورق پر خاتون کس طرح انجان پریشان سوچوں میں گم ہے۔ درخت پر نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ کیا حالات کی مار سہہ سکیں گی یا جل جائیں گی۔ جون ایلیا کی ایک آرزو، بڑی دردناک انداز میں کی گئی ہے۔ یہ آرزو پوری ہو سکتی ہے اگر قوم زندہ ہو۔ ہمارا شہر جو سارے ملک کا پیٹ پالتا رہا، اسی کو ہی لہولہان کر دیا گیا۔ جون ایلیا آپ کے قلم کا نشتر کند ہو جائے گا لکھتے لکھتے لیکن کوئی اثر نہیں ہوگا۔ دوستوں کی محفل بڑی دل پذیر ہوتی ہے۔ ہمارے پیارے بھائی بہن نے محبت کے بندھن باندھ رکھے ہیں۔ ہم چھ بھائی ہیں لیکن بہن کوئی نہیں۔ طاہرہ گلزار بہن کی محبت پڑھ کر دل میں بہن کی کمی کی آرزو آنکھیں نم کر دیتی ہے۔ ایک رمضان پاشا ہیں۔ دوستوں کی محفل میں رہتے ہیں لیکن کسی دوست سے کوئی واسطہ نہیں۔ اپنا اپنا مزاج ہے۔ تمام دوستوں کے تبصرے رنگارنگ ہوتے ہیں۔ داستان رزم و بزم، الیاس سیتاپوری تاریخ کے اور ماضی کے واقعات کو زندہ و جاوید بنانے کے ماہر ہیں۔ میں تاریخ کا طالب علم رہ چکا ہوں اور تاریخی واقعات کا بڑا پرستار ہوں اور الیاس سیتاپوری تاریخ کے استاد ہیں۔ بڑی عمدہ تحریر ہے اور سبق آموز بھی۔ شیش محل، کہانی نے بڑا موڑ لیا ہے۔ حالانکہ کہانی تیزی سے آگے بڑھی نہیں لیکن اپنی دلچسپی کو پوری طرح برقرار رکھا ہوا ہے۔ ربن دادا، جوزفین اور فاروق سب نئی الجھنوں میں الجھ گئے ہیں۔ حکم ربی، انسپکٹر ملک صاحب کی نیک نیتی پر خدا بھی ان کا مددگار رہتا ہے، ایک پڑوسن نے بڑے احساس ذمہ داری کا ثبوت دیا اور آنے والے حالات کی پیش گوئی کر دی لیکن حالات نے عجیب الٹا رنگ دکھا دیا۔ ظالم مقتول بن گیا۔ خالی پن، ایک غیر ملکی کہانی لیکن واقعی کسی بھی تخلیق احساس اور دلی جذبے کے ذریعے ہی وجود میں آتی۔ مصنف کی تحریر میں لکھنے کے ساتھ جذبات کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ غور سے پڑھنے والی کہانی وصیت، دولت سے کھیلنے اور رشتوں کو اہمیت نہ دینے والوں کی کہانی۔ ایک بیٹے نے اپنے دولت مند باپ کے لیے ایک وصیت ایسی چھوڑ دی کہ باپ کو خون کے آنسو رونا پڑے۔ ایک بہت معمولی کہانی کو آخر کار بڑی جذباتی بناتی ہے۔ بندگی، ایک بدخصلت شخص کی کہانی۔ جس کو زندہ رہنے کا حق نہیں تھا۔ جب وہ مارا گیا تو اس کا قتل ایک معما بن گیا۔ مجرم ایک معصوم لڑکی تھی۔ جس نے ایک بڑا قدم اٹھایا، اپنی عزت کو بچانے کی خاطر۔ دھماکا، ایک شخص جو ایک شادی شدہ عورت کا محبوب تھا۔ دونوں نے مل کر ایک پلان بنایا کہ عورت کے شوہر کو بم سے اڑا کر عورت آزادی حاصل کر لے لیکن تدبیر الٹی ہو گئی۔ آگ کا دریا، ہمارے بعض علاقوں کے فرسودہ جرگہ قوانین پر ایک طنز بھری تحریر۔ شکر ہے کاری کے خلاف اب قانون بن چکا ہے۔ ورنہ معمولی دشمنی پر کارو کاری کا الزام دھر کے لوگوں کو قتل کیا جاتا رہا۔ ڈھونگ، ایک کمال کی تحریر۔ مجرم سے جرم کا اقرار کروانے کا انتہائی عجیب تجربہ لیکن ایسا طریقہ کار جس میں بہت ساری انتظامی سرگرمیاں۔ ایک آبادی کو جھوٹ موٹ بسانا۔ بہت سارے لوگوں کو اداکاری کرنا۔ ہمارے یہاں تو منٹوں میں اقرار جرم کروالیا جاتا ہے۔ کترنیں، لطائف، حکایتیں، سنہری باتیں سب کچھ رسالے کا حسن بھی ہے اور چٹخارے بھی۔ اشعار میں بھی چنیدہ پھولوں کا گلدستہ نظر آتا ہے۔ خدا اس رسالے کو ترقی دے اور قائم و دائم رکھے۔ آمین'' (بہت شکریہ اتنا تفصیلی تبصرہ کرنے کا)

✠ **محمد شہباز ناز**، سرگودھا سے تشریف لائے ہیں ''سب سے پہلے تو میں شکرگزار ہوں ادارہ سسپنس ڈائجسٹ کا کہ آپ نے میرا خط شائع کیا۔ ٹائٹل کی بات کرتے ہیں حسینہ بہت خوب صورت تھی ایک ہاتھ منہ پر لگائے سوچوں میں گم اپنے محبوب کا انتظار کر رہی تھی۔ تمام دوستوں کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ میرے پاس ایک دوست فیصل حسن نے رسالہ دیکھا جس میں میرا خط شائع ہوا تھا، وہ بہت خوش ہوا، میں نے پوچھا کہ تم کون سا رسالہ پڑھتے ہو جبکہ وہ دوسرے رسائل شوق سے پڑھتا تھا۔ میں نے اس کو رسالہ پڑھنے کے لیے دیا جب وہ واپس دینے کے لیے آیا تو میں نے پوچھا کہ کیسا لگا؟ میرے دوست فیصل حسن نے بتایا، یار مزہ آگیا زندگی میں پہلی بار سسپنس پڑھا۔ دل کرتا تھا پڑھتا ہی رہوں ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ داستان رزم و بزم اعلیٰ پائے کی کہانی ہے۔ دھماکا اچھی تھی، آگ کا دریا اچھی تھی، ماروی بیسٹ کہانی۔ آخری قسط کا انتظار رہے گا۔ دعا گو ہوں کہ اللہ پاک اس محفل کو اسی طرح آباد و شاد رکھے۔ آمین۔'' (پسندیدگی کا بہت شکریہ...... آپ کا بھی اور آپ کے دوست فیصل حسن کا بھی)

✠ **اشفاق شاہین**، لاہور سے محفل میں شریک ہیں ''سسپنس کے ساتھ میری رفاقت تو برسوں پر محیط ہے لیکن خط پہلی بار لکھ رہا ہوں (مگر

کیوں بھئی) جی جی سن تو لیں لاہور سے پہلی بار لکھ رہا ہوں، کراچی سے لاہور کے سفر نے سسپنس سے ایک ماہ کے لیے دور کر دیا تھا، خط لکھا بھی تھا، شاید نئے راستوں کی وجہ سے بروقت منزل نہ پا سکا، اب کے کوشش پھر سے ہے۔ سسپنس سے دوری تو برداشت نہیں ہوتی، ہمارے بس میں ہو تو اسے پندرہ روزہ کر دیں (اللہ اللہ کریں) خیر ڈائجسٹ 18 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل بھی بہت خوب صورت تھا حسینہ انجانی سوچوں میں گھری نظر آئی۔ جون ایلیا کا انشائیہ ایک آرزو، تلخ حقیقت، جانے کب جون ایلیا کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو۔ محفل میں پہنچے جہاں قیصر اقبال کچھ اپنے مخصوص اور منفرد انداز کے ساتھ کرسی صدارت پر براجمان تھے، بہت شاندار تبصرہ رہا آپ کا۔ صادق معاویہ اس بار وزارت آپ کے نام رہی، مزے کیجیے اور خوش رہیے۔ وارث علی ملاح اور صفدر معاویہ زبردست خطوط کے ساتھ شامل بزم تھے، کیا بات ہے۔ سب سے پہلے شیش محل کا مطالعہ کیا۔ چاند بانو بملا کی خفگی کا شکار ہوئی ہے، فاروق کیسے بدلہ لیتا ہے بملا سے، یہ آگے دیکھیں گے۔ ربن دادا بھی دلدار آغا کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے، جوزفین سازش کا شکار ہو کر بے گھر ہوئی، ٹرین میں پھر فاروق اور ماجد کی آنکھ مچولی بلکہ لڑائی ہوئی، ہنوز ہم جولیٹ کی فاروق سے ملاقات کے منتظر ہیں۔ ماروی آہستہ آہستہ دیوتا بنتی جا رہی ہے۔ کاشف زبیر کی اسیر خیال عام ٹاپک سے ہٹ کر تھی مگر ایک بہترین تحریر تھی خصوصاً قیصر کا کردار۔ ملک صفدر حیات حکم ربی میں اپنے تمام کرداروں میں انصاف کرتے نظر آئے۔ ملک صاحب کا ساجد پہ شک تک نہ تھا لیکن چوٹ کھایا بندہ کچھ بھی کر سکتا ہے، اچھی تحریر تھی۔ مختصر کہانیاں بھی اپنی جگہ بہترین تھیں، خصوصاً ڈھونگ اور خالی پن مزہ دے گئیں۔ تاریخی کہانی داستان رزم و بزم بھی لاجواب تھی۔ کترنیں بھی اس بار خوب رہیں۔ محفل شعر و سخن میں انتخاب اس بار بے مثال تھا خصوصاً زرمین اعجاز، محمد قاسم اور انعم کمال کا انتخاب اپنی مثال آپ تھا۔''

(بہت شکریہ جناب حاضری لگانے کا)

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ٹاؤن خانیوال سے خراماں خراماں چلے آرہے ہیں ''پچھلے چند ماہ سے ایسی پریشانی میں مبتلا ہوں کہ تبصرہ تحریر کرنا تو دور کی بات شمارہ پڑھنے کی نوبت بھی کم کم آئی۔ آپ سب سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ پاک اس پریشانی کو آسانی میں بدل دے۔ (اللہ آپ کے مسائل حل کرے، آمین) اگست کا شمارہ بروقت لیا تو تبصرہ تحریر کرنے کا خیال آیا اور ہم نے کاغذ قلم اٹھا لیا۔ جون ایلیا نے کیا تلخ حقیقت بیان کی کہ اس شہر کا نہ کوئی چارہ گر ہے نہ تیماردار، دوسرے شہر صرف اس پر ترس ہی کھا سکتے ہیں۔ اداریہ بھی اس بار زبردست رہا ایسا لگا کہ ''زیرو پوائنٹ'' کا کوئی کالم پڑھ رہے ہیں۔ جو لوگ دہشت گردی کا شکار ہوئے یا حادثات میں ہلاک ہو گئے ان کے پیاروں کے لیے تو قیامت واقع ہو گئی اور بازی گر طبقہ بیانات تک ہی محدود رہا۔ رہی بات لوڈشیڈنگ ختم ہونے کی تو وہ ناممکن ہے۔ ایک سو میگا واٹ بھی پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں بڑھی تو ختم کیسے ہو گی۔ سچ کہا سب کچھ ہے پر ''اخلاص'' کا فقدان۔ محفل کی صدارت پیارے بھائی قیصر اقبال کے حصے میں آئی۔ ''ست ست مبارکاں جناب'' آپ نے تو چکر بازی کی حد کر دی اور محفل میں سب کو چکر دیتے نظر آئے لیکن یہ خواتین کے پاس رکنا ذرا نہ بھایا، کرسی صدارت کے پائے سے چمٹے صادق معاویہ اپنی ہمت دکھاتے نظر آئے۔ مسز صدیقی! بیٹیوں کے ساتھ ساتھ ہم بیٹوں کے لیے بھی دعا کر دیتی تھی۔ محمد انعام! آپ معیاری مواد نکالنے کی بات کر رہے ہیں جبکہ حکومت 2018ء تک تمام سرکاری تعلیمی اداروں کو پرائیویٹ کرنے کا عندیہ دے رہی ہے، اس ضمن میں 5000 پرائمری اسکولز این جی اوز کے حوالے کر بھی چکے ہیں اور این جی اوز کے جو مقاصد ہیں ہر باشعور پاکستانی جانتا ہے۔ حافظ شعیب معاویہ! کتنی بچت ہوئی جرمانے کی؟ وارث علی! لمبی انگلیاں دیکھ کر جھرجھری کھاتے نظر آئے۔ محمد خواجہ! یقیناً کہانیوں پر سب سے عمدہ تبصرہ آپ کا رہا تاہم کچھ کھٹی میٹھی محفل کی بھی ہو جاتی تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ طاہرہ گلزار مری کی سرد فضاؤں میں بیٹھ کر باقی سب کو للچاتی نظر آئیں۔ رمضان پاشا! صحت مبارک ہو اور سب مریضوں کے لیے بھی دعا کریں۔ محمد شہباز ناز! یہ حسینہ کو 402 نمبر کس کیٹیگری کے تحت دیا اور شریف آدمی کب پھنستا ہے بھلا؟ ماروی میں ٹیلی پیتھی کی واپسی سے ماروی میں دوبارہ دلچسپی لی لیکن وہ دیوتا جیسا مزہ کہاں؟ ملک صفدر حیات کی حکم ربی میں اس بار کافی مشکل کیس کی روداد پڑھنے کو ملی۔ بھولا کی اچانک اس جگہ سے گرفتاری کیس کو حل کرنے کا سبب بن گئی۔ ایک بات جو نوٹ کی کہ ملک صاحب کی روداد میں اکثر قاتل یا مقتول کی مین بازار میں کپڑے کی ہی دکان ہوتی ہے اس بار خورشید بیگم کے حوالے سے ملک صاحب نے ذہین قارئین کے لیے ایک سوال چھوڑا کہ اس کو کیا سزا دی گئی ہو گی شاید ضمیر کے کٹہرے میں اسے لا کھڑا کیا گیا ہو گا۔ تاریخی کہانی رزم و بزم میں ہلاکو خان کے بغداد پر حملے سے پہلے کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ مسلمانوں کو جتنا نقصان غداروں نے پہنچایا شاید دشمن بھی اتنا نہ پہنچا سکے۔ خلیفہ مستعصم باللہ کے وزیر ابن علقمی نے ملت اسلامیہ کے لیے اس عظیم سانحے کی راہ ہموار کی جس میں ہلاکو خان نے بغداد کے مسلمانوں کا اس قدر خون بہایا کہ دریا کا پانی بھی اس خون سے رنگین ہو گیا اور تمام علمی سرمایہ کو آگ لگا کر دیگر اقوام پر مسلمانوں کی علمی برتری کو بھی ختم کر دیا گیا۔ خواجہ نصیر الدین طوسی کو ہم سائنس دان کے طور پر پڑھتے آئے ہیں۔ خلیفہ کے دربار میں رسائی حاصل نہ کرنے کے بعد ذاتی عناد کی وجہ سے ہلاکو کا ساتھ دیتا نظر آیا۔ کاشف زبیر مرحوم کی اسیر خیال ہمیشہ کی طرح دلچسپی سے معمور اور اسرار و تحیر کے پردوں میں لپٹی ہوئی تحریر تھی جس کا موضوع انسانی ذہن کی اپنے حساب سے قلابازیاں تھا، پڑھتے ہوئے مرحوم کا چہرہ دل و دماغ میں گردش کرتا رہا۔ ہماری تجویز ہے کہ ہر ماہ ان کی کوئی ایک تحریر منتخب کر کے سسپنس کی زینت بنائی جائے کم از کم 12 کہانیوں کا انتخاب کر لیا جائے (آپ کی تجویز نوٹ کر لی گئی ہے) شیش محل میں ربن دادا اینڈ کمپنی پہلی بار مشکل میں نظر آئی تاہم ان حالات میں بھی دلدار آغا کی گوشمالی کا عزم ربن دادا کی حوصلہ مندی کا ثبوت ہے۔ محفل شعر و سخن میں زوہیب احمد اور اعجاز کا انتخاب پسند آیا۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی۔ اسرار ساقی، ڈسٹرکٹ جیل اٹک۔ محمد زکریا، نامعلوم مقام۔ مختار احمد، حیدر آباد۔ نازیہ خان، بہاولپور۔ وقار حسن، راولپنڈی۔ مدثر علی، پشاور۔ زریان سلطان، کراچی۔

انسانی قدم ہوں یا گزرا وقت... کسی نہ کسی حوالے سے اپنے نشان تو چھوڑ جاتے ہیں... یہ اور بات کہ ان سے وابستہ یادوں میں شدت ہے یا بس معمولی احساسات... قوموں کے حوالے سے تاریخ جہاں کی بھی ہو اپنی ایک مضبوط حیثیت دنیا سے تسلیم کراتی ہے... جیسے تاتاری اپنی سفاک فطرت کے باعث ایک الگ شناخت اور فتوحات میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ منگولوں نے جب عروس البلاد بغداد کی فتح کا ارادہ کیا تو چُن چُن کر اپنے لیے ہرکاروں کا انتخاب کیا۔ یہ جنگ کئی محاذوں پر لڑی گئی۔ ہلاکو خان کی خوفناک تباہی نے بغداد میں انتشار پھیلانے کی انتہا کردی۔ بغداد کے بااثر طبقے نے معمولی اور مبہم فائدے کے لیے اپنے ہی آشیانے کو آگ لگادی۔ معتبر لوگ اپنی حرص وطمع کے ہاتھوں غیر معتبر ہوگئے... عجیب وغریب جبلت کے ہاتھوں متغیر حالات اور اس قوم کے عروج وزوال کی سبق آموز داستان۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

ننگ و ناموس کی داستان

الیاس سیتاپوری

درداغ اسی وقت استاد شمس الدین کے پاس پہنچا اور کہا۔ ''استادِ محترم! گوت اپنا آخری وار کرنے وزیر ابن علقمی کے پاس جا چکا ہے۔ اب آپ کو بھی کوئی فیصلہ کن اور مؤثر قدم اٹھانا ہے۔ جلدی کیجیے۔ وقت نہیں ہے۔''

استاد شمس الدین نے کہا۔ ''اتنی رات کو، رات کے اندھیرے میں، میں کہاں ٹھوکریں کھاتا پھروں گا۔ کل صبح شہزادے کے پاس چلا جاؤں گا۔ اس وقت میں نہیں جاسکتا۔ شہزادہ کیا سوچے گا؟''

درداغ نے بے چینی سے کہا۔ ''استاد محترم! آپ میری بات سمجھ کیوں نہیں رہے۔ صبح تک گوت کوئی فرمانِ بے دخلی لے آئے گا اور ہم سب نہایت بے رحمی اور سفاکی سے نکال باہر کیے جائیں گے۔''

استاد نے پوچھا۔ ''پھر بتا کہ ہم کیا کریں؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''آپ میرے ساتھ اسی وقت شہزادہ ابوبکر کے پاس تشریف لے چلیں۔''

استاد نے پوچھا۔ ''اور اس سے بات کیا کریں؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''شہزادے کو سب کچھ بتا دینا ہوگا اور اسی کے توسط سے ساری باتیں امیر المومنین کے گوش گزار کرنی ہوں گی۔ اس کے بعد اگر ابن علقمی امیر المومنین سے ہمارے خلاف کوئی فرمان لینا بھی چاہے گا تو نہیں لے سکے گا۔''

طوعاً وکرہاً استاد شمس الدین درداغ کو لے کر شہزادہ ابوبکر کے پاس چلے گئے لیکن اس وقت شہزادہ اپنے محل میں نہیں تھا۔ وہ ہلاکو خان کے خلاف تیاریوں میں مشغول تھا۔ ابنِ علقمی فوج کم کر رہا تھا اور شہزادہ ابوبکر اپنی فوجی قوت کو بحال رکھنا چاہتا تھا۔ دونوں شہزادے کے انتظار میں محل کے دروازے پر ہی بیٹھ گئے۔ تقریباً نصف رات کو شہزادہ اپنے چند جیالے سرداروں کے ساتھ واپس آیا۔ چند مشعل بردار شہزادے کے آگے آگے چل رہے تھے۔ مشعلوں کی روشنی میں شہزادے نے اپنے محل کے دروازے پر دو آدمی بیٹھے دیکھے تو ٹھٹک کر دور ہی کھڑا ہوگیا اور بہ آوازِ بلند پوچھا۔ ''کون ہے؟ کھڑے ہو جاؤ۔''

استاد شمس الدین اور درداغ کھڑے ہوگئے۔ شہزادے نے استاد کو پہچان لیا۔ حیرت سے پوچھا۔ ''استاد محترم آپ! خیریت تو ہے؟''

استاد نے شہزادے کے آدمیوں کی طرف دیکھا، جواب دیا۔ ''شہزادے! اس وقت میں آپ سے بہت اہم باتیں کرنے آیا ہوں۔ میں صبح کا انتظار نہیں کرسکتا تھا۔''

شہزادے نے اپنے آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب اپنے ہی آدمی ہیں استادِ محترم! آپ کو جو کچھ کہنا ہے، بے خوف وخطر کہہ ڈالیے۔''

لیکن استاد اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ مجبوراً شہزادے نے محل کا پھاٹک کھلوایا اور دونوں کو اندر لے گیا۔ شہزادے کے ساتھی اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

شہزادے نے کہا۔ ''استاد محترم! اب فرمائیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

استاد نے ساری روداد سنادی۔ شہزادے نے درداغ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''میں پوچھتا ہوں یہ حرکت تو نے کی ہے؟''

درداغ نے گڑگڑا کر جواب دیا۔ ''میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔ دراصل ہمیں ہلاکو خان نے بھیجا تھا۔ ہم اس کے خلاف کس طرح جاسکتے تھے؟''

شہزادے نے کہا۔ ''اب اس کے خلاف کیوں جا رہا ہے؟''

استاد نے کہا۔ ''شہزادے! وقت کی نزاکت کا خیال کیجیے، مجھے ڈر ہے کہ گوت ابن علقمی یا امیر المومنین سے کوئی ایسا ویسا فرمان نہ حاصل کرلے۔''

شہزادے نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین رات کو کوئی فرمان نہیں جاری فرماتے۔ رہ گیا ابن علقمی تو اس کا میں علاج کردوں گا۔''

شہزادے نے ایک فرمان جاری کیا۔ ''استاد محترم شمس الدین اپنے مدرسے میں موجود رہیں کیونکہ کل میں معائنہ کروں گا۔''

دوسرا فرمان گوت کی گرفتاری کا جاری کردیا۔ انہوں نے ان دونوں فرمانوں کو لیا اور سپاہیوں کے ساتھ چلنے لگے۔ جب وہ اپنے گھر پہنچے تو گوت کو کمرے میں لیٹا پایا۔ وہ ناکام اور مایوس واپس آیا تھا۔ شہزادے کے آدمیوں نے گوت کو بیدار کیا اور شہزادے کا فرمان پڑھ کر سنا دیا۔ گوت کی نیند جاتی رہی۔ نیم غنودگی میں پوچھا۔ ''یہ فرمان کس نے جاری کیا؟''

سپاہی نے جواب دیا۔ ''شہزادے نے۔ کیوں کیا آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟''

گوت نے کہا۔ ''ہاں، مجھے اس پر اعتراض ہے۔ کیا شہزادہ یہ نہیں جانتا کہ میں اس کے دوست ہلاکو خان کا ایک آدمی، خاص آدمی ہوں؟''

استاد شمس الدین نے جواب دیا۔ ''افسوس کہ شہزادہ واقعی یہ نہیں جانتا کہ تو ہلاکو خان کا خاص آدمی ہے۔''

گوت نے استاد شمس الدین کو گالیاں دینا شروع کردیں، وہ کہہ رہا تھا۔ ”تو مجھ کو گرفتار کرا سکتا ہے، تو مجھے قتل بھی کرا سکتا ہے مگر ایسا کرنا تیرے، تیری قوم کے، تیرے خلیفہ اور تیرے بغداد کے خلاف ہوگا۔ ہلاکو خان تم سب سے اس کا جواب طلب کرے گا۔“ پھر وہ درداغ کی طرف مڑ گیا۔ ”اور تو...... تو غدار ہے۔ یہ آگ تیری ہی لگائی ہوئی ہے۔ میں چشم تصور میں تجھ کو بھی پابجولاں دیکھ رہا ہوں۔“

شہزادے کے آدمی گوت کو لے کر چلے گئے۔

درداغ اپنی کامیابی پر بے حد خوش تھا۔ استاد کے چہرے پر خوشی کا نام تک نہ تھا۔ درداغ نے پوچھا۔ ”استاد محترم! کیا آپ اداس ہیں؟“

استاد نے جواب دیا۔ ”میں اداس نہیں فکر مند ہوں۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ گوت پر قابو پالیا گیا ہے۔“

استاد نے جواب دیا۔ ”درداغ! میری آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ تو نہیں دیکھ سکتا۔ یہ مسئلہ ختم نہیں ہوا بلکہ اس طرح ایک اور جنگ کا آغاز ہوگیا ہے۔ ابن علقمی سے جنگ کا آغاز اور ابن علقمی کے مقابلے میں میری کوئی حیثیت نہیں۔“

درداغ نے کہا۔ ”آپ کے ساتھ شہزادہ جو ہے۔“

استاد نے جواب دیا۔ ”اور ابن علقمی کے ساتھ امیر المومنین جو ہیں۔“

درداغ نے کہا۔ ”پھر اب کیا ہوگا؟“

استاد نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں کیا ہوگا؟“

اس رات وہ دونوں بالکل نہ سو سکے۔ دونوں ہی کروٹیں بدل بدل کر بیداری میں بھیانک خواب دیکھتے رہے۔

☆☆☆

صبح ہوتے ہی استاد شمس الدین نے ایک نیا فیصلہ سنا دیا۔ ”درداغ! رات بھر کے غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اب ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا ہو جانا چاہیے۔“

درداغ بوکھلا گیا، بولا۔ ”لیکن میں کہاں جاؤں گا؟“

استاد نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں تو کہاں جائے گا لیکن تو یہاں سے میرے پاس سے ضرور جائے گا۔“

درداغ نے کہا۔ ”میں یہاں سے ہٹا تو ہلاک کردیا جاؤں گا۔“

استاد نے جواب دیا۔ ”اگر نہیں ہٹا تب بھی ہلاک کردیا جائے گا کیونکہ تیرے دشمنوں کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔“

درداغ نے التجا کی۔ ”استاد محترم! مجھ پر رحم کیجیے، میں بے سہارا ہو کر رہ جاؤں گا۔“

استاد نے جواب دیا۔ ”درداغ! میرے دل میں تیرے لیے بڑی ہمدردیاں تھیں۔ میں نے تو یہاں تک سوچا تھا کہ جب تو مسلمان ہونے کے بعد امیر المومنین کے حکم سے کوئی اچھا سا عہدہ حاصل کرلے گا تو میں علیہ کو تیرے حوالے کردوں گا۔ میرے دل میں تیری بڑی عزت تھی، بڑی وقعت تھی مگر افسوس تو نے اس کی قدر نہ کی۔“

درداغ نے کہا۔ ”استاد محترم! میرا صرف اتنا سا قصور ہے کہ میں نے آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ اگر میں آپ کو کچھ بھی نہ بتاتا تو آپ علیہ کو میرے حوالے کردیتے اور میرے لیے شاندار ٹھکانا بھی یہیں ہو جاتا لیکن اب میں سچ کا گھاؤ کھا کے کہیں کا بھی نہ رہا۔ خدارا مجھ پر رحم کیجیے۔“

استاد خاموشی سے سر جھکا کر کچھ سوچنے لگے، پھر کہا۔ ”تجھ کو میری بات مان لینی چاہیے۔ میں ابن علقمی سے نہیں لڑ سکتا اور یہ طے ہے کہ آج دن کے کسی بھی حصے سے ہم دونوں میں جنگ کا آغاز ہو جائے گا۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”اگر میں یہاں رہوں گا تو اس سے آپ کو کیا نقصان پہنچے گا؟“

استاد نے بتایا۔ ”نقصان یہ پہنچے گا کہ بار ثبوت مجھ پر ڈال دیا جائے گا۔ ابن علقمی اور امیر المومنین دونوں ہی مجھ سے کہیں گے کہ درداغ نے جو کچھ بتایا ہے... اس کو سچ ثابت کرنے کے ثبوت پیش کرو۔ اس وقت میں کیا کروں گا؟“

درداغ نے پوچھا۔ ”پھر میں کہاں جاؤں؟“

استاد نے جواب دیا۔ ”برتنوں کے سوداگر کے پاس، اسی دکاندار کے پاس چند دنوں کے لیے چلے جاؤ جس کی خواہش بھی یہی تھی کہ تم چند دنوں کے لیے اس کے مہمان بن جاؤ۔“

درداغ سوچنے لگا، آہستہ سے بولا۔ ”استاد محترم! میں ایک شرط پر اس کے پاس جا سکتا ہوں۔“

استاد نے پوچھا۔ ”کون سی شرط؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”شرط یہ کہ علیہ بالآخر میری ہی ہوگی۔“

استاد نے بے رخی سے کہا۔ ”یہ وعدہ میں نہیں کرسکتا کیونکہ کچھ پتا نہیں کل حالات کیا رخ اختیار کریں۔“

درداغ نے کہا۔ ”استاد محترم! میں نے جو کچھ بتایا، اس میں جھوٹ ذرا بھی نہیں۔ آخر کار میں ہی سچا ٹھہروں گا۔“

استاد نے کہا۔ ”اگر تو سچا ثابت ہوگیا تو میں تیرا ساتھ دوں گا اور تو جو کہے گا حتی الوسع کروں گا۔“

درداغ نے استاد سے ہاتھ ملایا، پوچھا۔ ”کیا میں

میں وہ ابھی تک شاک کی سی کیفیت میں تھا۔ پارو کی جدائی اس کے لیے ایسا صدمہ ثابت ہوئی تھی کہ وہ ساری دنیا یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی لاتعلق نظر آرہا تھا۔ آدمی کا امنگوں بھرا دل خالی ہوجائے تو وہ ایسا ہی ہوجاتا ہے۔ عام حالات ہوتے تو فاروق اس دکھی لڑکے کو اس کے دکھ سے نکالنے کے لیے اقدامات کی کوشش کرتا لیکن ابھی تو اسے سب سے زیادہ اپنے ساتھیوں کی پڑی تھی اور وہ اس معاملے سے ہٹ کر کچھ بھی سوچنے کے قابل نہیں تھا۔ ربن کا غیاب، راموکی گرفتاری اور اڈے کی نگرانی معمولی باتیں نہیں تھیں اور ان برے حالات میں بس ایک ہی حوصلہ افزا بات تھی کہ نانا ہر طرح سے اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا لیکن یہ عمل خود نانا کے لیے بھی تو نقصان کا باعث بن سکتا تھا۔ پولیس اپنے مجرموں سے تعاون کے الزام میں نانا کو بھی عذاب کا شکار بنا سکتی تھی۔ فاروق جوں جوں اس حوالے سے سوچتا گیا، اس کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہوتا گیا کہ اسے جلد از جلد یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔ ٹھکانے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اڈے کے علاوہ بھی کسی دوسری پناہ گاہ میں رہ سکتا تھا۔ نانا کا پاڑا چھوڑ دینے کا فیصلہ کرنے کے بعد اس نے دوسرا فیصلہ وکیل اشوک بچن سے ملنے کا کیا۔ اب اشوک بچن ہی تھا جو رامو اور جانی کی رہائی کی کوئی راہ نکال سکتا تھا۔

☆☆☆

رامو کو ہوش آیا تو اسے اپنے چہرے پر گیلے پن کا احساس ہوا۔ اس نے زور لگا کر اپنی بوجھل آنکھوں کو کھولا۔ آنکھیں کھل جانے کے بعد بھی کچھ دیر تک اسے اپنے سامنے کا منظر واضح نظر نہ آیا اور دھندلاہٹ چھائی رہی لیکن پھر یہ دھندلاہٹ چھٹنے لگی اور اس نے ایک باوردی سپاہی کو ہاتھ میں گلاس لیے اپنے سامنے کھڑا پایا۔ وہ سمجھ گیا کہ چہرے پر گیلے پن کا احساس اس پانی کی وجہ سے ہے جو سپاہی نے اسے ہوش میں لانے کے لیے اس کے اوپر انڈیلا ہوگا۔ ذہن پر ذرا سا زور دینے پر وہ سپاہی کو شناخت کرنے میں بھی کامیاب ہوگیا۔ یہ وہی سپاہی تھا جس نے پولیس کے اڈے پر ریڈ کرنے سے قبل بہت بروقت انہیں اطلاع دے دی تھی۔

''ہوش میں آؤ راموداوا! تمہیں ایک ضروری بات بتانی ہے۔'' رامو کو آنکھیں پھاڑے اپنی جانب دیکھتا پا کر سپاہی نے سرگوشی میں اسے پکارا۔ رامو نے اس کی پکار پر اپنے سر کو دو تین جھٹکے دیے تو حواس مزید بہتر کام کرنے لگے۔ اس نے دیکھا کہ وہ اور جانی ابھی تک اسی ستون سے بندھے کھڑے ہیں جس سے باندھ کر انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ جانی کی گردن ڈھلکی ہوئی تھی اور وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا۔ رامو نے ذرا تشویش سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس کی چنتا نہیں کرو۔ یہ بھی تھوڑے سے بعد ہوش میں آجائے گا۔ تم پہلے میری بات سنو۔'' سپاہی نے اس کی نگاہوں کی تشویش بھانپ لی۔

''کیا بات ہے۔ کیا بولنے کا ہے تیرے کو اپن سے؟'' رامو نے تیوری چڑھا کر اس سے پوچھا لیکن آواز بلند نہیں تھی۔

''ادھر کھیل بہت بگڑ گیا ہے دادا۔ وکرم صاحب اڈے کے نمک کو بھول کر گوروں کو خوش کرنے کے چکر میں ہے۔ گوروں نے اسے پرموشن کا لالچ دیا ہے اس لیے وہ کسی بھی حال میں ربن دادا کو گرفتار کرنے کو مانگتا ہے۔ ابھی اس نے تم کو شیشے میں اتار کر دادا کا پتا جاننے کا سوچا ہے۔ اپن نے اڈے کا نمک کھایا ہے اور اپنے پر دادا کا بڑا احسان ہے اس لیے تم کو یہ سب بتا رہا ہے، پر ابھی اپن کو سرکاری نوکری بھی نبھانے کی ہے۔ وکرم صاحب نے اپنے کو بولا ہے کہ تمہارا مرہم پٹی کر کے ایک دم فرسٹ کلاس کھانا کھلاؤ پھر اس کے سامنے لے کر آؤ تو اپن ابھی یہ کرنے کا ہے۔ آگے تم کو جو کرنا ہے تمہاری مرضی۔ اپن اپنا فرض ادا کر دیا۔''

وہ سپاہی رامو کی رسیاں کھولتے ہوئے مسلسل دھیمی آواز میں اس سے کہتا جا رہا تھا۔ رامو نے اس کی بات توجہ سے سنی اور پھر ستون سے بندھے جانی کو دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''اسے کاہے کو نہیں کھولتا ہے؟''

''اس کے لیے آرڈر نہیں ہے دادا!'' سپاہی نے انکساری سے اطلاع دی۔

''اس کے لیے آرڈر نہیں ہے تو پھر اپنے کو بھی دوبارہ باندھ دے۔ نہیں چاہیے کوئی مرہم پٹی اور کھانا پینا۔'' رامو نے دوٹوک الفاظ میں کہا تو سپاہی مزید کوئی بات کہے بغیر باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی تک رامو، جانی کو ہلا جلا کر اور آوازیں دے کر ہوش میں لا چکا تھا۔

''خوش ہوجاؤ دادا! وکرم صاحب نے اس کے لیے بھی پرمیشن دے دیا ہے۔'' وہ جانی کی رسیاں بھی کھولنے لگا۔ ساتھ ساتھ تبصرہ کیا۔ ''اپن نے تم کو بولا ہے نا کہ وکرم کو کسی بھی حال میں دادا کا پتا جاننا ہے۔ ابھی وہ تمہاری مان کر اپنی منوانے کی سوچ رہا ہے۔'' رامو نے اس کی بات سنی لیکن تبصرہ نہیں کیا۔ جانی کو کھولنے کے بعد اس نے اپنے کسی

ساتھی کو آواز دے کر اندر بلایا۔ ان دونوں نے مل کر رامو اور جانی کی مرہم پٹی کی۔ اس کے بعد واقعی انہیں عمدہ کھانا کھلایا گیا۔ کھانے کے بعد جانی تو وہیں رہا البتہ رامو کو وہ لوگ وکرم کے سامنے لے گئے۔

''آؤ آؤ رام داس! بیٹھو، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' وکرم نے بڑے جوش سے اس کا استقبال کرتے ہوئے اسے اس کے پورے نام سے پکارا جو رامو کو خاصا اجنبی لگا۔

''کھانا وانا تو ٹھیک سے کھالیا نا؟ میں نے سنتری کو بولا تھا کہ ایک دم فرسٹ کلاس کھانا کھلانے کا ہے اپنے رام داس کو۔'' وکرم کے لہجے میں ضرورت سے زیادہ چاشنی تھی۔

''ایک دم فرسٹ کلاس کھانا وہ بھی حلق تک ٹھنسایا ہے سالے نے اپن کو۔ اپن بولا بھی کہ یہ کیا قربانی کے جناور (جانور) کے مافق ٹھنساتا ہے اپنے کو۔ کہیں گردن کاٹنے کو تو نہیں لے جانے کا ہے اپنے کو۔ سالا ہنسنے لگا۔ بولا صاحب نے حکم دیا ہے۔ اب وہ تمہارا کیا کرتا ہے اس سے پوچھو۔'' رامو نے بے پروائی سے اس کی بات کا جواب دیا جسے سن کر وکرم زور سے ہنس پڑا اور پھر بولا۔

''یہ قربانی وربانی تو سالے مسلوں (مسلمانوں) کا کام ہے۔ اپنی ہندو جاتی میں یہ ریت کدھر ہے۔ اپن تو شاکاہاری ہے اور معصوم جانوروں کی جان لے کر اپنا پیٹ بھرنے کا پاپ نہیں کرتا۔'' وکرم کے الفاظ پر رامو منہ چلا کر رہ گیا۔ اس کے دانتوں میں غذا کا ایک آدھ ذرہ پھنسا رہ گیا تھا جو اس نے بائیں جانب منہ کر کے ہوا میں اڑا دیا۔

''میری بات ذرا ٹھنڈے من سے سننا رام داس! اپنے کو پتا ہے کہ تمہارا اور ربن دادا کا ساتھ بہت پرانا ہے اور تمہارے من میں ربن دادا کی بڑی عزت ہے، پر اب حالات بہت بدل گئے ہیں۔ اب اپنے کو کسی بھی رشتے ناتے سے بڑھ کر بھارت ماتا کا سپوت بن کر سوچنے کا ہے۔ سالے مسلوں نے اتنے برس ساتھ رہنے کے بعد اپنا راستہ الگ کرنے کا سوچ لیا ہے۔ یہ اپنی بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنے کا طے کر چکے ہیں اور ان حالات میں ہندو جاتی کے لوگوں کا بھی فرض بنتا ہے کہ ان مسلوں کا ساتھ چھوڑ کر خود ایک ہو جائیں۔ تمہیں بھی ان حالات میں ربن کا نہیں میرا ساتھ دینا چاہیے۔ میں اور تم ایک جاتی کے لوگ ہیں اور ہمارا کام ہے کہ ایک دوسرے کا خیال کریں۔ پہلے اپنا دماغ ذرا گرم ہو گیا تھا اس لیے اپن نے بے سوچے سمجھے تم کو اور تمہارے ساتھی کو ذرا زیادہ دھو ڈالا، پر ابھی اپن کو ہوش آ گیا ہے اس لیے اپن تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ بولو بنو گے اپنے متر؟'' سپاہی کی فراہم کردہ اطلاع بالکل درست تھی۔ وکرم بڑی چالاکی سے اسے شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے دھرم کا سہارا لیا تھا کیونکہ وہ یہ بات سمجھتا تھا کہ اس معاملے میں زیادہ تر لوگ جذباتی ہوتے ہیں اور فوراً بہکاوے میں آ جاتے ہیں۔

''تمہاری بات ٹھیک ہے انسپکٹر صاحب پر اپنا دادا ان سارے لفڑوں میں نہیں ہے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہے اور اس کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہے کہ مسلمان اپنا الگ دیش بنا پاتے ہیں یا نہیں۔ اس کے اڈے پر ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب برابر ہیں۔ وہ سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔'' رامو نے ربن کی حمایت کی۔ سپاہی کی فراہم کردہ معلومات کے بعد وہ مکمل ذہنی تیاری کے ساتھ وکرم کے سامنے آیا تھا اس لیے ایک طے شدہ حکمتِ عملی کے مطابق اس کی بات کا جواب دے رہا تھا۔

''یہ سب ڈھکوسلا اس وقت تک ہے جب تک ہم سب بھارت ماتا کے سپوت ہیں۔ اگر یہ مسلے بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنے میں سپھل (کامیاب) ہو گئے تو پھر تم دیکھنا کہ تمہارا ربن دادا کیسے پینترا بدلتا ہے۔ ابھی تو سب کو ایک نظر سے دیکھنا اس کی مجبوری ہے۔ الگ دیش بن گیا تو وہ صرف اپنے دھرم کے لوگوں کو پوچھے گا۔ اپنے کو ان مسلوں کا اچھی طرح پتا ہے۔ یہ سب اپنے دھرم اور قوم کے ہوتے ہیں۔'' وکرم اپنے دل میں موجود مسلمانوں کے لیے زہر کو اگلتے ہوئے رامو کو بھی اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کر رہا تھا اور رامو یوں اس کی باتوں کو سن رہا تھا جیسے وہ اس پر اثر انداز ہو رہی ہوں۔ وکرم کو لگا کہ لوہا گرم ہے اس لیے اس نے ایک اور چوٹ لگانے کی کوشش کی اور لہجے میں بڑی نرمی اور محبت سمو کر بولا۔

''دیکھ بھائی رام داس! اپنے کو بھی ان مسلوں سے شکشا لینی چاہیے اور سب چھوڑ کر اپنے دھرم اور جاتی کے لوگوں کا بھلا سوچنا چاہیے جیسا کہ میں سوچ رہا ہوں تیرا بھلا۔ سچ بولوں تو ربن دادا کو پکڑوانے میں تیرا ہی فائدہ ہے۔ ذرا سوچ، دادا جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا جائے گا تو اس کی جگہ تیرے سوا گدی پر بیٹھنے والا کون ہوگا۔ اپنے کو پتا ہے کہ اب بھی ساری دیکھ ریکھ تو کرتا ہے اور سکہ ربن دادا کے نام کا چلتا ہے۔ تو نکل اس مسلے کی غلامی سے اور سنبھال لے اڈا چوکی۔'' اس نے رامو کو لالچ دیا تو رامو بھی اپنی

آنکھوں اور چہرے پر ایسے تاثرات لے آیا جیسے وکرم کی بات اپنے دل کو لگی ہو۔

''بات تو تمہاری ایک دم ٹھیک ہے وکرم صاحب۔ اپنے مگج (مغز) میں بھی آگئی ہے۔ تم ٹھیک بولتے ہو کہ ابھی اپنی ہندو جاتی کے لوگوں کے لیے سوچنے کا سمے ہے۔ تم اپنے لیے سوچنا، اپنے کو بہت اچھا لگا پر تمہارا کیا فائدہ ہوگا یہ سب کر کے؟'' اس نے بڑے طریقے سے وکرم کے فائدے کا پوچھ کر خود کو ملنے والی اطلاع کی تصدیق کرنے کی کوشش کی۔

''اپنا سب سے بڑا فائدہ تو یہی ہے کہ اڈے کی چوکی پر اپنی جاتی (ذات) کا بندہ بیٹھ جائے گا، اس کے علاوہ ہوسکتا ہے کہ پرموشن وغیرہ مل جائے۔ انگریز اب ادھر ہندوستان سے نکلنے کو ہے۔ جاتے جاتے خوش ہو کر اپنے کو بڑا افسر بنا جائے گا تو اس میں بھی اپنی ہندو جاتی کا فائدہ ہوگا۔ اپن اپنے لوگوں کا پورا خیال رکھے گا۔'' وکرم نے تسلیم کرلیا کہ ربن کی گرفتاری میں اس کا بھی فائدہ ہے لیکن اس نے یہ بات بہت گھما پھرا کر مانی تھی اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ ذاتی مفاد سے زیادہ قومی مفاد میں سوچ رہا ہے۔

''تم بالکل برابر بولا انسپکٹر صاحب! اپنا من کرتا ہے کہ کسی بھی طرح ربن دادا کو پکڑ کر تمہارے سامنے لا کھڑا کرے پر ابھی اپن کچھ نہیں کرسکتا......'' رامو نے یوں اپنی ہتھیلی پر مکا مارا جیسے وہ بڑی بے بسی اور جھنجلاہٹ کا شکار ہو۔

''کیا مطلب؟ تو کیوں کچھ نہیں کرسکتا؟'' وکرم اس کے الفاظ پر چونکا اور تیوری چڑھا کر دریافت کیا۔

''تم مانو گے نہیں پر سچ یہی ہے کہ دادا کدھری گیا ہے، اپنے کو بول کر نہیں گیا۔ اس روز تم لوگوں نے اڈے پر چھاپا مارا تھا تو وہ جلدی میں بنا کچھ بولے بھاگ نکلا تھا اور ابھی تک اس نے اپنے سے کونٹیکٹ نہیں کیا ہے، پر یہ بات طے ہے کہ کتنی بھی دیری لگائے اس کو مڑ کر اپنے پاس ہی آنے کا ہے۔ وہ اپنے پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کرتا ہے اور اپن اس بات کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔'' رامو بڑے طریقے سے وکرم کو ٹالنے کے ساتھ ساتھ اپنے حق میں بھی رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔

''وہ آیا تیرے پاس تو کیا کرے گا تو؟'' وکرم نے دریافت کیا۔

''تمہارے کو اطلاع کرے گا اور کیا کرے گا، پر وہ اپنے پاس آئے گا کیسے؟ اپن تو ادھر لاک اپ میں بند ہے اور وہ پھنسنے کو ادھر لاک اپ میں تو آکر نہیں ملے گا اپنے سے۔'' رامو نے موقع دیکھتے ہی مطلب کی بات کرڈالی۔

''اسے پتا چلے کہ تو ادھر بند ہے تو تیرے کو چھڑانے کے لیے نہیں آئے گا کیا؟'' وکرم نے معنی خیز انداز میں پوچھا جس پر رامو نے دل ہی دل میں اس کی مکاری پر اسے گالی دیتے ہوئے زور زور سے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔

''وہ ایسے بنا دیکھے بھالے آگ میں کودنے والا آدمی نہیں ہے۔ اگر اس نے اپنے کو چھڑانے کا سوچا بھی تو چاروں کھونٹ دیکھ کر آگے بڑھے گا اور ایسے اپن کو نکال کر لے جائے گا کہ تم اپنا تھوبڑا ہی دیکھتے رہ جاؤ گے۔ ابھی تو اپنے کو لگتا ہے کہ وہ بمبئی میں ہے ہی نہیں ورنہ اب تک کچھ نہ کچھ کر گزرا ہوتا۔''

''اس کا بمبئی سے نکلنا آسان نہیں ہے۔ پولیس کے آدمی ہر اسٹیشن پر نگرانی کررہے ہیں۔ اس نے ادھر کا رخ کیا تو پکڑا جائے گا۔'' وکرم نے یقین سے کہا جس پر رامو نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔

''تم ربن دادا کو جانتے ہی نہیں ہو انسپکٹر۔ وہ کب کونسا بہروپ بدل کر تمہارے آدمیوں کے سامنے سے نکل گیا ہوگا، انہیں پتا بھی نہیں چلا ہوگا۔''

''اوہ......'' رامو کی بات سن کر وکرم کے ہونٹ سیٹی بجانے والے انداز میں سکڑ گئے۔ وہ کچھ دیر اسی حالت میں خاموش بیٹھا سوچتا رہا پھر بولا۔

''ٹھیک ہے، اپن تیرے کو اس ڈیل کے ساتھ ادھر سے جانے دیتے ہیں کہ جیسے ہی ربن دادا تیرے سے کونٹیکٹ کرے گا تو اپنے کو بولے گا۔ تو اپنے سے کوآپریٹ کر کے دیکھ پھر دیکھنا کیسے اپن تیرے کو اکھا بمبئی پر راج کرواتا ہے۔ ربن کے پاس تو بس دو اڈے ہیں نا۔ اپن سے ہاتھ ملا کر تو پورے بمبئی کے اڈوں پاڑوں پر راج کرے گا ......اور ہاں، یاد رکھنا اگر دھوکا دیا تو کدھر پانی پینے کا بھی سے نہیں ملے گا ایسا ڈسے گا اپن تیرے کو۔'' اسے اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرنے والا انسپکٹر وکرم لالچ اور دھمکی دونوں سے کام لے رہا تھا۔ اس کی چالاکی پر رامو دانت پیس کر رہ گیا لیکن بولا تو لہجے میں شیرینی تھی۔

''دھوکا کیسے دے گا اپن تمہارے کو۔ اپنے کو بھی معلوم ہے کہ پولیس سے بگاڑ کر اڈا نہیں چلتا ہے اور پھر تم تو اپنے فائدے کی ہی بات کرتے ہو اپنی کھوپڑی میں بھی مگج (مغز) ہے کوئی گوبر نہیں بھرا کہ اپن اپنا پرافٹ اور لاس کو

نہیں سمجھے گا۔‘‘ اس نے وکرم کو یقین دہانی کروائی کہ وہ پوری طرح اس کے بچھائے لالچ کے جال میں پھنس چکا ہے اور اب ہر حال میں اس کا ساتھ دے گا۔

’’یہ تو تو بالکل سولہ آنے ٹھیک بات بولا ہے۔ چل اسی بات پر ہاتھ ملا۔‘‘ وکرم نے رامو کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا جسے اس نے مجبوراً تھام لیا اور جوش کا مظاہرہ کرنے کے علاوہ باچھیں بھی پھیلا دیں۔

’’اس دوستانے کی خوشی میں یہ تو کنفرم کردے کہ گورا صاحب ولیم کو ربن دادا نے ہی اغوا کر کے اس حال کو پہنچایا ہے۔‘‘ وکرم نے اچانک ہی اس سے ایک نازک سوال کرلیا۔ یہ سوال اب تک اس کے لبوں پر نہیں آیا تھا اور دورانِ تشدد بھی وہ صرف اس سے ربن کے بارے میں پوچھتا رہا تھا جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ ولیم کے اغوا میں ربن کا ہاتھ ہونے کے معاملے میں پُریقین ہے اور بس اس کی گرفتاری چاہتا ہے۔ رامو جو اچانک سوال پر گڑبڑا گیا تھا، یہ نکتہ ذہن میں آنے پر سنبھل گیا اور خوشامدانہ لہجے میں بولا۔

’’تم خود سمجھدار ہو صاحب! تمہارے کو کچھ نہ کچھ سن گن ہوگی، جب ہی اتنی ہلچل مچائے ہو۔ اپن اپنا منہ اس سے کھولے گا جب تم اپنے کو کورٹ میں وعدہ معاف گواہ بنا کر پیش کرو گے ورنہ تو یہ منہ بند ہی اچھا ہے۔‘‘ اس کا جواب سن کر وکرم ہنس پڑا اور معنی خیزی سے بولا۔

’’چالاک تو تم بھی کم نہیں ہو رامو استاد۔‘‘

’’اتنے سال ربن دادا کے ساتھ رہ کر اتنا تو سیکھنے کا تھا نا۔‘‘ رامو نے بھی ہنس کر اسے جواب دیا۔

’’اچھی بات ہے، پر اس سیکھے پڑھے کو اپنے ساتھ استادی دکھانے کے لیے مت استعمال کرنا۔‘‘ وکرم کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس نے اپنی ضرورت کے تحت رامو سے سودے بازی کرتو لی ہے لیکن اس کے دل میں شکوک وشبہات ہیں۔ رامو نے بھی اس بات کو بھانپ لیا اور ناراضی سے بولا۔

’’اگر وشواس نہیں ہے تو جانے دو انسپکٹر صاحب۔ ابھی اپن تمہاری کسٹڈی میں ہی ہے۔ چاہو تو ایک بار پھر باندھ کر کوڑے برسا دو۔‘‘

’’ارے نہیں یار۔ ایسی بات نہیں ہے۔ بس تم جاؤ۔ اپنی طرف سے تم آزاد ہو۔‘‘ وکرم اسے ناراض ہوتے دیکھ کر تھوڑا اسٹپٹایا۔

’’اور وہ جو اپنے ساتھ لونڈا تھا وہ......؟‘‘ رامو نے جانی کے بارے میں دریافت کیا۔

’’اس کو ادھر ہی رہنے دو۔ اس کا تمہیں کیا کرنے کا ہے۔‘‘

’’نہیں انسپکٹر صاحب! اپن اسے چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ اکیلے باہر گیا تو وہ سارے حرام کے پلّے جان کو آجائیں گے۔ اپن کی عجت (عزت) خاک میں مل جائے گی کہ رامو استاد اکیلا باہر آگیا اور جانی کو چھوڑ دیا۔ اپن اس کے بنا باہر جانے کو نہیں مانگتا ہے۔‘‘ وکرم کے انکار پر اس نے دوٹوک لہجے میں فیصلہ سنایا تو وکرم نے کسی قدر تذبذب کے ساتھ جانی کی رہائی کا مژدہ بھی سنا دیا۔ جانی اور رامو تھانے سے باہر نکلے تو جانی تو تھوڑا حیران اور تھوڑا خوش تھا لیکن رامو کا ذہن تفکرات میں الجھا ہوا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ جانے کب ربن واپس لوٹے گا اور اس سارے معاملے کو نمٹائے گا۔ خود اس سے جو ہوسکتا تھا، کرگزرا تھا لیکن آگے کے لیے اسے کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔

☆☆☆

گندی، تنگ اور پُرپیچ گلیوں میں چلتے ہوئے فاروق کا دھیان اپنے اطراف کے ماحول سے زیادہ موجودہ حالات میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ اتنے برسوں سے ربن کے ساتھ تھا۔ ان برسوں میں اس نے کئی بار پولیس کو اڈے پر آتے ہوئے تو دیکھا تھا لیکن وہ ایسے معاملات ہوتے تھے جو عموماً اڈے پر بیٹھے بیٹھے ہی نمٹ جاتے تھے۔ بہت ہوتا تھا تو اڈے کے دو چار لوگوں کی گرفتاری عمل میں آجاتی تھی اور دو چار دن میں ہی ان کی واپسی بھی ہوجاتی تھی۔ ربن بہت ہاتھ پیر بچا کر کام کرنے والا آدمی تھا اور پولیس والوں سے بنا کر بھی رکھتا تھا اس لیے ان لوگوں کے لیے راوی چین ہی چین لکھتا تھا لیکن اب حالات بہت سنگین تھے۔ انسپکٹر وکرم ربن کی گرفتاری پر تلا بیٹھا تھا، وہ بھی اقدام قتل کے الزام میں اور اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ ربن غائب تھا۔ فاروق نے اتنے عرصے کے ساتھ میں اسے کبھی خوف زدہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر مصیبت کا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کرتا تھا پھر اب کیا ہوا تھا کہ وہ سامنے نہیں آرہا تھا؟ یہاں تک کہ پولیس رامو کو گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ ان حالات میں وہ خود فوری طور پر اڈے جانا چاہتا تھا لیکن پھر نانا کی رائے صحیح لگی تھی کہ اڈے جا کر پھنسنے سے بہتر ہے کہ پہلے وہ دور رہ کر حالات کا جائزہ لے اور پھر کوئی قدم اٹھائے۔ اڈے سے دور رہ کر اڈے کے حالات جاننے کے لیے اس نے مناسب سمجھا کہ پہلے خود کسی خفیہ ٹھکانے پر جا بیٹھے اور پھر اپنے آدمیوں سے رابطہ کرے۔ نانا کے پاڑے پر رہ کر اس بیچارے کو پولیس کے عتاب کا نشانہ بنانا ٹھیک نہیں تھا۔ اکبر

اور راموکو البتہ اس نے وہیں چھوڑ دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ مارے مارے پھرنے کے بجائے وہاں سکون سے رہیں۔ وہ گولو کی طرف سے بھی فکر مند تھا۔ کیتھرائن کو اس کے ہاسٹل چھوڑنے کے بعد وہ اڈے پہنچا ہوگا تو فاروق اور اس کے ساتھیوں کے وہاں نہ پہنچنے پر حیران ہوا ہوگا۔ کچھ دیر وہ لوگ اس کا انتظار کرتے رہے ہوں گے پھر وہاں تشویش کی لہر دوڑ گئی ہوگی کہ فاروق اور اس کے ساتھی آخر اتنی دیر ہونے کے باوجود اسٹیشن سے اڈے پر کیوں نہیں پہنچ سکے۔ وہ لوگ ان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہوں گے اور ناکامی کے بعد مزید پریشان ہوں گے۔ گولو اور بجو کے بارے میں تو اسے یقین تھا کہ اس کے لیے تشویش میں مبتلا ہو کر انہوں نے باقاعدہ رونا دھونا مچا رکھا ہوگا۔ وہ نانا کو اس سارے چکر سے دور رکھنا چاہتا تھا اس لیے اس کے اڈے سے کوئی آدمی اپنی طرف نہیں بھجوایا تھا اور ارادہ تھا کہ اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچتے ہی وہاں سے بندہ بھیج کر اڈے سے کسی کو بلوا لے گا۔ سوچوں میں غلطاں و پریشاں آخر وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا اور دروازے پر دستک دی۔ دستک کے جواب میں اندر سے ایک لڑکا برآمد ہوا۔

''ارے فاروق بھائی تم! کیسے ہو؟ بڑے دنوں بعد شکل دکھائی۔'' اس پر نظر پڑتے ہی لڑکا کھل اٹھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم اپنی سناؤ۔'' پریشانی کے باوجود فاروق جواباً مسکرایا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دریافت کیا۔

''اپن بھی ایک دم فسٹ کلاس ہے۔ آپ بڑے ٹائم پر آئے ہو۔ اپن آلو بھرے پراٹھے پکانے جا رہا تھا۔ ساتھ املی اور پودینے کی چٹنی بھی ہے۔'' اس نے فاروق کو اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے جوش بھرے لہجے میں بتایا۔

''تم تو کافی سگھڑ ہو جو اتنا ٹیکنیکل کام بھی کر لیتے ہو۔ میرے خیال میں تو یہ پراٹھے بنانا بڑی مہارت کا کام ہے۔'' فاروق نے حیرت کا اظہار کیا۔

''بس بڑے میاں کی زبان کے چٹخاروں نے سکھا دیا سب کچھ۔ بیٹھے بیٹھے کچھ بھی کھانے کو من کر جاتا ہے بڑے میاں کا۔'' اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے سرگوشی میں جواب دیا اور منہ دبا کر ہنسنے لگا۔

''کون ہے انورے! کس سے باتیں کر رہا ہے تو؟'' اسی وقت اندر سے کسی نے بوڑھی، لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''میں ہوں اچھو چاچا..... آداب! طبیعت کیسی ہے؟'' فاروق فوراً ہی کمرے میں داخل ہو گیا۔

''فاروق استاد! سدا جیتا رہ۔ کیسی طبیعت ہے اب تیری۔ مجھے بڑی دیر میں پتا چلا تیرے بارے میں ورنہ میں خیریت پوچھنے اسپتال آجاتا۔'' اچھو اسے دیکھ کر کھل اٹھا اور محبت سے بولنے لگا۔

''میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں چاچا! آپ خود دیکھ لو۔'' فاروق اس کے سامنے ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اللہ سدا جیتا اور ہنستا کھیلتا رکھے۔ دادا کو بڑی فکر تھی تمہاری۔'' اچھو کے جواب پر وہ چونکا اور پوچھنے لگا۔

''دادا کب آیا تھا یہاں؟''

''ابھی تھوڑے دن پیچھے کی ہی بات ہے۔ مجھے زیادہ تو نہیں پتا بس اتنی خبر ہے کہ ادھر اڈے پر کچھ گڑبڑ تھی اور پولیس دادا کے پیچھے لگی تھی۔ دادا ادھر سے اپنا حلیہ بدل کر پنجاب کے لیے نکل گیا تھا۔ دادا یہاں تھا تو رامو استاد اس سے ملنے آیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے بھی ادھر کا رخ نہیں کیا اس لیے مجھے آگے کا کچھ پتا نہیں۔ تم شملہ سے کب لوٹے؟ کیا لوٹنے کے بعد اڈے نہیں گئے تھے؟'' اس کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ اچھو نے بھی الجھ کر پوچھا۔

''نہیں، میں وہاں نہیں گیا۔ مجھے پتا چل گیا تھا کہ وہاں گڑبڑ ہے اس لیے سیدھا وہاں جانے کے بجائے تمہاری طرف آگیا۔ ارادہ تھا کہ انور کو اڈے بھیج کر وہاں سے کسی کو بلواؤں گا تاکہ سارے حالات کا پتا چل سکے۔ اطلاع ملی ہے کہ رامو استاد گرفتار ہو گیا ہے۔'' درمیان کی تفصیلات بتائے بغیر اس نے اچھو کو مختصر جواب دیا جسے سن کر وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا اور بولا۔

''میں ابھی انور کو بلاتا ہوں۔ پہلے تم اسے جو سمجھانا بتانا ہے بول کر اڈے بجھوا دو۔ باقی کام دھام وہ واپس آکر کرلے گا۔'' اپنی بات کہنے کے ساتھ ہی وہ ملازم لڑکے کو آوازیں دینے لگا۔

''کیا ہے چاچا۔ ابھی پراٹھے پک رہے ہیں۔ پک جائیں گے تو میں لاکر تمہیں دے دوں گا۔ اتنے بے صبرے کیوں ہو رہے ہو؟'' انور جو فاروق کے اس کمرے میں آنے کے بعد خود باورچی خانے میں چلا گیا تھا، ہاتھ میں بیلن پکڑے ہی وہاں چلا آیا اور جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کرنے لگا۔

''بھاڑ میں ڈال پراٹھوں کو ...... پہلے سن لے کہ اپنا فاروق استاد کیا کام بول رہا ہے؟'' اچھو نے لہجے میں رعب لانے کی کوشش کرتے ہوئے انور سے کہا تو وہ فاروق کی طرف رخ کر کے ہمہ تن گوش ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ فاروق

کچھ بولتا، بیرونی دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔
''میں دیکھتا ہوں۔'' انور ہاتھ میں بیلن پکڑے پکڑے ہی باہر نکل گیا۔
''اس وقت کون آ گیا؟'' اچھو بڑبڑایا۔ جواب ظاہر ہے فاروق کے پاس بھی نہیں تھا۔ اس نے سماعتیں باہر سے آنے والی آوازوں پر مرکوز کرلیں۔ انور نے باہر دروازے پر کیا گفتگو کی، یہ تو سنائی نہیں دیا لیکن اندر کی طرف آتے قدموں کی آوازوں سے اندازہ ہو گیا کہ انور کے ساتھ کوئی اور بھی اندر آ رہا ہے۔ آنے والے کے بارے میں کوئی اندازہ لگایا جاسکے اس سے قبل ہی وہ ان کے سامنے پہنچ گیا۔ سفید کرتہ شلوار میں ملبوس کھچڑی بالوں والا وہ باریش آدمی ان کے لیے اجنبی تھا لیکن پھر بھی فاروق نے اس کے لیے شناسائی محسوس کی اور یکدم ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ نو وارد نے بھی فوراً اپنے بازو وا کر دیے۔ فاروق لپک کر اس کی کھلی بانہوں میں سما گیا۔ اس نے ربن دادا کو شناخت کرلیا تھا۔
''تو نے اپنی نہیں سنی نا رے! اپن کو بولے بنا ہی واپس آ گیا۔'' پُرجوش انداز میں اسے اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے ربن نے خفگی کا اظہار کیا لیکن اس خفگی میں بھی شفقت بھری ہوئی تھی۔
''مجھے واپس تو آنا ہی تھا۔ آخر کب تک تم سب سے دور رہتا۔ اب اور وہاں رہنا پڑتا تو ٹھیک ہونے کے بجائے مزید بیمار ہو جاتا۔'' فاروق اس کے شکوے کے جواب میں بولا تو وہ ہنس دیا اور پھر ذرا چونک کر اسے خود سے الگ کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔
''تو ادھر کیا کر رہا ہے؟ تیرے ساتھ کوئی دوسرا بھی دکھائی نہیں دے رہا؟''
''تم آرام سے بیٹھو تو پھر بتاتا ہوں۔ لگتا ہے لمبے سفر سے لوٹے ہو۔'' فاروق نے اندازہ لگایا۔
''جو بھی ہے جلدی بول۔ یہ سفر وفر اپنا کچھ نہیں بگاڑتا۔'' ربن کھٹک گیا تھا اس لیے اس کے کہنے پر بیٹھ تو گیا لیکن موضوع سے نہیں ہٹا۔ ناچار فاروق نے اب تک خود کو ملنے والی اطلاعات اس کے گوش گزار کر دیں۔ رامو کی گرفتاری کا سن کر ربن کا چہرہ بھی سرخ پڑ گیا۔ اس نے اپنے چہرے پر چپکی ڈاڑھی کھینچ کر نکال دی اور غصے سے بولا۔
''حرام کے جنے وکرم کی ہمت بہت بڑھ گئی ہے۔ اسے سبق سکھانا ہی پڑے گا۔''
''آرام سے دادا۔ پہلے ہی جذبات میں بڑا نقصان ہو گیا ہے۔'' فاروق نے اسے ٹوکا۔
''وہ بالکل الگ بات تھی۔ اس سفید چوہے نے تیرے کو نقصان پہنچایا تھا اور اپن فائدے نقصان کا سوچنے بیٹھ کر اس کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔'' ربن فوراً سمجھ گیا کہ فاروق ولیم کے اغوا والے معاملے کی بات کر رہا ہے اس لیے ترنت اس کی بات کا جواب دیا۔ فاروق آگے سے کچھ کہنے کی ہمت نہ کرسکا۔ وہ ربن کی اپنے لیے بے تحاشا محبت سے خوب واقف تھا اور یہ بھی سمجھتا تھا کہ آدمی چاہے کتنا ہی عقل مند اور زیرک ہو اس کی زندگی میں کوئی ایک مقام ایسا ضرور آتا ہے جب وہ ساری عقل و دانش بھول کر اپنے جذبات کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اگر ربن نے بھی ایسا کچھ کر دیا تھا تو یہ اتنی انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ بھی ایک انسان ہی تھا اور اسے انسانی کمزوریوں سے مبرا نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔
''میں سوچ رہا ہوں ہم وکیل اشوک بچن سے ملاقات کریں۔ وہ رامو استاد کی رہائی کے لیے کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکال لے گا۔ میرا اندازہ ہے کہ شخصی ضمانت سے ہی کام چل جائے گا کیونکہ خود رامو استاد پر تو کوئی الزام ہے ہی نہیں۔ پولیس نے صرف تمہاری بازیابی کے لیے اسے گرفتار کیا ہے اور قانوناً اس کی کوئی تک نہیں بنتی ہے۔'' فاروق نے کسی بحث میں الجھنے کے بجائے اصل موضوع پر گفتگو کرنا مناسب سمجھا اور تجویز پیش کی۔
''ایسا کر کے دیکھ لیتے ہیں اگر پھر بھی کام نہ بنا تو اپن اپنی گرفتاری بھی دے سکتا ہے۔ اپنے کو یہ برداشت نہیں کہ اپنی وجہ سے کوئی دوسرا تکلیف اٹھائے۔'' ربن نے جواباً کہا۔
''مجھے یقین ہے کہ ایسا کچھ کرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ آدمی کے پاس بہت سے راستے ہوتے ہیں، اصل بات کوشش کرنے کی ہوتی ہے۔ تم جذباتیت میں اب ایسا کچھ الٹا سیدھا مت کرنا۔ وہ لوگ تمہارے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ یہ معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔ وکرم ایک طرف انگریز سرکار کو خوش کرنے کی کوشش میں ہوگا تو دوسری طرف تمہارے مسلمان ہونے کی بھی چڑ ہوگی اسے۔ اب ہندوستان کے حالات بہت بدل گئے ہیں۔ ہندو، مسلمانوں سے باقاعدہ دشمنی اور نفرت پر اتر آئے ہیں۔ تم انسپکٹر وکرم کو وہ آدمی نہ سمجھو جو نذرانے لے کر تمہارے پیچھے دم ہلاتا پھرتا تھا۔'' فاروق نے ربن کے ارادے کی مخالفت کرتے ہوئے حالات کا تجزیہ کیا۔ مطالعے اور مشاہدے نے اسے بہت سے حقائق سے آگاہ کر دیا تھا اور اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی طرف سے علیحدہ وطن کے مطالبے کے بعد

متعصب ہندوؤں کی مسلم دشمنی کھل کر سامنے آگئی ہے اور وہ کہیں بھی مسلمانوں کو رعایت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

''چل ٹھیک ہے۔ اب تو ہی بڑا بن کر بیٹھ جا اور سارے فیصلے کر۔ اپن یہاں بیٹھ کر دیکھتا ہے کہ تو کیا تیر مارتا ہے۔'' ربن نے ذرا خفگی کے ساتھ اس سے اتفاق کرلیا۔

''فاروق استاد ٹھیک بولتا ہے دادا! ابھی تم اس کی بات مان لو تو اچھا ہے۔'' اب تک خاموش بیٹھے اچھو نے بھی فاروق کی حمایت کی۔

''مان تو رہا ہوں اور کیا کروں۔'' ربن نے چڑچڑاہٹ کا مظاہرہ کیا جس پر فاروق نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اچھو کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ کسی کو اڈے بھیج کر کم از کم اپنی خیریت کی اطلاع بھجوا دوں۔ وہ لوگ بے چارے کم از کم اس پریشانی سے تو نکل جائیں۔''

''انور کا کام نمٹ گیا ہوگا۔ اسے بھیج دو۔'' اچھو نے تجویز دی۔

''ادھر پولیس کی نگرانی ہے۔ انور بدھو پولیس کو اپنے پیچھے لگا کر یہاں تک لے آئے گا۔'' ربن نے فوراً اعتراض کیا۔

''میں انور کو نانا کے پاڑے بھجواتا ہوں۔ وہ وہاں سے رامو کو اڈے بھجوا دے گا بلکہ اڈے بھی نہیں، غفور چاچا کے گھر چلا جائے گا رامو اور چاچا اڈے پر اطلاع کردے گا۔ رامو پولیس والوں کے لیے انجان ہے۔ اس پر کوئی شک نہیں کرے گا۔ بس اسے دور سے اپنا محلہ دکھانا ہوگا۔'' فاروق نے حل پیش کیا۔

''یہ ٹھیک ہے، پر ایسا کر رامو کے بجائے وہ جو تو دوسرا لڑکا اپنے ساتھ لے کر آیا ہے اس سے یہ کام کروالے۔ رامو اپنے ڈیل ڈول اور چلنے سے ذرا الگ دکھائی پڑتا ہے۔ کوئی عام سا بندہ جائے گا تو پولیس کی نظر میں نہیں آئے گا۔'' ربن نے مشورہ دیا جو بالکل مناسب تھا۔ اسی وقت انور نے آکر کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔ طے پایا کہ انور بھی ان کے ساتھ ہی کھانا کھالے پھر اسے نانا کی طرف روانہ کردیں گے۔

☆☆☆

رامو اور جانی اڈے واپس پہنچے تو سارے حیرت اور خوشی سے اچھل پڑے اور چیختے چلاتے ان سے چمٹ گئے لیکن رامو نے محسوس کرلیا کہ خوشی کا اظہار کرنے کے باوجود وہ اندر سے بجھے ہوئے ہیں۔

''کیا بات ہے رے! ایسے صورت کیوں لٹکی ہے تم لوگوں کی؟ اپنے پیچھے کوئی اور بھی گڑبڑ ہوئی ہے کیا؟'' اس نے سب کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اس سے قبل کہ ان میں سے کوئی جواب دیتا، اس کی نظر گولو کے چہرے پر پڑی۔ ایک تو اس کی اڈے پر موجودگی دوسرے رو رو کر متورم ہوجانے والی آنکھیں...... وہ بری طرح چونک گیا اور اس کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز میں ''گولو تو......'' کے فقط دو لفظ ہی نکل سکے۔ گولو جواب تک جانے کیسے خود پر جبر کیے کھڑا تھا، رامو کے متوجہ ہوتے ہی تیر کی طرح اس کے سینے سے آکر لگا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''کیا بات رے! کیوں روتا ہے؟ شملہ سے کب واپس آیا؟ فاروق استاد کدھر ہے؟'' رامو اس کی پیٹھ سہلا کر اسے خاموش کروانے کی کوشش کرنے کے ساتھ ساتھ پے در پے سوالات بھی کرتا جارہا تھا۔ گولو کو اچانک اور ایسی کیفیت میں دیکھ کر وہ بے حد تشویش میں مبتلا ہوگیا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ اڈے پر آنے والی مصیبتوں میں کسی نئی مصیبت کا اضافہ ہوگیا ہے۔

''فاروق بھائی نہیں ہیں۔ ہائے میرے فاروق بھائی......'' رونے کے دوران بہ مشکل ادا کیے گئے گولو کے ان چند الفاظ پر رامو کا کلیجا کٹنے لگا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ گولو کیا کہنا چاہتا ہے اور فاروق کا نام لے کر اتنی بری طرح کیوں رو رہا ہے۔

''پوری بات بول گولو۔ کیا ہوا ہے فاروق استاد کو۔ کدھر ہے وہ؟'' اس نے پریشانی میں گولو کو جھنجوڑ ڈالا۔

''اپن بتاتا ہے استاد! تو ادھر آ گولو۔ تھوڑا پانی پلا اسے سجو۔ کاہے کو اتنا پریشان ہوتا ہے۔ ابھی رامو استاد آگیا ہے نا۔ پتا لگ جائے گا فاروق استاد کا۔'' رامون عرف ممو کہلانے والے ایک ساتھی نے آگے بڑھ کر گولو کو سنبھالنے کی کوشش کی تو دوسرے بھی اس کا ساتھ دینے لگے۔ ممو رامو کو بتانے لگا۔

''فاروق بھائی اپنے دو مہمانوں کے ساتھ کل بمبئی پہنچا تھا۔ اسٹیشن سے خود اڈے پہنچنے کا بول کر اس نے گولو کو سسٹر کیتھی کو اس کے ہاسٹل چھوڑنے کو بھیج دیا۔ گولو سسٹر کو چھوڑ کر اڈے پہنچا تو اس نے اپن لوگ کو فاروق بھائی کا بولا۔ پہلے تھوڑی دیر اپن انتظار کیا کہ آتا ہوگا۔ رستے میں کہیں رک گیا ہوگا پر جب نہیں آیا تو اپن تلاش شروع کردیا۔ اسٹیشن بھی گیا۔ دوسری بھی بہت ساری جگہ دیکھا پر کچھ پتا نہیں لگا۔ تم بھی نہیں، دادا بھی نہیں۔ ابھی اپن کے کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ اور کیا کرے اور فاروق استاد کو

ڈھونڈنے کدھر جائے۔'' ممو کی اپنی آواز یہ سب بتاتے ہوئے بھرانے لگی۔ رامو کا اپنا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ فاروق کل سے بمبئی پہنچا ہوا تھا اور ابھی تک اڈے نہیں پہنچا تھا۔ آخر وہ اپنے دو عدد مہمانوں سمیت کہاں غائب ہو گیا تھا؟ یہ ایسا سوال تھا جس نے دماغ گھما کر رکھ دیا تھا۔ رامو کا شک سب سے پہلے پولیس پر گیا۔ انسپکٹر وکرم نے اسے بتایا تھا کہ ریلوے اسٹیشنوں پر پولیس کے آدمی نگرانی کے لیے موجود ہیں۔ ایسے میں بہت ممکن تھا کہ فاروق اور اس کے دونوں ساتھیوں کو اسٹیشن سے ہی پولیس اپنے ساتھ لے گئی ہو اور اس کے بعد ہی انسپکٹر وکرم نے اس سے معاملات طے کیے ہوں۔ وکرم کی فطرت کی کمینگی جس طرح سامنے آنے لگی تھی، اس سے کوئی بھی امید کی جا سکتی تھی۔ بعید نہیں تھا کہ اس نے رامو کے ساتھ معاملات طے کرنے کے ساتھ ساتھ فاروق کو ترپ کے پتے کے طور پر سنبھال رکھا ہو کہ اگر رامو بدلنا بھی چاہے تو بدل نہ سکے۔ برق کی طرح یہ سارے خیالات ذہن سے گزرنے پر رامو کا جسم اینٹھ سا گیا اور وہ دونوں مٹھیاں بھینچ کر بولا۔

''اپنے چاقو اور دوسرے ہتھیار تیار کرلو۔ طمنچوں کو بھی خفیہ خانوں سے نکال لو۔ اپن انسپکٹر وکرم سے مل کر آتا ہے۔ وہ سیدھی طرح فاروق استاد کا پتا بول دیتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اپن تھانے کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔'' اس کے الفاظ نے وہاں موجود ہر شخص کے جسم میں پھریری دوڑا دی۔ وہ سب بہادر اور جی دار تھے۔ لڑنا جھگڑنا، مار ماری اور مخالفین پر چڑھائی سمیت کوئی بھی کام ان کے لیے مشکل نہیں تھا لیکن وہ کبھی براہِ راست قانون کے رکھوالوں سے متصادم نہیں ہوئے تھے۔ پولیس کے ساتھ ان کے معاملات زیادہ تر افہام وتفہیم کے ساتھ چلتے رہتے تھے۔ حوالات کی ہوا کھانے کی نوبت بھی آجاتی تھی اور جو پکڑا جاتا تھا، وہ اپنا جرم ثابت ہوجانے کی صورت میں چپ چاپ سزا بھگت کر واپس آجاتا تھا۔ جیل یاترا کو ان کے ہاں بہت زیادہ تشویش سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور نہ ہی کبھی ربن نے اس سلسلے میں پولیس والوں پر بے جا دباؤ ڈالا تھا۔ ہاں، جیل میں اپنے آدمیوں کو بہترین سہولیات پہنچانے کا بندوبست وہ ضرور کروا دیتا تھا لیکن ابھی تو کوئی انہونی سی ہو گئی تھی۔ فاروق کے غائب ہونے کی خبر سنتے ہی رامو نے نا صرف یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ پولیس کی کسٹڈی میں ہے بلکہ تھانے پر حملے جیسے خطرناک فعل کا عندیہ بھی دے دیا تھا لیکن ان میں سے کوئی نہیں تھا جو رامو کے اس فیصلے سے اختلاف کرتا۔ سب نے ہی دل سے لبیک کہہ دیا۔

''چل جانی! تو بھی چل اپنے ساتھ۔'' رامو جو ابھی تھانے سے آیا تھا اور جس کا جسم تھانے میں گزرے تکلیف دہ وقت کی نشانیوں سے بھرا ہوا تھا، اپنی جنت میں پہنچ کر حلق میں پانی کا ایک گھونٹ تک نہیں ڈال سکا تھا اور اب جانی سمیت ایک بار پھر اسی جہنم میں جانے کے لیے تیار تھا۔ ابھی وہ اڈے کے دروازے پر نہیں پہنچا تھا کہ دستک کی آواز پر سب چونک پڑے۔ سجو نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ وہاں غفور چاچا کھڑا تھا۔

''پھر کبھی آنا غفورے بھائی۔ ابھی اپن ایک ضروری کام سے جاتا ہے۔'' رامو نے اسے دیکھ لیا اور خلافِ روایت وہیں سے اسے رخصت کرنے کی کوشش کی۔

''میں ایک ضروری اطلاع آپ لوگوں تک پہنچانے آیا ہوں۔'' غفور چاچا نے نیچی آواز میں کہا تو رامو ٹھٹک گیا۔ غفور چاچا کے انداز میں کوئی خاص بات تھی اور اس نے اپنی آواز یقیناً اس لیے نیچی رکھی تھی کہ اڈے کے اردگرد سن گن لینے کے لیے پھرتے پولیس والوں کے کان میں کچھ نہ پڑ جائے۔ عجلت میں ہونے کے باوجود رامو نے اس سے ملاقات کرلینا مناسب سمجھا اور پلٹ کر فرشی نشست سنبھال لی۔ غفور چاچا بھی اس کی دعوت پر اس کے مقابل آ بیٹھا۔ باقیوں میں سے کچھ وہیں ٹھہر گئے اور کچھ تتر بتر ہو گئے۔

''کچھ دیر قبل میرے گھر اکبر نام کا ایک لڑکا ملاقات کے لیے آیا تھا۔ میں اس لڑکے کو نہیں جانتا مگر اس نے مجھے بتایا کہ فاروق استاد کا واقف کار ہے اور ان کے ساتھ ہی بمبئی آیا ہے۔ وہ فاروق استاد کی طرف سے یہ پیغام لے کر آیا تھا کہ وہ خیریت سے ہیں اور ربن دادا کے ساتھ ہیں اس لیے اڈے پر کوئی ان کے لیے پریشان نہ ہو۔ وہ اور دادا مل کر حالات کو سنبھال لیں گے۔'' غفور چاچا کی اطلاع تھی کہ مژدۂ جاں فزا...... وہاں موجود ہر فرد کے جسم میں گویا نئے سرے سے زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ایک طرف فاروق کے بخیریت ہونے کی خوش خبری تھی تو دوسری طرف اس کے دادا کے ساتھ ہونے کی خبر سن کر سب کو یہ اطمینان ہو چلا تھا کہ اب یہ بگڑے ہوئے حالات سنور جائیں گے اور اڈے کی پہلی سی بہاریں لوٹ آئیں گی۔

''کیا خبر سنائی ہے غفور بھائی۔ من کرتا ہے تمہارا منہ موتی چور کے لڈوؤں سے بھر دوں۔''

رامو جو طوعاً وکرہاً ہی اس ملاقات پر راضی ہوا تھا،

کھل اٹھا۔ جواب میں غفور چاچا دھیرے سے مسکرا دیا اور بولا۔ ''آپ لوگ ان مشکل حالات سے نکل آئیں، میرے اور دیگر محلے والوں کے لیے یہی کافی ہے۔ یہاں کے بگڑے ہوئے حالات پر پورے محلے کو ہی تشویش ہے۔ پہلے ہم اپنے محلے میں اڈے کی موجودگی پر گھبراتے تھے لیکن اب ہم آپ لوگوں کو اپنا ہی ایک حصہ سمجھتے ہیں اور جیسے آپ ہمارے دکھ درد میں ہمارے ساتھی بنے رہے، ہم بھی ان مشکل حالات میں اپنی بساط کے مطابق آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔'' غفور چاچا اسی صاف ستھرے لہجے میں رامو سے مخاطب تھے جو بمبئی کی بول چال سے میل نہیں کھاتا تھا لیکن سب چاچا کی یہ زبان سننے کے عادی تھے۔

''تم سب لوگوں کا بہت بہت دھنیواد۔ ادھر دعاؤں کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے، پر یہ جو ابھی تم خبر لائے ہو یہ بھی اپنی بہت بڑی مدد کی ہے۔ اگر تم تھوڑا سا بھی لیٹ ہو جاتے تو جانے کیا کچھ ہو جاتا۔ تم بڑے سے پر آئے غفور بھائی۔'' رامو نے دل سے احسان مندی کا اظہار کیا۔

''اتنا تو ہمارا فرض بنتا ہی ہے۔'' غفور چاچا ایک بار پھر مسکرایا اور بولا۔ ''مجھے تو آپ کو دیکھ کر بھی بہت خوشی ہو رہی ہے۔ خبر ملی تھی کہ پولیس آپ کو اور جانی کو اپنے ساتھ تھانے لے گئی ہے۔''

''پولیس کا اور اپنا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تم بولو محلے میں تو سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟'' رامو نے موضوع کو ٹالا اور بات بدلنے کے لیے سوال کیا۔

''آپ کی مہربانی سے سب ٹھیک ہے پر جولی کی طرف سے ذرا فکر ہو رہی ہے۔'' غفور چاچا کے جواب پر رامو چونک گیا۔

''کیوں کیا ہوا؟ کیا پھر کوئی تنگ کر رہا ہے اسے؟''

''یہ بات نہیں ہے۔ اصل میں دو دن سے اس کے گھر کے دروازے پر تالا لگا ہوا ہے۔ آخری بار للیتا موسی نے اسے صبح کے وقت دفتر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ موسی کا کہنا ہے کہ جولی کے کندھے پر بڑا سا پرس لٹکا ہوا تھا جس کے بارے میں اس نے موسی کے پوچھنے پر یہ بتایا تھا کہ اس میں دفتر کی فائلیں اور کچھ اخبارات وغیرہ رکھے ہوئے ہیں لیکن دو دن سے دروازے پر لگا تالا دیکھ کر شک ہو رہا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے۔ کیوں اور کس لیے؟ یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یہ ڈر بھی ہے کہ شاید جولی نے سچ بولا ہو اور اس کے پرس میں واقعی دفتر کا سامان ہو اور ہمارے شک کے برعکس وہ پھر کسی مشکل میں پھنس گئی ہو۔'' غفور چاچا کی دی ہوئی یہ اطلاع خاصی تشویش ناک تھی۔ جولیٹ چاہے اپنی مرضی سے کہیں گئی تھی یا کسی نے زبردستی اسے گھر واپس آنے سے روک لیا تھا، دونوں صورتوں میں صورتِ حال گمبھیر تھی۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ فاروق بمبئی واپس آ چکا تھا۔

''تو کیا بولتا ہے جانی! تجھے کچھ اندازہ ہے کہ وہ کدھر ہوگی؟'' اڈے پر سب کو معلوم تھا کہ جولیٹ جانی کو برادر بولتی ہے اور جانی ہی تھا جو جولیٹ کی دیکھ بھال کرتا رہتا تھا اس لیے رامو نے اس سے سوال کیا۔

''ابھی اپن کیا بول سکتا ہے استاد! اپن تو خود تمہارے ساتھ تھانے میں تھا۔'' جانی نے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔

''یہ ٹھیک نہیں ہوا۔ دادا کو کیا جواب دے گا اپن کہ اس کے پیچھے سب الٹ کر رہ گیا۔'' رامو تشویش سے بڑبڑایا۔ حقیقتاً اسے ربن کو جواب دہی سے زیادہ فاروق کی فکر تھی۔ اب تک جولیٹ پر جو کچھ گزری تھی، اس سے فاروق کو بے خبر رکھا گیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد اسے ان حالات کی خبر ہوتی اور ساتھ ہی جولیٹ کے غیاب کی اطلاع ملتی تو اس پر نہ جانے کیا گزرتی۔ اس کی صحت کی طرف سے مثبت اطلاعات ملنے کے باوجود وہ لوگ اب بھی اس کی طرف سے ذرا فکر مند ہی تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ اس کے ذہن پر کوئی دباؤ پڑے۔

''دادا اور آپ لوگوں سے جتنا بن پڑا، آپ لوگوں نے جولی کا خیال رکھا۔ آج کل آپ لوگ جن حالات میں گھرے ہوئے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے تو کوئی آپ سے شکوہ کر ہی نہیں سکتا ہے۔ دادا بھی یقیناً آپ سے ناراض نہیں ہوں گے، آپ تسلی رکھیں۔'' غفور چاچا نے اسے تشویش میں مبتلا دیکھ کر دلاسا دینے کی کوشش کی۔

''تم ٹھیک بولتے ہو غفور بھائی۔ لو تم چائے تو پیو۔'' رامو نے بے دلی سے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے اسے چائے کی طرف متوجہ کیا۔ چائے اور کچھ لوازمات سے سجی ٹرے کچھ لمحوں پہلے بجو خاموشی سے آ کر ان کے درمیان رکھ گیا تھا۔ حالات جیسے بھی تھے، اڈے کی مہمان نوازی کی روایت قائم تھی اور اس میں بڑا ہاتھ بجو کا تھا۔

''اگر جولی کے بارے میں کوئی خبر ملے تو اپنے کو ضرور بولنا۔'' غفور چاچا پُرتکلف چائے پی کر وہاں سے رخصت ہونے لگا تو رامو اسے ہدایت دینا نہیں بھولا۔

''ٹھیک ہے استاد۔ میں خیال رکھوں گا۔'' غفور چاچا نے اسے یقین دہانی کروائی۔ پیچھے رامو تھکا تھکا سا دوبارہ اپنی جگہ پر جا بیٹھا اور سوچنے لگا، جانے کیا ہونے والا ہے جو

مصائب کا سلسلہ دراز ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔

☆☆☆

فاروق اور ربن وکیل اشوک بچن کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اشوک ان کے معاملات سے اچھا خاصا باخبر ہی رہتا تھا۔ باقی جو کچھ اس کے علم میں لانا ضروری تھا، وہ ربن نے اس کے گوش گزار کر دیا تھا۔ خصوصاً مجو دادا سے اپنی دشمنی کی وجہ اور اس کے بعد کے حالات سے۔ سب باتیں سن کر اشوک نے بھی ان سے اتفاق کیا کہ پولیس کو ان کے پیچھے لگانے میں مجو کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ یقیناً مجو بمبئی ہی میں کہیں پولیس کے سائے میں بیٹھا ہوا تھا اور وقتاً فوقتاً پولیس کو ایسی معلومات فراہم کر رہا تھا جس کے بعد ربن کی گرفتاری کو ضروری سمجھا جانے لگا تھا۔ وجہ بہرحال جو بھی تھی، ربن کے لیے حالات مشکل ہو گئے تھے اور یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ کھلے عام بمبئی میں رہ سکے اور پہلے کی طرح اڈا چلا سکے۔ اسے دوبارہ اڈے پر بیٹھنا تھا تو اس مصیبت میں سے نکلنا تھا اور وہ لوگ ایسا ہی کوئی حل ڈھونڈنے وکیل اشوک بچن کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اشوک تھوڑی دیر اس سارے معاملے پر غور کرتا رہا پھر ربن کی طرف رخ کر کے پوچھنے لگا۔

''یہ بتاؤ دادا! جن دنوں ولیم والا قصہ پیش آیا، تم ان دنوں بمبئی سے اپنی غیر موجودگی ثابت کر سکتے ہو؟''

''یہ تو کوئی مشکل ہی نہیں۔ کلکتہ، پونا، لکھنؤ بہت جگہیں ہیں جہاں اپنے یار رہتے ہیں، جس کو بولیں گے وہ گواہی دینے آ جائے گا۔'' ربن نے اعتماد سے جواب دیا۔

''بس تو پھر تم خود طے کر لو کہ تمہیں کہاں پر اپنی موجودگی ثابت کرنی ہے۔ جدھر تمہارا زیادہ بھروسا ہے وہاں ابھی اپنا کوئی سمجھ دار بندہ بھیج کر ساری بات اچھی طرح سمجھا دو اور کہلوا دو کہ ادھر سے بندہ بلاوا آنے پر فوراً کورٹ میں گواہی دینے کے لیے پہنچ جائے۔ بندہ آئے گا تو اسے کورٹ میں پیش کرنے سے پہلے میں خود بھی سب اونچ نیچ اچھی طرح سمجھا دوں گا۔ ایک بار ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ تم واقعے کے وقت بمبئی میں تھے ہی نہیں تو پولیس تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ اس کیس کو جہاں تک میں سمجھا ہوں، اس سے یہی پتا لگ رہا ہے کہ پولیس کے پاس کوئی آئی وٹنس یا ثبوت وغیرہ نہیں ہے۔ وہ بس مخبری اور حالات کی وجہ سے پیدا ہونے والے شک کو لے کر تمہارے پیچھے پڑ گئی ہے۔ پولیس کے پاس تمہارے اوپر شک کرنے کے لیے صرف ایک پوائنٹ ہے کہ کیونکہ ولیم کے حکم پر فاروق کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا اس لیے تم نے بدلہ لینے کے لیے ولیم کو شکار بنایا لیکن یہ پوائنٹ ایسا ہے کہ میں عدالت میں الٹا پولیس کی دھجیاں اڑا کر رکھ دوں گا۔ پولیس والوں کو جواب دینا پڑے گا کہ انہوں نے اپنی لمٹ سے نکل کر کسی افسر کے کہنے پر فاروق کو غیر انسانی تشدد کا نشانہ کیوں بنایا ہے۔ آئی ایم شیور کہ جس تھانے میں یہ واقعہ ہوا تھا، وہاں کا انچارج ہی ایسے کسی واقعے سے انکار کر دے گا۔ وہ ہرگز نہیں مانے گا کہ اس کے تھانے میں کوئی ایسی غیر قانونی کارروائی ہوئی تھی اور جب پولیس اپنا قصور نہیں مانے گی تو تم پر شک کی بنیاد ہی ختم ہو جائے گی۔ اس سارے کھیل کو شروع کرنے اور انت (انجام) تک پہنچانے کے لیے بس تمہیں اتنا کرنا ہوگا کہ کورٹ کے سامنے پیش ہو جاؤ۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔'' اشوک بچن نے اپنی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے سارے معاملے کا یوں تجزیہ کیا کہ فاروق اور ربن دونوں کو ہی احساس ہونے لگا کہ وہ پولیس کی جارحیت سے خواہ مخواہ ہی اتنے زیادہ دباؤ میں آ گئے تھے حالانکہ اصل بات یہ تھی کہ ان سے زیادہ خود پولیس والوں کی پوزیشن کمزور تھی۔

''آپ کی بات سمجھ میں آتی ہے وکیل صاحب لیکن یہ جو آج کل پولیس والوں نے دادا کو مفرور قرار دے کر ہنگامہ کھڑا کیا ہوا ہے اس کا کیا ہوگا؟ یہی کہا جائے گا کہ دال میں کچھ کالا تھا جب ہی دادا منظر سے غائب ہو گیا تھا۔'' فاروق جس کی آنکھیں اشوک کی باتیں سن کر چمکنے لگی تھیں، ذرا سے توقف کے بعد ایک اور نکتہ اٹھاتے ہوئے بولا۔

''اس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ دادا بول سکتا ہے کہ وہ پولیس کے اڈے پر ریڈ کرنے سے پہلے ہی کہیں اور گیا ہوا تھا۔ واپس آ کر اسے جیسے ہی حالات کا پتا چلا، وہ خود اپنی صفائی پیش کرنے عدالت پہنچ گیا۔'' اشوک نے چٹکی بجاتے حل پیش کر دیا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔ اپن بول دے گا کہ اپن چندی گڑھ گیا ہوا تھا۔ ادھر تو بھی تھا اور چاند بانو کو بھی دیکھنے کا تھا۔'' ربن نے فوراً اشوک بچن سے اتفاق کرتے ہوئے فاروق سے کہا۔

''پولیس کا وکیل اعتراض اٹھائے گا کہ اگر تم چندی گڑھ گئے تھے تو یہ بات اڈے کے لوگوں کو معلوم ہونی چاہیے تھی پھر انہوں نے پولیس کے پوچھنے پر کیوں نہیں بتائی؟'' فاروق اس معاملے کی ہر باریکی کو دیکھ رہا تھا۔

''تو بول دیں گے کہ پولیس کے سلوک سے اڈے کے لوگ ڈر گئے تھے کہ جانے پولیس دادا کے ساتھ کیا کرنے والی ہے اس لیے کوئی ڈر کے مارے سچ نہیں بولا۔

اتنا تو سب کو معلوم ہے کہ اڈے کا ہر بندہ اپن پر جان چھڑکتا ہے۔'' ربن حالات کی وجہ سے وقتی طور پر دباؤ میں آگیا تھا۔ بچنے کی راہ دکھائی دیتے ہی ایک بار پھر اس کی صلاحیتیں جاگنے لگیں۔ اشوک بچن کے اتفاق نے بھی ثابت کردیا کہ وہ بالکل صحیح رخ پر سوچ رہا ہے۔ اس کے بعد بھی وہ تینوں کافی دیر تک بیٹھے اس کیس کے ایک ایک پہلو پر غور کرتے رہے۔ جب ہر پہلو سے مطمئن ہوگئے تو ان کی یہ نشست برخاست ہوئی اور ربن اور فاروق نے اشوک بچن سے اجازت لی۔ وہ دونوں ہی اس وقت کسی قدر بدلے ہوئے حلیے میں تھے اور سرسری دیکھنے پر کسی کو اندازہ نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ ربن دادا اور فاروق ہیں۔ اچھو والے ٹھکانے سے یہاں تک آنے کے لیے یوں بھی انہوں نے ٹیکسی کا استعمال کیا تھا اس لیے کسی سے سامنا ہونے کا زیادہ امکان نہیں رہا تھا۔ واپسی کے لیے بھی انہوں نے یہی ذریعہ استعمال کیا اور راستے میں کوئی بات کرنے سے گریز کرتے رہے۔ واپس پہنچے تو انور بھی نانا کے پاڑے سے واپس آچکا تھا۔ اس نے اکبر کے ذریعے فاروق کی خیریت کی اطلاع اڈے پر پہنچانے کا کام ہوجانے کے ساتھ ساتھ یہ خوش خبری بھی سنائی کہ رامو اور جانی تھانے سے آچکے ہیں۔ وہ لوگ اس سلسلے میں بھی اشوک سے بات کرکے آئے تھے اور اس نے یقین دہانی کروائی تھی کہ جب ربن عدالت کے روبرو پیش ہوگا تو رامو کی رہائی کا بھی انتظام کرلیا جائے گا۔ اب یہ مسئلہ پہلے ہی حل ہوگیا تھا تو یہ ایک مثبت اشارہ تھا اور وہ لوگ خود کو آہستہ آہستہ دباؤ سے آزاد ہوتا ہوا محسوس کررہے تھے۔ اشوک نے ربن سے کل عدالت میں پیش ہونے کی بات کی تھی۔ اس دوران میں وہ خود اپنی تیاری کرلیتا اور سارے قانونی تقاضے پورے کرنے کا انتظام کرلیتا۔

''اپن سوچ رہا ہے کہ تجھے کلکتہ بھجوا دے۔ تجھ سے زیادہ سمجھ دار اور بھروسے کے لائق اپنے نزدیک کوئی اور نہیں ہے۔ ادھر جاکر تو اڈے والوں سے معاملہ طے کرلینا اور ثریا بانو کے سسرال جاکر اس کی بھی خیر خیریت لے آنا۔ اسے بیاہنے کے بعد سے مہلت ہی نہیں ملی ہے کہ اس کا حال چال پوچھنے کے واسطے جا پاتے۔'' انور نے انہیں چائے پیش کی تھی، اس چائے کو نوش کرتے ہوئے ربن نے فاروق سے یہ بات کہی تو وہ انکار نہیں کرسکا۔ اس کے ساتھ عجیب معاملہ تھا۔ اتنی مشکل سے وہ دوبارہ بمبئی واپس آنے میں کامیاب ہوا تھا لیکن آکر بھی جیسے واپس نہیں آسکا تھا۔ یہاں کی فضاؤں میں سے جیسے یکدم ہی اپنائیت کا احساس اٹھ گیا تھا۔ ہوا جو اسے

آکر چھوتی تھی۔ اس سے محبوب کے بدن کی خوشبو نہیں محسوس ہوتی تھی۔ نہ ہی اسے اس کوچے میں جانا نصیب ہورہا تھا جہاں اس کے محبوب سمیت وہ سب بستے تھے جو اس پر اپنی جان چھڑکتے تھے۔ پھر بملا والا معاملہ بھی تھا۔ وہ بھاٹیہ سیٹھ کے پالتو غنڈے گنیش سے مل کر ایک بار اپنے اس شک کی تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ چاند بانو پر قاتلانہ حملے کا حکم دینے والی بملا ہی تھی۔ تصدیق ہوجاتی تو وہ بملا کا احتساب کرتا لیکن ان معاملات کو چھیڑنے کی نوبت ہی نہیں آسکی تھی اور وہ دوسرے چکروں میں الجھ گیا تھا اور اب اسے بمبئی میں قدم رکھے پورے دو دن نہیں گزرے تھے کہ ربن نے ایک بار پھر اسے یہاں سے روانہ کرنے کی بات کردی تھی۔

ربن اس کا محسن اور مربی تھا جسے انکار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا بلکہ حقیقتاً اس کے لیے سب سے زیادہ اہم بات ربن کا تحفظ اور اس کا خیال ہی تھا باقی سب کچھ اس کے بعد ہی آتا تھا۔ ادھر ربن کو بھی خود سے زیادہ اس کی فکر تھی۔ بھجوانے کو وہ کسی اور کو بھی کلکتہ بھجوا دیتا لیکن اسے فاروق کو کچھ دن اور بمبئی سے دور رکھنے کا بہانہ مل رہا تھا تو اسے یہی مناسب لگ رہا تھا کہ اسے یہاں سے بھیج دیا جائے۔ وہ اپنے معاملات نمٹا لیتا تو فاروق کو گزرنے والے حالات و واقعات سے آگاہ کرنے اور اس کے ردعمل سے نمٹنے میں آسانی رہتی۔ یہاں جو کارروائی ہونا تھی، اس دوران میں فاروق کی موجودگی کی ضرورت نہیں تھی۔ عدالت کے معاملات تھے جنہیں اشوک بچن خود سنبھال سکتا تھا۔ اگر کسی مرحلے پر فاروق کی ضرورت محسوس بھی ہوتی تو اسے ایک تار بھیج کر بلوایا جاسکتا تھا۔

''تو نے اپنی بات کا جواب نہیں دیا۔'' ربن جو خود بھی اپنی سوچوں میں الجھا ہوا تھا، فاروق کی خاموشی پر اسے ٹوکنے لگا۔

''جواب کیا دینا ہے۔ تم نے کہہ دیا ہے تو میں کلکتہ روانہ ہونے کے لیے تیار ہوں۔ چاہو تو ابھی نکل کھڑا ہوتا ہوں۔'' فاروق نے اسے جواب دیا تو اس کے لہجے میں ہلکی سی تھکن تھی۔

''کیا بات ہے۔ تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ اگر گڑبڑ ہے تو بول۔ اپن تیرے کو سفر پر نہیں بھجوائے گا۔'' ربن نے فوراً اس کے لہجے کو محسوس کیا۔

''یہ بات نہیں ہے دادا۔ بس بمبئی آکر بھی کسی سے ملاقات نہیں ہوسکی اور اڈے جانے کا موقع نہیں مل سکا تو دل ذرا اداس ہے۔'' فاروق نے فوراً اسے مطمئن کرنے کی

کوشش کی۔

''جیتے رہے تو ملنے کے بہت سے موقعے ملیں گے۔ لوٹ کر تو آخر تجھے اڈے ہی آنا ہے۔ ہاں طبیعت گڑبڑ ہو تو تکلف نہ کر۔ اپنے کو بھی خیال ہے کہ تو ابھی سفر سے لوٹا ہے اور اپن پھر دوبارہ تجھے جانے کو بولتا ہے۔''

''سفر کا کیا ہے۔ مجھے کون سا بیل گاڑی یا اونٹوں پر ہچکولے کھاتے ہوئے جانا ہے۔ ریل کے فرسٹ کلاس ڈبے میں چڑھوں گا اور مزے سے سوتا ہوا کلکتہ جا کر اتروں گا۔ اس میں بھلا کیا تکلیف ہوتی ہے۔'' فاروق نے اسے اپنی طرف سے اطمینان دلایا۔

''پھر بھی اپن کیتھی کو تیرے ساتھ بھیج دے گا۔ وہ تیرا خیال رکھے گی۔'' ربن اسے بھیج تو رہا تھا لیکن دل میں اس کی طرف سے فکرمند بھی تھا۔

''ایسا بھی کیا دادا! اگر تم کسی کو ساتھ لے جانے پر اتنا زور دے ہی رہے ہو تو میرے ساتھ وہ جولڑ کا اکبر آیا ہے، اسے لے جاتا ہوں۔ بہت اچھا لڑکا ہے، میرا خیال رکھے گا۔'' فاروق نے متبادل تجویز پیش کی۔

''ٹھیک ہے، اسے بھی لے جانا پر کیتھی ساتھ رہے یہ زیادہ اچھا ہے۔ وہ نرس ہے اور تیری طبیعت کو سمجھتی ہے۔'' ربن بھی کیتھرائن کو اس کے ساتھ بھیجنے کے خیال پر جم گیا تھا۔

''تم تو میرے ساتھ بالکل بچوں کی طرح پیش آنے لگے ہو۔'' فاروق ناراض ہوا۔

''اپنے لیے تو بچہ ہی ہے۔ بس اپن نے کہہ دیا کہ کیتھی تیرے ساتھ جائے گی ورنہ تو یہیں بیٹھ اپن کوئی اور انتظام کرلے گا۔'' ربن نے فیصلہ سنایا۔ اسے معلوم تھا کہ فاروق ہرگز بھی پیچھے نہیں ہٹے گا اس لیے یہ دھمکی دی تھی۔

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔ میں کچھ بھی بولوں تمہیں چلانی تو اپنی ہی ہے۔'' فاروق نے قدرے خفگی سے اپنی آمادگی کا اظہار کیا تو ربن زیرلب مسکرانے لگا۔

''پھر کب نکلوں؟'' فاروق نے اس سے پوچھا۔

''آج کی رات آرام کرلے پھر چلے جانا۔'' ربن نے اسے جواب دیا۔ اس کے بعد ان کے درمیان مزید گفتگو نہیں ہوئی اور دونوں ہی اپنی اپنی سوچوں میں گم خاموش ہو کر بیٹھے رہے۔ ایسے میں راموکی آمد نے فضا میں ارتعاش پیدا کردیا۔ وہ ربن اور فاروق دونوں ہی سے بے پناہ گرم جوشی سے ملا۔ فاروق سے ملتے ہوئے تو عالم ہی جدا تھا۔ جذبات کا یہ ریلا گزر گیا تو وہ آپس میں حال احوال کہنے لگے۔ فی الحال بمبئی کے حالات زیادہ اہم تھے اس لیے فاروق نے اپنے حالات کا ذکر مناسب نہیں سمجھا۔ رامو بتا تا رہا کہ ربن کے پیچھے کیا گزری اور کس طرح اسے تھانے سے نکلنا نصیب ہوا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ پولیس والے ہنوز اڈے کے اردگرد منڈلا رہے ہیں اور وہ بڑی مشکل سے انہیں جل دے کر یہاں آنے میں کامیاب ہوسکا ہے۔

باتوں باتوں میں رات کے کھانے کا وقت ہوگیا۔ کھانے کے بعد ربن نے سفر کا بہانہ بنا کر فاروق کو آرام کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے جلد اپنے درمیان سے اٹھا دیا۔ انور کو اس نے کیتھی کی طرف بھیج دیا تھا کہ وہ بھی کل کے لیے تیار ہوجائے۔ اچھو کا ان کے معاملات سے تعلق نہیں تھا سو وہ بھی کھانے میں ان کے ساتھ شریک ہونے کے علاوہ ان کے ساتھ نہیں بیٹھا تھا۔ تنہائی ملی تو ربن نے راموکو اپنے سفر کی روداد سنائی اور بتایا کہ دلدار آغا کے ملک سے باہر ہونے کی وجہ سے اس کا وہاں جانا تقریباً بے کار ہی رہا ہے۔ رامو نے اسے جولیٹ کے غائب ہونے کی اطلاع دی۔ فاروق کی موجودگی کے باعث وہ ابھی تک یہ خبر دبا کر بیٹھا ہوا تھا۔ ربن نے خبر سنی تو اس کے ماتھے کے بلوں میں اضافہ ہوگیا اور اس نے دل میں سوچا کہ اس نے فاروق کو بمبئی سے باہر بھیجنے کا فیصلہ بالکل درست اور بروقت کیا تھا۔

☆☆☆

سیاہ لانگ اسکرٹ پر سیاہ وسفید امتزاج کا بلاؤز پہنے، گلے میں سیاہ رنگ کا اسکارف ڈالے جولیٹ حیدرآباد کے ریلوے اسٹیشن پر اتری تو اسے دیکھ کر کوئی بھی قیاس کرسکتا تھا کہ وہ عالم سوگ میں ہے۔ اس کی آنکھوں کی اداسی، چہرے کا حزن اور چال کی تھکن اس کی دلی کیفیت کی عکاس تھی۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس نے اپنا سب کچھ کھو دیا تھا۔ کسی نے اپنے اختیار وطاقت کے نشے میں اس کی ہستی کو پامال کردیا تھا اور ایسے کڑے وقت میں وہ ان دو انسانوں کے سائے سے محروم ہوگئی تھی جنہوں نے ہمیشہ اسے اپنی محبتوں کے سائے میں پناہ دی تھی۔ اتنے نازک حالات میں اس پر یہ بھیانک انکشاف ہوا تھا کہ وہ اصل میں جوزف کی بیٹی نہیں بلکہ اپنی ماں کی ناکام محبت کی نشانی ہے۔ پے درپے خود پر بیتنے والے ان سانحات نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ حرماں نصیب ماں کی بیٹی بھی حرماں نصیب نکلی تھی اور اسے چاہنے کا دعویٰ کرنے والا عارف مشکل وقت میں اسے سب سے پہلے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ان حالات میں اس کے دل میں مایوسی، دکھ اور انتقام کے جذبات نہ پنپتے تو اور کیا ہوتا۔ پہلے اسے صرف دلدار آغا سے انتقام لینا تھا،

اب اس فہرست میں نواب زادہ اسد اللہ کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ انتقام کا جذبہ لے کر ہی اس شہر میں وارد ہوئی تھی لیکن اسٹیشن پر اترتے ہی اس پر اداسی نے غلبہ پالیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کے اندر جوزفین کی روح حلول کر گئی ہو۔ وہ بھی تو برسوں پہلے اس شہر میں آئی تھی۔ ایک بہت کم عمر اور ناتجربہ کار سی لڑکی جو دنیا میں تنہا اور حالات سے خوف زدہ تھی لیکن ساتھ ہی اس کے دل میں امید بھی تھی کہ اگر اس ریاست میں اسے پناہ مل گئی تو اس کی پریشانیاں ختم ہو جائیں گی لیکن نتیجہ کیا نکلا تھا۔ وہ یہاں سے واپس گئی تھی تو پہلے سے زیادہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔

جولیٹ محسوس کرسکتی تھی کہ جب اس کی ماں یہاں سے لوٹ رہی ہوگی تو اس ریلوے اسٹیشن کے چپّے چپّے نے اس کی بے قراری محسوس کی ہوگی۔ وہ یہاں سے جاتی ہوگی لیکن دل میں کہیں یہ امید چھپی بیٹھی ہوگی کہ شاید اچانک کہیں سے نواب زادہ اسد اللہ نمودار ہو جائیں اور اسے جانے سے روک لیں لیکن اس امید کے بدلے میں اس کے حصے میں مایوسی کے سوا کچھ نہیں آیا ہوگا۔ بمبئی جا کر بھی اس نے اپنی ایک ایک سانس کے ساتھ نواب زادہ کا انتظار کیا ہوگا لیکن وہ تو شاید بھول ہی گئے تھے کہ انہوں نے ایک نرم و نازک سی لڑکی کے دل میں اپنی محبت کا بیج بویا تھا اور اس لڑکی نے بڑی محبت سے اس بیج سے پھوٹنے والی کونپلوں کی آبیاری کی تھی۔ وہ تو اپنی محبت میں اتنی سچی تھی کہ محبت کے نام پر ہونے والے دھوکے کی نشانی کو بھی ساری زندگی اپنے سینے سے لگا کر رکھا تھا۔ اگر اس کی محبت سچی نہ ہوتی تو وہ دنیا میں آنے سے قبل ہی جولیٹ کے وجود سے جان چھڑا سکتی تھی۔ اس نے نہ صرف ایسا نہیں کیا تھا بلکہ جولیٹ کے لیے اپنے حالاتِ زندگی تحریر کرتے ہوئے بھی کہیں نواب زادہ کو برا نہیں کہا تھا۔ اسے کوئی الزام نہیں دیا تھا اور سارے فیصلے جولیٹ پر چھوڑ دیے تھے۔ یہ جولیٹ تھی جس نے اپنی سادہ لوح ماں کے ساتھ ہونے والے دھوکے کو محسوس کر کے اپنے دھوکے باز باپ کو اس کے کیے کی سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اپنے فیصلے پر عمل درآمد کے لیے یہاں تک چلی آئی تھی۔ یہ روح کو جھلسا دینے والی آتشِ انتقام ہی تھی کہ جس نے زیادہ دیر تک اس کی اداسی کو اس پر حاوی نہیں ہونے دیا اور وہ ایک نئے عزم کے ساتھ نواب سلیم اللہ کی حویلی کی طرف عازم سفر ہوئی۔

تانگے میں سوار وہ جب اس عالیشان حویلی کے پھاٹک کے سامنے اتری تو اسے بمبئی کے ایک تنگ محلے میں موجود اپنا چھوٹا سا مکان یاد آیا۔ اس کو اس دنیا میں لانے کا ذمے دار شخص خود ایسی شاندار جگہ پر رہتا تھا اور وہ ایک معمولی مکان میں پل کر جوان ہوئی تھی۔ جوزف اور جوزفین کی محبت نے اگرچہ اسے کبھی اپنی کم حیثیتی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا لیکن اب تقابل کی نوبت آئی تھی تو وہ یہ سب باتیں سوچ رہی تھی۔ تانگے سے اترنے کے بعد اس نے پھاٹک پر موجود دربان سے نواب سلیم اللہ یا اسد اللہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ نواب صاحبان سے ملاقات کی ہر کس و ناکس کو اجازت نہیں ملتی تھی لیکن اس لڑکی کے انداز میں کچھ ایسی تمکنت تھی کہ وہ عام لباس میں بھی خاص محسوس ہوتی تھی۔ دربان نے ذرا سے تذبذب کے بعد اندر منشی کو اس کے بارے میں اطلاع بھجوا دی لیکن اس سے پہلے ہی وہ جولیٹ کو حویلی کے پھاٹک سے اندر بلوا چکا تھا۔ نواب صاحب تک پہنچنے سے قبل جولیٹ کو منشی سے ملاقات کرنا پڑی اور اس نے اسے بھی قائل کرلیا کہ وہ نواب صاحب سے ملاقات کرسکتی ہے۔ منشی کی اطلاع کے مطابق وہ خوش قسمت تھی کہ آج نواب صاحب کی کوئی مصروفیت نہیں تھی اور انہوں نے منشی کے کہنے پر اسے ملاقات کی اجازت دے دی تھی۔ ان سارے مراحل سے گزر کر وہ جب نواب سلیم اللہ کے روبرو پہنچنے میں کامیاب ہوئی تو اس کی آنکھوں نے بھی وہ شان و شوکت دیکھی جس سے اس کی ماں ماضی میں مرعوب ہو چکی تھی۔ وہ بھی مرعوب ہو جاتی اگر اس کی رگوں میں اسی خاندان کا لہو نہ دوڑ رہا ہوتا۔ ابھی تو دل میں یہ احساس تھا کہ وہ بھی اس شان و شوکت اور مال و زر کی ایک حق دار تھی لیکن اپنا یہ حق اس لیے نہ پا سکی تھی کہ اس کا باپ اس کی ماں سے کیا گیا وعدہ وفا نہ کرسکا تھا اور یوں اس کی ولایت کے خانے میں نواب زادہ اسد اللہ کے بجائے جوزف مسیح کا نام لکھ دیا گیا تھا۔

”جی فرمائیے۔ کون ہیں آپ اور آپ کا کیا تعارف ہے؟“ بہت بوڑھے ہو چکے نواب سلیم اللہ کے روبرو کھڑی ہو کر بھی جب وہ کچھ نہ بولی تو انہوں نے خود ہی دھیرے سے کھنکھار کر اسے مخاطب کیا۔ ان کے سوال کرنے پر وہ چونکی اور پھر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”میں نواب زادی

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور محبت کی فریب کاریوں کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

آخری گلاس

تنویر ریاض

بہت سی مثالیں ملتی ہیں میاں بیوی کی آپس میں محبت، ذہنی ہم آہنگی اور پسند وناپسند میں یکسانیت کی... مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ قدم قدم پر مرد کی ہرجائی فطرت دھوکا دیتی رہے اور محبتوں کا یقین بھی دلاتی رہے... فریب کا یہ شفاف منظر اس کی آنکھوں نے بھی دیکھا لیکن دل کا پاگل پن... اسے جان بوجھ کر دھوکے میں رہنے پر مائل کرتا رہا۔

کانچ کے گلاس اور دل ٹوٹنے کی آخری صدا کی گونج

وہ چھ گلاسوں کا سیٹ تھا جو انہوں نے شادی کے فوراً بعد خریدا تھا ہنی مون سے واپس آنے کے بعد پہلی ڈنر پارٹی کی تیاری کے دوران کیتھی کو خیال آیا کہ ان کے گھر میں صرف تین گلاس ہیں جو مہمانوں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے ناکافی ہوں گے۔ اس کے والدین نے شادی کے موقع پر اسٹین لیس اسٹیل کے برتنوں کا سیٹ دیا تھا جبکہ فرینک کی ماں نے آٹھ انتہائی خوب صورت ڈنر سیٹس تحفے میں دیے لیکن کسی نے بھی گلاسوں کے بارے میں نہیں سوچا۔ کیتھی

نے فرینک سے کہا کہ وہ ڈنر کی تیاری کر رہی ہے لہٰذا وہ اسٹور جا کر گلاس خرید لے لیکن فرینک کا اصرار تھا کہ شادی کے بعد وہ اپنے نئے گھر کے لیے پہلی چیز خرید رہے ہیں لہٰذا وہ بھی ساتھ چلے۔ مجبوراً کیتھی کو اپنی تیاری ادھوری چھوڑ کر اس کے ساتھ جانا پڑا۔

کیتھی نے آٹھ گلاسوں کے سیٹ کا انتخاب کیا لیکن فرینک کی نظر نیلے رنگ کے گلاسوں پر ٹھہر گئی جو لمبے چوکور اور نیم شفاف تھے۔

''یہ بہت نازک ہیں۔'' کیتھی نے کہا۔

''لیکن کتنے نفیس ہیں۔'' فرینک نے کہا۔ ''میں یہی گلاس خریدنا چاہتا ہوں۔''

ڈنر کے دوران فرینک کی ماں نمک کی شیشی اٹھانا چاہ رہی تھی کہ اس کا ہاتھ گلاس سے ٹکرایا اور وہ فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے اتنے نازک گلاس کیوں خریدے۔'' فرینک کی ماں نے اپنی پلیٹ میں نمک چھڑکتے ہوئے کہا۔

''کیونکہ یہ بہت خوب صورت ہیں۔'' کیتھی گلاس کے ٹکڑے سمیٹتے ہوئے بولی۔ ایک کرچی لگنے سے اس کی انگلی زخمی ہوگئی۔ اس نے خون روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ گلاس پسند ہیں۔'' پھر وہ کچن میں آئی اور ٹھنڈے پانی کی دھار سے خون روکنے کی کوشش کرنے لگی پھر اس نے ایک پلاسٹک کے گلاس میں پانی اور برف ڈال کر مسز موریل کے آگے رکھ دیا۔

''ممکن ہے کہ یہ ایک نیک شگون ہو۔'' جولیا نے کہا۔ وہ ایک پبلک ریلیشن فرم میں گرافک ڈیزائنر تھی۔ سنہرے بال، دبلی پتلی، صاف رنگت اور گہری نیلی آنکھیں۔ حسب معمول اس نے بغیر آستین اور کھلے گلے کا لباس پہن رکھا تھا۔ جس میں اس کے سڈول بازو اور جسم کے دیگر اعضا نمایاں ہو رہے تھے۔ اس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ تمہاری حال ہی میں شادی ہوئی ہے اور یونان کے لوگ شادی کے موقع پر جان بوجھ کر گلاس توڑتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ خوش قسمتی کی علامت ہے۔''

فرینک کے بڑے بھائی نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ''یونانی نہیں بلکہ یہودی۔ میں نے ان کے بارے میں سنا ہے کہ دولہا صرف ایک گلاس زمین پر گرا کر اپنے پاؤں سے کچلتا ہے لیکن خوش قسمتی کے لیے نہیں بلکہ ایک کہاوت ہے کہ تمہیں بہت زیادہ پرجوش نہیں ہونا چاہیے کیونکہ محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔''

''اس کی بات مت سنو جولیا۔'' فرینک نے ہلکے سے اس کا ہاتھ چھوتے ہوئے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو یہ واقعی خوش قسمتی کی نشانی ہے۔''

''میں ایک مرتبہ یہودیوں کے یہاں شادی میں گیا تھا۔'' برائن نے کہا۔ وہ جولیا کا شوہر اور فرینک کا برسوں پرانا دوست تھا۔ ''اسے میں کالج کے زمانے سے جانتا تھا۔ اس نے بتایا کہ گلاس اس لیے توڑا جاتا ہے کہ رومیوں نے ان کی عبادت گاہیں تباہ کر دی تھیں اور انہیں یروشلم سے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اس واقعے کو کبھی نہیں بھلا سکتے۔ یہاں تک کہ شادی کے موقع پر بھی نہیں لیکن اس نے یہ نہیں کہا کہ محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔''

جولیا نے فرینک کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا اور بولی۔ ''بالکل نہیں ہوتی کیونکہ یہ درست نہیں ہے۔ بہرحال کیتھی، چکن بہت مزے دار ہے۔''

نو سال بعد ایک بار پھر کیتھی کچن میں کھڑی ڈنر کی تیاری کر رہی تھی لیکن یہ اس کے اپارٹمنٹ کا کچن نہیں تھا بلکہ اب وہ بروکلین میں ایک مشترکہ رہائش گاہ میں رہ رہی تھی۔ ایک بار پھر مسز موریل، ول، جولیا اور برائن ڈنر پر آئے تھے لیکن اب فرینک نہیں رہا تھا اس کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہ شراب کے نشے میں دھت کار چلا رہا تھا۔ اس لیے وہ اسے خودکشی سمجھتی تھی لیکن حقیقت میں وہ ایک قتل تھا۔ ایسی علامات موجود تھیں جن کی بنا پر اسے قتل کہا جا سکتا ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا تو کیا وہ اس حادثے کو روک سکتی تھی۔ شاید نہیں۔

اس نے کپ بورڈ میں رکھے ہوئے آخری نیلے گلاس کو دیکھا اور اپنی جیب میں رکھی ہوئی ایک چھوٹی شیشی کو ہاتھ سے چھوا اور دل ہی دل میں بولی۔ ''آج رات میں کسی کے لیے یہ خاص مشروب تیار کر کے اسی گلاس میں پیش کروں گی جو ہم دونوں نے اکٹھے خریدا تھا، اب میں تمہارے لیے یہی کر سکتی ہوں۔''

چکن بھونتے ہوئے اسے یاد آیا کہ جب وہ ورجینیا جا رہے تھے تو برائن اور جولیا نے سامان پیک کرنے میں ان کی مدد کی تھی لیکن وہ دونوں بڑے بے پروا تھے۔ کیتھی دیکھ رہی تھی کہ جولیا کس طرح گلاس رکھ رہی ہے لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔ جب انہوں نے منزل پر پہنچ کر سامان کھولا تو اس میں ایک نیلا گلاس ٹوٹا ہوا تھا۔

شادی کا تیسرا سال ان کے لیے بہت سخت رہا۔ مارچ میں کیتھی کے باپ کو فالج ہوا اور وہ مر گیا۔ چھ ہفتے بعد

اس کی ماں پر فلو کا شدید حملہ ہوا اور وہ جانبر نہ ہوسکی۔ کیتھی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی مگر وہ اس کے لیے اتنا چھوڑ گئے تھے کہ وہ اور فرینک سنجیدگی سے سرمایہ کاری اور ریٹائرمنٹ اکاؤنٹس کے بارے میں گفتگو کرسکیں۔ فرینک نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ اپنی مصروف زندگی میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر تھوڑی سی تفریح کی جائے۔ وہ ایک کامیاب انشورنس ایجنٹ کی حیثیت سے اچھی بھلی زندگی گزار رہا تھا جبکہ وہ خود بھی پیشہ ور معالج تھی لیکن اب انہیں بچے کی خواہش ہو رہی تھی اور ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ ہوائی میں تعطیلات گزار سکیں۔ بہرحال وہ اس پر متفق ہوگئے کہ کار کے ذریعے ورجینیا اور چند تاریخی مقامات کی سیر کی جائے۔

انہوں نے ایک رات موٹیل میں قیام کیا اور ڈرنک کے لیے ٹپس نامی بار میں چلے گئے۔ وہاں کا ماحول بالکل دیہاتی تھا لیکن اس میں روایت پسندی نظر آرہی تھی۔ کچھ گاہک ایک ٹرک کے پچھلے حصے میں اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے اپنے گھر میں ہوں جبکہ قریبی کالجوں اور یونیورسٹی سے آئے ہوئے طالب علم بھی اپنے فیکلٹی لاؤنج کے مانند آرام وہ محسوس کر رہے تھے۔ بار کے بالکل سامنے ایک چھوٹا سا اسٹیج بنا ہوا تھا جس پر ایک جوڑا بینجو اور وائلن پر دھنیں بکھیر رہا تھا۔ فرینک اور کیتھی نے بیئر کے ساتھ مکئی کا بنا ہوا کیک منگوایا اور فرینک ٹانگیں پھیلا کر موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگا۔

اسی وقت ایک ستر سالہ شخص ان کے پاس آکر رکا اور پوچھنے لگا کہ وہ اس جگہ پر کیسا محسوس کر رہے ہیں؟

''زبردست!'' فرینک نے اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کاش میرے پاس بوسٹن میں ایسی جگہ ہوتی۔''

''شاید بوسٹن میں تمہیں ایسی جگہ نہ ملے۔'' وہ شخص بے ساختہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''لیکن ہم نے یہاں بہت اچھا وقت گزارا ہے۔ تقریباً بیس سال ہوگئے ہیں۔ اب اس کام کو چھوڑتے ہوئے دل دکھتا ہے۔ میں خود ہفتے میں دو بار پرفارم کرتا ہوں اور مجھے یہ پسند ہے لیکن بیوی کا کہنا ہے کہ یہ ریٹائرمنٹ کا وقت ہے۔ اب اپنے پوتوں اور نواسوں سے دل بہلاؤ۔ اگر تمہارا کوئی دوست یا رشتے دار ہے جس کے پاس سرمایہ کاری کرنے کے لیے معقول رقم ہو تو اسے فون کردو۔''

کیتھی نے فرینک کی آنکھوں میں ایک نئی چمک دیکھی لیکن اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ وہ بار بند ہونے تک وہاں رہے پھر موٹیل واپس آگئے۔ کچھ پُرمسرت لمحات گزارنے کے بعد فرینک گہری نیند سوگیا اور وہ باہر کھلی فضا میں آگئی۔ اس نے یکے بعد دیگرے دو سگریٹ پیے اور کچھ سوچنے لگی۔

انہوں نے پہاڑ پر دو خوب صورت دن گزارے اور واپسی میں ایک بار پھر اسی موٹیل میں قیام کیا۔ اس رات بوڑھے بڑنے بھی ٹپس میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ وہ اوسط درجے کا گلوکار تھا لیکن گٹار بہت اچھا بجاتا تھا۔ اس رات فرینک نے کیتھی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''تمہیں یہ بات عجیب لگے گی لیکن کیوں نہ ہم یہاں آجائیں اور یہ جگہ خرید لیں۔ تم اپنے باس کو پسند نہیں کرتیں اور میں بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ساری عمر بیمہ پالیسی بیچتا رہوں گا۔ ظاہر ہے کہ تمہیں ورثے میں ملنے والی دولت کو کہیں نہ کہیں استعمال کروں اور مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ تمہاری دولت کو خرچ کرنے کے بارے میں تمہیں کہوں۔''

''یہ میرا پیسا نہیں ہے بلکہ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ ہماری مشترکہ دولت ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں اپنے باس کو برداشت نہیں کرسکتی اور نہ ہی یہ چاہتی ہوں کہ اپنی زندگی ایسے کام میں گزار دوں جسے تم پسند نہیں کرتے۔''

ایک بار پھر اس نے فرینک کی آنکھوں میں وہی چمک دیکھی لیکن اس نے بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اپنے کام سے نفرت نہیں ہے لیکن اگر ہم ٹپس کو خرید لیں تو یہ ہمارا اپنا کاروبار ہوگا اور میں بھی پرفارم کرسکوں گا۔ جانتا ہوں کہ میں کوئی راک اسٹار نہیں ہوں اور نہ ہی اچھا نغمہ نگار ہوں لیکن دوسروں کے لکھے ہوئے گانے گا کر لوگوں کو خوش تو کرسکتا ہوں۔''

وہ اس کا ہاتھ دباتے ہوئے بولی۔ ''اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو میں تمہارے ساتھ ہوں، یہاں کا موسم بھی اتنا سرد نہیں۔ اس لیے میں تم سے ملنے آتی رہوں گی۔''

''نہیں۔ ہم مل کر کام کریں گے۔ میں بار کا انتظام سنبھال لوں گا۔ تم کھانا پکانا اور عملے کی نگرانی کرنا۔''

''میں کھانا نہیں بنا سکتی۔ تمہاری بات دوسری ہے۔ میں جو کچھ بنا کر میز پر رکھ دوں وہی کھالیتے ہو لیکن تم جانتے ہو کہ میں اچھی باورچن نہیں ہوں۔''

''ہم فرانسیسی کھانوں کی بات نہیں کر رہے بلکہ جس طرح کے کھانے ایسی جگہوں پر ملتے ہیں مثلاً آلو کے چپس، بھنی ہوئی اشیا اور چکن وغیرہ۔ ویسے بھی یہ ہر لحاظ سے ایک محفوظ جگہ ہے۔ یہاں جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر

ہے۔ چیزیں سستی اور اچھے اسکول ہیں۔ ہم ایک مکان کرائے پر لے لیں گے جس میں اتنی جگہ ہو کہ تم ایک کتا پال سکو جو تمہاری پرانی خواہش ہے۔''

انہوں نے اپنی چھٹیاں بڑھالیں۔ بزسے بات کی۔ اس کے ایجنٹ سے ملے۔ یہاں تک کہ کرائے پر رہنے کے لیے ایک مکان بھی دیکھ لیا، جس کے عقب میں اتنی جگہ تھی کہ وہاں ایک کتا چہل قدمی کر سکے۔ ماسٹر بیڈروم کے برابر میں ایک چھوٹا کمرا تھا جسے ضرورت پڑنے پر بچوں کی نرسری میں تبدیل کیا جاسکتا تھا۔

بوسٹن میں سب لوگوں کا خیال تھا کہ وہ غلطی کر رہے ہیں۔ ''یہ کوئی اچھا آئیڈیا نہیں ہے۔'' برائن نے کہا وہ بھی کسی دوسری کمپنی میں بیمہ ایجنٹ تھا۔ ''تم بہت اچھا کمار ہے ہو اور میں چاہتا ہوں کہ میری آمدنی بھی تمہارے برابر ہو جائے۔ تم یہ سب چھوڑ کر ایک دور افتادہ بار کو خریدنے کا جوا کیوں کھیل رہے ہو؟''

''تم ہمیں بہت یاد آؤ گے فرینک۔'' جولیا کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ ''اور کیتھی، تم تو ایک پروفیشنل ہو۔ باورچن بن کر کیسا محسوس کرو گی؟''

''کھانا بنانا بھی ایک پیشہ ہے۔'' کیتھی نے کہا۔ ''مجھے صرف اس میں بہتری لانا ہے۔''

''اوہ تو تم کھانا بناؤ گی۔'' برائن نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''سوال یہ ہے کہ کیا تم سارا دن یہ کام کر سکو گی؟''

''تم نے ساری زندگی بوسٹن میں گزاری ہے فرینک۔'' جولیا نے کہا۔ ''اب تم ایک چھوٹے شہر میں جا رہے ہو جو بالکل مختلف حصے میں واقع ہے۔ نہ جانے وہاں کے لوگوں کا رویہ کیسا ہو؟ کیا تم نئے دوست بنا سکو گے؟''

فرینک نے جواب میں کندھے اچکائے، البتہ کیتھی نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ ہم وہاں کئی اچھے لوگوں سے ملیں گے اور میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ ٹیپس کو دیکھنے کے بعد تمہاری رائے تبدیل ہو جائے گی۔ تم وہاں آؤ گے نا؟''

''ہاں۔ ہم ضرور آئیں گے۔'' برائن نے کہا۔ ''کیونکہ تم ہم سے ملنے نہیں آسکتے۔ اس لیے کہ تمہیں پورے ہفتے کام کرنا ہوگا۔ ایسی جگہوں پر بہت محنت کرنا ہوتی ہے۔ تم کسی تفریح گاہ بلکہ اچھی جگہ ڈنر کرنے بھی نہیں جاسکتے۔''

جب انہوں نے مسز موریل کو اس بارے میں بتایا تو وہ بولی۔ ''ہرگز نہیں۔ میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ میرا بیٹا کسی بار میں کام کرے۔''

فرینک نے اپنے بھائی ول کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ''چھوٹے بھائی۔ کوشش کر کے دیکھ لو۔ بار چلانا بہت مشکل کام ہے اور تمہیں اس کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔''

''فرینک بہت محنتی ہے۔'' کیتھی نے کہا۔

''رہنے دو کیتھی۔'' فرینک بولا۔ ''ہم جانتے ہیں کہ خطرہ مول لے رہے ہیں لیکن ہم اسے شروع کرنے کے بارے میں پُرعزم ہیں۔''

''تم تو بچے پیدا کرنے کے لیے بھی پُرعزم تھے۔'' مسز موریل نے طنز کرتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھتی ہوں کہ تم کبھی اس بارے میں سنجیدہ نہیں تھے اور نہ ہی اب سنجیدہ ہو لیکن میں تمہیں متنبہ کر رہی ہوں کہ دوبارہ مالی مدد نہیں کروں گی۔ لہٰذا جب کیتھی کے پیسے ختم ہو جائیں اور تم قرضوں کے بوجھ تلے دب جاؤ تو میرے پاس روتے ہوئے مت آنا۔''

''یہ لوگ مجھے پاگل کر دیں گے۔'' کیتھی نے گھر واپس آتے ہوئے راستے میں کہا۔ ''ول کیسے کہہ سکتا ہے کہ تم محنتی نہیں ہو۔ تم نے تو کالج کے زمانے میں ہی پارٹ ٹائم ملازمت شروع کر دی تھی اور اب بھی تم اپنی کمپنی میں ٹاپ ایجنٹ ہو۔''

''جانے دو۔'' فرینک نے ونڈ اسکرین پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''یہ محض اس کی خواہش بھی ہو سکتی ہے۔''

''نہیں۔ وہ جھوٹ بول رہا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود محنتی نہیں ہے۔ اسی لیے اپنی تعلیم پوری نہ کر سکا اور اب تک پانچ یا چھ جگہ کام کر چکا ہے۔ وہ تم سے حسد کرتا ہے۔ اسی لیے ایسی باتیں کر رہا ہے۔''

''ممکن ہے۔'' فرینک نے کہا۔ ''بہرحال میں اس کی باتوں کی پروا نہیں کرتا۔''

''اور تمہاری ماں۔ مجھے اس کی بات سمجھ نہیں آتی۔ وہ کون سا کام ہے جو تم نے شروع کر کے مکمل نہ کیا ہو اور تم نے اس سے کب پیسے مانگے۔ یہ ایک سنجیدہ سوال ہے۔''

''بچپن میں وہ یہ بات کہا کرتی تھی۔ شاید وہ مجھ سے کچھ زیادہ توقع کر رہی تھی لیکن اب مجھے ان باتوں سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔''

وہ لائبریریوں میں گئے اور ٹیلی ویژن شوز دیکھے تاکہ ریستوران کی آرائش اور تزئین نو کے بارے میں جان سکیں۔ کیتھی نے کھانا پکانے کی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ بز کی بیوی نے اسے کچھ ترکیبیں بتائی تھیں لیکن کیتھی کوئی ایسی خاص ڈش تیار کرنا چاہ رہی تھی جس کے لیے قرب و جوار کے قصبوں سے بھی گاہک دوڑے چلے آئیں۔ ورجینیا جانے سے پہلے اس نے کئی ترکیبیں آزمائیں اور کم

از کم چار خاص ڈشیں تیار کرنے میں کامیاب ہوگئی۔
انہوں نے دو ہفتے کے لیے پلیس کو بند رکھا اور اس کی از سر نو تزئین و آرائش کے لیے ایک ٹھیکے دار کی خدمات حاصل کیں۔ اس کام میں بجٹ سے کچھ زیادہ ہی خرچ ہوگیا لیکن اس کا دوبارہ افتتاح بہت کامیاب رہا۔ فرینک نے افتتاحی تقریب کے لیے مقامی بینڈ کی خدمات حاصل کی تھیں اور خود بھی ایک گانا گایا، جب گانا ختم ہوا تو لوگوں نے تالیاں بجا کر داد دی۔ کیتھی نے دیکھا کہ اس کا چہرہ شرم، خوشی اور حیرت سے سرخ ہوگیا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ ہم نے صحیح قدم اٹھایا ہے۔
اگلے تین سال بہت اچھے گزرے اور کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ لوگوں کو ریستوران کا نیا روپ، فرینک کی موسیقی اور کیتھی کی بنائی ہوئی نئی ڈشیں پسند آرہی تھیں۔ اس نے ایک مخصوص مشروب بھی متعارف کروایا تھا جو لیسن جوس، سرکہ اور رم پر مشتمل تھا۔ اب وہ صبح اٹھ کر درجنوں آلو کاٹتی اور کئی گیلن مشروب بناتی لیکن فرینک کی خوشی کی خاطر وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھی۔
فرینک کافی مطمئن تھا۔ پہلے چھ مہینے کچھ سخت تھے۔ انہیں اخراجات پورے کرنے کے لیے اپنے پاس سے خرچ کرنا پڑ رہا تھا پھر حالات بہتر ہونا شروع ہوئے۔ گاہکوں کی تعداد بڑھنے لگی اور ہر ویک اینڈ پر کالج کے طلبا مخصوص ڈش اور مشروب سے لطف اندوز ہونے کے لیے آنے لگے۔ فرینک نے ہفتے میں ایک بار موسیقی کی محفل سجانا شروع کردی جس میں قرب و جوار کے قصبوں سے آنے والے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔ ان میں سے کئی ایک مستقل گاہک بن گئے۔ پہلا سال ختم ہونے سے پہلے انہیں اتنی آمدنی ہونے لگی کہ اس میں سے اپنی تنخواہ نکال سکیں۔
ان کی مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ کیتھی علی الصباح کچن میں جا کر کھانے کی تیاری کرتی کیونکہ دوپہر میں بھی کچھ لوگ لنچ کے لیے آتے تھے۔ فرینک سہ پہر میں آتا اور ان کی کوشش ہوتی کہ پیک آور شروع ہونے سے پہلے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکیں۔ وہ کچھ دیر آرام کرتی اور رات میں جب وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتا تو وہ اسے سننے کے لیے دوبارہ آجاتی۔ فرینک ریستوران بند کر کے گھر آتا اور دو چار باتیں کرنے کے بعد سو جاتا۔
انہوں نے بچوں کے بارے میں گفتگو کرنا چھوڑ دی تھی اور نہ ہی انہیں کتا پالنے کا خیال آیا۔ فی الحال یہ دونوں باتیں ممکن نہیں تھیں۔ کیتھی سوچتی تھی کہ ملک کے معاشی حالات بہتر ہوں اور آمدنی بڑھ جائے تو وہ ایک منیجر اور کچن میں کام کرنے کے لیے مددگار باورچی رکھ لے گی پھر انہیں اتنا زیادہ کام نہیں کرنا پڑے گا۔
فرینک کی ماں ان سے ملنے کبھی نہیں آئی۔ البتہ ول ایک مرتبہ آیا تھا۔ اس نے ہفتے کی رات بار میں گزاری اور مفت کی شراب پیتا رہا۔ اتوار کی صبح وہ دیر تک سوتا رہا اور جب کیتھی اس کے لیے کھانا بنانے آئی تو وہ واپس جا چکا تھا۔ برائن اور جولیا سال میں دو مرتبہ آتے اور ماسٹر روم کے برابر والے چھوٹے کمرے میں قیام کرتے جسے اب تک بچوں کی نرسری میں تبدیل ہو جانا چاہیے تھا۔
اگلی مرتبہ جب وہ آئے تو برائن مستقل اپنے باس کی شکایت کرتا رہا اور جولیا نے بتایا کہ اس کی ترقی ہوگئی ہے۔ اس نے اپنے بال مزید چھوٹے کروالیے تھے اور پہلے سے زیادہ پرکشش لگ رہی تھی۔ کیتھی نے نوٹ کیا کہ فرینک چوری چوری جولیا کو دیکھ رہا ہے۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا اسے بھی اپنے اسٹائل میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ اسے ڈائٹنگ تو لازماً شروع کر دینا چاہیے۔ ان دنوں وہ مکمل طور پر بار کے کھانوں پر انحصار کر رہی تھی اور اس کے پاس یہ سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا کہ اسے کن چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔
فرینک اور کیتھی کو یہ بار چلاتے ہوئے تین سال ہوگئے تھے کہ برائن نے فون کر کے کہا کہ وہ اور جولیا ان سے ملنے آرہے ہیں۔ اس نے اصرار کر کے کہا کہ وہ جمعے کی شب انہیں کیتھی کے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں ڈنر کروائے گا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے فرینک سے کہا۔
''میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ اس باس سے تنگ آچکا ہوں اور اپنی علیحدہ ایجنسی شروع کر رہا ہوں۔''
''یہ تمہارے لیے اچھا رہے گا۔'' فرینک نے کہا۔ ''اپنا کاروبار کرنا مشکل ضرور ہے لیکن آگے چل کر فائدہ مند ہوسکتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے جولیا؟''
''یقیناً!'' وہ مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔ ''برائن کے پاس بہت اچھے آئیڈیاز ہیں۔''
برائن نے اپنی نظریں فرینک کے چہرے پر جمائیں اور بولا۔ ''حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس کام کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت ہے جو اونچے درجے کا سیلز مین ہو اور میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا، مجھے ایسا ساتھی چاہیے جو اس ایجنسی میں سرمایہ لگا سکے۔ میں کام شروع کرنے کے لیے نصف سے زیادہ رقم کا انتظام نہیں کرسکتا۔ اسی لیے میں

تمہارے پاس آیا ہوں۔ تم صرف ایک بہترین سیلز مین ہی نہیں بلکہ میرے بہترین دوست بھی ہو۔ میں تمہارے ساتھ کاروبار شروع کرنے سے بہتر کسی اور بات کا تصور نہیں کرسکتا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

حیرت زدہ کیتھی نے برائن کو دیکھا۔ وہ اپنی جگہ منجمد ہوکر رہ گیا۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات نہ جان سکی۔ اس نے برائن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم چاہتے ہو کہ ہم یہ جگہ بیچ کر تمہاری انشورنس ایجنسی میں پیسا لگا دیں لیکن ہم اپنا سب کچھ اس پر خرچ کرچکے ہیں اور ہم نے اسے کامیاب بنانے کے لیے بڑی محنت کی ہے۔''

برائن منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''جانتا ہوں۔ تم نے بہت بڑا کام کیا ہے لیکن کیا تم واقعی کامیاب ہو؟ تم دونوں دن رات کام کرکے برائے نام منافع کما رہے ہو اور اگر معیشت نیچے آئی تو تمہارے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ اگر اس وقت بیچ دو گے تو شرطیہ کہتا ہوں کہ اچھی قیمت مل جائے گی اور تم ایسا کام شروع کرسکو گے جس میں حقیقی کامیابی کے امکانات ہوں۔''

ایک بار پھر کیتھی نے فرینک کی طرف دیکھا۔ اس نے جواب میں سر ہلایا لیکن زبان سے کچھ نہیں بولا۔

''تم نے اس خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔'' برائن اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اور تم تین سال سے اس خواب کے سہارے زندہ ہو۔ ممکن ہے کہ آگے چل کر تمہیں اس کی تعبیر مل جائے لیکن اس وقت تمہیں وہ کام کرنا ہے جو تم چاہتے ہو۔ کیتھی کے ساتھ مخلص ہونے کا کیا بہترین طریقہ ہوسکتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ بچے چاہتی ہے۔ کیا تم اس کی یہ خواہش پوری کرسکتے ہو اگر اس کام سے چمٹے رہے؟''

''ہاں، مجھے بچے چاہئیں۔'' کیتھی نے کہا جب وہ اور فرینک اپنے کمرے میں تنہا تھے۔ اس نے اپنی آواز دھیمی رکھی۔ ''لیکن ہم ابھی جوان ہیں اور ہمارے پاس کافی وقت ہے۔ برائن بھی تمہاری طرح ایک سیلز مین ہے اور اپنے مطلب کی بات کررہا ہے لیکن تم اسے اس کام کے بارے میں بات مت کرنے دو جو تم نہیں کرنا چاہتے۔''

''میں اتنی آسانی سے اس کی باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔'' اس کی آواز میں ایک کاٹ تھی۔

دوسری صبح جب وہ کچن میں گئی تو برائن پہلے سے موجود تھا۔ ''میں ناشتا بنا رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''تمہیں ٹیپس پر کافی کھانا بنانا ہوتا ہے۔ آج میں بھی تمہاری مدد کروں گا کیونکہ اس خاص ڈش کی خفیہ ترکیب چرانا چاہتا ہوں۔''

''یہ اتنی خفیہ بھی نہیں ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں لکھ کر دے دوں گی۔ فرینک کا خیال ہے کہ تم تینوں آج جیفرسن کا مشہور جنگل دیکھنے جاؤ۔ کیا تم پہلے کبھی وہاں گئے ہو؟''

''تمہیں پتا ہے مجھے درختوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ فرینک اور جولیا چلے جائیں گے۔'' اس نے جوس کا گلاس میز پر رکھا اور ہک پر لٹکا ہوا فرائنگ پین اتارتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں تاکہ تمہیں اپنے منصوبے کے بارے میں قائل کرسکوں۔ اگر تم نے کہہ دیا کہ واپس بوسٹن جانا چاہتی ہو تو فرینک اس پر عمل کرنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگائے گا۔''

اس نے بے دھیانی میں اپنا بازو گھمایا اور فرائنگ پین کی ٹکر سے میز پر رکھا ہوا گلاس زمین پر گر کر چکنا چور ہوگیا۔ اس نے وہ جگہ صاف کی اور ٹوٹے ہوئے ٹکڑے سمیٹتے ہوئے بولا۔ ''معاف کرنا۔ غالباً یہ تمہارے خاص گلاسوں میں سے تھا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے کہا اور دل میں سوچنے لگی کہ یہ تیسرا گلاس تھا جو ٹوٹ گیا پھر بولی۔ ''مجھے قائل کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف فرینک کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''چلو اسی پر بات کرتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے۔''

وہ اصرار کرکے اس کے ساتھ ٹیپس گیا اور اس نے پورا دن کیتھی کی مدد کرنے اور دن میں آنے والے گاہکوں کو اٹینڈ کرنے میں گزارا۔ فرینک اور جولیا کی واپسی سہ پہر کے بعد ہوئی۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ غالباً جولیا کو جنگل پسند نہیں آیا۔ اس رات فرینک نے غضب کی پرفارمنس دی اور لوگ کھڑے ہوکر تالیاں بجاتے رہے۔ کیتھی نے سوچا کہ وہ کبھی یہ کام نہیں چھوڑے گا۔ بوسٹن جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن انہیں ایسا کرنا پڑا۔ اگلی اتوار کو وہ کچن ٹیبل پر بیٹھے حساب کتاب کررہے تھے جس سے یہ بات سامنے آئی کہ ٹیپس کو چلانے کا مطلب جدوجہد جاری رکھنا ہے۔ اگر معیشت بہتر رہی تو آمدنی میں تھوڑا سا اضافہ ہوسکتا ہے۔ دوسری صورت میں حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جائیں گے۔

''لیکن اگر میں برائن کی پیشکش قبول کرلوں۔'' فرینک نے کہا۔ ''تو میں اور وہ مل کر بہت کم وقت میں بڑا

منافع کما سکتے ہیں۔ تم کسی اچھے باس کے ساتھ بہتر ملازمت تلاش کرسکتی ہو اور اس طرح ہم دوبارہ کچھ بچت کرنے کے قابل ہوجائیں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں دوبارہ اپنے دوستوں میں مل بیٹھنے اور ان کے ساتھ لنچ یا ڈنر کرنے کا موقع مل سکے گا۔''

اس نے تائید میں سرہلا دیا۔ سخت محنت کے باوجود وہ اس جگہ کو، یہاں کام کرنے والوں اور مستقل گاہکوں کو پسند کرنے لگی تھی۔ جب فرینک اپنے فن کا مظاہرہ کرتا اور لوگ اسے داد دیتے تو اسے بہت اچھا لگتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ دوبارہ معالج کا پیشہ اختیار کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے فرینک سے کہا۔

''لیکن تم بیمہ پالیسی بیچنے میں خوش نہیں تھے اور یہاں تم مطمئن ہو۔''

''کبھی کبھی لیکن زیادہ تر میں تھکن اور دباؤ محسوس کرتا ہوں اور تمہیں کچن میں کام کرتا دیکھ کر مجھے ندامت ہونے لگتی ہے۔ برائن کے ساتھ کام کرنے میں مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور پھر یہ کہ ہماری بچوں کی خواہش بھی پوری ہوجائے گی۔''

''ہاں۔ میں نے اس بارے میں سوچا ہے۔'' کیتھی نے آہستہ سے کہا۔

''پھر تم نے یہ بھی محسوس کیا ہوگا کہ یہاں رہ کر یہ ممکن نہیں۔ ہم دونوں ہفتے میں ساٹھ ستر گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ کام کرتے ہیں۔ اگر ہم اس میں کمی کردیں تو مزید ملازم رکھنا پڑیں گے اور منافع کم ہوجائے گا۔ بچوں کی پیدائش کے بعد اخراجات بڑھ جائیں گے۔ ہمیں ان کی پرورش اور تعلیم کے لیے کچھ پس انداز کرنا ہوگا جو کہ ممکن نظر نہیں آتا۔''

کیتھی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''برائن ٹھیک ہی کہتا ہے تم ایک اچھے سیلز مین ہو۔''

فرینک پُرجوش لہجے میں بولا۔ ''مجھے اپنی ماں سے کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں خود ہی اس جگہ کو فروخت کردوں گا۔ کسی ایجنٹ کو کمیشن کیوں دوں؟ امید ہے کہ اس کی اچھی قیمت مل جائے گی۔''

اس نے انٹرنیٹ کا سہارا لیا اور لوگوں سے فون پر رابطہ کرنے لگا۔ ایک ہفتے کے اندر ہی سودا ہوگیا اور اسے اس جگہ کی معقول قیمت مل گئی چونکہ برائن اتنی رقم کا انتظام نہ کرسکا جس کی وہ توقع کررہا تھا۔ اس لیے فرینک کو ہی ابتدائی اخراجات کا بڑا حصہ ادا کرنا پڑا۔ پارٹنر شپ کے معاہدے میں کیتھی کا نام بھی لکھوایا اور کہا۔ ''بہرحال یہ تمہارا ہی پیسا ہے۔''

انہیں بروک لین کی ایک مشترکہ رہائشی عمارت میں ایک اپارٹمنٹ مل گیا جس کے چھوٹے کمرے میں ایک ہی کھڑکی تھی لیکن اسے نرسری کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ کیتھی کو ایک اچھی ملازمت مل گئی۔ سامان کھولنے اور اسے ترتیب سے رکھنے کے بعد انہوں نے مسز موریل اور ول کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ مسز موریل نے ان کے ڈڑبا نما لیونگ روم کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تو تم واپس آگئے۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا۔''

''وہ کوئی برا بار نہیں تھا۔'' ول نے کہا۔ ''تم اگر وہاں کام کرتے رہتے تو اچھی آمدنی ہوسکتی تھی لیکن لگتا ہے کہ تمہیں اپنے دوست کے ساتھ کام کرنا پسند ہے۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ اس پر اعتبار کرسکتے ہو؟''

''میں اسے کافی عرصے سے جانتا ہوں۔'' فرینک نے کہا۔ ''مجھے اس پر پورا بھروسا ہے۔''

''فرینک اگر تمہیں پارٹنر چاہیے تھا تو اپنے بھائی کے ساتھ کام کرتے۔'' مسز موریل نے کہا۔

''دراصل برائن نے ہی یہ تجویز پیش کی تھی۔'' کیتھی نے کہا۔

''بہت ہوگیا کیتھی۔'' فرینک نے کہا۔ ''اب ہمیں ڈنر کرنا چاہیے۔''

جب وہ کچن میں آئی تو فرینک بھی اس کے ساتھ آگیا اور بولا۔ ''وہ میری ماں ہیں۔ میں انہیں سنبھال لوں گا۔ تمہیں بیچ میں بولنے کی ضرورت نہیں۔ ایک بات یقینی ہے کہ پہلی پالیسی میں لے رہا ہوں جو بہت بڑی ہے۔ میرے مرنے کی صورت میں بیمہ کی رقم تمہیں ملے گی جبکہ برائن اور جولیا ثانوی حقدار ہوں گے اور وصیت کے مطابق میری ماں اور بھائی کو کچھ نہیں ملے گا بلکہ میری حقیقی فیملی اس کی حقدار ہوگی۔''

''ہم جلد ہی اپنی فیملی شروع کردیں گے۔'' کیتھی نے کہا۔

''فی الحال میری توجہ اپنے کام پر ہے۔ اس کے بعد ہی کچھ سوچیں گے۔''

اسی طرح دو سال گزر گئے۔ فرینک نے دوسرے بیڈروم کو اپنا دفتر بنالیا جہاں وہ رات کے کھانے کے بعد ایک دو گھنٹے کمرا بند کرکے کام کیا کرتا تھا۔ اس دوران کیتھی ٹیلی وژن دیکھتی، کتابیں پڑھتی یا مشین پر ورزش کرتی۔ اس نے بارہ پونڈ وزن کم کرلیا تھا۔ فرینک کو ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ دور دراز کے مضافاتی علاقوں میں جانا پڑتا اور اسے

جب واپسی میں دیر ہو جاتی تو کیتھی سو چکی ہوتی۔
فرینک اب پہلے سے زیادہ اسمارٹ نظر آنے لگا تھا۔ بوسٹن آنے کے بعد اس نے اپنے لیے بہت سے کپڑے اور جوتے خریدے۔ وہ ہر ہفتے باقاعدگی سے اپنے بال کٹواتا تھا اور یہ بات سمجھ میں آتی تھی کیونکہ اس کا کام ہی ایسا تھا جس میں اچھا نظر آنا ضروری ہوتا ہے حالانکہ پہلے اس نے کبھی ان باتوں پر توجہ نہیں دی تھی۔ کیتھی کو تشویش ہونے لگی کہ وہ ضرورت سے زیادہ ہی خرچ کر رہا تھا حالانکہ وہ کیتھی کے لیے بھی تحفے لاتا رہتا تھا۔ کبھی اس کے پسندیدہ مصنف کا ناول یا کوئی ڈی وی ڈی، ایک شام وہ اس کے لیے آئی پیڈ لے کر آیا۔
''بہت اچھا ہے۔'' کیتھی نے کہا۔ ''لیکن بہت قیمتی لگ رہا ہے۔ کیا ہم یہ افورڈ کر سکتے ہیں؟''
''بالکل۔'' اس نے آئینے میں اپنی ٹائی کی ناٹ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ وہ کسی متوقع گاہک سے شام کی ملاقات کرنے جا رہا تھا۔ ''میں روزانہ پالیسی بیچ رہا ہوں۔ تم اس فون سے دل بہلاؤ۔''
اس کے جانے کے بعد وہ ان تحائف کے بارے میں سوچنے لگی جو وہ اس کے لیے لے کر آیا تھا۔ وہ کبھی اس کے لیے جیولری، پرفیوم یا کپڑے لے کر نہیں آیا۔ کتابیں، ڈی وی ڈی اور آئی پیڈ تو وہ خود بھی خرید سکتی تھی۔ اس نے سوچا کہ یہ سب اسے مصروف رکھنے کے طریقے ہیں جب وہ اس سے دور ہوتا ہے۔ اس نے ان شاموں کے بارے میں سوچا جب وہ کمرا بند کر کے کام کرتا ہے یا اپنے گاہکوں کے ساتھ شامیں گزارتا ہے پھر وہ سوچتی ہی چلی گئی۔ اس کے کپڑوں، جوتوں اور ہیئر اسٹائل کے بارے میں۔ کتنا عرصہ ہو گیا۔ اس نے کوئی محبت بھرا جملہ نہیں کہا۔ نہ ہی وہ بچوں کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا اور جولیا کے ساتھ اس کی بے تکلفی دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔
کیتھی نے برائن کو اس کے سیل فون پر کہا۔ ''فرینک نے کہا تھا کہ تم دونوں آج رات دفتر میں کام کرو گے۔ میں نے اسے فون کرنے کی کوشش کی لیکن جواب نہیں ملا۔ کیا میں اس سے بات کر سکتی ہوں؟''
''فرینک یہاں نہیں ہے۔'' برائن نے کہا۔ ''وہ کسی گاہک سے ملنے ڈیڈہم گیا ہوا ہے۔''
''اچھا۔ مجھ سے سمجھنے میں غلطی ہوئی۔'' وہ قدرے توقف سے بولی۔ ''لیکن تم دفتر میں ہی ہو؟''
''ہاں۔'' وہ اس سوال پر حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''مجھے آدھی رات تک بیٹھ کر ان پالیسیوں کے کاغذات مکمل کرنا ہیں جو فرینک نے بیچی ہیں۔ تمہارا شوہر ایک ڈائنمو ہے کیتھی۔''
''یقیناً وہ ایسا ہی ہے۔ بہت بہت شکریہ۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔
وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر برائن کے گھر گئی لیکن فرینک کی کار وہاں موجود نہیں تھی۔ وہ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ برائن کسی وقت بھی گھر آ سکتا تھا۔ اس لیے انہوں نے موٹیل میں ملنے کو ترجیح دی۔ اگر برائن جلدی گھر آ جاتا اور جولیا موجود نہ ہوتی تو وہ کوئی بھی بہانہ بنا سکتی تھی۔ مثلاً یہ کہ وہ کسی ساتھی ورکر کی ماں کی عیادت کے لیے گئی تھی۔
کیتھی نے موٹیل کی پارکنگ لاٹ دیکھنے کے بارے میں سوچا لیکن اسے یہ ایک احمقانہ بات لگی۔ گھر واپس جاتے ہوئے اس نے سگریٹ کا ایک کارٹن خریدا اور سوچنے لگی کہ وہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔
جب فرینک نصف شب کے قریب گھر پہنچا تو وہ سگریٹ کا آدھا پیکٹ ختم کر چکی تھی اور کاؤچ پر بیٹھی جن پی رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''جولیا کیسی ہے؟''
وہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں جولیا سے ملنے نہیں گیا بلکہ چیلسیا میں ایک گاہک کے ساتھ تھا۔''
''ڈیڈہم۔'' اس نے کہا۔ ''تم نے برائن کو ڈیڈہم بتایا تھا۔ تمہاری کہانی میں جھول ہے فرینک۔ تم اسی لیے ٹیپس چھوڑنے پر خوش ہو رہے تھے تاکہ اس کے ساتھ وقت گزار سکو۔ کیا یہ کہانی ورجینیا میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ اس روز جب تم اور جولیا جنگل دیکھنے گئے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تم وہاں نہ گئے ہو اور وہ دن کسی موٹیل میں گزارا ہو۔''
وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''مجھے افسوس ہے کیتھی میں تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ تمہیں یہ بات معلوم ہو جائے گی۔''
''بالکل نہیں۔'' کیتھی نے کہا۔ ''بہرحال میں بہت ہوشیار نہیں ہوں۔ تم اور جولیا ساری عمر مجھے دھوکا دیتے رہتے پھر تم نے یہ کوشش کیوں کی۔ تم مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟''
فرینک نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور بولا۔ ''کیونکہ تم میری بیوی ہو اور میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اسی طرح میں برائن کو بھی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا لیکن جولیا کے ساتھ یہ تعلق اچانک ہی بن گیا۔ میں نے اس سے بچنے کی کوشش کی تھی۔''

''کیا تم مجھ سے وعدہ کر سکتے ہو کہ اس کے ساتھ آئندہ کوئی تعلق نہیں رکھو گے اور جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں، اس سے نہیں ملو گے۔''

''میں یہ وعدہ نہیں کر سکتا۔ مجھے اس سے محبت ہے اور تم سے بھی محبت کرتا ہوں لیکن اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ اگر وہ برائن سے علیحدہ ہو جاتی ہے تو میں اس کے ساتھ رہنا پسند کروں گا۔''

کیتھی نے اس پر گلاس پھینکا جو اس سے چند انچ کے فاصلے سے گزرتا ہوا دیوار سے ٹکرایا اور اس کے ٹکڑے فرش پر بکھر گئے۔ وہ ہذیانی انداز میں چلاتے ہوئے بولی۔

''نکل جاؤ اور جب تک میں یہاں ہوں، واپس مت آنا۔ اپنے لیے وکیل کر لو کیونکہ میں بھی کل ایک وکیل کو فون کرنے والی ہوں۔''

جب وہ اگلے روز گھر آئی تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے ساتھ چند جوڑے کپڑے، جوتے اور گٹار کے علاوہ کچھ لے کر نہیں گیا۔ اگلے تین روز اسی طرح گزر گئے۔ وہ کام پر جاتی۔ واپس آ کر اپنے لیے کھانا بناتی ٹی وی دیکھتی اور کاؤچ پر بیٹھے بیٹھے سو جاتی۔ اسے تنہا بستر میں سونے کی عادت نہیں تھی۔ اس نے کوشش کی کہ اس بارے میں کچھ نہ سوچے۔ اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی وکیل کو فون کیا۔ چوتھے روز جب وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی تو وہ خود ہی آ گیا۔ وہ نشے میں لگ رہا تھا۔

''وہ اسے نہیں چھوڑے گی۔'' فرینک نے کہا۔ ''وہ اب بھی کچھ نہیں جانتا اور نہ ہی وہ ایسا چاہتی ہے اب یہ معاملہ ختم ہو چکا ہے۔ میں تم سے ہر وہ وعدہ کرنے کو تیار ہوں جو تم چاہتی ہو۔ بس مجھے گھر آنے دو۔''

اس نے حقارت آمیز انداز میں کہا۔ ''اب تم مجھ سے وعدے کرو گے جب اس نے تمہیں دھتکار دیا اور تم کسی بھی طرح اس کے ساتھ تعلق برقرار نہیں رکھ سکتے۔''

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ پکڑ لیا اور رونا شروع کر دیا۔ ''میں تمہیں چاہتا ہوں۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ ایک موقع اور دے دو۔ میں نہیں جانتا کہ کہاں جاؤں گا۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کیتھی سے یہ نہیں دیکھا گیا۔ وہ اب بھی اس سے محبت کرتی تھی اور اس کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی محال تھا۔ وہی اس کے لیے سب کچھ تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنا بازو اس کے کندھے کے گرد ڈالتے ہوئے بولی۔ ''اندر چلو۔''

وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولا۔ ''تم بہت اچھی ہو کیتھی، میں تمہارے بچے کا باپ بننا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ ''دیکھا جائے گا۔''

اس رات بھی وہ کاؤچ پر سوئی۔ صبح چھ بجے بیدار ہوئی تو اس نے دیکھا کہ وہ کافی بنا رہا تھا اور شیو اور غسل کر چکا تھا۔ اس نے اپنا بازو اس کی گردن میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''رات جو کچھ ہوا، اس پر مجھے افسوس ہے۔ جانتا ہوں کہ میں نے کچھ زیادہ ہی پی لی تھی لیکن یہی ایک طریقہ تھا کہ میں تمہارا سامنا کرنے کے لیے اپنے اندر ہمت پیدا کرتا۔ اب ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ آج رات انتھونی میں ڈنر کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

کیتھی نے اپنے آپ کو اس سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کل رات فریزر سے چلی نکال لی تھی اگر آج نہ کھاتی تو خراب ہو جائے گی۔ معاف کرنا۔ مجھے کام پر جانے کے لیے تیاری کرنا ہے۔''

فرینک نے بہت زیادہ پینا شروع کر دی تھی۔ اس نے کیتھی کو یہی بتایا کہ وہ گزرے ہوئے واقعات کو بھلانے کے لیے پیتا ہے۔ پہلے تو کیتھی سمجھی کہ یہ عارضی کیفیت ہے۔ جانتی تھی کہ وہ اسے اور برائن کو دھوکا دینے پر اپنے آپ کو قصوروار سمجھتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسے جولیا کی طرف سے دھتکارے جانے کا غم ہو۔ کیتھی کا خیال تھا کہ صورت حال معمول پر آنے کے بعد وہ اس سے نجات حاصل کر لے گا۔

لیکن کچھ بھی معمول پر نہیں آیا اور اس کی شراب نوشی بڑھتی گئی۔ ایک رات جب اس کی ماں اور بھائی ڈنر پر آئے ہوئے تھے۔ فرینک نے اتنی پی لی کہ اس کے ہاتھ سے پانچواں گلاس بھی چھوٹ کر زمین پر گر گیا اور فرینک اس کے ٹوٹنے پر رونے لگا۔ اس کی ماں نے حسب عادت کہا۔

''میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا۔'' جس پر ول قہقہے لگانے لگا اور دونوں بھائیوں میں ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی۔

فرینک کا کام بری طرح متاثر ہو رہا تھا۔ وہ اکثر اوقات کلائنٹ سے ملنے کا موقع ضائع کر دیتا اور اپنی میز پر بیٹھے بیٹھے سو جاتا۔ مجبوراً برائن کو ایک نیا ایجنٹ رکھنا پڑا۔ جس کے نتیجے میں دلبرداشتہ ہو کر فرینک نے مزید پینا شروع کر دی۔ برائن نے کیتھی کو فون کر کے کہا کہ فرینک اس کے لیے بھائیوں جیسا ہے......لیکن اسے حقائق کا سامنا کرنا تھا۔ اب اس کا دل اس کام میں نہیں لگ رہا تھا اور اس کے وہاں بیٹھنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ نیا ایجنٹ بہت متحرک تھا اور بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اور برائن مل کر فرینک کا حصہ خرید سکتے تھے اور یہ ہر ایک کے حق میں بہتر ہوتا، ممکن ہے کہ

کیتھی اور فرینک ٹپس جیسی کوئی دوسری جگہ تلاش کرلیں، برائن چاہتا تھا کہ کیتھی اس بارے میں سوچے۔

کیتھی نے سوچا اور اس نے فرینک سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ایک بار پھر آپے سے باہر ہوگیا۔ کیتھی نے برائن کو فون کر کے کہا کہ وہ خود ہی فرینک سے بات کرلے۔

وہ نومبر کی ایک سرد شام تھی، اس روز سہ پہر سے ہی برف باری ہورہی تھی۔ کیتھی کے گھر پہنچتے تک سڑکیں برف سے ڈھک چکی تھیں۔ ساتھ بجے اس نے فرینک سے اس کے سیل فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن جواب نہیں ملا۔ دس بجے اس کا فون آیا۔ اس کی آواز کمزور اور بھرائی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ اس نے معمول سے زیادہ شراب پی رکھی ہے۔

''تم کہاں ہو؟'' کیتھی نے پوچھا۔

''میں بہت شرمندہ ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''کچھ بھی سچ نہیں تھا۔ میں نے کیوں اس پر یقین کرلیا' میں اتنا احمق کیسے ہوسکتا ہوں لیکن تم نے مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ تم واحد ہستی ہو جس نے مجھ سے محبت کی۔''

وہ ماضی کا صیغہ استعمال کررہا تھا جس نے کیتھی کو خوفزدہ کردیا۔ ''تم کہاں ہو؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔ ''کیا تم گھر سے قریب ہو؟''

''ابھی نہیں۔'' اس نے کہا۔

''برف باری ہورہی ہے۔ تمہیں اس موسم میں ڈرائیونگ نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے بتاؤ کہ تم کہاں ہو۔ میں تمہیں لینے آجاتی ہوں۔''

''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے تم سے محبت ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔ اس کے بعد کیتھی نے کئی بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے نائن الیون کو بھی فون کر کے فرینک کی گاڑی کا نمبر دیا اور کہا کہ وہ نشے کی حالت میں ہے لہٰذا پولیس اس کی مدد کرے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ پولیس والے اسے کہاں ڈھونڈیں گے اور فون سننے والے نے بھی اس بارے میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ وہ کاؤچ پر بیٹھی اس کے انتظار میں سگریٹ پھونکتی رہی پھر تین بجے ایک غمزدہ صورت آفیسر نے آکر بتایا کہ فرینک کی کار پھسلن کے سبب ایک درخت سے جاٹکرائی تھی۔

تدفین کے بعد جولیا نے کیتھی کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ اس نے تمہیں کیا بتایا تھا لیکن مجھے بہت افسوس ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

کیتھی نے وہ جگہ فروخت کردی پھر اس نے فلاڈلفیا میں ملازمت کرلی اور ایک اپارٹمنٹ کے لیے زرِضمانت جمع کروادیا۔ برائن کمپنی میں فرینک کا حصہ خریدنا چاہ رہا تھا لیکن اس نے انکار کردیا۔ پھر اس نے ایک دن برائن، جولیا، مسز موریل اور رول کو ڈنر پر مدعو کیا اور اس نے چکن کی وہی ڈش بنائی جو نو سال پہلے بنائی تھی۔ اس کے علاوہ اپنے ریستوران کی مخصوص ڈش بھی بنائی۔ سب چیزیں اتنی اچھی تھیں کہ مسز موریل بھی ان میں کوئی نقص نہ نکال سکیں۔

کیتھی نے الیکٹرانک سگریٹ نکالا اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ مسز موریل نے اپنی ناک پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ ''اس فضول شے کو ہٹاؤ۔ میں سگریٹ کا دھواں برداشت نہیں کرسکتی۔''

''یہ دھواں نہیں' صرف بخارات ہیں اور ان سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میرے سپروائزر نے سگریٹ نوشی چھوڑنے کے لیے انہیں استعمال کیا ہے۔''

''یہ بہت مہنگے ہیں۔'' ول نے کہا۔ ''ایک کارٹریج کتنے کا ہوگا؟''

''میں انہیں دوبارہ بھر لیتی ہوں۔'' کیتھی نے کہا۔ ''اور مجھے صرف مائع نکوٹین خریدنا ہوتی ہے۔

''بہرحال مجھے خوشی ہے کہ تم سب لوگ یہاں آئے تاکہ میں فلاڈلفیا میں اپنی نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے تم سے مل سکوں۔''

''ہمیں فرینک کی موت کا بہت غم ہے۔'' برائن نے کہا۔ ''لیکن کیتھی کے لیے یہاں سے جانا بہت ضروری ہے۔''

''مجھے امید ہے کہ تم وہاں خوش رہوگی۔'' جولیا نے کہا۔ ''ممکن ہے کہ تمہیں نیا ساتھی مل جائے۔''

''کون جانتا ہے۔'' کیتھی نے کہا۔ ''ممکن ہے ایسا ہوجائے۔''

یہ کہہ کر وہ کھڑی ہوگئی اور بولی۔ ''میں تم لوگوں کے لیے ڈرنکس لاتی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آج وہ خاص مشروب جنجر لیمن ڈریمز پیو جو میں ٹپس میں بناتی تھی۔ برائن، یاد ہے تم نے ایک دفعہ میری مدد کی تھی' کیا آج بھی تم اس مشروب کی تیاری میں میرا ساتھ دوگے؟''

اس نے کچن میں کپ بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے زیادہ تر گلاس پیک کردیے ہیں۔ صرف چند گلاس وہاں رکھے ہوئے ہیں۔ کیا تم انہیں اتار سکتے ہو؟''

اس نے وہ گلاس نکال کر میز پر رکھ دیے۔ ان میں دو

سادے، دو گلابی اور ایک نیلا گلاس تھا۔ ''مجھے اب بھی یقین نہیں آتا۔'' برائن نے کہا۔ ''میں اسے ہر روز یاد کرتا ہوں۔''

کیتھی بولی۔ ''جس دن اس کا انتقال ہوا، تم نے کہا تھا اس سے بات کرو گے، کیا تمہاری بات ہوئی تھی؟''

''موقع ہی نہیں ملا۔ اس روز میری ایک میٹنگ تھی جو دیر سے ختم ہوئی۔ تب تک فرینک جا چکا تھا۔''

''بہت برا ہوا۔ اس رات اس نے فون پر مجھ سے کچھ عجیب باتیں کہی تھیں۔ مجھے امید ہے کہ تم اس کی وضاحت کر سکو گے۔''

برائن نے اسے چونک کر دیکھا اور بولا۔ ''اس نے تمہیں فون کیا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا؟''

''اس نے کہا کچھ بھی سچ نہیں تھا۔ یہ بات اس نے دو مرتبہ کہی اور یہ بھی کہا کہ وہ احمق تھا جو اس نے یقین کر لیا۔ میں حیران ہوں کہ اس کا کیا مطلب تھا۔ کیا سچ نہیں تھا۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟''

برائن کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''وہ نشے میں تھا اور اس حالت میں کچھ بھی کہہ سکتا تھا۔''

کیتھی نے دل میں کہا۔ ''ہاں، وہ شراب پینے لگا تھا اور تم اسے شراب مہیا کرتے تھے اور تم نے ایسی باتیں کیں کہ وہ دل برداشتہ ہو کر اپنا حصہ تمہیں بیچ دے۔ جولیا اور تم نے اس سے جھوٹ بولا۔ تمہیں اس سے کبھی بھی محبت نہیں تھی۔ تم نے اس روز ایک اسکیم کے تحت جولیا کو اس کے ساتھ جنگل دیکھنے کے لیے بھیجا تاکہ جولیا اس کے ساتھ محبت کا جھوٹا ناٹک رچا کر اسے بوسٹن واپس آنے اور تمہاری کمپنی میں سرمایہ لگانے پر آمادہ کر لے۔ ممکن ہے کہ تم نے یہ نہ سوچا ہو کہ وہ اس حد تک آگے چلے جائیں گے کہ ان کے درمیان جنسی تعلق قائم ہو جائے لیکن تم نے اپنی بیوی کو اتنی چھوٹ ضرور دی کہ جب تک وہ تمہارے لیے کام کر رہا ہے، وہ اس کے ساتھ چپکی رہے پھر جب تمہارے پاس ایک معقول رقم جمع ہو گئی اور فرینک کے کام کی رفتار سست پڑ گئی تو تم نے اس سے پیچھا چھڑانے کا فیصلہ کر لیا۔ تم جانتے تھے کہ وہ پہلے ہی اپنے آپ کو قصوروار سمجھ رہا ہے اور تم نے یہ کہہ کر رہی سہی کسر پوری کر دی کہ تمہیں اس کی کوئی پروا نہیں اور یہ کہ جولیا اس سے کبھی بھی محبت نہیں کرتی تھی۔ ممکن ہے کہ تم یہ نہ جانتے ہو کہ وہ اپنے آپ کو مار لے گا لیکن تم چاہتے تھے کہ وہ یہ خطرہ مول لے اور میں شرطیہ کہتی ہوں کہ اب تمہیں سکون مل گیا ہے۔''

''اوہ!'' کیتھی نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''میں رم لانا تو بھول ہی گئی۔ کیا تم لا سکتے ہو؟ تمہیں معلوم ہے کہ نا کہ کیبنٹ کہاں ہے؟''

جب وہ چلا گیا تو اس نے جیب سے ایک شیشی نکالی اور نیلے گلاس میں لیمن کے فلیور والی نکوٹین انڈیل دی۔ اس نے اخبار میں پڑھا تھا کہ اس کا ایک کھانے کا چمچہ کسی بھی بالغ شخص کے لیے مہلک ہو سکتا ہے۔ اس نے تین چمچے ڈال دیے۔ وہ انصاف کرنا چاہ رہی تھی جو کسی عدالت سے نہیں مل سکتا تھا۔ اس نے شیشی صاف کر کے کوڑے دان میں پھینک دی۔ جب برائن واپس آیا تو وہ گلاسوں میں لیمن اور سادہ سیرپ مکسچر ڈال رہی تھی۔

''یہ میری خفیہ ترکیب ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اب میں ان میں رم ڈالوں گی۔ مسز موریل کا گلاس الگ کرنا ہوگا۔ کیا تم یہ گلاس لے جاؤ گے۔ مجھے نیلا گلاس دینا۔ آج میں بہت جذباتی ہو رہی ہوں۔''

اس نے وہ گلاس اٹھایا اور بولا۔ ''میری خواہش ہے کہ تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو۔ یہ کوئی عقل مندی نہیں کہ تم کمپنی میں اپنا حصہ برقرار رکھو۔ اگر تم اسے بیچ دو تو نئے سرے سے زندگی شروع کر سکتی ہو۔''

''میں وہی کر رہی ہوں۔ میں نے نئی ملازمت ڈھونڈ لی ہے۔ اپارٹمنٹ کا زر ضمانت جمع کروا دیا ہے۔ ایک بار پھر سگریٹ نوشی چھوڑنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے شوہر کی خواہش کا بھی احترام کرنا ہے۔ اس کی وصیت کے مطابق تم اور جولیا انشورنس پالیسی کے ثانوی حق دار تھے۔ اب تم دونوں میرے حقیقی وارث ہو گے۔ میں نے امریکن کینسر سوسائٹی کو ثانوی حق دار بنا دیا ہے اور جیسا کہ فرینک نے ہمیشہ کہا کہ تم اور جولیا ہماری حقیقی فیملی ہو۔ اس لیے اگر میں مر گئی تو میرا سب کچھ تمہیں مل جائے گا۔''

اس نے دل میں کہا۔ ''تمہاری انگلیوں کے نشان گلاس پر ہیں۔ تم نے ہی فرینک کا قتل کیا ہے لیکن اس کی سزا سے بچ گئے۔ خوش قسمتی سے مجھے یہ موقع مل گیا ہے۔ اس لیے تم مجھے قتل کرنے کے الزام میں جیل چلے جاؤ گے۔''

برائن کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ ''شکریہ لیکن تم اس طرح کیوں سوچ رہی ہو۔ ابھی تم صرف چونتیس برس کی ہو۔ تم کیوں مرنے کی باتیں کر رہی ہو؟''

''میں کینسر کی آخری اسٹیج پر ہوں اور ڈاکٹر نے کہا ہے کہ صرف چند روز کی مہمان ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے وہ آخری گلاس منہ سے لگا لیا جو اس کے شوہر کی نشانی تھا۔

کوہِ گراں

مرزا امجد بیگ

عدالت کے منظر میں بہت سی کہانیاں آپ نے پڑھیں مگر اب عدالت سے باہر کیس کی شروعات اور انجام بخیر بھی پڑھ کر دیکھیں... مرزا امجد نے ثابت کردیا کہ وکالت ہر مقام پر دلیل پیش کرسکتی ہے اور یہ دلیل ہر مجرم کو ذلیل کرکے رکھ دیتی ہے۔ اس رات بھی کئی آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ کسی بھیانک خواب سے کم نہ تھا مگر حقیقت نظرانداز کرنے سے نہ تو نظروں سے اوجھل ہوتی ہے اور نہ ہی دیکھنے کا انداز بدلتا ہے۔ وہ جو کسی کی محبت کے حصول کی خاطر گلی گلی بھٹکتا پھرتا تھا کہ اچانک ساری گلیوں نے اس پر رستے تنگ کردیے... اور وہ اس محبت سے اس قدر تنگ آگیا کہ الامان الحفیظ... کیونکہ غلط راستے کبھی کسی مسافر کو درست منزل تک نہیں پہنچاتے... یہ فلسفہ اسے دیر سے سمجھ میں آیا مگر موت اب بھی اس سے چند قدم دور ہی تھی اور پھر بیگ صاحب کی وکالت کے سبب اس دوری کو طویل فاصلوں میں بدلتے دیر نہیں لگی۔

اندھے کنویں میں چھلانگ لگانے والے ایک عاشق کی نامرادیوں کا قصہ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب پاکستان کو دولخت ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ جغرافیائی لحاظ سے تو پاکستان اپنے قیام کے وقت ہی دولخت تھا یعنی مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں کوئی زمینی رابطہ نہیں تھا تاہم مجموعی طور پر یہ دونوں ایک ہی ملک کہلاتے تھے مگر سقوطِ ڈھاکا ایسے سانحے نے ایک کو پاکستان اور دوسرے کو بنگلا دیش بنا دیا تھا۔ زیرِنظر واقعہ موجودہ پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی کا ہے۔

ملک میں ایک افراتفری کا عالم تھا۔ ایسے میں چوروں اور ڈاکوؤں کی بن آئی تھی کراچی کے باسیوں کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ میں جس دور کا ذکر کررہا ہوں ان دنوں ڈکیتی کی وارداتوں کا تناسب بہت بڑھ گیا تھا۔ اپنی مدد آپ کے تحت شہریوں نے اپنے اپنے محلوں میں گلی گلی پہرا دینا شروع کردیا تھا۔ یہ بھی ایک ایسی ہی ستم ظریف رات کی داستان ہے۔

میں معمول کے مطابق اپنے بیڈروم میں ایک اہم کیس کی اسٹڈی میں محو تھا کہ شور کی آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ شور کی یہ آواز گھر سے باہر گلی میں ابھری تھی۔

بے ساختہ میری نگاہ دیوارگیر کلاک کی جانب اٹھ گئی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ میں نے کیس کی فائل کو ایک جانب رکھا اور توجہ گھر کے باہر ابھرنے والی آواز پر مرکوز کردی۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس آواز کے بارے میں میرا ابتدائی اندازہ غلط تھا۔ اصل میں وہ شور میرے

پڑوس والے بنگلے کے اندر سے اٹھ رہا تھا اور اس کی شدت میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ اب میرے لیے اپنے گھر کے اندر بیٹھے رہنا مناسب نہیں تھا لہٰذا میں نے چپل پہنی اور اپنے گھر سے باہر نکل آیا تا کہ پتا چلا سکوں کہ میرے پڑوس کے بنگلے میں رات کے اس پہر کون سی آفت آ گئی ہے۔

میں نے اپنے پڑوس کے جس بنگلے کا ذکر کیا، وہاں قدوس نامی ایک صاحب اپنی فیملی کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ یہ ایک مختصر سا خاندان تھا۔ قدوس، اس کی بیوی کلثوم اور ان کی دو بیٹیاں خالدہ اور عابدہ۔ قدوس صاحب کی ایم اے جناح روڈ پر ڈینسو ہال کے نزدیک گھڑیوں کی ایک دکان تھی۔

میں اپنے گھر کا گیٹ کھول کر باہر نکلا ہی تھا کہ ایک نوجوان لڑکی کے چہرے پر نگاہ پڑی۔ وہ خاصی گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی۔ میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھی۔

''انکل! آپ وکیل ہیں نا......؟''

''جی بالکل، میں وکیل ہوں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ کون؟''

''میرا نام خالدہ ہے۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولی۔ ''ہم اس بنگلے میں رہتے ہیں۔'' بات ختم کرتے ہی اس نے میرے پڑوس والے بنگلے کی جانب اشارہ کر دیا۔

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''تو یہ شور کی آوازیں آپ کے گھر کے اندر سے آ رہی تھیں؟''

میں نے ''تھیں'' کا لفظ اس لیے استعمال کیا تھا کہ اب وہ شور سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں خالدہ یا اس کی بہن عابدہ کو چہرے سے نہیں پہچانتا تھا۔ صرف مجھے اتنا معلوم تھا کہ میرے پڑوسی قدوس کی دو بیٹیاں ہیں جن کے نام خالدہ اور عابدہ ہیں۔

''خیریت تو ہے نا بیٹی!'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔ ''یہ کیسا شور تھا؟''

''انکل! آپ جلدی سے ہمارے گھر چلیں۔'' وہ اضطراری انداز میں بولی۔ ''امی نے آپ کو بلایا ہے۔''

''خالدہ بیٹی!'' میں نے اس متوحش لڑکی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی رسان سے کہا۔ ''میں وکیل ضرور ہوں مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ آدھی رات کو تمہاری امی مجھے کیوں بلا رہی ہیں؟''

''وہ جی...... ہمارے گھر میں ایک ڈاکو گھس آیا ہے۔'' وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

''اوہ......!'' میں ایک طویل سانس خارج کر کے رہ گیا پھر پوچھ لیا۔ ''تمہارے ابو کہاں ہیں؟''

''ابو گھر ہی میں ہیں جی۔'' اس نے بتایا۔ ''ابو نے اس ڈاکو کو پکڑ رکھا ہے۔ ہمیں اس وقت آپ کی مدد کی سخت ضرورت ہے......''

حقِ ہمسائیگی کا معاملہ تھا اس لیے میں مزید کوئی سوال کیے بغیر اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس صورتِ حال نے میرے اندرونی تجسس کو بھڑکا دیا تھا۔

☆☆☆

قدوس صاحب نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا تھا۔ قدوس مضبوط بدن کا مالک ایک پستہ قامت شخص تھا۔ اس کی عمر پچپن کے آس پاس رہی ہوگی۔ اس نے بڑی مہارت اور چابک دستی کے ساتھ مبینہ ڈاکو کو زیر کر لیا تھا۔ جب خالدہ نے تھوڑی دیر پہلے کسی ڈاکو کا ذکر کیا تو میں یہی سمجھا تھا کہ وہ کوئی خطرناک شخص تھا مگر قدوس نے جس بندے کو قابو کر رکھا تھا وہ میرے تصور سے بہت مختلف تھا۔

قدوس کے قریب ہی اس کی بیوی کلثوم اور بڑی بیٹی عابدہ بھی موجود تھیں۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو کلثوم نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

''لیں جی...... وکیل صاحب آ گئے۔ اب وہ خود ہی اس کم بخت کا بندوبست کر دیں گے۔''

مبینہ ڈاکو کی عمر بیس بائیس سال رہی ہوگی۔ وہ دبلا پتلا اور دراز قامت نوجوان تھا۔ شیو بڑھا ہوا اور لباس سے اجڈپن جھلکتا تھا۔ ان لمحات میں وہ صحن کے فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا اور خاصا سہا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اسی دوران میں عابدہ دو کرسیاں اٹھا لائی۔ کلثوم کے اصرار پر ایک کرسی میں نے سنبھال لی اور دوسرے پر قدوس براجمان ہو گیا۔ قدوس نے اس لفنگے نوجوان کو زیر کر کے ایک کارنامہ انجام دیا تھا۔ میری آمد پر اس کا حوصلہ مزید بڑھ گیا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے کڑے تیوروں سے اس نوجوان کو گھورا۔

اس نے جواب دیا۔ ''مراد......!''

''تم مراد نہیں نامراد ہو!'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''جبھی ڈاکا ڈالنے اس گھر میں گھسے تھے...... ہیں نا؟''

''نہیں جناب......'' وہ گھگیایا۔ ''میں چور ہوں اور نہ ڈاکو۔''

''پھر تمہارا اس گھر میں گھسنے کا مقصد کیا تھا؟'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آدھی

رات کو یہاں پکنک منانے آئے تھے......؟''

''میں جھوٹ نہیں بول رہا جناب۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے منت ریز لہجے میں بولا۔ ''آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں۔''

''مجھے تمہاری چھوٹی اور بڑی قسموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' میں نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔ ''میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم آدھی رات کو قدوس صاحب کے گھر میں کیا کر رہے تھے؟''

''میں اپنی جان بچانے کے لیے دیوار پھلانگ کر اس گھر میں کود گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''مجھے نہیں پتا، یہ کسی قدوس صاحب کا گھر ہے یا کسی اور کا......''

''یہ بکواس کرتا ہے وکیل صاحب!'' قدوس نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ ''میں کافی دیر سے اس مردود کی یہی بک بک سن رہا ہوں۔''

مسز قدوس نے کہا۔ ''وکیل صاحب! آپ کو میں نے اس لیے بلایا ہے کہ آپ قانونی معاملات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ اس بدمعاش کو قابو کر کے پولیس کے حوالے کر دیں۔ آپ ہمارے پڑوسی ہیں۔ یہ آپ کا ہم پر احسان ہوگا۔''

مراد باری باری سب کے چہروں کی طرف دیکھنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''وکیل صاحب! آپ میری بات کا یقین کریں۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں مجرم نہیں ہوں۔''

''قدوس صاحب!'' میں نے صاحب خانہ کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس کی بات تو میں بعد میں سنوں گا۔ پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے اسے کب اور کہاں سے پکڑا ہے؟''

''ہم لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ بنگلے کے عقبی حصے میں ''دھپ'' کی آواز ابھری۔'' قدوس مجھے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ ''میں اس وقت واش بیسن پر کھڑا تھا اور برش کرنے کا ارادہ تھا۔ اس پراسرار آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے یوں لگا جیسے کوئی ہمارے گھر کے اندر کودا ہو۔ میں نے دانت برش کرنے کے ارادے کو وقتی طور پر ملتوی کیا اور دبے قدموں سے بنگلے کے عقبی حصے کی جانب بڑھ گیا اور پھر میں نے اسے ایک دیوار کے ساتھ کھڑے دیکھا۔ اس کا رخ دوسری جانب تھا۔ میں نے اسے محسوس نہیں ہونے دیا اور بہ آہستگی اس کے سر پر پہنچ گیا اور پھر میں نے گرجدار آواز میں اسے پکارا۔

''اے......کون ہو تم؟''

''اپنے عقب میں میری آواز سن کر یہ اس طرح اچھلا جیسے اس نے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔ اگلے ہی لمحے اس نے ایک جانب دوڑ لگا دی۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا اور چند فٹ آگے جا کر اسے دبوچ لیا۔ اس نے میری گرفت سے نکلنے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر میں نے اس کی ایک نہیں چلنے دی اور کالر سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے یہاں لے آیا......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''جب سے یہ ایک ہی رٹ لگائے ہوئے ہے کہ یہ چور نہیں بلکہ یہ اپنی جان بچانے کے لیے ہمارے گھر میں کودا ہے۔''

''قدوس صاحب!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بلاشبہ آپ نے بڑی جرأت سے کام لیا ہے ورنہ اس قسم کی صورت حال میں لوگ عموماً حواس باختہ ہو جاتے ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ چور اور سانپ کی ایک اپنی ہی دہشت ہوتی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں وکیل صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید بری طرح گھبرا جاتا۔ بس جی......'' لمحاتی توقف کے بعد اس نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''جوانی کی کسرت کام آگئی۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''نوجوانی میں مجھے پہلوانی کا شوق تھا۔ میں روزانہ باقاعدگی سے اکھاڑے جاتا رہا ہوں بہرحال......'' اس نے نفرت آمیز نظر سے مبینہ ڈاکو مراد کی طرف دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''اب وہ جوانی والی پھرتیاں تو باقی نہیں ہیں اور نہ ہی جسم میں وہ طاقت موجود ہے لیکن اس جیسے چور اچکوں سے تو میں اب بھی دو دو ہاتھ کرنے کی سکت رکھتا ہوں۔''

''بہرحال، آپ کی کارکردگی نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔'' میں نے انہیں سراہتے ہوئے کہا پھر میں مراد کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''ہاں بھئی نامراد! بتاؤ، تمہارے ساتھ کیا سلوک

کیا جائے؟‘‘

’’آپ مجھے معاف کردیں جناب۔‘‘ وہ التجا آمیز انداز میں بولا۔ ’’مجھے یہاں سے جانے دیں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔‘‘

’’نہیں، قدوس صاحب تو تمہیں تھانے میں بند کروانے کے حق میں ہیں۔‘‘ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ’’یہ میرے پڑوسی ہیں اور ان کی خواہش کا احترام کرنا مجھ پر واجب ہے۔‘‘

’’میں ان کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے کو تیار ہوں۔‘‘ وہ قدوس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’اور یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ پھر کبھی اس علاقے کا رخ نہیں کروں گا۔‘‘

میری تجربہ کار نگاہ نے مجھے بتا دیا کہ مراد غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا۔ وہ واقعی چوری یا ڈکیتی کی نیت سے اس گھر میں نہیں گھسا تھا البتہ یہ عقدہ کھلنا ضروری تھا کہ وہ کس سے جان بچانے کے لیے دیوار پھلانگ کر قدوس کے گھر میں کودا تھا۔

’’تمہارے وعدے وعید اور معافی تلافی کی کوئی اہمیت نہیں۔‘‘ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ’’جب تک مجھے تمہاری بے گناہی کا یقین نہ ہو جائے، تم یہاں سے جا نہیں سکتے بلکہ اگر یہاں سے جاؤ گے تو سیدھے تھانے کی حوالات میں جاؤ گے......‘‘

اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ بے حد پریشانی کے عالم میں مجھ سے مستفسر ہوا۔ ’’وکیل صاحب! آپ کو...... میری بے گناہی کا...... کیسے یقین...... آئے گا......؟‘‘

’’تمہاری بے گناہی صرف سچ بولنے ہی سے ثابت ہو سکتی ہے۔‘‘ میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

’’میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا وکیل صاحب......‘‘ وہ ملتجیانہ لہجے میں بولا۔

’’تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے اس گھر میں کودے تھے۔‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’یہ کیا قصہ ہے...... تمہیں کس سے جان کا خطرہ تھا؟‘‘

’’چند غنڈے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے جناب۔‘‘ وہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ’’میں اپنی جان بچا کر بھاگ رہا تھا۔ اس بنگلے کی عقبی گلی میں تاریکی نظر آئی تو میں ان غنڈوں کو چکما دے کر ادھر آ گیا اور خود کو محفوظ کرنے کے لیے بنگلے کی دیوار پھلانگ کر اندر کود گیا۔‘‘ وہ سانس درست کرنے کے لیے رکا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

’’اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ان شیطانوں نے مجھے بنگلے کے اندر کودتے ہوئے نہیں دیکھا اور میری جان بچ گئی......‘‘ بات کے اختتام پر اس نے ایک جھرجھری لی۔

وہ مئی کا مہینا تھا۔ ان دنوں موسم کے کیا تیور ہوتے ہیں، یہ بات سب کو معلوم ہے۔ مسز قدوس نے ایک پیڈسٹل فین ہمارے رخ پر آن کر دیا تھا اور وہ ماں بیٹیاں بھی کرسیاں ڈال کر ہمارے قریب ہی بیٹھ گئی تھیں۔ عدالت سے باہر وہاں قدوس صاحب کے گھر کے صحن میں ایک چھوٹی سی ’’عدالت‘‘ لگ گئی تھی اور وہ بھی بعد از نصف شب!

ملزم مراد کافی دیر سے اکڑوں بیٹھا ہوا تھا اور اس پوزیشن میں بیٹھا وہ رحم کا منتظر دکھائی دیتا تھا۔ مجھے اس کی کہانی میں خاصی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس کی تکلیف رفع کرنے کی غرض سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

’’سیدھے ہو کر بیٹھ جاؤ...... آلتی پالتی مار کر......‘‘

اس نے فوراً سے پیشتر میری ہدایت پر عمل کیا اور صحن کے پختہ فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اب اس کے چہرے پر قدرے اطمینان جھلک رہا تھا۔

میں نے باقاعدہ جرح کا آغاز کرتے ہوئے اس سے سوال کیا۔ ’’وہ غنڈے تمہارے پیچھے کیوں لگے ہوئے تھے۔ تم سے ان کی کیا دشمنی ہے؟‘‘

’’نامراد‘‘ نے اپنا قصہ شروع کرنے سے پہلے باری باری ہم سب کے چہروں کا جائزہ لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ شاید کسی چکر بازی کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ میں نے فوراً تنبیہی انداز میں اس پر واضح کر دیا۔

’’ایک بات کان کھول کر سن لو مراد...... اور وہ یہ کہ اگر تم نے ذرا سی بھی غلط بیانی یا چکر بازی سے کام لینے کی کوشش کی تو پھر سیدھے یہاں سے تھانے جاؤ گے۔ میرے ایک فون پر پولیس والے اس بنگلے کے گیٹ پر کھڑے ہوں گے...... پھر تم مجھ سے کسی مدد اور رعایت کی توقع نہ رکھنا۔‘‘

’’میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں۔‘‘ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ’’جو بھی کہوں گا، سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

’’جناب! ان غنڈوں سے براہ راست تو میری کوئی دشمنی نہیں ہے وکیل صاحب!‘‘ اس نے ’’نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن‘‘ ایسی صورتِ حال دیکھی تو گہری سنجیدگی سے بتانے لگا۔ ’’یہ سارا چکر وصی شاہ کا چلایا ہوا ہے۔‘‘

’’وصی شاہ......‘‘ میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ’’کون

وصی شاہ؟"

"وصی شاہ ایک نجومی ہے وکیل صاحب۔" اس نے جواب دیا۔ "جو ستاروں کا حال بتاتا ہے۔"

"تو تمہاری دشمنی کسی نجومی سے ہے؟"

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"پھر......!" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "اگر وہ تمہارا دشمن نہیں تو پھر اس نے تمہارے پیچھے غنڈے کیوں چھوڑ رکھے ہیں؟"

"یہ سب سلمٰی کا کیا دھرا ہے۔" اس نے بتایا۔

"سلمٰی کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سلمٰی ببلی کی ماں ہے۔" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

اس کی کہانی ایک سے ایک دلچسپ اور سنسنی خیز موڑ لے رہی تھی۔ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"ببلی کسی سلمٰی کی بیٹی ہے اور سلمٰی نے کسی نجومی وصی شاہ کو تمہارا دشمن بنا رکھا ہے لہٰذا وصی شاہ نے تمہارے پیچھے غنڈے لگا دیے ہیں جو تمہاری جان لینا چاہتے ہیں۔ تم کوئی ہوش ربا کہانی سنا کر مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش تو نہیں کررہے؟"

"میری توبہ جو میں آپ کو کوئی چکر دینے کی کوشش کروں۔" وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ "ببلی کا اصل نام سحرش ہے۔ آپ نے میری کہانی کو ہوش ربا کہا ہے تو ٹھیک ہی کہا ہے۔ اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ میری کہانی بڑے انوکھے انداز میں آگے بڑھ رہی تھی کہ اس نجومی کے بچے وصی شاہ نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا......"

"مجھے بتاؤ، تمہاری کہانی کیا ہے؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس دوران میں کلثوم نے بنگلے کے کچن میں جا کر چائے بنالی تھی اور اس وقت ہم چائے سے بھی شغل کررہے تھے۔ اگرچہ قدوس اور اس کی بیگم کلثوم تو اس بات کے حق میں نہیں تھے کہ "نامراد" کو بھی چائے پیش کی جائے تاہم میرے کہنے پر انہوں نے چائے کی ایک پیالی اسے بھی دے دی جس پر مراد نے خلوصِ دل سے میرا شکریہ ادا کیا تھا۔ اس موقع پر کلثوم کہے بنا نہیں رہی تھی۔

"وکیل صاحب! آپ ہمارے پڑوسی ہیں، ہمارے محسن ہیں اسی لیے ہم نے آپ کی بات مان لی ورنہ اس بدبخت کو تو میں ایک بوند پانی بھی نہ دیتی۔ ایسے چور ڈاکو کسی رعایت کے مستحق نہیں ہوتے۔"

میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "مسز قدوس! میں مراد کا حمایتی نہیں ہوں لیکن ایک سوال آپ سے ضرور کرنا چاہوں گا۔"

"جی ضرور......" وہ سنجیدگی سے مجھے تکنے لگی۔

"کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گی کہ مراد نے آپ کے گھر سے کون سی چیز چرائی ہے؟" میں نے بہ دستور زیرلب مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن......" وہ گڑبڑا گئی۔ "یہ چوری کی نیت ہی سے دیوار پھلانگ کر...... ہمارے گھر میں کودا تھا......"

"نیت کا حال صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے مسز قدوس جو ہم سب کا خالق اور مالک ہے۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "انسان محض اندازے ہی قائم کرسکتا ہے اور میرا اندازہ ہے کہ......"

"کیا اندازہ ہے آپ کا؟" میری بات مکمل ہونے سے پہلے وہ بول اٹھی۔

"میرا اندازہ یہ ہے کہ مراد ہرگز چور نہیں ہوسکتا۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "اب اس حقیقت کا سراغ لگانے کے لیے ہی میں اس پر جرح کررہا ہوں۔"

"مجھے بھی اس کے اندر چوروں والی پھرتی اور دم خم نظر نہیں آرہا۔" قدوس مراد کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے میری تائید میں بولا۔ "اسے قابو کرنے میں مجھے زیادہ وقت نہیں ہوئی تھی۔"

"مراد......!" میں نے اس مصیبت زدہ جوان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے تم خود اپنی زبان سے سچ بولنے کا حلف اٹھا چکے ہو۔"

"جی، مجھے اچھی طرح یاد ہے وکیل صاحب۔" وہ چائے کی چسکی لینے کے بعد اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں اپنے وعدے، مطلب یہ کہ اپنے اس حلف پر قائم ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ "اب جلدی سے تم مجھے وہ کہانی سنانا شروع کردو جس میں ببلی، سلمٰی اور وصی شاہ کے کردار سجے ہوئے ہیں۔"

اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری پھر اپنی داستان بیان کرنے لگا:

☆☆☆

آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو مراد کے پس منظر سے آگاہ کردوں تاکہ اس کہانی کے مطالعے کے دوران میں

آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ اس میں سے بیشتر باتیں تو مجھے خود مراد ہی نے بتائی تھیں اور کچھ میں نے بعدازاں اپنی تحقیق اور تفتیش سے معلوم کرلی تھیں۔

مراد کا پورا نام مراد علی تھا۔ وہ کراچی کے علاقے غریب آباد کا رہنے والا تھا۔ وہ بوڑھے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ عمر تیئس سال اور قدوقامت وصحت کے بارے میں ابتدائی صفحات میں بتایا جاچکا ہے۔ وہ محض مڈل تک تعلیم یافتہ تھا اور فی الحال بے روزگار بھی تھا۔

مراد کا باپ امداد علی ایک تجربہ کار ماہر موٹر مکینک تھا اور غریب آباد کے مین روڈ پر اس نے اپنی ایک چھوٹی سی مکینیکل شاپ بنا رکھی تھی جہاں وہ صبح سے رات گئے تک کام میں مصروف رہتا تھا۔ امداد علی اپنے کنبے کا واحد کفیل تھا۔ اس کی سب سے بڑی محرومی اس کا غیر تعلیم یافتہ ہونا تھا۔ وہ بچپن ہی سے موٹر مکینکی کے کام میں پڑ گیا تھا اور پھر اسی روزگار میں اس کی عمر گزر گئی۔ اب وہ بڑھاپے کی منزل پر کھڑا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں وہ پہلے جیسی طاقت اور توانائی تو باقی نہیں رہی تھی تاہم جب تک سانس چل رہی تھی، اسے یہی کام کرنا تھا۔

انسان نے اپنی زندگی میں جو محرومیاں دیکھی ہوں، اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد کا ان محرومیوں سے واسطہ نہ پڑے لہٰذا امداد علی کی بھی شدید خواہش تھی کہ اس کی اکلوتی اولاد نرینہ پڑھ لکھ کر کوئی بڑا آدمی بنے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی طرح مراد بھی مشینوں اور کل پرزوں کے تیل سے ہاتھ پاؤں اور کپڑے کالے کرے۔ اس کی تمنا تھی کہ اس کا بیٹا قلم کی نوک سے کاغذ کالے کرے اور ایک دن وہ اپنا اور اپنے والدین کا نام روشن کرے مگر امداد علی کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا...... وہ خود اس لیے تعلیم حاصل نہیں کرسکا تھا کہ اس کے والدین اسے تعلیم دلانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے اسی لیے اس نے خود محنت اور کڑی مشقت کرکے بیٹے کو پڑھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی محنت رائگاں گئی۔ وہ مراد کو ''بامراد'' کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کی اس کوشش میں مالی تنگی آڑے نہ آئی بلکہ مراد کی تعلیم سے عدم دلچسپی نے امداد علی کا دل توڑ دیا اور اس کے ارمانوں کا خون کرڈالا۔

مراد کی والدہ سلطانہ نے بھی اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی مگر والدین کی کوئی نصیحت اس بدنصیب کے پلے نہ پڑی۔ پڑھنا لکھنا تو رہا ایک طرف، اس نامراد نے تو کسی کام کاج میں بھی دلچسپی نہ لی اور تیئس سال کا ہونے کے باوجود بھی بے روزگار ہی تھا۔ وہ کبھی کبھار اپنے باپ کے موٹر گیراج میں چلا جاتا اور اس کا ہاتھ بٹا دیتا ورنہ دن کا بیشتر حصہ وہ آوارہ گردی کی نذر کردیتا تھا اور اسی بے روزگاری، بے کاری اور آوارہ گردی کے دوران میں اسے سحرش عرف ببلی سے محبت ہوگئی تھی۔

کہتے ہیں، اگر انسان کے سامنے کرنے کو بہت کچھ ہو جس کی وجہ سے اس کا ذہن ہمہ وقت مصروف رہتا ہو تو پھر اسے عشق ومحبت کا خیال بھی نہیں آتا۔ مصروف انسان اپنے کام کی محبت میں گرفتار رہتا ہے۔ فارغ لوگوں میں عشق ومحبت کے جراثیم کچھ زیادہ ہی پائے جاتے ہیں۔ کسی کی کہی ہوئی یہ بات کس حد تک درست ہے؟ اس سوال کا جواب کوئی ایسا شخص ہی دے سکتا ہے جس نے کبھی محبت کی ہو۔

ببلی، مراد ہی کے محلے میں رہتی تھی۔ وہ چھپ چھپ کر اور کبھی کھلم کھلا بھی ببلی کو دیکھا کرتا تھا۔ ببلی ایک دھان پان، خوب صورت اور پرکشش سانولی سلونی لڑکی تھی۔ جب وہ اسکول کے لیے گھر سے نکلتی تو مراد بس اسٹاپ تک اس کا تعاقب کرتا تھا۔ جب تک وہ بس میں سوار ہوکر اس کی نگاہ سے اوجھل نہ ہوجاتی، وہ ادھر اسٹاپ پر ہی کھڑا رہتا تھا۔ اسے ببلی کی اسکول سے واپسی کا وقت بھی اچھی طرح ذہن نشین تھا۔ وہ اسے بس اسٹاپ سے گھر تک پہنچا کر ہی دم لیتا تھا۔

جب کسی شخص کے معمولات میں اس قدر ''نظم ونسق'' ہو پھر فریق ثانی بھلا کیسے ایسی سرگرمیوں سے بے خبر رہ سکتا ہے۔ ببلی کو بھی بخوبی احساس تھا کہ محلے کا ایک آوارہ لڑکا اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ ابھی تک مراد کی کوئی قابلِ اعتراض حرکت ببلی کے نوٹس میں نہیں آئی تھی لہٰذا وہ مراد کی ان حرکات کو اچھال کر بلاوجہ کوئی ایشو نہیں بنانا چاہتی تھی۔ یہ سب کچھ یونہی چل رہا تھا کہ ایک روز اس...... معمول میں اچانک بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔

اس دن ببلی حسب معمول چھٹی کے وقت جب اسکول سے واپس لوٹی تو بس اسٹاپ پر مراد موجود نہیں تھا۔ اگرچہ اس نے کسی بھی مرحلے پر مراد میں اپنی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا تاہم وہ روزانہ اس آوارہ لڑکے کی شکل دیکھنے کی عادی ہوچکی تھی چنانچہ اس روز مراد کی غیر موجودگی اسے عجیب سی لگی۔

ببلی نے غیر ارادی طور پر گردن گھما کر چاروں جانب نگاہ دوڑائی پھر اپنے گھر کی سمت قدم بڑھا دیے۔ جب وہ

اپنی گلی میں داخل ہونے ہی والی تھی تو اسے اپنے تعاقب میں کھنکھارنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی اسے پکارا بھی گیا۔

''بلی جی...... ایک منٹ......''

بے ساختہ اس کے قدم تھم گئے اور اس نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے مراد کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک کتاب اٹھا رکھی تھی۔

''جی فرمائیں؟'' وہ گہری سنجیدگی سے مستفسر ہوئی۔

''میں آپ ہی کے محلے میں رہتا ہوں۔'' مراد نے خوشگوار لہجے میں اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام مراد علی ہے۔''

''جی، جانتی ہوں۔ آگے بولیں!'' بلی نے رُکھائی سے کہا۔

وہ جذباتی لہجے میں بولا۔ ''آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔''

''کیا یہی بتانے کے لیے آپ نے مجھے روکا ہے......؟''

''اگر آپ میرے دلی جذبات کی قدر کریں گی تو مجھے خوشی ہوگی۔'' مراد نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ ''آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

''ایسے فضول کاموں کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔'' بلی نے اکھڑے لہجے میں کہا اور جانے کے لیے مڑی۔

''میں یہ آپ کے لیے لایا ہوں۔'' مراد نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب کو آگے بڑھاتے ہوئے شکستہ لہجے میں کہا۔

بلی ایک لمحے کے لیے رکی اور پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''شعر و شاعری کی کتاب ہے۔'' مراد نے حتی الامکان شیریں انداز میں کہا۔ ''آپ پڑھیں گی تو بہت لطف اندوز ہوں گی۔ یہ آپ کے لیے میرا پہلا تحفہ ہے۔''

''مجھے شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی آپ کے گھٹیا جذبات سے۔'' بلی نے ناگواری سے کہا۔ ''آپ میرا پیچھا کرنا چھوڑ دیں ورنہ ایک دن آپ کو بری طرح پچھتانا پڑے گا......''

مراد دنگ رہ گیا۔ بلی کے دھمکی آمیز انداز نے اس کی محبت کے غبارے میں سوئی چبھو دی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ بلی نے وہ شعری مجموعہ کھینچ کر اس کے منہ پر دے مارا ہو۔ وہ دل مسوس کر رہ گیا۔

اس دوران میں بلی تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کی نظر سے اوجھل ہوگئی۔

آئندہ تین چار روز تک مراد نے بلی کا تعاقب نہیں کیا اور دن رات یہی سوچتا رہا کہ بلی نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا تھا۔ اس سنگ دل لڑکی نے تو مراد کی محبت کے نوزائیدہ پودے کو اپنے پاؤں کے نیچے روند ڈالا تھا۔ جب انسان کسی معاملے پر سوچ بچار کرتا ہے تو دماغ سے کوئی نہ کوئی جواب ضرور آتا ہے۔

مراد کے دماغ نے سمجھایا کہ یہ عشق و محبت اس کے بس کا کام نہیں لہٰذا اس بکھیڑے کو چھوڑ چھاڑ کر اسے آگے بڑھ جانا چاہیے لیکن دل نے اس کے برخلاف فیصلہ دیا۔

اندر کا عاشق اپنی شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا چنانچہ چند روزہ ''تعطل'' کے بعد وہ دوبارہ ''کام'' سے لگ گیا۔

مراد کو ''غیر حاضر'' پا کر بلبلی نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ ایک مصیبت سے جان چھوٹی لیکن جب مراد اسے دوبارہ اپنے تعاقب میں دکھائی دیا تو اسے بہت غصہ آیا اور ایک روز اس نے خود ہی رک کر اس سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس وقت بھی وہ اسکول ہی سے واپس آرہی تھی۔ مراد چند قدم کا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ قدرے کم بھیڑ والی جگہ دیکھ کر رکی تو مراد چونک اٹھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ بلبلی اچانک رک کیوں گئی۔ وہ بوکھلاہٹ آمیز انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''میں نے شرافت کی زبان میں تمہیں جو کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی وہ تمہاری عقل میں نہیں آیا۔'' بلبلی نے اسے گھورتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ ''لگتا ہے، مجھے تمہارا کوئی بندوبست کرانا ہی پڑے گا۔''

بلبلی کے خطرناک تیور دیکھ کر مراد گھبرا گیا پھر ملتجیانہ لہجے میں بولا۔ ''میں اپنے اس دن کے رویے پر شرمندہ ہوں۔ اگر آپ کو میرا اظہارِ محبت برا لگا ہو تو میں اس کے لیے آپ سے معافی مانگنے کو تیار ہوں۔ آپ کے لیے میرے دل میں جو جذبات تھے وہ میں نے......''

''جہنم میں جاؤ تم اور بھاڑ میں جائے تمہارا عشق۔'' بلبلی ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئی۔ ''اگر آئندہ تم میرے آس پاس دکھائی دیے تو سر پراتنے جوتے برساؤں گی کہ محبت کا بھوت پر لگا کر اڑ جائے گا...... آوارہ، بدمعاش، لچا کہیں کا......''

اپنی اس درجہ ذلت پر مراد سلگ اٹھا۔ اسے بلبلی کی جانب سے ایسے جارحانہ رویے کی توقع نہیں تھی۔ توقع چھوٹی ہو یا بڑی، جب یہ پوری نہیں ہوتی تو دل میں ایک خنجر سا پیوست ہوجاتا ہے۔ وہ ایسا موقع تھا کہ وہ بلبلی کو اس ردِعمل کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اگر بات بڑھ جاتی تو لوگوں کا وہاں جمع ہونا لازمی تھا اور اس کے بعد مراد کی جو دھلائی منجھائی ہوتی اس کا تصور بھی لرزا دینے والا تھا لہٰذا وہ کان دبا کر چپ چاپ اپنی راہ ہولیا۔

اس دلخراش واقعے کے بعد مراد ایک مرتبہ پھر گوشہ نشین ہوگیا۔ اب وہ شام وسحر اپنے دل کے زخموں کی مرہم پٹی میں مصروف تھا۔ چند روز بعد جب اس کی حالت ذرا سنبھلی تو دلِ بے قرار نے اسے پھر بلبلی کی سن گن لینے پر مجبور کر دیا اور...... اس مرتبہ مراد پر آسمانی بجلی کوندگئی۔

اس نے دیکھا، بلبلی اب ایک کار میں اسکول جا آرہی تھی۔ مراد کو اچھی طرح خبر تھی کہ ان لوگوں کے پاس کوئی کار نہیں تھی اور نہ ہی وہ کوئی گاڑی خریدنے کی استطاعت رکھتے تھے۔ پھر یہ کار کس کی تھی......؟

یہ سوال کسی خوف ناک بگولے کے مانند اس کے دماغ میں چکرانے لگا۔ اندرونی تجسس سے مجبور ہو کر وہ اس شخص کی کھوج میں لگ گیا۔ ان دنوں جس کی کار میں بلبلی اسکول جا آرہی تھی، وہ کالا بھجنگ شخص مراد کو ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ وہ اس منحوس بندے کی ٹوہ میں لگ گیا اور چند ہی روز میں وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ وہ کالا کلوٹا فربہ اندام شخص کوئی نجومی تھا۔ اس کا نام وصی شاہ پتا چلا۔ بلبلی وصی شاہ کو ''انکل'' اور اس کی ماں سلمٰی اسے ''بھائی صاحب'' کہہ کر بلاتی تھی۔ محلے والوں کی معلومات کے مطابق وہ بندہ بلبلی کے باپ شوکت حسین کا کوئی دور کا رشتے دار تھا۔ یہ حقیقت تھی یا بلبلی کے گھر والوں نے ایسا مشہور کر رکھا تھا، مراد اس راز سے واقف نہیں ہوسکا۔

دو چار بار جب مراد اور وصی شاہ کا آمنا سامنا ہوا تو وصی شاہ نے اسے گھور کر ایسی نظر سے دیکھا تھا جیسے کچا چبانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ وصی شاہ کے اس انداز سے مراد کو یہ سمجھنے میں کسی دقت کا سامنا نہ ہوا کہ بلبلی نے اپنے انکل بلیکی کو اس کے بارے میں تفصیلاً بتادیا ہوگا۔

بلبلی کا انکل بلیکی مراد کے لیے کسی مصیبت سے کم نہیں تھا۔ وہ اس گینڈے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ وصی شاہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ بلبلی کو اسکول لے جانے اور لانے کی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔

چند روز کے بعد وصی شاہ نے باقاعدہ بلبلی کے گھر آنا جانا بھی شروع کردیا۔ اس بے ڈھنگے کالے مسٹنڈے کو بلبلی کے نزدیک دیکھ کر مراد کا دل خون ہوجاتا تھا۔ اسے اس رقیب روسیاہ سے حسد محسوس ہونے لگا تھا لیکن چونکہ اس کا وصی شاہ پر کوئی بس نہیں چلتا تھا اس لیے مراد دل مسوس کر رہ جاتا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ایک مرکھنے کالے بھینسے نے اس کی محبوبہ چھین لی ہو۔

وصی شاہ کی ذات کے حوالے سے مراد کی تحقیق کا سفر جاری رہا۔ چند روز کے بعد وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ وہ بلبلی اور سلمٰی کا یا شوکت حسین کا کہیں سے بھی رشتے دار نہیں تھا بلکہ وہ بلبلی کی ماں سلمٰی کے چکر میں ان کے گھر کے پھیرے لگا رہا تھا۔ چور رشتوں کو محلے داری میں

زیادہ عرصے تک چھپا کر رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ گنجان آباد محلے والے خصوصاً اس محلے کی عورتیں اس نوعیت کی تفتیش اور تحقیق میں ''پی ایچ ڈی کرمنالوجی'' سے کم نہیں ہوتیں......

جب مراد کو یہ یقین ہو گیا کہ وصی شاہ سلمٰی پر رال ٹپکا رہا ہے تو اس کے دل کو قدرے اطمینان محسوس ہوا۔ وہ خوش تھا کہ وصی شاہ کی نظر بلبلی پر نہیں ہے لیکن اس انکشاف سے بھی مراد کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا تھا۔ وہ بلبلی کا طلب گار تھا جو اس سے ''کوسوں دور'' وصی شاہ کی نگرانی اور محافظت میں تھی اور اس صورتِ حال نے مراد کی زندگی عذاب بنا کر رکھ دی تھی۔

ایک روز بڑا ہنگامہ خیز اور خطرناک واقعہ رونما ہوا جب وصی شاہ نے مراد پر اپنی گاڑی چڑھا کر اسے مارنے کی کوشش کی۔ مراد کی قسمت اچھی تھی کہ اسے بروقت خطرے کا احساس ہو گیا، اس لیے وہ بال بال بچ گیا۔ اس کے بعد تو گویا وصی شاہ نے باقاعدہ مراد کے خلاف محاذ ہی کھول دیا۔

چند روز بعد جب ان کا سامنا ہوا تو وصی شاہ نے پستول نکال کر مراد کو دھمکی دی۔ ''اگر تم نے بلبلی کا خیال دل سے نہ نکالا تو میں کسی تاریک کونے میں تمہیں ایک گولی مار کر ٹھنڈا کر دوں گا......''

وصی شاہ نے اتنی سفاکی سے یہ جملہ ادا کیا تھا کہ مراد اندر باہر سے لرز کر رہ گیا تھا۔ وصی شاہ کی آواز میں جھلکتے استحکام کو محسوس کر کے مراد کو یقین ہو گیا کہ وہ کالا ناگ اپنی اس دھمکی کو عملی جامہ پہنانے میں کسی تکلف سے کام نہیں لے گا۔

یہاں تک اپنی داستان سنانے کے بعد مراد نے ایک آسودہ سانس خارج کی اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''وکیل صاحب! یہ ہیں وہ حالات جن سے میں ان دنوں گزر رہا ہوں۔ اس خبیث کالے جن وصی شاہ نے میرا جینا حرام کر کے رکھ دیا ہے۔ کبھی وہ پولیس والوں کی مٹھی گرم کر کے انہیں میرے پیچھے لگا دیتا ہے۔ پولیس خوامخواہ مجھے پریشان کرتی رہتی ہے۔ تیس، چالیس روپے دے کر ہی ان سے جان چھڑانا پڑتی ہے اور اب تو جناب......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک جھرجھری لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اس کمبخت کالے بھجنگ نے میرے پیچھے کرائے کے غنڈے لگا دیے تھے جو میری جان لینا چاہتے ہیں۔ آج بڑی مشکل سے اس بنگلے میں کود کر جان بچائی ہے۔ آگے پتا نہیں، کیا ہوگا......''

تعمیل

سالن ابل کر دیگچی سے باہر گر گیا اور اس کے جلنے کی بو پھیلی تو مالکن نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے غصیلے لہجے میں نئی ملازمہ سے کہا ''میں نے تم سے کہا تھا کہ خیال رکھنا، سالن کب ابلنا شروع ہوتا ہے۔''

''میں نے خیال رکھا تھا جی......!'' ملازمہ نے سعادت مندی سے کہا ''سالن گیارہ بج کر اٹھارہ منٹ پر ابلنا شروع ہوا تھا۔''

''وکیل صاحب!'' قدوس صاحب نے ترحم آمیز نظر سے مراد کی طرف دیکھتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ بے چارہ تو بڑا مظلوم لگتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے جانے کی اجازت دے دیں اور اگر ممکن ہو تو اس کی کچھ مدد بھی کر دیں۔''

''مدد......'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی جانب دیکھا اور کہا۔ ''میں سمجھا نہیں قدوس صاحب؟''

''میرا مطلب ہے......'' وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ وصی شاہ کو سمجھا بجھا کر یا اگر ضرورت محسوس کریں تو ڈرا دھمکا کر اس مجبور غریب کی خلاصی کرا دیں۔ یہ بڑا نیکی کا کام ہوگا۔''

''یقیناً!'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی پھر مراد کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم آج...... میرا مطلب ہے کل سہ پہر یا شام میں میرے آفس آ جاؤ۔ پھر تم سے تفصیلی بات ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے وکیل صاحب۔'' وہ ممنونیت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ اپنا کوئی وزیٹنگ کارڈ وغیرہ مجھے دے دیں تاکہ آپ کا آفس تلاش کرنے میں مجھے آسانی رہے۔''

''تم میرے گھر کے گیٹ تک چلو۔'' میں نے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی دیتا ہوں اور آفس کا ایڈریس بھی سمجھا دیتا ہوں۔''

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے باری باری اپنی پڑوسی فیملی کے ممبران کی طرف دیکھا پھر زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اب آپ لوگ اطمینان اور سکون سے سو سکتے ہیں۔ میں چور کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔''

ان سب کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے۔

☆☆☆

آئندہ روز جب میں عدالتی بکھیڑے نمٹا کر اپنے آفس میں پہنچا تو مراد علی پہلے سے وہاں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس وقت میرے آفس کے ویٹنگ روم میں مراد کے علاوہ بھی تین چار کلائنٹ موجود تھے۔ میں نے سب کے سلام کا جواب دیا اور سبک خرامی سے چلتے ہوئے اپنے چیمبر میں داخل ہو گیا۔ مراد علی کی باری پر میری سیکریٹری نے اسے میرے پاس بھیج دیا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

''کیا حال ہے جوان؟''

''اللہ کا شکر ہے وکیل صاحب۔'' وہ چہک کر بولا۔ ''ابھی تک تو ٹھیک ٹھاک ہی ہوں۔''

''جس اللہ کا تم نے شکر ادا کیا وہ ہمیشہ تمہیں اپنی حفاظت اور نگہبانی میں رکھے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''آمین......!'' وہ تشکرانہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''رات امن و امان سے اپنے گھر پہنچ گئے تھے نا۔ وصی شاہ کے بھیجے ہوئے غنڈوں نے کہیں دوبارہ تمہیں گھیرنے کی کوشش تو نہیں کی؟''

''جی نہیں...... سب خیریت گزری۔'' وہ ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

گزشتہ رات مراد علی جس قدر ڈرا سہما ہوا دکھائی دیتا تھا آج اس کی حالت اس سے بالکل مختلف تھی۔ اس وقت وہ خاصے اعتماد کے ساتھ بات کر رہا تھا اور مطمئن بھی نظر آتا تھا۔ میں نے اسے ٹھنڈے گرم کی پیشکش کی تو وہ جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے وکیل صاحب۔ اگر آپ مجھے اس مصیبت سے نکال دیں تو آپ کا مجھ پر یہ بہت بڑا احسان ہوگا۔''

میں نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر موسم کی مناسبت سے مراد کے لیے کولڈ ڈرنک لانے کے لیے اپنی سیکریٹری سے کہہ دیا پھر مراد کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''میں نے تمہیں اپنے آفس میں محض اسی لیے بلایا ہے تاکہ تمہارے اس مسئلے کا کوئی ٹھوس اور پائیدار حل نکالا جاسکے۔''

''جی بہت شکریہ وکیل صاحب۔'' وہ عقیدت بھرے انداز میں مجھے تکنے لگا۔

''میں اگر چاہتا تو کل رات ہی تم سے بہت ساری باتیں کر لیتا اور تمہیں میرے آفس آنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن وہاں قدوس صاحب کے گھر میں ان کی بیوی اور دونوں بیٹیاں تمہیں بڑے معنی خیز انداز میں دیکھ رہی تھیں اور ببلی والے قصے پر ان کی دلچسپی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس صورتِ حال میں تم خاصے نروس ہو رہے تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ان لوگوں کے سامنے ببلی والا واقعہ بیان کرتے ہوئے مجھے خاصی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔''

سیکریٹری نے آفس بوائے کے ہاتھ ایک ٹھنڈی ٹھار بوتل میرے چیمبر میں پہنچا دی تو میں نے مراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بوتل بھی پیتے جاؤ اور یہ بھی بتاؤ کہ تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''میں کچھ سمجھا نہیں وکیل صاحب۔'' وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔

''میرا اشارہ ببلی کی طرف ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے وصی شاہ کی عداوت کے چند نمونے دیکھ لیے ہیں۔ کیا ان حالات میں بھی تم ببلی کی محبت کا دم بھرو گے؟''

میں نے یہ سوال دو مقاصد کی غرض سے کیا تھا۔ ایک مقصد تو محض مراد علی سے چھیڑ چھاڑ کرنا تھا اور دوسرے میں اس کی محبت کے ٹمپریچر کو ناپ کر اس معاملے میں اس کی سنجیدگی کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔

''جناب......'' وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ''میں تو ایسی محبت سے باز آیا جس میں میری جان ہی داؤ پر لگ جائے اور میں زندگی بچانے کے لیے ادھر ادھر چھپتا پھروں۔''

''اس کا مطلب ہے، تم نے ببلی کا خیال اپنے دل سے نکال دیا ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''جج...... جی......'' وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔ ''ظاہر ہے......''

''اس کا مطلب ہے، تم کچے عاشق ہو......''

''بات کچے اور پکے کی نہیں ہے وکیل صاحب۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

میں نے بھی اسی کے انداز میں پوچھ لیا۔ ''پھر کیا بات ہے؟''

اس بات میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ ببلی مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔'' وہ قدرے جذباتی ہو گیا۔ ''وہ بہت ہی حسین و جمیل اور پُرکشش لڑکی ہے۔ اس کے تصور پر ہی میرا

دل دھڑکنے لگتا ہے۔ میرے دل کا تو یہی مطالبہ ہے کہ اسے ہر قیمت پر بلی چاہیے لیکن اس کے رویے اور ردعمل نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔ اس نے میری محبت کی توہین کی ہے اور پھر اپنے اس کالے جن انکل وصی شاہ کو میرے پیچھے لگا کر میرا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ وکیل صاحب! میں بہت پریشان ہوں۔ آپ کسی طرح وصی شاہ سے میری جان چھڑا دیں تو میں سکھ کی سانس لوں گا۔''

''وصی شاہ سے تو میں تمہاری گلوخلاصی کرا دوں گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن اس کے لیے تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔''

''ایک نہیں، میں دس وعدے کرنے کو تیار ہوں۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

''دس نہیں، صرف ایک!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''لیکن ایسا وعدہ کہ جس کی تمہیں ہر حال میں پاسداری کرنا ہوگی۔''

''جی میں سمجھ گیا۔'' وہ آنکھیں جھپکتے ہوئے پُرعزم لہجے میں بولا۔

''بلی کو بھول جاؤ۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''ک... کیا......؟'' وہ بھونچکا نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''وعدہ کرنے میں کوئی دقت پیش آ رہی ہے......؟'' میں نے پوچھا۔

''ن، نہیں......'' وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''میں کوشش کروں گا وکیل صاحب!''

''کوشش نہیں...... یہ کام یقینی طور پر کرنا ہوگا۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''ہاں یا نہ......؟''

''ہاں۔'' وہ مضبوط انداز میں بولا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد میں بلی کو بھول جاؤں گا لیکن......''

''لیکن کیا؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''لیکن اگر وہ خود بخود میرے خیالوں میں آ گئی تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔'' وہ بے بسی کے عالم میں بولا۔ ''انسان کو اپنی سوچوں پر تو اختیار نہیں ہے نا۔''

''سوچنا انسان کی فطرت ہے۔'' میں نے بڑی رسانیت کے ساتھ کہا۔ ''اور فطرت پر پابندی عائد نہیں کی جا سکتی......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ دشمن سے ہمیشہ بچو اور دوست سے اس وقت بچو جب وہ تمہاری زیادہ تعریف کرنے لگے۔

☆ حضرت جنید بغدادیؒ کا قول ہے کہ نیکی کرتے وقت بدلے کی توقع نہ رکھو کیونکہ نیکی کا بدلہ انسان نہیں اللہ دیتا ہے۔

☆ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا کہ انسان کو دریا کی طرح سخی، سورج کی طرح شفیق اور زمین کی طرح نرم ہونا چاہیے۔

☆ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا جس نے سچے دل سے کوشش کی وہ ضرور کامیاب رہا۔

☆ حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا زبان کی لغزش قدموں کی لغزش سے زیادہ خطرناک ہے۔

☆ حضرت علیؓ نے فرمایا جو شخص اپنا راز پوشیدہ رکھتا ہے، وہ اپنی سلامتی کو اپنے قبضے میں رکھتا ہے۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

ندامت کا آنسو

عقل کی لاکھوں دلیلیں اللہ تعالیٰ سے ایک گناہ معاف نہیں کروا سکتیں لیکن...... ندامت کا ایک آنسو ساری زندگی کے گناہ معاف کروا سکتا ہے۔

مرسلہ۔ ماریہ چودھری، تابر، پاک پتن شریف

''میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آج کے بعد تم بلی سے ملنے یا اس کا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کرو گے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''اور نہ ہی وصی شاہ یا بلی کی ماں سلمیٰ سے کسی قسم کا کوئی تعلق واسطہ رکھو گے...... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی، میں اچھی طرح سمجھ گیا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے یقینی انداز میں بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

''گڈ......!'' میں نے نوٹ پیڈ کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے قلم سنبھال لیا اور کہا۔ ''تم مجھے بلی کے گھر کا ایڈریس

نوٹ کرا دو۔''

اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا تمہارے بوڑھے والدین کو ان غیر یقینی حالات کی کچھ خبر ہے؟''

''نہیں!'' وہ گردن کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ''وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

''کیا وہ لوگ تمہارے عشقیہ معاملات سے بھی واقفیت نہیں رکھتے؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں وکیل صاحب...... انہیں کچھ پتا نہیں۔''

''ٹھیک ہے......'' میں نے خلا میں گھورتے ہوئے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''سمجھ لو کہ تمہارا کام ہوگیا۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں جناب۔'' وہ تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ''اس طرح چٹکی بجاتے میں کس طرح کام ہوسکتا ہے؟''

''برخوردار! تمہارا مسئلہ چٹکی بجاتے میں حل نہیں ہوگا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے لیے مجھے چند روز تک دوڑ دھوپ کرنا ہوگی اور چونکہ مجھے یقین ہے کہ میں یہ کام کرلوں گا اس لیے میں نے پورے اعتماد کے ساتھ کہہ دیا کہ...... سمجھ لو، تمہارا کام ہوگیا۔''

''اوہ......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آپ بہت ذہین اور باکمال وکیل ہیں۔''

''ان خالی خولی تعریفی جملوں سے کام نہیں چلے گا مراد علی!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''جناب! میں نے یہ بات ایسے ہی نہیں کہہ دی۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں دل سے آپ کا معترف ہوگیا ہوں۔''

''اچھی بات ہے مگر......''

''مگر کیا وکیل صاحب؟'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔

میں نے کہا۔ ''وکالت میرا پیشہ ہے، میرا روزگار ہے، یعنی میری روزی روٹی ہے اور میں یہ کام فی سبیل اللہ نہیں کرتا ہوں۔ تمہیں میری اس دوڑ دھوپ، اس کڑی محنت کی فیس دینا ہوگی۔''

''فیس......!'' اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھرے۔ ''لیکن میں تو ایک بے روزگار شخص ہوں۔ آپ کی بھاری فیس کیسے ادا کرسکتا ہوں؟''

''اگر تم بے روزگار ہو تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔'' میں نے تفریح کے عمل کو گہری سنجیدگی سے جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں نے تمہیں نوکری کرنے سے منع کر رکھا ہے؟''

''نہیں جناب! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ خفیف ہوتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ ''کیا ایک کام نہیں ہوسکتا؟''

''کون سا کام؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ اپنی فیس ادھار نہیں کرسکتے؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''ادھار...... کیا مطلب؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی، میرا مطلب یہ ہے کہ......'' وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر آج میں بے روزگار ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہمیشہ بے روزگار ہی رہوں گا۔ میں جیسے ہی کسی کام پر لگوں گا، سب سے پہلے آپ کی فیس ادا کروں گا۔''

دراصل، میرا مراد علی سے فیس لینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کا کام ایسا تھا کہ جس کے لیے مجھے کوئی خاص چارہ جوئی کرنے کی ضرورت نہیں تھی اور پھر میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس وقت میری فیس ادا کرنے کے لیے اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ میں یہ ساری گفتگو درحقیقت اس کے اندر احساسِ ذمے داری کو جگانے کے لیے کر رہا تھا۔

''اوں......'' میں نے ایک لمحہ سوچنے کی اداکاری کی پھر کہا۔ ''تمہاری تجویز تو بری نہیں ہے مگر اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔ اگر تم میری یہ شرط ماننے کے لیے تیار ہو جاؤ تو میں اپنی فیس ادھار کرلوں گا۔''

''جی بتائیں۔'' وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی کیا شرط ہے؟''

''یہ ایک ایسی شرط ہے کہ جس کے ماننے سے تمہاری جیب میں خود بخود پیسے آنے لگیں گے۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''پھر تم کسی سے یہ نہیں کہہ سکو گے کہ تم ایک مفلس اور کنگلے انسان ہو۔''

اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''ایسا کون سا کام ہے۔ میرا مطلب ہے...... ایسی کون سی شرط ہے۔''

''تم آج کے بعد اپنے بوڑھے باپ کا ہاتھ بٹاؤ گے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''امداد علی کو اس وقت تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اس بے چارے نے ساری زندگی محنت مشقت کر کے تمہیں پالا پوسا ہے، تمہیں جوان کیا ہے۔ اس کے بدلے میں تم نے اسے کیا دیا ہے؟ کچھ بھی نہیں......'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے

ہوئے کہا۔

''تم نے اس غریب کے ارمانوں کے شیش محل کو چکنا چور کر دیا ہے۔ اس کی خواہش اور کوشش کے نتیجے میں اگر تم پڑھ لکھ کر اس معاشرے کے ایک مفید انسان بن جاتے تو اس بیچارے کے خوابوں کو تعبیر مل جاتی۔ یاد رکھو، جو لوگ اپنے والدین کو ناخوش رکھتے ہیں انہیں دنیا اور آخرت میں کبھی فلاح نہیں ملتی اور اگر کسی شخص کا باپ اس سے ناراض ہے تو خدا بھی اس شخص سے خفا ہو جاتا ہے۔''

وہ حیرت اور بے یقینی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا پھر اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ ''آپ وکیل صاحب ہیں یا کوئی مولوی......؟''

''ارے نہیں بھئی...... انہیں تو اپنے جھگڑوں سے فرصت نہیں۔''

مراد علی حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر میرے خاموش ہونے پر اس نے کہا۔ ''وکیل صاحب! آپ تو زبردست انسان ہیں۔ میں بہت متاثر ہوا ہوں۔''

''گویا تم میری بات ماننے کے لیے تیار ہو؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی، میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''میں تم سے اس امر کی تصدیق چاہ رہا تھا کہ میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کل سے تم اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے اس کے گیراج جایا کرو گے۔''

''وکیل صاحب......!'' وہ ہچکچاہٹ بھرے انداز میں بولا۔ ''میں کام کرنے کے لیے تو تیار ہوں لیکن موٹر مکینکی نہیں کروں گا۔''

''کیوں......!'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اس کام میں کیا خرابی ہے؟''

''اس کام میں ہاتھ، منہ اور کپڑے سب......''

''کالے ہو جاتے ہیں؟'' میں نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ ''تم یہی کہنا چاہ رہے ہو نا؟''

''جی......'' وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔ ''آپ نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔''

''او کے!'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اگر تمہیں یہ کام پسند نہیں تو رہنے دو۔ میں تمہارے لیے کچھ اور بندوبست کرتا ہوں۔''

''اور بندوبست کیا؟'' وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''مجھے سوچنے دو۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''چند روز بعد بتاؤں گا۔''

''بہت مہربانی جناب کی۔'' وہ احسان بھری نگاہ سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہارا کوئی کانٹیکٹ نمبر ہے؟''

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''ٹھیک ہے مراد علی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم تین چار دن کے بعد میرے دفتر چکر لگانا۔ میں تمہارے لیے کوئی صاف ستھری اور ڈھنگ کی مصروفیت تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

اس نے تہ دل سے میرا شکریہ ادا کیا پھر پُرجوش انداز میں مصافحہ کرنے کے بعد رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

غریب آباد کا علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ ایک روز آفس سے واپسی پر میں سلمٰی کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اگرچہ وہاں اکثر میرا آنا جانا نہیں ہوتا تھا تاہم میں اس علاقے کے گلی کوچوں سے بخوبی واقف تھا لہٰذا سلمٰی اینڈ کمپنی کا گھر تلاش کرنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ویسے مراد علی نے اتنی تفصیل سے اس کے گھر کا ایڈریس سمجھا دیا تھا کہ کسی دشواری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مراد علی خود بھی ایک گلی چھوڑ کر اسی محلے میں رہتا تھا۔

سلمٰی کے گھر کے باہر پرانے ماڈل کی ایک گاڑی کھڑی تھی۔ میں نے اپنی کار اس سے تھوڑے فاصلے پر پارک کر دی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ پرانے ماڈل کی گاڑی وصی شاہ کی ہو سکتی تھی جس میں مراد علی کے بیان کے مطابق وہ سلمٰی کی بیٹی سحرش عرف ببلی کو اسکول لانے لے جانے کا فریضہ ادا کرتا تھا۔ اگر وہ گاڑی سلمٰی کے گھر کے سامنے موجود تھی تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وصی شاہ بھی اس وقت گھر کے اندر موجود ہوگا۔ اس علاقے میں متوسط طبقے کے لوگ رہائش پذیر تھے لہٰذا بہت کم گھروں کے سامنے گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

یہ واقعہ گزرے وقتوں کا ہے۔ اس زمانے میں آج کی طرح مختلف بینکوں نے عوام کے لیے گاڑیوں کا جمعہ بازار نہیں لگایا ہوا تھا۔ ایک تو اس وقت بینک ہی گنتی کے ہوا کرتے تھے پھر ان کی جانب سے عوام کے لیے ایسی پُرکشش آفرز بھی نہیں ہوا کرتی تھیں جیسی آج کل ہیں۔ ان دنوں تو گاڑی کا حصول اتنا آسان ہو گیا ہے کہ چاہے گھر میں آٹا ہو یا نہ ہو مگر گھر کے باہر یا اندر گاڑی دیکھنے کو

ضرور مل جائے گی۔ دنیا والے جب ہمارے ملک کی سڑکوں پر گاڑیوں کا سیلِ آب رواں دیکھتے ہیں تو حیرت سے یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ...... ایسے ہوتے ہیں غریب ملک؟ اس زمانے میں گاڑی اسی شخص کے پاس ہوتی تھی جو گاڑی رکھنا افورڈ کرتا تھا۔ آج کل معاملہ اس کے برعکس ہے۔

میں نے سلمٰی کے گھر کی دوڑ بیل بجائی تو چند لمحات میں دروازہ کھل گیا اور ایک سانڈ نما کالا کلوٹا شخص میری نگاہ میں اجاگر ہو گیا۔ میرے ذہن نے پکارا، یہ وصی شاہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

اس قوی الجثہ، سیاہ صورت شخص نے پتلون اور شرٹ پہن رکھی تھی اور اس کی تیاری سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کہیں جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پینتالیس اور پچاس کے درمیان لگایا۔ اس کے سر کے سامنے والے حصے کے بال اڑ چکے تھے اور آنکھوں میں وحشت کی سرخی پائی جاتی تھی۔ میرا سرتاپا، بغور جائزہ لینے کے بعد وہ سخت آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

''جی...... فرمایئے؟''

میں نے فرمایا۔ ''کیا سلمٰی اسی گھر میں رہتی ہیں؟''

''جی، رہتی ہیں۔'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی پھر پوچھا۔ ''آپ کو سلمٰی سے کیا کام ہے؟''

''سوری...... کام تو میں انہی کو بتاؤں گا۔'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ اس وقت گھر پر موجود ہیں؟''

دروازے کے بیچوں بیچ ایستادہ اس جنگلی ریچھ نے گھور کر میرے چہرے کا جائزہ لیا اور مجھے اس کی آنکھوں میں ایسے تاثرات دکھائی دیے جیسے وہ مجھے دروازے سے ہی چلتا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو لیکن اسی لمحے گھر کے اندر سے ایک زنانہ آواز ابھری۔

''وصی! کون ہے باہر......؟''

میری معلومات کے مطابق اس گھر میں ببلی کی ماں صرف ایک عورت یعنی سلمٰی ہی رہتی تھی لہٰذا اس امر میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں ہونا چاہیے تھی کہ وصی شاہ سے استفسار کرنے والی وہ عورت سلمٰی ہی تھی۔

''کوئی تمہیں پوچھ رہا ہے۔'' اس گینڈے نے جھلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''آ کر خود ہی دیکھ لو کون ہے......''

سلمٰی کے سوال کے جواب میں اس کالے بھجنگ شخص نے جو کچھ کہا وہ اس بات کی تصدیق تھا کہ سلمٰی گھر کے اندر موجود تھی۔ سلمٰی نے جس انداز میں وصی کو مخاطب کیا تھا اس سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ایک لمحے کی دیر بھی نہ لگی کہ ان دونوں کے بیچ بڑی خطرناک نوعیت کی بے تکلفی پائی جاتی تھی، ان دونوں کے مابین ''آپ جناب'' والی کوئی اخلاقیات نظر نہیں آتی تھیں۔ ابھی انہوں نے جس انداز میں گفتگو فرمائی تھی اس طور تو ایک دوسرے سے اکتائے ہوئے میاں بیوی آپس میں بات کرتے ہیں۔

اگلے ہی لمحے وصی دروازے کے فریم سے ہٹا اور اسی فریم میں آ کر سلمٰی سج گئی۔

وہ خاصی بنی سنوری نظر آتی تھی۔ بھرا بھرا جسم جسے مائل بہ فربہی بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے چہرے سے خاص قسم کی تنک مزاجی جھلکتی تھی۔ وہ اس وقت ایک قیمتی ساڑی میں ملبوس تھی اور چہرے پر تھوپے ہوئے بے دریغ میک اپ سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی تقریب وغیرہ میں جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس کی عمر پچاس کے اریب قریب محسوس ہوتی تھی تاہم اس نے خود کو پچیس کا ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا تھا۔ یہ تمام تر تجزیہ میں نے ایک نظر میں کر لیا تھا۔

میں آج سلمٰی سے پہلی مرتبہ مل رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک اور رویے میں اپنائیت کی جھلک دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ مجھ سے ہم کلام ہونے سے پہلے اس نے میرے عقب میں میری کار کو ستائشی نگاہ سے دیکھا پھر بڑے معنی خیز انداز میں زیرِ لب مسکرائی اور لگاوٹ سے بولی۔

''معاف کیجیے گا، میں نے آپ کو پہچانا نہیں......''

اخلاقیات کے تقاضے کے پیشِ نظر کہنا تو نہیں چاہیے لیکن کہے بغیر بات بھی نہیں بنے گی کہ سلمٰی کے اخلاص، مسکراہٹ اور رویّے میں مجھے بازاری پن سا محسوس ہوا تھا چنانچہ میں نے اسی کے لیول پر بات کرنے کا فیصلہ کیا اور کہا۔

''ارے، آپ پہچانیں گی کیسے۔ ہم زندگی میں آج پہلی مرتبہ تو مل رہے ہیں......''

یہ بات میں نے دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ کہی تھی۔ میرے اس انداز نے اسے خاصا حوصلہ دیا۔ وہ میرے لیے گھر میں داخل ہونے کا راستہ چھوڑتے ہوئے بولی۔

''آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں تو باہر کیوں کھڑے ہیں؟''

''جب تک آپ اندر آنے کو نہیں کہیں گی، میں گھر میں داخل ہونے کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں۔'' میں نے بہ دستور مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''ورنہ آپ نے

اگر ''چور چور'' کا نعرہ لگا دیا تو میں عزت دار بندہ دو منٹ سے پہلے دو کوڑی کا ہو کر رہ جاؤں گا۔''

''ارے، ارے...... ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''میں چوروں اور ڈاکوؤں کو ایک نظر میں پہچان لیتی ہوں۔ آپ ایک معزز شخص نظر آتے ہیں...... اندر تشریف لے آئیں۔''

چند لمحات کے بعد میں سلمٰی کے سامنے اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کالا بھینسا وصی شاہ بھی ہمارے پیچھے چلا آیا تھا۔ سلمٰی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''وصی! بس، میں ذرا ان سے بات کرلوں۔ پھر ہم چلتے ہیں۔''

وصی شاہ نے جواب دینے سے پہلے گھور کر مجھے دیکھا پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں باہر گاڑی میں بیٹھا ہوں۔ تم جلدی سے فارغ ہو جاؤ۔ ہمیں پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔''

وصی شاہ کے جانے کے بعد میں نے دانستہ سلمٰی کے ایک چٹکی کاٹی۔ ''یہ آپ کے میاں تو بہت غصے والے ہیں......''

''یہ میرے میاں نہیں ہیں۔'' اس کے چہرے پر کچھ اس نوعیت کے تاثرات ابھرے جیسے اس نے کوئی کڑوی شے چبالی ہو۔

''میاں نہیں ہیں، کیا مطلب؟'' میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''مطلب وہی ہے جو میں نے کہا۔''

''او کے۔ اگر یہ آپ کے میاں نہیں ہیں تو پھر؟''

''ہمارے دور کے ایک رشتے دار ہیں بلکہ ہمارے بھی کیا، یہ میرے میاں کے ایک دور کے رشتے دار ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

''اوہ...... تو یہ بات ہے۔'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

''قدرت نے پتا نہیں، ہمارے کن گناہوں کی سزا کے طور پر اس بندے کو ہم پر مسلط کر دیا ہے۔'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''جانے کب اس سے جان چھوٹے گی۔''

''واقعی......'' میں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہی صورت حال ہے تو پھر آپ تو بڑے عذاب میں ہوں گی۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک ذاتی سا سوال کروں؟''

میں سلمٰی کے لیے اجنبی تھا۔ اصولی طور پر تو میرے بارے میں تسلی کرنے کے بعد ہی مجھے گھر کے اندر آنے کی اجازت ہونا چاہیے تھی اور گھر میں بٹھانے کے بعد بھی ٹو دی پوائنٹ بات ہونا چاہیے تھی مگر ہمارے بیچ ابھی تک کوئی بھی اہم یا ڈھنگ کی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں بھی کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ سلمٰی کا شمار ان عورتوں میں ہوتا تھا جو بغیر کسی موضوع کے، کسی بھی اجنبی کے ساتھ گھنٹوں خوش دلی سے گپیں لگا سکتی تھیں اور اس کا یہ وصف یا یہ عادت کسی بھی طور مستحسن یا قابلِ تعریف نہیں تھا۔

''جی ضرور!'' میرے استفسار کے جواب میں وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

''آپ کے میاں کہاں ہوتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''جو یہ شخص اتنی دیدہ دلیری سے آپ کے اوپر مسلط ہو گیا ہے۔''

''میرے میاں اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔'' وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔''

''اس واقعے کو تو برسوں گزر گئے ہیں۔'' وہ سادگی سے بولی پھر شاید اسے خیال آگیا کہ میری آمد کا سبب جاننا بھی ایک ضروری کام ہے۔ ''اوہ، آپ بھی کن دکھی معاملات میں الجھ گئے۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''آپ نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کرایا۔''

''مجھے امجد کہتے ہیں...... امجد بیگ۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک وکیل ہوں۔''

''اچھا جی۔'' میرے منہ سے وکیل کا لفظ سنتے ہی وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور محتاط لہجے میں کہا۔ ''وکیل صاحب! اب آپ یہ بھی بتا دیں کہ مجھے کیسے جانتے ہیں اور مجھ سے ملاقات کا سبب کیا ہے...... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''

اس نے ایک ہی سانس میں جتنے سوالات داغ دیے تھے اور وہ بھی ایک ترتیب کے ساتھ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ سلمٰی خاصی حاضر دماغ اور تیز طرار عورت تھی۔

''مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اسی لیے میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔''

''ہمدردی......'' اس نے شک زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ''کیسی ہمدردی اور کیوں؟''

''میں آپ کو قانونی چکروں اور عدالتی بکھیڑوں سے بچانا چاہتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''سوچا، جو معاملہ گھر میں نمٹایا جاسکتا ہے اسے عدالت میں لے جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''آپ کی باتیں میرے اوپر سے گزر رہی ہیں وکیل صاحب۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ''میں کسی قانونی چکر میں کیوں پڑوں گی۔ میں نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا جو مجھے عدالت تک جانا پڑے......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک آسودہ سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''بتائیں، ایسا کون ہے جو مجھے عدالت کی سیر کرانا چاہتا ہے اور کیوں......؟''

''وہ جو کوئی بھی ہے آپ اسے اچھی طرح جانتی ہیں۔'' میں نے اس کا ذہن پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اگرچہ وہ میری بات سن کر پریشان یا خوف زدہ نہیں ہوئی تھی تاہم اس کے انداز میں وہ پہلے والی بے پروائی بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

''مگر وہ ہے کون؟''

''وہ آپ ہی کے محلے میں رہتا ہے۔'' میں نے اس کے اضطراب سے کھیلتے ہوئے کہا۔ ''اسی نے مجھے آپ کے گھر کا ایڈریس دیا ہے۔''

''اس کا کوئی نام تو ہوگا۔'' وہ قدرے زچ ہوتے ہوئے بولی۔ ''آپ اتنی رازداری کیوں برت رہے ہیں۔ کھل کر بتائیں، کون محلے دار مجھ سے دشمنی کے بارے میں سوچ رہا ہے؟''

''اس کا نام ہے مراد علی!'' میں نے سنسنی خیز لہجے میں بتایا۔

''اوہ......'' اس کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوگئیں۔ ''آپ کہیں اس لڑکے کا ذکر تو نہیں کررہے جو امداد علی موٹر مکینک کا بیٹا ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک جگہ پہنچ گئی ہیں۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

''وہ لفنگا......'' سلمٰی نے نفرت آمیز انداز میں کہا۔ ''اس کمینے نے آپ کو میرے گھر کیوں بھیجا ہے؟''

''آپ کے ردعمل سے تو یہی ظاہر ہورہا ہے کہ آپ اس سے سخت خفا ہیں۔'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''خفا......'' وہ پھنکار سے مشابہ آواز میں بولی۔ ''وکیل صاحب! یہ تو بہت چھوٹا سا لفظ ہے۔ اگر میرا بس چلے تو میں اس مردود کی گردن ہی دبادوں۔''

''اوہ!'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''تو آپ لوگوں کے معاملات اس حد تک بگڑے ہوئے ہیں۔''

''آپ کے تصور سے بھی زیادہ وکیل صاحب۔'' وہ ایک خاص ادا سے بولی۔ ''میں تو اسے پولیس کے حوالے کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ الٹا اس نے آپ کو میرے پاس بھیج دیا۔ اس کے پیٹ میں کس قسم کا مروڑ اٹھا ہے، یہ تو بتادیں......؟''

میں ایک مخصوص ذہن کے ساتھ سلمٰی سے ملاقات کرنے آیا تھا۔ سلمٰی سے کس نوعیت کی بات چیت کرنا ہے، یہ سب میں نے طے کررکھا تھا۔ مراد علی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے میں نے جو منصوبہ بندی کی تھی، اس کے تین حصے تھے۔ ایک حصے پر میں اس وقت عمل کررہا تھا۔ دوسرا اسٹیشن مراد علی کے ساتھ کرنا تھا اور تیسرے حصے میں مجھے اپنے پڑوسی قدوس صاحب سے ایک سنجیدہ میٹنگ کرنا تھی۔ یہ ایک، تین ایکٹ کا پلے تھا جس کے اینڈ پر مراد علی کے مسئلے کو لازمی حل ہوجانا تھا۔

''سلمٰی جی!'' میں نے اس کے سوال کے جواب میں اسے گہری سنجیدگی سے مخاطب کرتے ہوئے بتایا۔ ''وہ میرے پاس آپ کی شکایت لے کر آیا تھا۔''

''میری شکایت لے کر؟'' وہ منہ بگاڑ کر قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔

''جی، میں آپ سے غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔''

''یہ تو الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے والی بات ہوگئی۔'' اس کی آواز سے غصہ ٹپکتا تھا۔ ''ناک میں اس نے ہمارا دم کر رکھا ہے اور شکایت بھی ہمارے خلاف...... یہ کیسی اندھیر نگری ہے وکیل صاحب؟''

اس نے مجھ سے سوال کیا تھا تو جواب دینا بھی ضروری تھا۔ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ''جو حقیقت تھی وہ میں نے آپ کو بتادی۔''

''آپ کیا تھانے دار لگے ہوئے ہیں۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''جو وہ میری کمپلین لے کر آپ کے پاس پہنچ گیا۔''

''میں تھانے دار نہیں، ایک وکیل ہوں۔'' میں نے متحمل انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اور 'شکایت' کا لفظ تو میں نے محض آپ کو سمجھانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ درحقیقت، وہ باقاعدہ مقدمے کا ارادہ رکھتا ہے۔''

''مقدمہ...... آپ بھی کیسی باتیں کررہے ہیں وکیل صاحب۔'' وہ غیریقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اور وہ

بھی میرے خلاف......؟''

''آپ کے خلاف نہیں......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''پھر......؟'' اس کی الجھن دوچند ہوگئی۔ ''ابھی تو آپ نے کہا تھا، وہ میری شکایت لے کر آپ کے پاس آیا تھا اور اسی نے آپ کو میرے گھر بھیجا ہے؟''

''جی، میں نے آپ سے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا۔'' میں نے بڑی رسان کے ساتھ جواب دیا۔ ''دراصل، مراد کو آپ کے اس عزیز سے کوئی مسئلہ ہے جو ابھی یہاں سے گیا ہے۔ وہ اسی شخص پر مقدمہ کرنا چاہتا ہے۔''

''اوہ...... آپ کا مطلب ہے، وصی شاہ پر۔'' وہ ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولی۔ ''وصی نے اس کی کون سی بھینس چرالی ہے؟''

''بھینس چرائی ہے یا بکری، یہ تو میں نہیں جانتا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''بہرحال، وہ میرے توسط سے وصی شاہ کے خلاف مقدمہ دائر کرنا چاہتا ہے۔''

میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سلمٰی کے ذہن کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ یہ تو مجھے بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ سلمٰی کا شمار ان عورتوں میں ہوتا تھا جو مردوں کو گھیرنے اور ان کی جیبیں خالی کرانے کی ماہر ہوتی ہیں۔ مجھے اس کے کردار یا پیشے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں تو محض اس مقصد سے یہاں آیا تھا کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی سلامت رہے۔ میں صرف اور صرف یہ چاہتا تھا کہ مراد علی، وصی شاہ کے شر سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوجائے اور یہاں آمد کا مقصد سلمٰی کو یہ باور بھی کرانا تھا کہ مراد کوئی لاوارث یا بے یارومددگار نہیں کہ اس کے ساتھ یہ لوگ جو چاہیں، وہ سلوک کرتے پھریں۔

''اس نے شکل دیکھی ہے اپنی مقدمہ کرنے والی۔'' وہ تمسخرانہ انداز میں بولی۔ ''جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں اور چلا ہے مقدمہ کرنے......'' لمحاتی توقف کرنے کے بعد اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''وکیل صاحب! آپ بھی کس احمق کی باتوں میں آگئے......؟''

''میں ایک پیشہ ور وکیل ہوں اور اپنے پاس آنے والوں کی بات کو پوری توجہ سے سنتا ہوں۔ یہ سب میرے فرائض کا حصہ ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مجھے اپنی کہانی سنانے والا وہ شخص احمق ہے یا دانشور...... البتہ'' میں نے ڈرامائی توقف کرکے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

''کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے میں اپنے طور پر اس شخص کی بیان کردہ کہانی کے سلسلے میں تھوڑی تحقیق اور تفتیش ضرور کرتا ہوں۔ اگر کوئی شخص غلط بیانی کا سہارا لے کر میری خدمات حاصل کرنے کی کوشش کررہا ہوتا ہے تو میں دوٹوک الفاظ میں اس سے معذرت کرلیتا ہوں۔ میں اسی سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں تاکہ مراد علی کا کیس پکڑنے سے پہلے میں اپنی تسلی کرلوں۔''

یہ ساری باتیں میں نے سلمٰی کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کی تھیں ورنہ وکالت میں اس نوعیت کی تسلیوں کی کوئی گنجائش نہیں کہ کوئی وکیل کیس پکڑنے سے پہلے اپنے موکل کا شجرۂ نسب کھودنے میں لگ جائے۔ سلمٰی کا اعتماد حاصل کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ اس طرح اسے اپنے ڈھب پر لانے میں مجھے آسانی ہوجاتی اور میں ذہن میں جو منصوبہ لے کر اس کے پاس آیا تھا اس میں کامیابی کے امکانات بڑھ جاتے اور...... یہ دیکھ کر مجھے خوشی اور اطمینان ہورہا تھا کہ میری باتوں نے اس پر خاطرخواہ اثر کیا تھا۔

''آپ تو بہت ہی اصول پرست وکیل ہیں!'' اس نے ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی بالکل......'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اگر کوئی وکیل اصول پسند نہیں ہوگا تو وہ قانون کا احترام کرنا بھی نہیں جانتا ہوگا اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنے کلائنٹ کو انصاف دلوانے کی صلاحیت سے بھی پیدل ہوگا۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب۔'' وہ تعریفی انداز میں بولی پھر پوچھا۔ ''یہ تو بتائیں، اس بدمعاش نے آپ کو کیا کہانی سنائی ہے؟''

ہزار نفرت کے باوجود بھی وہ مراد علی کے معاملے میں خاصی دلچسپی لے رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بتایا۔

''مراد کا دعویٰ ہے کہ وہ آپ کی بیٹی بلی سے سچی محبت کرتا ہے۔ بلی بھی پہلے اس کی طرف مائل تھی لیکن پھر آپ نے بلی کو اس کے خلاف بھڑکا دیا اور اس کی وجہ یہ شخص وصی شاہ ہے۔''

''وہ مراد نہیں بلکہ نامراد ہے۔'' وہ پھٹ پڑی۔ ''ذلیل انسان سراسر بکواس کرتا ہے۔ اس نے آپ کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلی بہت ہی شریف اور تمیزدار

لڑکی ہے۔ وہ مراد جیسے لفنگوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی روادار نہیں کجا یہ کہ وہ اس کی طرف مائل ہو جائے۔ یہی بدمعاش ہاتھ دھو کر میری بچی کے پیچھے پڑا ہوا ہے......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھمی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''آپ نے اپنا نام کیا بتایا تھا......؟''

اس کا یہ سوال سیاق وسباق سے لگا نہیں کھاتا تھا تاہم میں نے متحمل لہجے میں جواب دیا۔

''امجد بیگ......مرزا امجد بیگ۔''

''کیا میں آپ کو صرف بیگ صاحب کہہ سکتی ہوں؟''

''جی ضرور۔'' میں نے اسے اجازت دے دی۔

''بیگ صاحب!'' وہ بڑی اپنائیت سے بولی۔ ''ہم اس آوارہ لڑکے کی وجہ سے سخت پریشان ہیں۔ یہ اسکول آتے جاتے بلی کا تعاقب کرتا ہے اور اس پر گھٹیا جملے پھینکتا ہے۔ عامیانہ انداز میں محبت کا اظہار کرتا ہے۔ وصی شاہ نے تو محض اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور یہ وصی پر مقدمہ کرنا چاہتا ہے۔ بیگ صاحب! آپ نے یہ نہیں بتایا کہ مراد کس نوعیت کا مقدمہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟''

میں نے پہلے بھی دانستہ سلمٰی کے اس سوال کا جواب نہیں دیا تھا اور اس مرتبہ بھی یہ ذکر گول کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس کا خیال ہے کہ آپ اچھے کردار کی عورت نہیں ہیں اور بلی کو بھی اپنی لائن پر لانے کی کوشش کر رہی ہیں جبکہ مراد کو بلی سے محبت ہے۔ وہ اس کی خیر خواہی چاہتا ہے اور......''

''اس بدذات نے اپنی ماں کے کردار کو بھی ناپنے کی کوشش کی ہے جو میرے کردار پر انگلی اٹھا رہا ہے۔'' وہ تڑخ کر بولی۔ ''اور اس نے میرے سامنے یہ بات کی ہوتی تو میں گدی سے اس کی زبان کھینچ لیتی۔''

اسی لمحے باہر گلی میں گاڑی کے ہارن کی آواز ابھری۔ یہ یقیناً وصی شاہ کی حرکت تھی جو گاڑی میں بیٹھا سلمٰی کا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے سلمٰی سے پوچھا۔ ''آپ کی بیٹی بلی اس وقت گھر میں دکھائی نہیں دے رہیں۔ کیا وہ کہیں گئی ہوئی ہیں؟''

''بلی کی ایک دوست کی آج رخصتی ہے۔'' وہ خفگی بھرے انداز میں بولی۔ ''وہ گزشتہ رات سے اپنی اسی دوست کے گھر میں ہے۔ ہم لوگ بھی ابھی شادی ہال کی طرف ہی جا رہے تھے کہ آپ آ گئے۔''

''اس کا مطلب ہے، میں بہت غلط وقت پر آیا ہوں۔'' میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''میری باتوں نے خوامخواہ آپ کا موڈ خراب کر دیا حالانکہ آپ تو خوشی کی ایک تقریب میں شرکت کرنے جا رہے تھے......''

''کوئی بات نہیں بیگ صاحب! خوشی اور غمی تو زندگی کا حصہ ہے۔ آپ کو معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ سرسری انداز میں بولی پھر سوال کیا۔ ''آپ مجھے مراد کے حوالے سے کچھ بتا رہے تھے......''

''جی، میں آپ کو بتا رہا تھا کہ......'' میں نے منقطع سلسلۂ کلام کو جوڑتے ہوئے کہا۔ ''مراد کا خیال ہے کہ وصی شاہ کی آمد کے بعد بلی اس سے دور ہو گئی ہے۔ آپ بلی کو وصی شاہ کے ہاتھ فروخت کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں اور وصی شاہ، مراد کو ڈرا دھمکا کر بلی سے دور کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''جھوٹ بولتا ہے وہ، بکواس کرتا ہے۔'' وہ زہرخند لہجے میں بولی۔ ''میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ وصی شاہ، بلی کے باپ کا دور کا رشتے دار ہے اور ہمارے گھر میں بس اس کا آنا جانا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''

''کیا یہ بھی غلط ہے کہ وصی شاہ نے مراد کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی تھی۔'' میں نے اپنے مقصد کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''ایک مرتبہ وصی شاہ نے اپنی گاڑی مراد پر چڑھا کر اس کی جان لینے کی کوشش کی، دوسری بار پستول دکھا کر قتل کی دھمکی دی، تیسری دفعہ پولیس والوں کو اس کے پیچھے لگا دیا جو دن رات اسے پریشان کرتے رہتے ہیں اور جب اس پر بھی وصی شاہ کی تسلی نہ ہوئی تو اس نے کرائے کے غنڈوں کو مراد کی جان لینے پر مامور کر دیا......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے سلمٰی کی آنکھوں میں دیکھا پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''وصی شاہ کی یہ تمام تر خطرناک کارروائیاں محض اس لیے ہیں کہ مراد اپنے دل سے بلی کے خیال کو نکال دے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''میں آپ کو غلط سمجھ ہی نہیں سکتی بیگ صاحب لیکن......''

ایک بار پھر گھر کے باہر گلی میں گاڑی کے ہارن کی آواز گونجی تو سلمٰی کو اپنی بات ادھوری چھوڑنا پڑی اور وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ایک منٹ بیگ صاحب! میں ذرا وصی کو تسلی دے دوں۔''

بات ختم کرتے ہی وہ اٹھی اور ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی۔ اگلے ہی لمحے اس کی تیز خفگی بھری آواز میری

سماعت سے ٹکرائی۔ وہ وصی شاہ سے مخاطب تھی۔

''دس منٹ رک جاؤ۔ بس، میں ایک اہم معاملہ نمٹا کرابھی آرہی ہوں۔''

چند لمحات کے بعد وہ دوبارہ ڈرائنگ روم میں وارد ہوئی پھر میرے قریب ہی ایک صوفے میں دھنستے ہوئے بولی۔ ''بیگ صاحب! آپ ایک سمجھدار اور سلجھے ہوئے انسان ہیں۔ مراد کی بکواس کی کوئی اہمیت نہیں۔ آپ کو اس کی بات پر دھیان نہیں دینا چاہیے۔''

''دھیان دینا تو میرے پیشے کا تقاضا ہے سلمٰی جی۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''جب تک میں آپ کی اور مراد کی باتوں پر دھیان نہیں دوں گا، مجھے کھرے کھوٹے کی پہچان کس طرح ہو سکے گی؟''

''بس تو پھر آپ میری بات کا یقین کرلیں۔'' وہ محبت پاش نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مراد جھوٹا، عیار اور کھوٹا شخص ہے جبکہ میں سو فیصد کھری بات کر رہی ہوں۔ مراد کی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہاں، یہ میں تسلیم کرتی ہوں کہ وصی نے اسے سخت الفاظ میں سمجھانے کی کوشش ضرور کی تھی کہ وہ ببلی کا پیچھا چھوڑ دے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ورنہ وصی شاہ کے لیے مراد جیسے لچے لفنگے لڑکے کو سیدھا کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس کام کے لیے اسے دھمکی دینے یا مراد کے پیچھے غنڈے لگانے کی کوئی ضرورت نہیں......''

''آپ کا مطلب ہے کہ وصی شاہ خاصا خطرناک شخص ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گئی پھر جلدی سے بولی۔ ''آپ میری بات کا غلط مطلب نہ لیں بیگ صاحب! دراصل...... میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ...... وصی شاہ بڑا باکمال اور...... ہنرمند شخص ہے۔''

''ہنرمند...... باکمال......'' میں نے اسی کے الفاظ دہرائے پھر پوچھا۔ ''آپ وصی شاہ کو کن معنوں میں ان بیان کردہ اوصاف کا اہل سمجھتی ہیں؟''

''بیگ صاحب! وصی شاہ بہت بڑا نجومی ہے۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔

''پھر؟'' میں نے بڑی معصومیت سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ ستاروں کی چالیں دیکھ کر ہر شخص کے بارے میں بالکل درست حساب کتاب کرتا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اور میں نے اس سے بڑا عامل آج تک نہیں دیکھا۔ اگر وہ مراد کو کوئی خطرناک سبق سکھانے کا فیصلہ کرلے تو اس کا ایک عمل......''

اس نے ڈرامائی انداز میں اپنی بات نامکمل چھوڑی تو میں نے بڑی سرعت سے سوال کیا۔ ''اس کا ایک عمل کیا؟''

''اس کا ایک عمل مراد کو خون کی الٹیاں کرنے پر مجبور کرسکتا ہے۔'' وہ سراسیمہ لہجے میں بولی۔ ''اور وہ کمبخت خون کی الٹیاں کرتے کرتے، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دے گا۔''

''اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ وصی شاہ سفلی کا ماہر ہے؟'' میں نے چہرے پر مصنوعی خوف کے تاثرات سجاتے ہوئے کہا۔

''جی بالکل...... وہ اس دنیا میں بہت پہنچ رکھتا ہے۔''

اس نے بڑے فخر سے بتایا۔

''میں نے سنا ہے کہ......'' میں نے بدستور حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔ ''ایسے خطرناک کاموں کے لیے بندے کا نام مع والدہ کی ضرورت ہوتی ہے؟''

''آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''اچھا ہوا، میں نے کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے آپ سے ملاقات کرلی۔'' میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے کہا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''اس طرح ساری حقیقت میرے علم میں تو آگئی۔''

وہ بھی میری تقلید میں کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''اگر حقیقت آپ کی آنکھوں کے سامنے کھل ہی گئی ہے تو اس احمق کو بھی سمجھانے کی کوشش کریں کہ مقدمے کا خیال ذہن سے نکال کر وہ بندے کا پتر بن جائے۔ یہی اس کے لیے بہتر ہے ورنہ خوامخواہ نقصان اٹھائے گا۔ ابھی میں نے وصی شاہ کو اس نامراد کی ایک گھٹیا حرکت کے بارے میں تو بتایا ہی نہیں......''

وہ بولتے بولتے جملہ ادھورا چھوڑ کر اچانک خاموش ہوگئی تو مجھے محسوس ہوا کہ کسی فوری خیال نے اسے آگے بولنے سے روک دیا تھا۔ اس بات نے میرے تجسس کو ہوا دی اور میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''کون سی گھٹیا حرکت؟''

''یہ کمبخت مراد ایک دن موقع پاکر میرے گھر میں گھس گیا تھا۔'' وہ سنسنی خیز انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اس وقت ببلی اسکول گئی ہوئی تھی اور وصی شاہ

بھی گھر میں موجود نہیں تھا.......''

''لیکن اس نے حرکت کیا کی، یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں؟''

''اس شیطان کی اولاد نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں، شرافت سے اس کی شادی ببلی سے کردوں ورنہ......'' وہ میرے ہمراہ ڈرائنگ روم سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔

''ورنہ کیا؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔ ''ورنہ وہ ببلی کو اغوا کرلے گا......''

مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ سلمیٰ دروغ گوئی سے کام لے رہی تھی۔ مراد کو برا آدمی ثابت کرنے کے لیے اس نے من گھڑت قصہ سنایا تھا۔

میں نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ''ہاں بھئی، یہ تو واقعی بڑی نیچ حرکت ہے۔''

''اس کے باوجود بھی آپ اس گھٹیا ذہن اور نیچ آدمی کی وکالت کرنا چاہتے ہیں......؟'' وہ مجھے مراد کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''میرے پاس جو شخص بھی اپنا مسئلہ لے کر آتا ہے، میں اس کی وکالت کرتا ہوں کیونکہ وکالت میرا پیشہ ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ بھی مجھے کوئی کیس دیں گی تو میں آپ کا وکیل بن جاؤں گا۔''

''زبردست!'' وہ چونک کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''پھر آپ ابھی میرے وکیل بن جائیں......''

''کس کیس کے سلسلے میں؟'' میں نے پوچھا۔

''کیس بہت سیدھا اور سادہ ہے۔'' وہ ایک ایک بات پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''آپ کسی طرح کوشش کرکے مراد کے ذہن سے ببلی کا خیال نکال دیں۔ بس وہ میری بچی کا پیچھا چھوڑ دے۔''

سلمیٰ جس مقصد کے حصول کے لیے مجھے اپنا وکیل کرنا چاہتی تھی، وہ کام تو میں پہلے ہی کرچکا تھا بلکہ میں نے مراد کے کام میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس پر یہ شرط عائد کی تھی کہ وہ ببلی کے عشق کے بخار سے باہر نکل آئے گا اور کبھی بھول کر بھی اس کی طرف جانے کی کوشش نہیں کرے گا اور اس نے میری شرط مانتے ہوئے میری اس ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں آپ کا یہ کام کردوں گا۔'' میں نے سلمیٰ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''وہ آپ کی بیٹی ببلی کی طرف کبھی میلی نگاہ سے نہیں دیکھے گا لیکن اس کام کے لیے میں اپنی فیس وصول کروں گا۔''

''ڈن!'' وہ حتمی لہجے میں بولی۔ ''اگر آپ نے میرا یہ کام کردیا تو میں آپ کی پوری فیس ادا کروں گی۔''

''سوری سلمیٰ جی!'' میں نے محتاط انداز میں کہا۔ ''میرا اوّل روز سے یہ اصول ہے کہ میں فیس ایڈوانس لیتا ہوں۔''

''اوکے، میں آپ کو ایڈوانس فیس ہی دوں گی۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن اس وقت نہیں۔ میں کل آپ کے آفس میں آپ سے ملاقات کرنے آؤں گی۔ مجھے آپ سے اور بھی بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ اگر آپ مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دے دیں تو مجھے آسانی ہوجائے گی۔''

''جی ضرور......'' میں نے پرس میں سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے ہوشیاری سے کہا۔ ''سمجھ لیں کہ اسی وقت میں نے آپ کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے لیکن اس کیس میں کامیابی اسی صورت ممکن ہے جب آپ مجھ سے بھرپور تعاون کریں گی۔''

''مثلاً کس قسم کا تعاون؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''صرف آپ کو مجھے ایک یقین دہانی کرانا ہوگی۔'' میں نے کہا۔

اس نے پوچھا۔ ''کیسی یقین دہانی بیگ صاحب؟''

''آج اور اسی لمحے سے آپ وصی شاہ کو مراد کے خلاف کسی بھی قسم کی معاندانہ کارروائی کی اجازت نہیں دیں گی۔'' میں نے تاکیدی لہجے میں کہا۔ ''نہ مادّی اور...... نہ ہی عاملانہ قسم کی۔ آپ میری بات تو سمجھ گئی ہیں نا؟''

''جی بہت اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔'' وہ معنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ بہت ہی ذہین وکیل ہیں۔ ایک تیر سے دو شکار کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں......؟'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''مطلب یہ کہ آپ میرا کام کرنے کے ساتھ ساتھ اس نامعقول انسان کی حفاظت کا بھی بندوبست کررہے ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میں غلط تو نہیں کہہ رہی بیگ صاحب؟''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ مراد کا حق بھی بنتا ہے۔ اگر میں نے آپ کی وکالت کرتے ہوئے مراد کو کسی قسم کی مقدمے بازی سے باز رکھنے کی کوشش کے ساتھ ہی اس امر کو بھی یقینی بنانا ہے کہ وہ آپ کی بیٹی کا ہمیشہ کے لیے پیچھا

چھوڑ دے تو پھر اس کا تحفظ بھی ضروری ہے۔''

''مجھے منظور ہے۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ ''آپ بے فکر ہو جائیں بیگ صاحب! اگر مراد اوچھی حرکتوں سے باز آ گیا تو میں وصی شاہ کا ذمہ لیتی ہوں۔ وصی شاہ کو کیسے ہینڈل کرنا ہے، یہ میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔''

ہم باتیں کرتے ہوئے گھر کے مین دروازے تک آ گئے۔ میں نے کہا۔ ''تو یہ طے ہو گیا کہ میں نے مراد علی کو ہینڈل کرنا ہے اور آپ نے وصی شاہ کو......''

''جی بالکل، یہ ہی طے ہوا ہے۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

ہم گھر سے باہر نکلے تو میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے تو پھر مجھے اجازت دیں۔''

''آپ کی آمد بہت اچھی لگی بیگ صاحب۔'' وہ بڑی لگاوٹ سے بولی۔ ''لیکن ایک بات کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا۔''

''کس بات کا؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''آپ پہلی مرتبہ میرے گھر تشریف لائے اور کچھ کھائے پیے بغیر ہی واپس جا رہے ہیں۔'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولی۔ ''میں اپنی اس بداخلاقی کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گی۔''

''زندگی یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی سلمٰی جی۔'' میں نے زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر اللہ کو منظور ہوا تو دوبارہ بھی آپ کے گھر کا چکر لگ سکتا ہے۔ پھر آپ اپنا یہ شوق پورا کر لیجیے گا۔''

''انشاءاللہ۔'' وہ تہ دل سے بولی۔

میں نے اسے ''اللہ حافظ'' کہا پھر اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے قدم وصی شاہ کی گاڑی کی سمت اٹھ گئے جو کافی دیر سے اپنی گاڑی میں بیٹھا سلمٰی کا انتظار کر رہا تھا۔

میرے سوچے ہوئے منصوبے کا پہلا مرحلہ بخیر و خوبی بڑی کامیابی کے ساتھ طے ہو گیا تھا۔

☆☆☆

منظر میرے آفس کا تھا اور اس وقت میرے سامنے قدوس احمد بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے رسمی علیک سلیک کے بعد کہا۔

''قدوس صاحب! خیریت تو ہے نا۔ آپ میرے آفس میں؟''

''سب خیریت ہے بیگ صاحب۔'' وہ تسلی آمیز انداز میں بولا۔

''آج ایک شخص سے ملنے ادھر سٹی کورٹ کے علاقے میں آیا ہوا تھا تو سوچا آپ کو بھی سلام کرتا چلوں۔ گھر میں آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں لگتا۔ آپ ایک مصروف انسان ہیں۔''

''انسان کی مصروفیت اپنی جگہ مگر پڑوسیوں کے بہت حقوق ہوتے ہیں۔'' میں نے پُرخلوص انداز میں کہا۔ ''آپ کسی بھی وقت مجھ سے ملنے آ سکتے ہیں۔''

''آپ کی نوازش ہے۔'' وہ تشکرانہ لہجے میں بولا پھر پوچھا۔ ''اس لڑکے کا کیا بنا بیگ صاحب؟''

''کون سا لڑکا؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''بیگ صاحب! میں اس لڑکے کی بات کر رہا ہوں جو اس رات دیوار پھلانگ کر ہمارے گھر میں گھس گیا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے وہ معاملہ نمٹایا تھا اور اسے اپنے دفتر آنے کے لیے کہا تھا۔''

''اچھا وہ!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ آیا تھا اگلے روز مجھ سے ملنے اور میں نے اس کی دکھ بھری داستان بھی سنی تھی۔''

''مجھے بھی تو کچھ بتائیں۔'' وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولا پھر میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''اگر آپ کو اس میں کوئی حرج محسوس نہ ہو تو......؟''

''کوئی حرج نہیں ہے قدوس صاحب۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔

وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں قدوس احمد کو مراد علی سے ہونے والی گفتگو اور بعد ازاں سلمٰی سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتا دیا اور ظاہر ہے، اس داستان میں سحرش عرف بلی اور اس کے نام نہاد انکل وصی شاہ کا ذکر بھی آیا۔ میری بات کے اختتام پر اس نے کہا۔

''بیگ صاحب! بس اللہ معاف کرے۔ انسان کو گمراہ ہوتے دیر نہیں لگتی۔ یہ سلمٰی تو مجھے کوئی باکردار اور شریف عورت نہیں لگتی اور...... یہ عامل کامل لوگ تو مجھے ایک دم زہر محسوس ہوتے ہیں۔ پتا نہیں، کیسے کیسے الٹے سیدھے دھندوں میں لگے رہتے ہیں۔''

''میں آپ کی بات سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں قدوس صاحب۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''سلمٰی کے بارے میں میرا بھی یہی تجزیہ ہے جس نوعیت کے خیالات کا اظہار آپ نے کیا ہے اور جہاں تک وصی شاہ کا تعلق ہے تو......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''یہ لوگ اپنے اوندھے سیدھے عملیات کے دوران میں ایک تلخ حقیقت کو بالکل فراموش کر بیٹھتے ہیں۔''

''کون سی حقیقت بیگ صاحب؟'' اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

''آپ نے ان کے اکثر سلوگن سنے ہوں گے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جیسے...... سنگ دل سے سنگ دل محبوب آپ کے قدموں میں۔''

''جی ہاں، بالکل سنا ہے۔'' اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ لوگ سادہ دل افراد کو بے وقوف بناتے ہیں۔''

''آخر ان عاملوں کاملوں اور اسی قسم کے دعوے کرنے والے دیگر الو کے پٹھوں اور گدھے کے بچوں سے کوئی یہ کیوں نہیں پوچھتا کہ انہیں کس نے یہ حق دیا ہے کہ یہ کسی کی بہن یا بیٹی کو کسی کے قدموں میں جھکانے کے لیے کوئی عمل کریں۔'' میں اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ''یہ تو سیدھا سیدھا جرم بلکہ سنگین جرم ہے۔''

''اگرچہ ایسا ہونا ممکن نہیں جس قسم کے یہ لوگ دعوے کرتے ہیں لیکن پھر بھی اس مذموم کاروبار کو روکنا قانون کا فرضِ اول ہونا چاہیے۔'' قدوس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''شہر کی ہر دیوار پر ان اشتہاری عاملوں کی چاکنگ نظر آتی ہے۔ بجائے اس کے کہ ان معاشرتی ناسوروں کے خلاف قانون حرکت میں آئے، الٹا پولیس ان بدمعاشوں کو تحفظ فراہم کرتی ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ ہمارے معاشرے کا ایک المیہ ہے۔''

''میری آپ سے ایک درخواست ہے بیگ صاحب۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''حکم کریں قدوس صاحب؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ کسی طرح سمجھا بجھا کر مراد علی کو سلمٰی اور وصی شاہ کے چنگل سے نکال لیں۔'' اس نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ''مجھے وہ لڑکا بھلا لگا ہے۔ اگر وہ ان بدمعاشوں کی گردش میں پھنس گیا تو پھر کہیں کا نہیں رہے گا۔''

''بھلا تو وہ مجھے بھی لگا ہے قدوس صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''میں اسی لیے تو اس کا معاملہ سیدھا کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔''

میں نے اس کیس کو حل کرنے کے لیے جو تین اسٹیپ بنائے تھے ان میں ایک سلمٰی کے کانوں کے کیڑے جھاڑنا تھا اور یہ کام میں نے بڑی کامیابی سے مکمل کرلیا تھا۔ دوسرا مرحلہ مراد علی سے اہم ترین گفتگو کا تھا جبکہ تیسرے حصے میں مجھے قدوس احمد سے چند ضروری باتیں کرنا تھیں لیکن موجودہ صورتِ حال میں مجھے اپنے منصوبے میں تھوڑی تبدیلی کرنا پڑی مطلب یہ کہ...... قدوس کی مراد علی میں خصوصی دلچسپی کو دیکھ کر میں نے فیصلہ کرلیا کہ تیسرے حصے کو ابھی اور دوسرے مرحلے کو بعد میں نمٹانا زیادہ مناسب ہوگا۔

''اللہ آپ کو اس نیکی کا اجر دے گا۔'' قدوس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''اگر مراد کسی ٹھکانے لگ گیا تو اس کے دل سے آپ کے لیے جو دعا نکلے گی اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہوسکتا۔''

''جناب! تھوڑی سی نیکی آپ بھی کمالیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ نہیں چاہیں گے کہ مراد علی کے دل سے آپ کے لیے بھی دعا نکلے؟''

''ضرور...... کیوں نہیں۔'' وہ آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ''حکم کریں بیگ صاحب! میں مراد کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''

''اگرچہ میں نے سلمٰی کو اس بات کے لیے راضی کرلیا ہے کہ وصی شاہ اب مراد سے کسی بھی قسم کی دشمنی نہیں کرے گا اور مجھے یقین ہے کہ سلمٰی اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن مراد علی کا ذہن بٹانے کا بھی کوئی مناسب بندوبست ہونا ضروری ہے۔ اس کے دل و دماغ پر بجلی نے قبضہ جما رکھا ہے۔''

''کہہ تو آپ بالکل ٹھیک رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ''لیکن اس سلسلے میں کیا ہوسکتا ہے؟''

''مراد کی سوچ کو بجلی سے پاک کرنے کے لیے میرے ذہن میں نیک آزمودہ کار آئیڈیا ہے۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''اس آئیڈیا کو بروئے کار لانے کے لیے مجھے آپ کا تعاون درکار ہوگا۔''

''اور وہ آئیڈیا کیا ہے؟'' اس نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

''مراد کا باپ، جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں، وہ ایک موٹر مکینک ہے اور اسے اپنے بیٹے کی مدد کی اشد ضرورت ہے۔'' میں نے اپنے منصوبے سے قدوس احمد کو آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر مراد کو موٹر مکینکی پسند نہیں ہے۔ میں نے سوچا ہے، اسے کسی صاف ستھری نوکری پر لگا دیا جائے۔''

''گڈ آئیڈیا۔'' قدوس نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

''اس کے پاس تعلیم کی شدید کمی ہے ورنہ میں اسے اپنے ہی دفتر میں رکھ لیتا۔'' میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس سلسلے میں اگر آپ کا تعاون حاصل ہو جائے تو مراد کی زندگی کسی پٹری پر آجائے گی۔ اس کا ذہن کام میں مصروف ہوگا تو بلی کو بھولنے میں اسے آسانی حاصل ہو جائے گی۔''

''آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے بیگ صاحب۔'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ''ڈینسو ہال پر میری گھڑیوں کی جو دکان ہے اس میں، میں نے دو ملازم بھی رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک جانے کے لیے پر تول رہا ہے۔ میں مراد کو اپنی دکان پر رکھ سکتا ہوں۔ کام صاف ستھرا ہے اور اس کے لیے زیادہ تعلیم کی بھی ضرورت نہیں۔ اس طرح اس کی فوری آمدنی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ جب وہ مجھ سے ملنے آئے گا تو میں اسے سیدھا آپ کے پاس بھیج دوں گا۔'' میں نے اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر آپ جانیں اور آپ کا کام۔''

''آپ کو مایوسی نہیں ہوگی بیگ صاحب۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''سمجھیں کہ آپ نے اسے میرے پاس بھیجا اور...... اس کا کام ہوگیا۔''

''گڈ......!'' میں نے تعریفی نظر سے قدوس صاحب کی طرف دیکھا۔

ہمارے درمیان مزید کچھ دیر تک اس موضوع پر بات چیت ہوتی رہی پھر وہ میرے دفتر سے رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

جیسا کہ آپ کو میں بتا چکا ہوں، سلمٰی نے میرے آفس آکر فیس ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ اپنے وعدے کی پکی نکلی اور اگلے روز اس نے آفس آکر مجھ سے ملاقات کی اور میری فیس بھی ادا کر دی۔ اس روز سلمٰی سے میری جو گفتگو آفس میں ہوئی اس کا زیرِ نظر کیس سے کوئی تعلق نہیں لہٰذا میں اس کا ذکر گول کرتا ہوں۔

مراد علی کے حوالے سے میرے پاس دو خوشخبریاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وصی شاہ اور اس کے غنڈوں سے میں نے ہمیشہ کے لیے اس کی جان چھڑا دی تھی اور دوسرے اس کی ملازمت کا بھی بندوبست ہوگیا تھا۔ اگر میرے پاس مراد کا کوئی رابطہ نمبر ہوتا تو میں فوراً اسے یہ خوش خبریاں سنا دیتا۔ میں اگر چاہتا تو اس کا گھر تلاش کرنا میرے لیے چنداں مشکل نہیں تھا لیکن میں نے یہ مناسب نہ جانا اور اس کی آمد تک اپنے منصوبے کے تیسرے مرحلے کو وقتی طور پر روک دیا۔

ایک ہفتے کے بعد مجھے مراد علی کی صورت نظر آئی۔ اس وقت میں عدالت کے کمرے سے نکل کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ رہا تھا جو سٹی کورٹ کے پارکنگ لاٹ میں کھڑی تھی۔ وہ سیدھا میری ہی سمت چلا آرہا تھا۔ اس کو دیکھ کر میں رک گیا۔

وہ میرے قریب پہنچا اور بڑے احترام کے ساتھ اس نے مجھے سلام کیا۔ ''السلام علیکم بیگ صاحب!''

''وعلیکم السلام۔'' میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور پوچھا۔ ''تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

''میں ادھر ہی تھا، کراچی میں جی۔'' اس نے بتایا۔

''وصی شاہ یا اس کے غنڈے تمہیں تنگ تو نہیں کر رہے؟'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں جی۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں، وہ لوگ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ میں بہت سکون میں ہوں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ......''

اس نے ڈرامائی انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے پوچھ لیا۔ ''تمہیں کیا محسوس ہوتا ہے؟''

''جیسے آپ نے ان لوگوں پر کوئی جادو پھونک دیا ہو۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا تم مجھے کوئی جادوگر سمجھتے ہو؟'' میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں جی، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

''پھر کیا مطلب تھا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے تفریح لیتے ہوئے کہا۔ ''پہلے اس روز تم نے مجھے ''مولوی'' کہا تھا اور آج ''جادوگر'' کہہ رہے ہو......؟''

''وہ اصل بات یہ ہے کہ مجھے شدید حیرت ہوئی تھی۔'' وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''کہ...... اچانک وصی شاہ کا بخار کیسے اتر گیا۔ اب ایک تو اس سے میرا سامنا ہی نہیں ہوتا اور اگر کبھی وہ میرے روبرو آجاتا ہے تو اس نے مجھے گھورنا چھوڑ دیا ہے اور...... اب وہ یا اس کے غنڈے مجھے ہراساں بھی نہیں کر رہے۔''

''بیٹا جی! وصی شاہ کا بخار کوئی عام نوعیت کا نہیں تھا جو تم سمجھ رہے ہو کہ خود بخود ہی اتر گیا ہوگا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے لگاتار تین چار انجکشن دے کر اس کے بخار کو رخصت کیا ہے۔''

''میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں بیگ صاحب!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''آپ مولوی بھی ہیں، جادوگر بھی ہیں اور ڈاکٹر بھی......''

''بس بھائی، بہت ہوگئی میری تعریف۔'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اب جلدی سے یہ بتادو کہ اس وقت تم عدالت میں کیا کر رہے ہو؟''

''وہ جناب، میں ملنے تو آپ ہی سے آیا تھا لیکن مجھے ٹائم کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہوسکا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ اُدھر دفتر میں نہیں تھے تو میں ادھر کورٹ آگیا۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''یہ...... بس اتنی سی بات نہیں ہے مراد۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''تم ادھر آئے ہو تو میں اُدھر جارہا ہوں۔''

''مطلب، آپ ابھی دفتر جارہے ہیں؟''

''ہاں، عدالت میں میرا کام ختم ہوگیا ہے اور میں اب آفس ہی جاؤں گا لیکن لنچ کرنے کے بعد۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، آپ لنچ وغیرہ سے فارغ ہوجائیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں تھوڑی دیر میں آپ کے آفس پہنچتا ہوں۔''

''کیا تم نے لنچ کرلیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نن...... نہیں۔'' وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

''تو تم میرے ساتھ ہی چلو۔'' میں نے کہا۔ ''ایک ساتھ لنچ کرتے ہیں اور وہیں پر تم سے بات بھی ہوجائے گی۔''

''مجھے کوئی خاص بھوک نہیں ہے......'' وہ تکلف سے کام لیتے ہوئے بولا۔

''مجھے بھی عام بھوک ہی ہے، کوئی خاص نہیں...... آؤ''

میرے ''آؤ'' میں اتنی توانائی تھی کہ وہ مزید کوئی حیل وحجت نہ کرسکا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم اس ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے جہاں میں روزانہ لنچ کیا کرتا تھا۔ اس ریسٹورنٹ کے کھانوں کی تعریف میں پہلے ہی کئی مرتبہ کرچکا ہوں۔

جب میری زبانی مراد علی کو پتا چلا کہ میں نے سرتوڑ

رپورٹ

استاد شاگرد سے۔ ''تمہارے ابا نے تمہاری اسکول رپورٹ دیکھ کر کیا کہا؟''

شاگرد۔ ''سر! اگر آپ اجازت دیں تو میں اس میں سے سخت الفاظ اور گالیاں حذف کردوں؟''

استاد۔ ''اجازت ہے......''

سر۔ ''انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

محبت کی شادی

ایک دوست نے دوسرے دوست سے کہا۔ ''تمہارا کہنا ہے کہ تم جس لڑکی سے شادی کررہے ہو وہ کروڑوں کی دولت اور جائداد کی مالک تو ہے مگر نہایت بدصورت لڑکی ہے۔''

''ہاں!'' دوسرے دوست نے تائید کی۔

''اس کے باوجود تمہارا کہنا ہے کہ یہ محبت کی شادی ہے۔'' پہلے دوست نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ہاں! مجھے دولت سے محبت ہے نا!......'' دوسرے دوست نے اطمینان سے جواب دیا۔

☆......☆......☆

''بھئی وہ اپنے مرزا صاحب کا انتقال کیسے ہوا؟''

''ڈوب کر مرگئے۔''

''ارے وہ دھان پان سے تو تھے، کیا تیراکی فرمارہے تھے؟''

''نہیں بھئی! وہ تو گھر کی ٹینکی میں پانی دیکھ رہے تھے کہ بچے نے پنکھے کا رخ ان کی طرف کردیا۔''

مرسلہ۔ مرجا گل، درابن کلاں

لطیفہ

ایک کشتی میں چار ملکوں کے آدمی سفر کررہے تھے۔ امریکی، جاپانی، انڈین اور کشمیری، امریکی نے جلدی سے اپنی شراب کی بوتل سمندر میں پھینک دی اور فخر سے بتایا کہ ہمارے ملک میں یہ بہت پائی جاتی ہے۔ جاپانی نے جلدی سے اپنی گھڑی اتار کر پھینک دی اور بولا ہمارے ملک میں یہ بہت پائی جاتی ہیں۔ کشمیری نے جلدی سے انڈین کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا اور فخر سے بولا کہ ہمارے ملک میں یہ بہت پائے جاتے ہیں۔

مرسلہ۔ اسرار ساقی، ڈسٹرکٹ جیل اٹک

کوششیں کر کے سلمٰی اور وصی شاہ کو اس سے دشمنی کرنے سے روک دیا ہے تو وہ احسان بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ اس احسان مندی میں حیرت کا عنصر بھی نمایاں تھا۔

''آپ کی ان لوگوں کے ساتھ کیا باتیں ہوئی ہیں؟'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

''بہت سی باتیں ہوئی ہیں۔'' میں نے اپنے منصوبے کے تیسرے اور آخری حصے پر عمل کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہارے حوالے سے ان پر بہت کچھ واضح کر دیا ہے۔''

''اوہ شکریہ بیگ صاحب۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''آپ کی بہت مہربانی ہے۔''

''میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ اگر تمہارا بال بھی بانکا ہوا تو میں ان دونوں کو عدالت میں گھسیٹ لوں گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ تمہیں کوئی کمزور اور لاوارث انسان نہ سمجھیں۔''

''زبردست......'' وہ پُرجوش انداز میں بولا۔ ''آپ نے تو کمال کر دیا۔ جبھی میں کہوں کہ وصی شاہ مجھ پر اتنا مہربان کیسے ہو گیا۔ تو...... یہ سب آپ کی کارروائی کا نتیجہ تھا۔''

''ہاں......'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ فرطِ جذبات میں آ کر تم ہاتھ ہی روک لو......''

''جی......'' وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''میں سمجھا نہیں جناب۔ میں نے کہاں اپنے ہاتھوں کو روکا ہے؟''

''اس وقت ہم کون سا کام کر رہے ہیں؟''

''کھانا کھا رہے ہیں......'' اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔

''بس اسی کام سے تم نے ہاتھ روک لیا ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''باتیں تو چل ہی رہی ہیں، کھانے کا عمل بھی جاری رہنا چاہیے۔''

''جی ضرور......'' وہ کھسیاہٹ بھرے انداز میں بولا۔ پھر کھانے کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کے کس کس احسان کا بدلہ چکاؤں گا بیگ صاحب۔''

اس نے آخری جملہ پوری سچائی اور دل کی گہرائی سے ادا کیا تھا لہٰذا میں نے بھی سنجیدگی سے کہا۔ ''مراد! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔''

وہ ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''جی، بتائیں۔''

میں نے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ احسان اس لیے نہیں کیا جاتا کہ اس کا بدلہ بھی اتارا جائے۔ دوسری بات یہ کہ اگر احسان مند انسان کو کسی بھی طور قرار نہ مل رہا ہو اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ جب تک وہ احسان کا بدلہ نہیں اتارے گا، اسے سکون حاصل نہیں ہو گا تو پھر اسے ''احسان کا بدلہ احسان'' کے فارمولے پر عمل کرنا چاہیے......'' لحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تم بھی کبھی ایسی ذہنی بے سکونی کی کیفیت سے دوچار ہو جاؤ تو میرے اس احسان کا بدلہ چکا کر حساب برابر کر دینا۔''

''مگر...... میں آپ پر کس طرح احسان کر سکتا ہوں بیگ صاحب۔'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''میں تو بہت کمزور انسان ہوں۔''

''احسان کا کمزوری اور طاقت وری سے کوئی تعلق نہیں مراد۔'' میں نے کہا۔ ''بس، اس کام کے لیے انسان کی نیت صاف اور ارادہ مضبوط ہونا چاہیے۔ قدرت خود ہی مدد کر دیتی ہے۔''

''میری نیت میں کوئی کھوٹ ہے اور نہ ہی ارادہ کمزور ہے۔'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ''اب دیکھیں، قدرت کب مجھے موقع فراہم کرتی ہے۔''

''واقعی، تمہاری نیت کی سچائی اور ارادے کی مضبوطی کا مجھے یقین آ گیا۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''اس لیے قدرت نے تمہیں ابھی اور اسی وقت موقع فراہم کر دیا ہے۔''

''جج...... جی......'' وہ ہونقوں کی طرح منہ کھول کر میرا منہ تکنے لگا۔ ''کیسا موقع بیگ صاحب؟''

''کھانا جاری رکھو۔'' میں نے کہا پھر اپنا بیان آگے بڑھایا۔ ''اگر تم مجھ سے ایک وعدہ کرو اور پھر زندگی کی آخری سانس تک اس وعدے کو نبھانے کا بھی وعدہ کرو تو سمجھ لینا کہ تم نے میرے احسان کا بدلہ چکا دیا۔''

''جی حکم کریں، آپ مجھ سے کیا وعدہ لینا چاہتے ہیں؟'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''تم آج کے بعد بلی سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رکھو گے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس لڑکی سے کسی نوعیت کی چھیڑ چھاڑ یا فقرے بازی بھی نہیں کرو گے۔''

''جی ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔'' وہ جلدی سے گردن کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ وعدہ تو میں آپ سے پچھلی ملاقات میں بھی کر چکا ہوں۔''

''اسے تم تجدید عہد وفا سمجھ لو۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تمہاری جانب سے ببلی یا سلمیٰ کو کبھی کوئی شکایت پیدا ہوئی تو سمجھو، پھر تمہارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے...... شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ وصی شاہ کتنا خطرناک شخص ہے۔''

''جی مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے۔'' وہ خوف بھری جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا بیگ صاحب!''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے کھانا ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر میری ہدایات تمہارے ذہن میں تازہ رہیں تو پھر تمہیں ان لوگوں کی طرف سے کبھی کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔''

''بیگ صاحب! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔'' وہ لجاجت بھرے انداز میں بولا۔

''ہاں، پوچھو۔'' میں نے کہا۔ ''اور کچھ پوچھنے سے پہلے یہ بتادو کہ کولڈ ڈرنک یا چائے کافی؟''

اس نے کولڈ ڈرنک کے حق میں ووٹ دینے کے بعد مجھ سے جو سوال کیا وہ اس کے دل کی آواز تھی۔

''کیا سلمیٰ کے گھر میں کبھی آپ کی ببلی سے بھی ملاقات ہوئی؟''

''ہاں!'' میں نے دروغ مبنی بر مصلحت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''ببلی سے تمہارے موضوع پر میری تفصیلی بات ہو چکی ہے۔''

''اوہ......'' وہ بے قرار لہجے میں بولا۔ ''وہ کیا کہتی ہے میرے بارے میں؟''

''تمہارے بارے میں اس کے خیالات بہت ہی دل شکن اور افسوس ناک ہیں۔'' میں نے اپنے منصوبے کو تکمیل کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''سنو گے تو تمہیں دھچکا لگے گا لہٰذا اس باب کو بند ہی رہنے دو۔''

اس کے اضطرار اور اشتیاق میں کوئی خاص کمی نہیں آئی، بے تابی سے بولا۔ ''آپ کچھ تو بتائیں نا بیگ صاحب......''

''مراد! ببلی تم سے شدید نفرت کرتی ہے۔'' میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اس نے اتنی حقارت سے تمہارا نام لیا جیسے تم اس دنیا کی غلیظ ترین چیز ہو۔ اگر تمہارے اندر غیرت کی ایک رمق بھی باقی ہے تو اس لڑکی کو اپنے دل و دماغ سے نوچ ڈالو۔ تم شریف والدین کی اولاد ہو اور وہ......!''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ میں آج اس کے دماغ کے سارے کیڑے جھاڑ کر اس کے اندر خودداری کو بیدار کرنا چاہتا تھا۔ میری اس گہری چال کے نتیجے میں وہ تڑپ کر بولا۔

''وہ...... کیا وکیل صاحب؟''

''میں نے اپنے خفیہ ذرائع استعمال کر کے سلمیٰ، ببلی اور وصی شاہ کا شجرہ بھی کھوج نکالا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''متعلقہ تھانے کا انچارج میرا دوست ہے۔ میں نے ان لوگوں کے بارے میں اپنے دوست سے بھی معلومات حاصل کی ہیں۔ ان لوگوں کی رپورٹ بہت گندی ہے۔ یہ مختلف قسم کے اخلاقی اور معاشرتی جرائم میں گردن گردن تک دھنسے ہوئے ہیں اور...... کسی بھی وقت سزا پا کر جیل جا سکتے ہیں......'' میں نے ذرا سا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ میں اس سے زیادہ تمہیں اور کچھ نہیں بتا سکتا مراد......''

میری باتوں کا مراد پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ میں نے اس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا۔ چند لمحات کے تذبذب کے بعد وہ پھٹ پڑا۔

''بیگ صاحب! آپ نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں پاگل ہوں، ببلی کی محبت میں خوامخواہ اندھا ہو گیا تھا۔ لوگ ببلی اور سلمیٰ کے کردار کے حوالے سے گندی گندی باتیں کرتے تھے لیکن میں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا کرتا تھا۔ میری نظر صرف ببلی پر لگی ہوئی تھی اور وہ......'' وہ لمحے بھر کو تھما پھر زہرخند لہجے میں بولا۔

''اور وہ مجھے دنیا کی غلیظ ترین شے سمجھتی ہے۔ لعنت ہے ایسی خوب صورت بلا پر......''

''مراد! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرو...... کہ تم برباد ہونے سے بچ گئے۔'' میں نے لوہا گرم دیکھتے ہوئے ہمدردی کی چوٹ لگائی۔ ''تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وصی شاہ اور سلمیٰ کتنے بدقماش اور خطرناک انسان ہیں۔ تمہیں تو وہ لوگ اس طرح غائب کر دیتے کہ تمہارے ماں باپ ساری زندگی ڈھونڈتے ہی رہ جاتے۔''

''بیگ صاحب!'' وہ سراسیمہ انداز میں ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ''اللہ کے بعد میں سب سے زیادہ آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اور میں ایک خونی دلدل میں قدم رکھنے سے بچ گیا ہوں۔''

''میں نے یہ ساری محنت بلاوجہ نہیں کی۔'' میں نے مصنوعی سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی اس محنت کی تم سے فیس وصول کروں گا۔''

''بیگ صاحب!'' اس کی حالت قابلِ رحم ہوگئی۔ ''میرے پاس تو مشکل سے واپسی کا کرایہ ہی ہوگا۔ میں بھلا آپ کی بھاری فیس کس طرح ادا کرسکتا ہوں؟''

''اپنی بھاری آمدنی میں سے۔'' میں نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ چند روز کے بعد تمہاری جیبیں نوٹوں سے بھر جائیں گی۔''

''مم...... مگر...... یہ کیسے ہوسکتا ہے......'' وہ حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولا۔ ''دولت ایسے ہی تو نہیں آجاتی نا...... بیگ صاحب!''

''تم ٹھیک کہتے ہو مراد۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''واقعی دولت کوئی پھل نہیں جو درختوں پر اگتی ہو۔ دولت کو حاصل کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ یہ جدوجہد تم کرو گے کیونکہ...... میں نے تمہارے لیے ایک صاف ستھری نوکری کا بندوبست کردیا ہے۔''

''کہاں......؟'' اس کی آنکھوں میں مسرت کے جگنو جاگ اٹھے۔

میں نے نہایت ہی نپے تلے الفاظ میں مراد کو قدوس احمد سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔ اس نے گہری توجہ سے میری بات سنی اور جب میں خاموش ہوا تو اس کی حالت دیدنی تھی۔ میں نے مزید کہا۔

''اب تم اپنی غلطی کو نہیں دہراؤ گے......!''

''کون سی غلطی بیگ صاحب؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں......''

''دیوار پھلانگ کر کودنے کی غلطی۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس رات تم اسی فارمولے پر عمل کرکے قدوس احمد کے گھر میں داخل ہوئے تھے اور اب تمہارے سامنے ان کی دکان ہے۔ کہیں تم......''

اس کی ہنسی نکل گئی۔ اس کے چہرے پر کھلنے والے خوشی کے رنگ دیکھ کر میں مطمئن ہوگیا۔ تین مراحل پر مبنی میرا منصوبہ گویا پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ میری محنت کی اس سے زیادہ فیس کچھ اور نہیں ہوسکتی تھی۔

☆☆☆

لگ بھگ ایک سال کے بعد مراد علی دوبارہ میرے آفس آیا تو اس کا چہرہ مسرت سے چمک رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک دلچسپ اور حیرت انگیز خبر بھی لایا تھا۔ وہ ایک کارڈ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''بیگ صاحب! پندرہ روز کے بعد میری شادی ہے۔ آپ کو لازمی آنا ہے۔''

میں نے کارڈ کھولتے ہوئے پوچھ لیا۔ ''بھئی مبارک ہو...... کس سے ہورہی ہے تمہاری شادی؟''

''آپ کی پڑوسن سے......!'' وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب؟'' میں چونکے بنا نہ رہ سکا۔

''بیگ صاحب! میں قدوس صاحب کی...... بیٹی عابدہ کی بات کررہا ہوں۔'' وہ بڑے فخر سے بولا۔

''اوہ......'' میں نے شادی کارڈ پر نگاہ دوڑائی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ وہاں میرے سابق پڑوسی قدوس صاحب کی بیٹی عابدہ کا نام چھپا ہوا تھا۔ میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''پھر تو ڈبل مبارک ہو بھئی لیکن شاید ایک بات تمہارے علم میں نہیں ہے۔''

''کیا بیگ صاحب......؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''قدوس احمد کچھ عرصہ پہلے تک میرے پڑوسی تھے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر اب وہ شہر کے کسی اور علاقے میں شفٹ ہوچکے ہیں۔''

''جی۔ میں جانتا ہوں۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''پڑوسی کا حوالہ میں نے یوں دیا ہے کہ ہماری پہلی ملاقات انہی کے گھر میں ہوئی تھی اور اس وقت وہ آپ کے پڑوسی تھے۔''

میں نے کہا۔ ''قدوس احمد جب تک میرے پڑوسی رہے، وہ گاہے بہ گاہے تمہاری تعریف کرتے رہتے تھے۔ اگر انہوں نے تمہیں اپنا داماد بنانے کا فیصلہ کیا ہے تو یہ ان کی دانش مندی کا ثبوت اور تمہارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے......'' بات کے اختتام پر میں نے اٹھ کر اسے گلے لگالیا۔

اس کی آنکھوں میں خوشی آنسو بن کر چمک اٹھی۔ اس نے مجھ سے شادی میں شرکت کا وعدہ لیا اور سلام کرکے رخصت ہوگیا۔

انسان اگر محنتی ہو اور خلوصِ نیت سے کسی بھی کام میں جت جائے تو کوئی کوہِ گراں بھی اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہیں کرسکتا۔ کامیابی ایک دن اس کے قدم چوم لیتی ہے۔

(تحریر: حسام بٹ)

اٹارنی کیتھی مور نے کانفرنس ٹیبل کی دوسری جانب بیٹھے ہوئے نوجوان کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

''مسٹر جیمز! کیا تم سمجھ رہے ہو کہ یہ دو ہفتے قبل تمہاری پرائیویٹ آرٹ گیلری میں ہونے والی چوری سے متعلق عدالت کے روبرو حلفیہ بیان قلم بند ہو رہا ہے؟''

جیمز کے ہونٹوں پر ایک بناوٹی ہنسی ابھر آئی۔ اس نے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی سے اپنی نیلے رنگ کی ریشمی ٹائی کو درست کیا۔ آرٹ گیلری کا لوگو اس کے کوٹ کی اوپری بائیں جیب پر سنہری تاروں کی کشیدہ کاری سے نمایاں تھا۔

''ویل، مجھے اس چوری کا یقین ہے۔ اسی لیے تو میں یہاں موجود ہوں۔''

''تم مزید یہ بھی سمجھ لو مسٹر جیمز کہ تم حلف اٹھا رہے ہو اور

کوتاہ اندیش

سلیم انور

حالات چاہے جو بھی ہوں اگر اندیش بینی میں کوتاہی ہو جائے تو اس کا نتیجہ بہرحال بھگتنا پڑتا ہے۔ اسے بھی ہر حال میں یہ نقصان برداشت کرنا تھا جو محض اس کی نااندیشی کی بنا پر ہوا اور جس نے اس کے سارے اندیشوں کو سچ کر دکھایا۔

چالاک چور کی خودفریبیوں کا دلچسپ ماجرا

یہ کہ تم جو کچھ بھی کہو گے وہ ہماری کورٹ کی ریکارڈر تحریر میں لے آئے گی جو اس میز کے اوپری سرے پر بیٹھی ہوئی ہے۔''

جیمز نے ایک اچٹتی نگاہ اس خوش لباس خاتون پر ڈالی جس کی انگلیاں ایک چھوٹی سی سیاہ مشین کے کی بورڈ پر حرکت کر رہی تھیں۔ اس مشین کے ساتھ ایک دھات کی ٹرے منسلک تھی جس میں کاغذ کی ایک پتلی سی پٹی کا رول لگا ہوا تھا۔

جیمز نے شانے اچکا دیے۔''میں تیار ہوں۔''

اٹارنی کیتھی مور نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''ہماری قانونی فرم کی خدمات اس بیمہ کمپنی نے حاصل کی ہیں جس کے پاس تمہاری آرٹ گیلری کی بیمہ پالیسی ہے۔ اس سے قبل کہ بیمہ کمپنی تمہارے چوری کے کلیم کی ادائیگی کرے، ہمیں چند حقائق کو تسلیم کیے جانے کی ضرورت ہے۔''

''یہ بات مناسب لگ رہی ہے۔''

''گڈ!'' اٹارنی کیتھی مور نے اپنے سامنے میز پر رکھی ہوئی ایک... فائل کی جانب ہلکا سا اشارہ کیا۔''پولیس رپورٹ کے مطابق جس وقت چوری کی یہ واردات ہوئی، اس وقت آرٹ گیلری میں صرف تم اکیلے موجود تھے۔''

''درست۔''

''اس روز کوئی ملازم کام پر موجود نہیں تھا؟''

''میرا اسلز مین ایک ڈیلیوری دینے کے لیے گیا ہوا تھا اور ریسپشنسٹ جلدی لنچ کرنے چلی گئی تھی۔''

''جب اس واقعے کا آغاز ہوا تو اس وقت تم کہاں تھے؟''

''میں عقبی کمرے میں چند قیمتی وائن کے کیپسول کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ وائن ہم اپنے بہترین کسٹمرز کو پیش کرتے ہیں۔ اس سے انہیں خریداری کے موڈ میں آنے میں مدد ملتی ہے۔ ایک اعلیٰ درجے کی فرم ہونے کے ناتے ہم یہ وائن صرف اپنے بہترین خریداروں کو ہی آفر کرتے ہیں۔''

''یقیناً ایسا ہی ہونا چاہیے۔ یہی کامیاب کاروبار کا گر ہے۔ پھر اس کے بعد کیا ہوا؟''

''میں نے اپنی تجویز کردہ عینک ابھی اپنے کوٹ کے بریسٹ پاکٹ میں رکھی ہی تھی کہ مجھے مین گیلری میں کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔'' جیمز نے کہا۔

''جب تم اس کمرے میں داخل ہوئے تو تم نے کیا دیکھا؟''

جیمز نے ایک گہرا سانس لیا۔''سیاہ اسکی ماسک پہنے ہوئے ایک شخص نے اسی وقت شیشے کے اس باکس کو ضرب لگا کر توڑ دیا تھا جس میں ہمارا روسی زار کے دور کے نوادرات میں سے ایک نادر ہیرا رکھا ہوا تھا جو انڈے کے برابر تھا۔ شیشے کے ٹکڑے ٹائل کے فرش پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ چور ہمارا بیش قیمت ہیرا ایک چھوٹے سے پیڈڈ پاؤچ میں منتقل کر رہا تھا۔''

اٹارنی کیتھی مور نے بات سمجھنے کے انداز میں اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں نے چیخ کر اسے رکنے کو کہا لیکن وہ پلٹ کر دوڑنے لگا۔ میں اپنے قیمتی ہیرے کو یوں ہاتھوں سے نکلتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ سو میں اس چور سے بھڑ گیا۔''

''اور وہ پھر بھی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا؟''

''ہاں... لیکن ہم کچھ دیر تک لڑتے رہے تھے۔ ہم چھینا جھپٹی کی اس تگ ودو میں دیر تک فرش پر لڑھکنیاں کھاتے رہے تھے۔ اس دوران وہاں رکھے ہوئے گلدانوں کے چند اسٹینڈ بھی نیچے گر گئے۔ آخر میں اس نے مجھے لات رسید کر کے خود کو چھڑا لیا اور پھر بھاگ کھڑا ہوا۔''

جیمز نے اپنے بائیں رخسار کی جانب اشارہ کیا۔''اس کے جوتے کی نوک مجھے یہاں لگی تھی۔''

''میں وہ پولیس فوٹوگراف دیکھ چکی ہوں جس میں تمہارے رخسار پر رگڑ کا نشان موجود ہے۔'' کیتھی مور نے کہا۔''تم نے بہت بہادری کا مظاہرہ کیا تھا۔''

''تھینک یو۔'' جیمز نے اپنی ڈیزائنر عینک اتار کر اسے ایک اسپیشل قسم کے کپڑے سے صاف کرتے ہوئے کہا۔''کیا بیان مکمل ہو گیا؟''

''تقریباً۔'' کیتھی مور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔''مجھے یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ مجھے تمہاری یہ عینک بہت اچھی لگ رہی ہے۔ کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں؟''

جواباً جیمز بھی مسکرا دیا۔ اس نے اپنی عینک میز کے پار بیٹھی ہوئی اٹارنی کیتھی مور کی جانب بڑھا دی اور بولا۔''یہ عینک خاصی قیمتی ہے لیکن مجھے پسند ہے۔''

کیتھی نے پتلے وائر فریم کی بنی ہوئی اس قیمتی عینک کا بغور جائزہ لینا شروع کر دیا۔''یہ تو میری توقع سے کہیں زیادہ ہلکی ہے۔ یہ دیکھنے میں جتنی نازک لگ رہی ہے تو یقیناً اسے بار بار ایڈجسٹ کرانا پڑتا ہوگا تا کہ یہ پہننے میں بالکل فٹ رہے۔''

''نہیں، نہیں۔ میں اسے ہمیشہ بے حد احتیاط کے ساتھ استعمال کرتا ہوں۔ یہ عینک گزشتہ چھ ماہ سے میرے پاس ہے اور مجھے اس کے فریم کو دوبارہ تطبیق کرانے کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی۔''

کیتھی نے عینک جیمز کو واپس لوٹا دی۔

''چونکہ چوری کی واردات کے دوران تم نے یہ عینک نہیں پہنی ہوئی تھی اس لیے میرا خیال ہے کہ تم چور کو شناخت نہیں کر پاؤ گے۔''

یہ سن کر جیمز بے ساختہ ہنس دیا۔ ''میری دور کی نظر اتنی خراب بھی نہیں ہے۔ زیادہ تر میں یہ عینک پڑھنے کے لیے استعمال کرتا ہوں لیکن جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، چور نے اپنے چہرے پر اسکی ماسک پہنا ہوا تھا۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔''

کیتھی کے ہونٹوں سے مسکراہٹ معدوم ہوگئی۔ اس نے ایک اچٹتی نگاہ اپنی کلائی کی گھڑی پر ڈالی۔

''مسٹر جیمز! میں تمہیں صرف پورے تیس سیکنڈ کی مہلت دے رہی ہوں، یا تو تم اپنی کہانی تبدیل کر دو یا پھر اپنا کلیم واپس لے لو۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو میں اپنے کلائنٹ سے یہ سفارش کروں گی کہ وہ تمہارے کلیم کی ادائیگی اس وقت تک کے لیے روک دیں جب تک اس چوری کے بارے میں تمہارے بیان کا جھوٹ پکڑنے والی مشین پر پولی گراف ٹیسٹ نہ ہوجائے۔ اب تمہارے پاس پچیس سیکنڈ کا وقت باقی رہ گیا ہے۔''

جیمز کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ ''کیا؟''

''تم پہلے یہ کہہ چکے ہو کہ اس چور کو روکنے کی کوشش میں تم اور تمہارا بیان کردہ وہ چور فرش پر ایک دوسرے سے الجھ کر لڑھکنیاں کھاتے رہے تھے اور خود تمہارے اپنے بیان کے مطابق اس وقت یہ نازک عینک تمہارے کوٹ کے بریسٹ پاکٹ میں موجود تھی۔ ڈیزائنر فریم کی باریک تاروں سے بنی ہوئی یہ عینک جتنی نازک دکھائی دے رہی ہے تو اس دھینگا مشتی کے دوران اگر یہ نہیں ٹوٹی تو اسے کم از کم مڑ ضرور جانا چاہیے تھا...... اور ابھی تم یہ حلفیہ بیان دے چکے ہو کہ اس کے فریم کو کبھی تطبیق کرانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ میرا خیال ہے کہ تم نے چوری کی بہانہ بازی کی ہے اور حقیقت میں چوری کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہ سب تمہارے اپنے ذہن کی اختراع ہے اور جھوٹ موٹ چوری کا ڈھونگ رچا کر تم بیمے کی رقم اینٹھنا چاہتے ہو۔''

جیمز کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

کیتھی نے ایک نگاہ اپنی دستی گھڑی پر ڈالی اور بولی۔ ''اب تمہارے پاس صرف پانچ سیکنڈ کا وقت باقی رہ گیا ہے۔''

تب جیمز نے شکست تسلیم کرتے ہوئے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

محفلِ شعر و سخن

❄ زریان سلطان..... عیدگاہ، کراچی

پیشہ ور گواہوں کی اور بھی مثالیں تھیں
مجھ کو قتل کرنے میں منصفوں کی چالیں تھیں

❄ سیدہ ثانیہ کاظمی..... ڈیرہ اسماعیل خان

اک شخص مجھ کو زخم شناسائی دے گیا
جب دے سکا نہ پیار تو رسوائی دے گیا
جاتے ہوئے وہ اپنی نشانی کے طور پر
کتنے خلوص سے مجھے تنہائی دے گیا

❄ صادق معاویہ سعیدی..... خان پور، ضلع رحیم یار خان

بال و پر کاٹ کے صیاد نے میرے یہ ارشاد کیا
اب توڑ دیا قفس جا تجھے آزاد کیا

❄ احمد حسن عرضی خان..... قبولہ بائی پاس

گنگناتے ہوئے آنچل کی ہوا دے مجھ کو
انگلیاں پھیر کے بالوں میں سلا دے مجھ کو

❄ ایم کامران خالد..... محلہ خسر خیل چھچھ

جب بھی جی چاہے نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پہ کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ
ہو خوشی بھی ان کو حاصل یہ ضروری تو نہیں
غم چھپانے کے لیے بھی مسکرا لیتے ہیں لوگ

❄ اسرار ساقی..... ڈسٹرکٹ جیل اٹک

مجھ کو تو معلوم ہی نہیں کہ میں کیا ہوں ساقی
لوگ کہتے ہیں کہ دیوانہ سا لگتا ہوں

❄ عرفان احمد عاجز، جمیل انور..... آڑہ چواسیدن شاہ

ورق ورق پر تری حقیقت، تیرا فسانہ، تیری محبت
کتابِ ہستی جہاں سے کھولی، تیری ہی یادوں کا باب نکلا

❄ محمد شہباز ناز..... سرگودھا

بے نتیجہ، بے ثمر، جنگ وجدل سود و زیاں
ساری جیتیں ایک جیسی، ساری ماتیں ایک جیسی
سب ملاقاتوں کا مقصد کاروبارِ زرگری
سب کی دہشت ایک جیسی، سب کی گھاتیں ایک جیسی

❄ جاوید اختر رانا..... پاک پتن شریف

گرد بیٹھ جائے تو کچھ میں سمجھ سکوں
آنکھیں نہیں رہیں یا تماشا نہیں رہا

❄ ماہین فاطمہ..... اوکاڑہ

جلے جو جسم تو لگتی ہے روح کو بھی آنچ
وہ خود بھی جلتا رہا عمر بھر جلا کے مجھے

❄ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ..... ضلع خانیوال

تجھے کیا خبر تیری یاد نے مجھے کس طرح ستا دیا ہے
کبھی خلوتوں میں ہنسا دیا کبھی محفلوں میں رلا دیا
کبھی یوں ہوا تیری یاد میں مری ہر نماز قضا ہوئی
کبھی یوں ہوا تری یاد نے مجھے پاک رب سے ملا دیا

❄ داؤد اشفاق..... اوکاڑہ

رکا ہوا تھا مرا سانس، میرے سینے میں
اسے گلے نہ لگاتا تو گھٹ کے مر جاتا

❄ وسیم خان.....کوئٹہ
کچھ انوکھے تجھے اندازِ ستم آتے ہیں
ہم تیری بزم سے بادیدۂ نم آتے ہیں
سچ تو ہے کہ مہکتی ہے وہ پھولوں کی طرح
جس جگہ آپ کے گل رنگ قدم آتے ہیں

❄ محمد آصف جھانپ.....سراں بھکر
خوشبو ہوں سرِبزم بکھر جاتی ہوں
نغمہ ہوں ہر اک دل میں اتر جاتی ہوں
درپیش تخیل کا سفر رہتا ہے
شاعر ہوں ذرا دیر سے گھر جاتی ہوں

❄ بادیہ ایمان، ماہا ایمان.....ڈاہرانوالہ
سزا قبول مگر اتنا سوچ لو کہ یہاں
جو تم سے پہلے تھے با اختیار وہ بھی تھے
سواد شہر سے بھی خاک اڑ گئی جن کی
کبھی تمہاری طرح شہریار وہ بھی تھے

❄ ملائکہ حریم.....اوکاڑہ
تو اک بار جو دل کی زمین چھو لیتے
تو پھر میں اگلا قدم آسماں پر رکھتا

❄ اشفاق شاہین.....لاہور
ترے جمال کو میں چھو نہیں سکا لیکن
ترے خیال نے مجھ کو دیا بہت کچھ ہے

❄ محمود علی.....سیالکوٹ
ہر غم کو دلِ آویز کیے دیتا ہوں
احساس کی لو تیز کیے دیتا ہوں
تو زلف کو کچھ اور پریشان کر دے
میں جام کو لبریز کیے دیتا ہوں

❄ محمد قدرت اللہ نیازی.....حکیم ٹاؤن، خانیوال
اندر سے کیا ہیں لوگ، نظر کیوں نہیں آتے
اس غم نے کسی کو بھی ہمارا نہیں رکھا

❄ وزیر محمد خان.....بٹل ہزارہ
بے سبب ہم سے روٹھنے والے
خود بھی پھرتے ہیں کچھ اداس اداس

❄ انیلا رشید سیال.....خیر پور، میرس
دل سے لٹ کر بھی سخاوت کی تمنا نہ گئی
کوئی اجڑا ہوا آئے تو دعا لے جائے

❄ زوہیب احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی
قاتل کے قصے مقتل کی باتیں ہیں
آج کی محفل میں بھی کل کی باتیں ہیں
دیوانوں پر اک اک لمحہ بھاری ہے
ہوش کی باتیں کتنی ہلکی باتیں ہیں

❄ کمال انور.....اورنگی ٹاؤن، کراچی
دل جو کہتا ہے چلو کر دیکھو
کسی بے درد کے ہو کر دیکھو
لذتِ غم بھی عجب نشہ ہے
دوست کی یاد میں رو کر دیکھو

❄ ناہید اختر.....اسلام آباد
سوچ ابھی وقت ہے حالات بدل سکتے ہیں
ورنہ اس رشتۂ بے ربط پہ پچھتائے گی
توڑ ان کہنہ رسومات کے بندھن ورنہ
جیتے جی موت کے زنداں میں اتر جائے گی

❄ وسیم اکرم.....مہر شاہ، خانیوال
اپنا ہی تھا قصور جو طوفاں میں گھر گئے
اک موج تھی کہ جس کو کنارا سمجھ لیا

❄ رمضان پاشا.....گلشن اقبال
تمنا وہ تمنا ہے جو دل ہی دل میں رہ جائے
جو مر کر بھی نہ ہو پورا اسے ارمان کہتے ہیں

❄ سید عبادت کاظمی.....ڈیرہ اسماعیل خان
میں تم سے کہوں کیسے اے مہرباں!
کہ تو علاج ہے میری ہر اداسی کا

❄ ظفر احمد.....راولپنڈی
ہم ہیں ظلمت میں کہ ابھرا نہیں خورشید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں رات کی تردید اب کے
کون سنتا تھا حدیثِ غم دل یوں تو مگر
ہم نے چھیڑی ہے ترے نام سے تمہید اب کے

❄ محمد شہباز اکرم نوئی.....ڈھپئی، پاک پتن شریف
عشق کرو تو اس کے آداب وفا بھی سیکھو دلنشین
یہ فارغ وقت کی بے قراری محبت نہیں ہوتی

❄ ریاض بٹ.....حسن ابدال
اس توقع پہ سرِ دیر دل کو کھلا رکھا ہے
لوٹ آئے گا کبھی تو روٹھ کے جانے والا

❄ مرحا گل، رمنا گل..... ورا بن کلاں
حُسنِ تحریر سے ظاہر ہے تیرے دل کا خلوص
خط کا ہر لفظ محبت کا پتا دیتا ہے

❄ محمد ذکریا حیدر..... نامعلوم مقام
سوکھی ہیں بڑی دیر سے پلکوں کی زبانیں
بس آج تو جی بھر کے رلا دے کوئی آ کے

❄ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

❄ مدحت..... کراچی
اے رگِ جاں کے مکیں تو بھی کبھی غور سے سن
دل کی دھڑکن ترے قدموں کی صدا لگتی ہے

❄ مختار احمد..... حیدر آباد
کون لایا تری محفل میں ہمیں ہوش نہیں
کوئی آئے تری محفل سے اٹھا لے جائے

❄ نازیہ خان..... بہاولپور
کوئی بتلاؤ کہ اک عمر کا بچھڑا محبوب
اتفاقاً کہیں مل جائے تو کیا کہتے ہیں

❄ شازیہ..... کراچی
کتنے طوفانوں کی حامل تھی لہو کی اک بوند
دل میں اک لہر اٹھی آنکھ سے دریا برسا

❄ سحرش ناز..... گجرانوالہ
گھر میں کتنا سناٹا ہے باہر کتنا شور
یا دنیا دیوانی ہے یا میرا دل ہے چور

❄ ثمینہ وقار..... راولپنڈی
اس طرح منزلوں سے ہوں محروم
میں شریکِ سفر نہ تھا جیسے

❄ جہانزیب احمد..... سرگودھا
ایک دنیا منتظر ہے اور تیری بزم میں
اس طرح بیٹھے ہیں ہم جیسے کہیں جانا نہیں

❄ وردا، محمد آریز ملک..... کراچی
راتیں ہیں اداس دن کڑے ہیں
اے دل ترے حوصلے بڑے ہیں

❄ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر..... نبی منڈی سکھیکی
آئے نہیں وہ جن کے لیے در کھلا رہا
دل میں مگر امید کا روشن دیا رہا

❄ رعنا رضوی..... مانچسٹر، یو کے
پھیلے ہیں چار سمت مکاں ہی مکاں یہاں
اس شہرِ نامراد میں کوئی گھر تو دیکھتے

❄ شوکت علی زخمی..... رحیم یار خان
لفظ جب تک وضو نہیں کرتے
ہم تیری گفتگو نہیں کرتے

❄ سجاد علی شگری..... گلگت بلتستان
غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھ کو بُرا جانا
سمجھے بھی تو کیا سمجھے جانا بھی تو کیا جانا.....!

❄ مرزا طاہر الدین بیگ..... میرپور خاص
جلے جاتے ہیں بڑھ بڑھ کر مٹے جاتے ہیں گر گر کر
حضور شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی

❄ شاہ زیب..... سرگودھا
کل جب رکے گا بازوئے قاتل تو دیکھنا
اے اہلِ شہر تم تھے شہیدِ وفا کہ میں

❄ وقار حسن..... راولپنڈی
ترس جائیں گی ہم سے بے نواؤں کو تری گلیاں
ہمارے بعد اے شہرِ نگاراں ہم نہ کہتے تھے

❄ محمد اسماعیل..... کوئٹہ
یہ سانحہ ہے کہ واعظوں سے الجھ پڑے ہم
یہ واقعہ ہے کہ پی رہے تھے شراب سارے

❄ مدثر علی..... پشاور
تو مجھ کو چھوڑ گیا لکھ کے ''نسخہ ہائے وفا''
میں کس طرح تجھے اے دوست بے وفا لکھوں

کوپن برائے شمارہ اکتوبر 2016

محفلِ شعر و سخن

نام: ---------------------------------

پتا: ---------------------------------

پھارٹلے

اثر نعمانی

ہیرا پھیری بے شک بہت دلچسپ کام ہے لیکن ذرا مشکل بھی ہے مگر... لطف اس وقت دوبالا ہوجاتا ہے جب سیر کو سواسیر ٹکراتا ہے... وہ بھی خود کو ناقابلِ تسخیر سمجھتا تھا... اپنی طاقت، اپنے اختیارات اور اپنی ہوشیاری پر بڑا ناز تھا... غیرقانونی دھندوں میں اس کا نیٹ ورک بھی بہت مضبوط تھا لیکن... اس سب کے باوجود بازی پلٹنے والے اپنی چال کچھ یوں چل گئے کہ اس کا سارا گھمنڈ چکنا چُور ہوگیا۔

بے ایمان کی بے ایمانی کو ثابت کرنے کے لیے ایمانداروں کی تھوڑی سی بے ایمانی

جج صاحب نے اپنی کافی کی پیالی میز پر رکھ دی۔ کرسی سے پشت لگا کر آرام دہ نشست اختیار کرتے ہوئے انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ہیرس پوری توجہ سے ان کی کہانی سننے کے لیے کرسی پر ذرا آگے کو جھک آیا۔

''اس زمانے میں، میں نائب ڈسٹرکٹ کی حیثیت سے کام کررہا تھا۔ غالباً 1931ء کی بات ہے۔ شراب سازی اور شراب نوشی پر پابندی عائد تھی۔ وولسٹڈ لاء کو نافذ ہوئے دس سال گزر چکے تھے۔ یہاں جنوب مغربی علاقے

میں شراب کی اسمگلنگ کا کاروبار بڑے وسیع پیمانے پر جاری تھا۔ اسمگل کی جانے والی شراب کا کچھ حصہ تو ناجائز طور پر اندرونِ ملک چھوٹی چھوٹی بھٹیوں میں کشید کیا جاتا تھا لیکن زیادہ مقدار میکسیکو سے آتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ باقاعدہ منظم طور پر جرائم کرنے کی بنیاد اسی زمانے میں پڑی تھی۔ آج کل ناجائز منشیات کی اسمگلنگ کا بڑا زور ہے، لیکن اس اسمگلنگ کا اس اسمگلنگ سے کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس کی خرید و فروخت میں نصف کے قریب آبادی شامل تھی۔

''نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ہم نے محسوس کیا کہ ٹکسن جیسے چھوٹے قصبے میں بھی ہمیں ایک انڈر گراؤنڈ جرائم پیشہ تنظیم کا سامنا ہے، دوسری طرف یہ بھی حقیقت تھی کہ چند پُرجوش قوم کے علاوہ کسی کو شراب کی اسمگلنگ سے کوئی ایسی تشویش نہیں تھی لیکن اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا اور وہ یہ کہ شراب کے کاروبار میں اضافے کے ساتھ ہی جرائم پیشہ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ شراب براہِ راست ہمارے لیے وجہ پریشانی نہیں تھی لیکن اس سے جس قسم کے اثرات پیدا ہو رہے تھے، وہ ہمارے لیے مسئلہ بنتے جارہے تھے۔ مجرموں کے سماجی اور سیاسی اثر رسوخ میں اضافہ ہوتا جارہا تھا اور ایماندار لوگوں کو یہ اندیشہ پریشان کررہا تھا کہ کہیں یہ مجرم برسرِ اقتدار نہ آجائیں۔ وہ لوگ سیاستدانوں کو خرید رہے تھے۔ بڑے بڑے کاروبار میں سرمایہ لگارہے تھے اور اسی کے ساتھ تجارت پیشہ افراد کو ڈرا دھمکا کر ان سے غنڈا ٹیکس وصول کررہے تھے اور ہم لوگ نہیں چاہتے تھے کہ ایک دن ایسا آجائے، جب معاملات ہمارے قابو سے باہر ہوجائیں۔ شراب کی اسمگلنگ ایک الگ بات ہے لیکن مجرموں کو اس بات کی اجازت دینا کہ وہ اپنی مرضی سے گورنر کا انتخاب کریں، ایک دوسری بات تھی اور یہ مجرم انسانی حقوق تو درکنار، خود قانون کی بھی کوئی پروا نہیں کرتے تھے۔

''ٹکسن کے قصبے میں مجرموں کا بے تاج بادشاہ ارون اسٹیرک نام کا ایک آدمی تھا۔ بظاہر تین ریسٹورنٹس کا مالک تھا جہاں جائے، کافی اور شراب کے علاوہ قمار بازی کی مختلف مشینیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ یوں تو وہ کسی گروہ کا سردار نہیں تھا اور نہ براہِ راست اسمگلنگ میں ملوث تھا لیکن اسے مجرموں کی تنظیم میں سب سے اہم پوزیشن حاصل تھی۔ پہلے وہ وہاں محض ایک اکاؤنٹ کلرک تھا پھر ترقی کرتے کرتے چیف اکاؤنٹنٹ بن گیا اور پھر رفتہ رفتہ اسے وہ حیثیت مل گئی جو کسی کمپنی میں اس کے سربراہ یا مالک کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر کوئی مجرم اپنا کاروبار شروع کرنا چاہتا تو پہلے اسے ارون سے اجازت حاصل کرنی پڑتی تھی۔ اتنا ہی نہیں، ارون کبھی کبھی کاروبار کے لیے سرمایہ بھی فراہم کرتا تھا۔ بڑے بڑے سودے اس کے ہاتھوں انجام پاتے تھے۔ سب سے بڑی اور اہم بات یہ تھی کہ تمام کالے کاروبار کا حساب کتاب اسی کے پاس رہتا تھا۔

''ہم جانتے تھے کہ اگر اس کے اکاؤنٹ رجسٹر ہمارے ہاتھ آجائیں تو ہم نہ صرف تمام سرکردہ مجرموں کو گرفتار کرسکتے تھے بلکہ ٹکسن اور آس پاس کے قصبات کی حد تک اس کاروبار کا خاتمہ بھی کرسکتے تھے۔ دوسری طرف ارون دن بہ دن زیادہ اہمیت، زیادہ طاقت اور زیادہ اثر رسوخ حاصل کرتا جارہا تھا۔ ہماری طرح فیڈرل پولیس بھی اس کی گرفتاری کے لیے کوشاں تھی، لیکن ہم نے جب بھی اس کے دفتر پر چھاپا مارا، وہ اکاؤنٹ رجسٹر جن کی ہمیں ضرورت تھی، پراسرار طور پر غائب ہوجاتے تھے اور ان رجسٹروں کے بغیر ہم اس کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں کرسکتے تھے۔ آخر کار ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ سیدھے سادے قانونی طریقے سے ہم بھی اس سے چھٹکارا نہیں پاسکیں گے۔

''ان ہی دنوں فونیکس کے گورنر کے مشیرِ خاص کا انتخاب ہونے والا تھا۔ (ہمارا قصبہ ٹکسن کی حدود میں آتا ہے) اور یہ بات قطعی طور پر ظاہر تھی کہ ارون کا نامزد کردہ امیدوار بلا مقابلہ کامیاب ہوجائے گا۔ ہم نے محسوس کیا کہ اگر مجرموں کا کوئی بھی آدمی گورنر ہاؤس تک پہنچ گیا، تب پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فونیکس کی ریاست قطعی طور پر مجرموں کے قبضے میں آجائے اور اس کے امیدوار کو منتخب ہونے سے روکنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ ارون کو راستے سے ہٹایا جائے۔ اگر وہ موجود نہ ہوا تو مقامی سیاستداں اور عام لوگ آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرسکتے تھے۔

''ہم نے کورٹ ہاؤس میں میٹنگ بلائی۔ اس میٹنگ میں ڈپٹی پولیس کمشنر، ڈسٹرکٹ اٹارنی، اس کے دو نائب (جن میں سے ایک میں تھا) اور ٹکسن کا میئر شریک ہوئے۔ صرف ہم ہی لوگ ایسے تھے جو ابھی ارون کے زرخرید نہیں تھے۔ میں تمہیں اس اجلاس کی تفصیلات بتا کر بور نہیں کروں گا لیکن اس میٹنگ کا حاصل یہ نکلا کہ مجھے ارون کو ٹھکانے لگانے پر مامور کیا گیا اور میں نے اس شرط پر یہ ذمے داری قبول کی کہ میں اپنی تمام کارروائی کو اس وقت تک ان سب

سے ... پوشیدہ رکھوں گا جب تک اس سے کوئی مفید نتیجہ نکلنے کی امید نہیں ہوگی اور اس رازداری کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں اپنی رپورٹیں باقاعدہ تحریری طور پر پیش کر کے یہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا کہ دفتری عملے میں سے وہ لوگ جو ارون کے ہاتھوں فروخت ہو چکے ہیں، ان سے آگاہ ہوں اور ہمارے ہر اقدام کی اطلاع اسے بروقت پہنچاتے رہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ عدالتی کارروائی کا اکثر و بیشتر ... دار و مدار کچھ لینے اور کچھ دینے کے اصول پر مبنی ہوتا ہے۔ اگر ہمیں کبھی ایک خاص مجرم کو سزا دلانا مقصود ہوتا ہے تو کبھی کبھی اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کسی دوسرے مجرم کو معافی بھی دینا پڑ جاتی ہے۔ یہ کوئی پسندیدہ طریقہ کار نہیں ہے لیکن یہ دوسرے بہت سے طریقوں کے مقابلے میں نسبتاً بہتر ہے۔ آج کل بھی اس طریق کار پر عمل ہوتا ہے۔ سزا میں نرمی یا بالکل معافی کے وعدے پر خود مجرموں کے ساتھی سلطانی گواہ بن جاتے ہیں، اس زمانے میں ٹکسن قصبے کی آبادی صرف بیس ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ مجرم پولیس کے ہر سپاہی اور افسر کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ ہم ان میں سے کسی سے بھی یہ کام نہیں لے سکتے تھے کہ وہ بھیس بدل کر مجرموں میں شامل ہو جائے اور ہمیں مفید معلومات فراہم کرے۔ چنانچہ میں نے خود مجرم سے ارون کے بارے میں مختلف معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

''اس وقت میری عدالت میں تین بڑے مقدمات زیرِ سماعت تھے۔ مقدمات تو اور بھی کئی تھے لیکن یہ ایسے مقدمے تھے جو ہمارے پیشِ نظر مقصد کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتے تھے۔ ان میں سے ایک ملزم سینڈس تھا۔ وہ ارون کے گروہ میں پیغام رسانی کی خدمات انجام دیتا تھا۔ باقی دو کا تعلق ارون کے گروہ سے نہیں تھا، وہ اپنے طور پر جرم کرتے تھے۔ ان میں سے ایک پر مختلف اوقات میں جعلی دستخط بنا کر چیک کیش کرانے کا الزام تھا اور دوسرا قفل اور سیف کھولنے کا ماہر تھا جو ایک بینک کے تالے کھول کر اس کے سیف سے رقم نکالتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا، کیونکہ اسے خفیہ الارم کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔

''اس خطرے کے پیشِ نظر جو ہمیں درپیش تھا اور اس ذمے داری کو دیکھتے ہوئے جو مجھ پر ڈالی گئی تھی، میں نے قانون کو اپنی مرضی کے مطابق جھکانے کی کوشش کی اور دراصل یہی نکتہ اس واقعے کے اخلاقی پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ سب سے پہلے میں نے سینڈس سے تنہائی میں گفتگو کی

کیا آپ جانتے ہیں؟

☆ ......قرآن پاک میں شہد کی مکھی، چیونٹی اور لکڑی کا ذکر آیا ہے۔

☆ ......لعاب (پانی نما سیال) جسے saliva کہتے ہیں اس کے بغیر آپ کسی بھی کھانے کا ذائقہ محسوس نہیں کر سکتے۔

☆ ......مچھلی کی جلد یعنی فش اسکیل لپ اسٹک بنانے میں استعمال ہوتی ہے۔

☆ ......مینڈک اپنی آنکھیں کھلی رکھ کر کوئی چیز نگل نہیں سکتے۔ انہیں نگلنے کے لیے اپنی آنکھیں بند کرنا پڑتی ہیں۔

☆ ......سانس لیتے وقت آکسیجن کی پچیس سے تیس فیصد مقدار صرف آپ کا دماغ استعمال کرجاتا ہے۔

☆ ......آپ کی اپنی سالگرہ والے دن دنیا میں تقریباً نوے (90) لاکھ لوگوں کی برتھ ڈے ہوتی ہے۔

☆ ......انسانی دماغ کا اَسّی فیصد حصہ پانی پر مشتمل ہے۔

☆ ......آکسیجن کی مائع حالت میں رنگت نیلی ہوتی ہے۔

☆ ......شہد کی مکھی الٹراوائلٹ روشنی کو دیکھ سکتی ہے۔

☆ ......سانپ کھائے پیے بغیر 2 سال کا عرصہ گزار سکتا ہے۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاک پتن شریف

اور اسے اچھی طرح ڈرا دھمکا کر یہ لالچ دیا کہ اگر وہ ہمیں ارون کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کردے تو ہم اس کے خلاف مقدمہ واپس لے لیں گے۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ ہمیں خاص طور پر کن معلومات کی ضرورت ہے مگر اسے یہ خوف تھا کہ اگر اس نے ہمیں ارون کے بارے میں معلومات فراہم کیں تو یہ بات چھپی نہ رہے گی اور جیسے ہی ہم اسے آزاد کریں گے، ارون کے حکم سے اسے قتل کر دیا جائے گا۔ بڑی مشکل سے وہ اس بات پر آمادہ ہوا کہ میں اس سے سوالات کروں اور وہ جس سوال کو بے ضرر خیال کرے گا، اس کا جواب دے دے گا۔ میں نے اس سے ارون اور اس کے گروہ کی مختلف سرگرمیوں کے بارے میں سوالات شروع کر دیے۔ اس نے بہت سے سوالات کا جواب دینے

سے انکار کر دیا لیکن کئی سوالات کے جواب بھی دیے اور یوں رفتہ رفتہ گھما پھرا کر سوال کرتے کرتے آخر کار میں اس سے وہ بات اگلوانے میں کامیاب ہو گیا جس کی مجھے ضرورت تھی۔ مجھے اس کے جوابات سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ ارون گروہ کے حساب کتاب کے رجسٹر کہاں رکھتا ہے۔

وہ رجسٹر جیسا کہ مجھے اندازہ تھا، ایک آہنی سیف میں رکھے جاتے تھے اور یہ آہنی سیف نارتھ اسٹون ایونیو کے علاقے میں واقع ایک پراپرٹی ایجنسی کے دفتر میں رکھا ہوا تھا۔ بظاہر یہ ایجنسی جائداد کی خرید و فروخت کا کام کرتی تھی اور ارون کا ایک بھائی اس کا مالک تھا، لیکن اندرونی طور پر ارون اس کے دفتر میں بیٹھ کر اپنے گروہ کو چلاتا تھا اور تمام گروہ کا حساب کتاب اور اکاؤنٹ مختلف رجسٹروں میں تحریر کرتا تھا، اس کی مدد کرنے کے لیے دو تین اکاؤنٹ کلرک بھی دفتر میں بیٹھتے تھے۔ عام پر کلرک ہی کام کرتے تھے اور ارون کبھی کبھی وہاں چیکنگ کے لیے چلا جاتا تھا۔ یہ لوگ صبح سے شام تک ایجنسی کے عقبی کمرے میں کام کرتے تھے۔ رات کے وقت ایک چوکیدار سیف کی نگرانی اور حفاظت کے لیے پہرا دیتا رہتا تھا۔ یہ سیف اتنا بڑا تھا کہ اسے اٹھا کر لے جانا ناممکن تھا۔ پھر اس کے ساتھ ایک الیکٹرک الارم بھی منسلک تھا۔ اسے کسی وقت اکیلا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ دن کے وقت کلرک موجود رہتے تھے اور رات کو چوکیدار۔

''یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد میں نے سینڈس کو قید تنہائی میں رکھوا دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی طریقے سے اس بات کی اطلاع ارون کو پہنچا سکے پھر بعد میں جب ہمارا کام مکمل ہو گیا تو طے شدہ وعدے کے مطابق اسے آزاد کر دیا گیا لیکن وہ جرم سے باز آنے والا آدمی نہیں تھا۔ چند ماہ بعد ہی اسے پھر گرفتار کر لیا گیا اور اپنی باقی زندگی اس نے زیادہ تر بھی ایک بھی دوسرے جرم کی سزا میں جیل میں ہی گزار دی۔

''گورنر کے مشیر کا انتخاب جون میں ہونے والا تھا اور اس وقت اپریل کا مہینا تھا۔ گویا ہمارے پاس کم و بیش سات ہفتوں کی مہلت تھی، ایک دن میں نے اس جعلساز کو ملاقات کے لیے بلایا۔ اس پر کئی ہزار ڈالرز کے چیک کیش کرانے کا الزام تھا اور ہمارے پاس ایسے ٹھوس ثبوت موجود تھے کہ اگر مقدمہ چلایا جاتا تو اسے کئی سال کی سزا ہو سکتی تھی۔ وہ بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اسے کسی دوسری ریاست میں لے جا کر آزاد کر دیا جائے گا اور اس کی گرفتاری کے لیے کوئی وارنٹ بھی جاری نہیں کیا جائے گا۔

''یہ بات جہاں تک قانون کا تعلق ہے، قطعی قانونی حدود کے اندر تھی۔ یہ میرا اپنا ایک فیصلہ تھا۔ بلاشبہ اس کی اخلاقی حیثیت پر اعتراض کیا جا سکتا ہے لیکن قانون کے مطابق ایک پبلک پراسیکیوٹر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ کسی خاص کیس کے سلسلے میں اسے کسی فرد پر مقدمہ چلانا ہے یا نہیں؟ میں نے اسے جعلسازی کے الزام سے بری نہیں کرایا تھا، صرف سر دست اس کے خلاف اس الزام میں مقدمہ نہ چلانے کا فیصلہ کیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہمارے آزاد کرنے کے بعد وہ کبھی ٹلکسن قصبے کی حدود میں پایا جاتا تو ہم اسے دوبارہ گرفتار کر کے اسی الزام میں مقدمہ چلا سکتے تھے۔

''اس سے فارغ ہو کر میں نے اس سیف توڑنے والے سے ملاقات کی اور اس کے ساتھ بھی ایک ایسا ہی معاہدہ کر لیا۔ ابھی تک میں کسی قسم کی قانون شکنی کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد میرے منصوبے کے اگلے مرحلے کا تعلق پولیس کے تعاون سے تھا۔ میں ڈپٹی کمشنر کے پاس گیا اور اسے اپنی اسکیم بتائے بغیر یہ اجازت حاصل کر لی کہ میں جب چاہوں پولیس سے ہر قسم کی امداد لے سکتا ہوں۔ چوکیدار بارہ گھنٹے ڈیوٹی دیتا تھا۔ وہ شام کو ساڑھے سات بجے پراپرٹی ایجنسی کے دفتر آتا تھا اور صبح ساڑھے سات بجے تک ڈیوٹی پر رہتا تھا۔ جس وقت وہ آتا تھا تو اکاؤنٹ کلرک اور کبھی کبھی خود ارون بھی دفتر میں موجود ہوتے تھے لیکن اس کے آنے کے بعد وہ پونے آٹھ بجے یا زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے تک رخصت ہو جاتے تھے۔ اسی طرح اگلی صبح کو جب ساڑھے سات آٹھ بجے کوئی نہ کوئی اکاؤنٹ کلرک آ جاتا تھا تب چوکیدار کو گھر جانے کی اجازت ملتی تھی۔

''رات کے وقت سیف کو مقفل کر دیا جاتا اور سوائے چوکیدار کے کوئی نگرانی کرنے والا نہیں ہوتا تھا۔ چوکیدار بھی ارون کا دور کے رشتے سے بھائی تھا اور ارون کو اس پر مکمل اعتماد تھا، وہ ایک صحت مند اور طاقتور آدمی تھا لیکن اس کے جسم میں جتنی طاقت تھی، دماغ میں اتنی عقل نہیں تھی پھر بھی اس کی وفاداری میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا اور بلاشبہ اسے یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ اگر رات کے وقت کوئی پولیس افسر یا کوئی اور اعلیٰ عہدے دار تلاشی کے وارنٹ لے کر آئے تو وہ سیف میں رکھی ہوئی تمام چیزیں ضائع کر دے۔ سینڈس نے میرے سامنے اس سیف کے حفاظتی انتظامات کا بڑے فخریہ انداز میں ذکر کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ چوکیدار اور الیکٹرک الارم کے علاوہ سیف میں ایک اور مشین بھی لگی تھی

جس کے آن کرنے کا بٹن ایک میز میں فٹ کیا گیا تھا۔ بٹن دبانے پر سیف کے اندر رکھی ہوئی تمام کتابیں، رجسٹر اور کاغذات چشم زدن میں جل کر راکھ ہوجاتے لیکن ساتھ ہی چوکیدار کو سختی سے یہ ہدایت کی گئی تھی کہ انتہائی ضرورت اور مجبوری کے بغیر وہ یہ بٹن کبھی نہ دبائے کیونکہ ظاہر تھا کہ ایک مرتبہ اگر وہ رجسٹر ضائع ہوجاتے تو ان کے بغیر نہ صرف کاروبار کو سنبھالنا مشکل تھا بلکہ ان کی دوبارہ تیاری ایک صبر آزما مرحلے سے کم نہ تھی اور ہمیں یہی توقع تھی کہ چوکیدار کم سے کم اتنا عقلمند ضرور ہوگا کہ وہ پولیس کو دیکھتے ہی بٹن دبانے کی حماقت نہیں کرے گا۔ چوکیدار کئی مرتبہ کا سزا یافتہ مجرم بھی تھا۔ اگرچہ کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن اس نے ہمارے اگلے قدم کی کامیابی کو آسان بنا دیا۔

''میں نے اپنے دونوں مددگاروں یعنی جعلساز اور سیف توڑنے والے کی جیل سے رہائی کا انتظام کیا۔ انہیں ایک ایک پولیس ریوالور بھی دے دیا، پھر میں انہیں اپنے ساتھ اپنی کار میں لے کر پراپرٹی ایجنسی کے دفتر روانہ ہوا۔ کار دفتر سے ایک بلاک کے فاصلے پر چھوڑ دی اور عمارت کے عقبی دروازے کی جانب مگر اس سے کچھ دور اس طرح چھپ کر بیٹھ گئے، جہاں سے دروازے اور سڑک دونوں پر نگاہ رکھی جاسکے۔ اس وقت شام کے آٹھ بجے تھے، کلرک اور دوسرے تمام لوگ جاچکے تھے اور صرف چوکیدار ڈیوٹی پر تھا۔

''چند منٹ کے بعد ایک پولیس کار آئی، دو آفیسر اترے اور انہوں نے عقبی دروازے پر دستک دی۔ چوکیدار نے دروازہ کھولا، پولیس افسروں اور چوکیدار میں کچھ باتیں ہوئیں۔ ہم اتنی دور تھے کہ ان کی باتیں نہیں سن سکتے تھے لیکن میں نے دیکھا کہ چوکیدار کچھ غصے میں اور کچھ الجھن میں مبتلا ہے، ایک آفیسر نے ریوالور نکال لیا تھا۔ پھر جیسے بادل ناخواستہ چوکیدار نے جیب سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر دکھایا اور پھر چاہتا تھا کہ اندر واپس جائے۔ غالباً فون پر ارون کو یہ اطلاع دینے کے لیے کہ اسے گرفتار کیا جارہا ہے لیکن ہمارے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت آفیسر نے اسے اندر جانے اور فون کرنے کا موقع نہیں دیا۔ انہوں نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں اور اسے اپنی کار میں ساتھ لے کر روانہ ہوگئے۔ وہ عقبی دروازہ کھلا چھوڑ گئے تھے۔ طے یہ ہوا تھا کہ چوکیدار کو جیل میں بند کردیا جائے گا اور اگلی صبح چھ بجے معذرت کرکے اسے رہا کردیا جائے گا کہ اسے کسی دوسرے شخص کے شبہے میں گرفتار کیا گیا تھا۔ وہ شخص اب پکڑلیا گیا ہے اس لیے اسے اب آزاد کیا جارہا ہے۔

بہرحال جیسے ہی پولیس آفیسر چوکیدار کو لے کر رخصت ہوئے تو میرے دونوں ساتھی ایجنسی کے دفتر میں پہنچے اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ میرے پاس بھی ریوالور تھا اور وہ دونوں یہ بات جانتے تھے کہ مجھے دھوکا دے کر بھاگنا ان کے لیے مشکل ہے۔

''پہلے سیف کھولنے والے نے اپنے کام کی ابتدا کی۔ اس نے الیکٹرک کے الارم کے تار تلاش کرکے انہیں کاٹ دیا پھر سیف کھولنے میں مصروف ہوگیا۔ یہ خاصا صبر آزما کام ثابت ہوا۔ یوں ہم چاہتے تو سیف کو توڑ بھی سکتے تھے لیکن میرے منصوبے کے مطابق یہ بہت ضروری تھا کہ بعد میں ارون یا کسی اور کو یہ شبہ نہ ہوسکے کہ سیف کھولا گیا ہے۔ اسے اتنی دیر لگی کہ میں تو پریشان ہونے لگا تھا کہ شاید اس کے بس کی بات نہیں ہے مگر آخر کار طویل محنت کے بعد اس نے کامیابی حاصل کرلی۔

''اب میری اور اس جعلساز کی باری تھی۔ پہلے میں نے سیف میں رکھے ہوئے تمام رجسٹروں اور کاغذات کا جائزہ لیا اور ان رجسٹروں کو چھانٹ کر الگ کرلیا جن کا تعلق ارون کے گروہ اور اس کے کالے کاروبار سے تھا۔ میں نے انہیں سرسری نظر سے دیکھا۔ ہرچند مجھے اکاؤنٹ کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن مجھ جیسا اکاؤنٹ سے کورا آدمی بھی یہ دیکھ سکتا تھا کہ ان رجسٹروں میں مجرموں کی تنظیم کے طریق کار اور ان کی آمدنی وخرچ کے بارے میں ایسی ایسی تحریریں تھیں کہ میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ان رجسٹروں کی مدد سے ہم ارون اور اس کے گروہ کا مکمل خاتمہ کرسکتے تھے لیکن ہم وہاں ان رجسٹروں پر ایک نظر ڈالنے نہیں گئے تھے ان رجسٹروں کو چرا کرلے جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اگر میں انہیں لے جاتا تب بھی انہیں عدالت میں پیش نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ عدالت میں صرف ثبوت کا پیش کرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی بتانا پڑتا ہے کہ وہ ثبوت کس طرح حاصل کیا گیا اور اس معاملے میں نہ میرے پاس تلاشی کا وارنٹ تھا اور نہ میں ارون کی اجازت سے اس کے آفس میں داخل ہوا تھا۔ میں کسی کے مکان میں ناجائز طور پر داخل ہوا تھا اور نقب زنی کا مجرم تھا اور اگر میں یہ رجسٹر عدالت میں پیش کرتا تو ارون کے ساتھ جو کچھ ہوتا وہ تو ہوتا، لیکن اس سے پہلے مجھے اور میرے ساتھ دوسرے لوگوں کو جو اس منصوبے میں شامل تھے، چوری کے جرم میں گرفتار کرلیا جاتا۔

''چنانچہ میں ان رجسٹروں کو چوری کرنے وہاں نہیں گیا

تھا، میں ان رجسٹروں کے فوٹو اتارنے گیا تھا اور یہ کام جعلساز کے سپرد تھا، وہ اس کام کو جانتا بھی تھا۔ ایک ایک صفحہ کر کے اس نے تمام رجسٹروں اور نوٹ بکس کے فوٹو اتارے۔ یہ کام بھی گھنٹوں کا تھا۔ میں پسینے میں شرابور ہر چند منٹ کے بعد اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب آخری رجسٹر کے آخری صفحے کا فوٹو لیا گیا تو چھ بج کر دو تین منٹ ہو چکے تھے اور ہم جانتے تھے کہ ٹھیک چھ بجے چوکیدار کو جیل سے رہا کر دیا گیا ہوگا اور وہ جلد سے جلد یہاں پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ ہم نے جلدی جلدی وہ فلم سمیٹی جواب تک اتاری جا چکی تھی۔ جعلساز نے رجسٹروں پر ایک آخری نگاہ ڈالی۔ اسے رجسٹروں کی نقل تیار کرنے کے لیے تمام جزویات اور باریک سے باریک تفصیل کی ضرورت تھی۔ تحریر کا انداز، روشنائی کا رنگ اور اسی طرح کی دوسری چیزیں تاکہ بعد میں بالکل اسی طرح کے رجسٹر خرید کر وہ لی گئی تصویروں کی مدد سے ان کا ایک ایک صفحہ اصل رجسٹر کے مطابق تحریر کر سکے۔

”سب کام کر کے، چیزیں سمیٹ کر رجسٹروں اور دوسرے کاغذات کو بالکل اسی طرح سیف میں رکھ کر جس طرح وہ پہلے رکھے ہوئے تھے اور سیف کو بند کر کے، اپنی آمد کا ہر نشان مٹاتے ہوئے جب ہم آفس سے باہر نکلے تو چھ بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ چوکیدار کسی بھی لمحے پہنچنے والا ہوگا۔ بہرحال ہم لوگ اس کے نمودار ہونے سے پہلے ہی وہاں سے چلے آئے تھے، بعد میں مجھے پتا چلا کہ جب ارون کو اس واقعے کا علم ہوا تو وہ اور اس کے آدمی کئی دن تک نہ صرف چوکیدار سے پوچھ گچھ کرتے رہے بلکہ انہوں نے تمام دفتر اور خاص طور پر سیف کی ایک ایک چیز کا جائزہ لیا لیکن آخر کار وہ مطمئن ہو گئے کہ چوکیدار کی گرفتاری واقعی کسی غلط فہمی کا نتیجہ تھی اور یہ کہ اس کی گرفتاری سے پولیس کے پیش نظر کوئی اور مقصد نہیں تھا۔ چوکیدار کو بدستور اپنی ڈیوٹی پر برقرار رکھا گیا تھا۔

”دوسری طرف ہمارے جعلساز مددگار کو سادہ رجسٹر خرید کر ان پر تمام اندراجات منتقل کرنے میں سات ہفتوں کی شب و روز محنت صرف کرنا پڑی۔ اس نے اس قدر جسمانی اور ذہنی محنت سے کام کیا کہ جب اس کا کام ختم ہوا تو وہ تھک کر چور ہو چکا تھا۔ اس نے واقعی اپنی آزادی کی قیمت ادا کر دی تھی۔ چنانچہ اسے اور سیف توڑنے والے کو پولیس کی نگرانی میں میکسیکو کے شہر ایل پاسو لے جا کر رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد مجھے ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی اور نہ کبھی وہ واپس ٹکسن آئے۔ مجھے امید ہے کہ اس حادثے سے عبرت پکڑ کر وہ آئندہ پوری طرح محتاط رہے ہوں گے۔

”گورنر کے مشیر کا انتخاب ہونے میں صرف تین دن باقی رہ گئے تھے اور ان تین دنوں میں یہ بات مشکل نظر آتی تھی کہ ہر قسم کی عدالتی کارروائی سے گزرنے کے بعد ہم ارون کے امیدوار کو الیکشن میں حصہ لینے سے روک سکیں گے لیکن کوشش کرنا بہرحال ہمارا فرض تھا۔ میں کسی رازداری کے اہتمام کے بغیر سیدھا سپیریئر کورٹ کے سامنے پیش ہوا اور درخواست کی کہ ہمیں پراپرٹی ایجنسی اور ارون کے دوسرے کاروباری دفاتر کی تلاشی کا وارنٹ اور ضروری رجسٹروں، کتابوں اور کاغذات کو قبضے میں لینے کا اختیار دیا جائے۔

”ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی پولیس کے چھاپے کی اطلاع وقت سے پہلے ہی ارون اور اس کے کارندوں کو مل گئی اور جب تک میں پولیس کے آدمیوں کو لے کر ایجنسی کے دفتر پہنچتا، دفتر کا سیف تمام اہم رجسٹروں اور کاغذات سے خالی کیا جا چکا تھا۔ اب وہاں صرف جائداد کی خرید و فروخت سے متعلق چند رجسٹر اور کاغذات ہی نظر آ رہے تھے۔ جس وقت سیف کھولا جا رہا تھا تو ہم نے دفتر کے تمام عملے کو ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ میں نے ہر کمرے میں ایک چکر لگایا اور پھر سب کے ساتھ آملا۔ میں نے پولیس کے انچارج آفیسر کو بتایا کہ وارنٹ کے مطابق ہمیں نہ صرف سیف یا دفتر بلکہ پوری عمارت میں ہر جگہ تلاشی لینے کا اختیار دیا گیا ہے اور اسے ہدایت کی کہ وہ دفتر کے ہر کمرے بلکہ ہر میز اور ہر الماری کی اچھی طرح تلاشی لے۔

”تھوڑی ہی دیر میں پولیس کے ایک نوجوان ڈیٹیکٹو نے بیرونی آفس میں ایک میز کی نچلی دو درازوں سے وہ تمام رجسٹر اور نوٹ بکس برآمد کر لیں جن کی ہمیں ضرورت تھی میں نے اس اطلاع پر دوسروں کو دکھانے کے لیے بڑی حیرت اور خوشی کا اظہار کیا۔

”سترہ سال کے بعد ارون کا جیل ہی میں انتقال ہو گیا۔ اس کارنامے کے صلے میں پہلے مجھے ڈسٹرکٹ اٹارنی اور آخری جج کے عہدے پر ترقی مل گئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس طرح انصاف کے تقاضے پورے ہوئے یا نہیں؟“

”لیکن ان لوگوں کو یہ شبہ ضرور ہوا ہوگا کہ وہ رجسٹر اور کاغذات جعلی ہیں۔“ ہیرس نے کہا۔

”بلاشبہ انہیں تو شک ہونا ہی تھا۔“ جج صاحب نے

بتایا۔ ''ان کے وکیلِ صفائی نے مختلف مقامات سے ماہرین کی ایک پوری جماعت یہ ثابت کرنے کے لیے بلائی کہ وہ رجسٹر جعلی ہیں اور رجسٹروں میں درج شدہ اندراجات ارون یا اس کے اکاؤنٹ کلرکوں کے ہاتھ سے تحریر کردہ نہیں۔''

''تب پھر اس کے نتیجے میں تم مقدمہ ہارے کیوں نہیں، جیت کیسے گئے؟''

''اس لیے کہ ماہرینِ تحریر بغیر اپنا بیان دیے واپس چلے گئے۔''

''میں کچھ نہیں سمجھا؟''

''انہوں نے وکیلِ صفائی کو بتایا کہ رجسٹر میں جملہ اندراجات ہرگز ہرگز جعلی نہیں ہیں اور جب انہوں نے اس رائے کا اظہار کیا تو وکیلِ صفائی نے جتنی جلدی ممکن ہوسکا، انہیں قصبے سے واپس بھجوا دیا۔ چنانچہ ہمیں اپنے ماہرینِ تحریر پیش کرنا پڑے جنہوں نے حلفیہ بیان دیا کہ رجسٹروں کے اصلی ہونے میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ میں وکیلِ صفائی کے بلائے ہوئے ماہرین سے بیان دلواتا کیونکہ اس طرح بات ذرا زیادہ دلچسپ اور وزنی ہوجاتی، لیکن جیسا کہ میں نے کہا انہیں بڑی عجلت میں قصبے سے باہر بھجوا دیا گیا تھا۔''

''میں اب بھی آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔'' ہیرس نے الجھتے ہوئے کہا۔ ''آخر ماہرین ایسا بیان دینے پر کیسے راضی ہوگئے؟''

جج صاحب کے ہونٹوں پر ایک شوخ مسکراہٹ نمایاں ہوگئی۔ ''اس لیے کہ وہ تمام رجسٹر اور کاغذات حقیقت میں جعلی نہیں بلکہ اصلی ہی تھے۔'' انہوں نے لطف لیتے ہوئے کہا۔ ''جس رات ہم نے سیف کھول کر رجسٹروں کے فوٹو اتارے تھے تو سیف توڑنے والے نے مجھے سیف کے قفل کا نمبر بتا دیا تھا اور میں نے اسے حفاظت سے اپنی ڈائری میں نوٹ کرلیا تھا۔ جس دن ہم نے چھاپا مارا اس سے ایک رات قبل میں نے پولیس کے دو آفیسروں کو ایجنسی کے دفتر بھیجا کہ وہ چوکیدار کو اپنے اِدھر اُدھر کے سوالات میں الجھا کے عمارت سے باہر لے جائیں۔ ایسا ہی کیا گیا۔ پولیس آفیسر چوکیدار کو باہر سڑک پر کھڑی ہوئی اپنی کار تک لے گئے اور انہوں نے اسے پانچ منٹ سے زیادہ روکا بھی نہیں، لیکن میرے لیے پانچ منٹ ہی کافی تھے۔ میں نے سیف کھولا، اس کے اندر سے اصلی رجسٹر اور کاغذات نکالے اور ان کی جگہ جعلی رجسٹر رکھ دیے۔ اور پھر دوسرے دن چھاپے کے دوران جب دفتر کے عملے کو ایک کمرے میں بند کردیا گیا تو میں نے ان اصل رجسٹروں کو ایک میز کی نچلی دو درازوں میں چھپا دیا، جہاں سے بعد میں انہیں برآمد کرنے کا ڈراما کھیلا گیا۔ چنانچہ جو رجسٹر ہم ایجنسی کے دفتر سے بظاہر برآمد کرکے لے گئے تھے، اصل رجسٹر تھے، نقلی نہیں تھے۔ جبکہ سیف میں رکھے ہوئے جعلی رجسٹروں کو اصل خیال کرتے ہوئے ارون نے ہمارا چھاپا پڑنے سے پہلے ہی کہیں چھپا دیا تھا۔ چنانچہ تم سمجھ سکتے ہو کہ ہم کسی کو دھوکا یا فریب نہیں دے رہے تھے۔ ہم ایک وارنٹ لے کر آئے اور تلاشی میں ہم نے وہی چیز حاصل کرلی جسے حاصل کرنے گئے تھے۔ ارون کے اصل رجسٹر...... اور یہ ہی اصلی رجسٹر عدالت میں پیش کیے گئے تھے۔''

جج صاحب نے ایک نیا سگار نکال کر سلگایا اور کش لے کر بولے۔

''بے شک ارون اور اس کے ساتھیوں کو اس بات پر بڑا...تعجب تھا کہ ہم اصلی رجسٹر پیش کرنے میں کیسے کامیاب ہوسکے، کیونکہ ارون تو اپنی دانست میں انہیں چھاپا پڑنے سے پہلے ہی کسی خفیہ مقام پر پہنچا چکا تھا اور غالباً اسے کبھی یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ جن رجسٹروں کو وہ اتنی حفاظت سے چھپا رہا ہے، وہ جعلی ہیں۔''

''آپ نے ذہانت اور چالاکی میں لومڑی کو بھی مات دے دی۔'' ہیرس ہنسنے لگا۔

''جہاں تک مقدمے کا تعلق ہے ہم نے شروع سے آخر تک...... قطعی قانونی تقاضوں کے مطابق لڑا۔ ہم نے کوئی جعلی ثبوت نہیں بنایا اور نہ پیش کیا۔ ہم نے کسی کو فریب نہیں دیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ارون کو جیل بھجوانے اور اس کی مجرمانہ سرگرمیوں کو ختم کرنے کی کوشش میں، میں ایک سے زیادہ قانون توڑنے کا مرتکب ہوا۔ اب تم بتاؤ کہ تم حصولِ انصاف کے اس طریق کار کے بارے میں کیا فیصلہ دو گے؟ کیا واقعی جائز مقصد حاصل کرنے کے لیے غلط اور ناجائز ذرائع اختیار کرنا قانونی اور اخلاقی اعتبار سے درست ہے؟''

''میں...... میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' ہیرس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''سچی بات یہ ہے کہ اتنی مدت گزرنے کے باوجود میں خود آج تک اس بارے میں کسی ایک فیصلے پر نہیں پہنچ سکا۔'' جج صاحب نے متانت سے کہا اور خاموشی سے سگار کے کش لینے لگے۔

لاچس کولا

ڈاکٹر شیر شاہ سید

زیرِنظر کہانی اپنے عنوان سے ہی چونکا رہی ہے... یقیناً اس کے مصنف کو بھی اسی جستجو اور دلچسپی نے لکھنے پر مجبور کیا ہوگا... دنیا میں جگہ جگہ بہت کچھ اوجھل اور بہت کچھ نمایاں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہیں ”بہت“ ہے اور کہیں ”کچھ“ ہے لیکن جو بھی ہے دلچسپ ہے۔

غیر ملکی معاشرے اور نئے پس منظر میں انوکھا منظر

”یہ الورتینا کی تصویر ہے۔“ اس نے خوب صورت فریم کی ہوئی ایک تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

الورتینا یقیناً خوب صورت تھی۔ ایک خاص کشش تھی اس کے چہرے پر اور چبھتی ہوئی آنکھیں جیسے دور تک دیکھ رہی ہوں۔ میں ٹھٹک کر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

لاچس کولا میں الورتینا کی تصویر کیوں تھی، میں سوچنے لگا۔ لاچس کولا اس گھر کا نام تھا جو ایک جہاز کے مانند تھا۔ ایک چھوٹا سا بحری جہاز...... خشکی پر ٹھہرا ہوا۔

یہ سب کچھ چلی کے شہر سانتیا گو میں ہو رہا تھا۔ اسی چلی میں جس کا نام پہلی دفعہ میں نے اس وقت سنا جب میں میڈیکل کالج میں دوسرے سال کا طالب علم تھا۔ صبح تقریباً ساڑھے آٹھ بجے بس کے رکتے ہی نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے بورڈ پہ نظر پڑی جہاں موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا کہ 'امریکا کی مدد سے چلی کے صدر ایلندے کو قتل کر دیا گیا ہے۔' ایلندے جو عوام کا منتخب کردہ .... تھا، فوجی بوٹوں کے تلے روندا گیا۔

پھر سانتیاگو کا نام اس وقت سامنے آیا جب میں نے لندن میں جیک لیمن کی فلم 'مسنگ' (Missing) دیکھی جس میں جیک لیمن ایک ایسے امریکی باپ کا کردار ادا کرتا ہے، جس کے صحافی بیٹے کو سانتیاگو میں قتل کرنے کے بعد اس کی لاش غائب کر دی جاتی ہے۔ جیک لیمن کا کردار بڑی ہوشیاری اور نہایت دردمندی کے ساتھ انسانی حقوق کی پامالی کی روداد بیان کرتا ہے۔ اس وقت سے میرے دل میں خواہش تھی کہ چلی دیکھوں اور سانتیاگو کا وہ میدان بھی دیکھوں جہاں نہ جانے کتنے کمیونسٹوں کو حق و انصاف کی آواز بلند کرنے کے جرم میں پنوشے کے دورِ اقتدار میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

چلی کے اسی شہر سانتیاگو میں قسمت ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے لے آئی تھی۔

سانتیاگو شہر کے بازاروں، گلیوں میں گھومتے ہوئے چائے خانوں، کافی ہاؤسز میں محظوظ ہوتے ہوئے شراب خانوں اور ریستورانوں میں چکر لگانے کے بعد ہمارا گروپ لاچس کولا پہنچا تھا۔

''یہ میری نانی ہے۔'' میرے گائڈ گونسالو ایستورا نے میرے چہرے پر ابھرے ہوئے سوالوں کو بھانپ کر خود ہی جواب دیا۔

اس جواب نے میرے دماغ میں مزید پیچیدگیاں پیدا کر دی تھیں۔ ''لاچس کولا'' سانتیاگو شہر کے بیچوں بیچ پابلو نیرودا کا جہاز نما گھر تھا۔ پابلو کے گھر میں خوب صورت عورت الورتینا کی تصویر جو ہمارے گائڈ گونسالو ایستورا کی نانی تھی۔ میں نے سوچا کہ گائڈ نے یہ تصویر ایسے ہی لگا دی ہوگی، خوب صورت عورتوں کو تو سجایا بھی جا سکتا ہے۔

میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ اس نے امریکی لہجے والی انگریزی میں آہستہ آہستہ رک رک کر کہا کہ ''الورتینا پابلو کی معشوقہ تھی۔ ایک طویل مدت تک اس کی محبوبہ رہی۔ یہ تصویر اور اس کے برابر رکھے ہوئے تمام خطوط پابلو نے گاہے بہ گاہے الورتینا کو لکھے تھے۔'' وہ سارے خطوط بڑی احتیاط سے تصویر کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ تاریخ سیکنڈ، منٹ، گھنٹے، دن۔ ان ہفتے مہینوں اور سالوں کو پھلانگتے ہوئے الورتینا کے پاس رک گئے تھے۔

''پابلو کی پہلی کتاب میں الورتینا کے لیے بے شمار نظمیں ہیں۔ وہ تمام محبت بھری نظمیں ان انسانی جذبات سے کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں جو زندگی میں خوشی، لگن، جذبہ اور مقصد بھر دیتے ہیں۔'' گونسالو نے بڑے رومانی انداز میں تقریر کی تھی۔

ہم سب اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ پابلو نے صرف عشق کیا اور تمام زندگی عشق میں گزار دی۔ سمندر سے عشق، عورت سے عشق، علم اور کتابوں سے عشق، جنوبی امریکا، افریقا اور ہندوستان سے عشق اور پھر جمہوریت، شخصی آزادی اور آزادی کے دیوانوں سے عشق۔ اس کا عشق، اس کی محبت کہیں چھپی ہوئی ہے، کہیں علی الاعلان اشتہار بنی ہوئی ہے۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا۔ وہ کہیں تو بالکل سامنے ہے اور کہیں مکمل طور پر چھپا ہوا اور پراسرار۔

میرے دل میں آیا کہ میں اس سے پوچھوں کہ کیا وہ اپنی نانی الورتینا کے بارے میں صحیح کہہ رہا ہے۔ ابھی یہ سوال ذہن میں کلبلا ہی رہا تھا کہ اس نے کہا۔ ''اب اس جہاز نما مکان کو ہی دیکھ لیں۔ یہ مکان بھی پابلو کی طرح پراسرار ہے۔ پابلو کی طرح عاشق ہے اور پابلو کی طرح بے باک بھی۔''

گونسالو نے کسی اچھے گائڈ کی طرح ہم لوگوں کو مسحور کر لیا تھا۔ ''اس گھر کو پنوشے کے فوجیوں نے تباہ کر دیا۔ پابلو نے یہ گھر بڑی محبت سے مٹلڈا کے لیے بنایا تھا۔ وہ سامنے تصویر ہے مٹلڈا کی۔ مٹلڈا سے اس نے شادی نہیں کی مگر وہ آخر دم تک اس کی محبتوں کا مرکز بنی رہی۔'' ہم سب نے دیوار پر لگی ہوئی عورت کی تصویر کو دیکھا۔ بھرے بھرے ہونٹ، چہرے کی ابھری ہوئی ہڈیاں۔ چمکتی ہوئی آنکھیں اور سر پر ڈھیر سارے سیاہ بالوں کا بڑا سا الجھا ہوا دائروں میں بنا گھونسلا۔

''یہ تصویر پابلو کے ایک بہت اچھے دوست نے بنائی ہے۔ اسے غور سے دیکھیں۔ اس تصویر میں صرف ایک مٹلڈا نہیں ہے اور بھی بہت کچھ ہے۔'' گونسالو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم سب بڑے غور سے خوب صورت مٹلڈا کی تصویر دیکھ رہے تھے اور ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"لاچس کولا......" اس نے زور سے کہا۔ "لاچس کولا کا مطلب ہے گھنے بالوں والی عورت۔ مٹلڈا گھنے بالوں والی عورت تھی۔ پابلو نے لاچس کولا اس کے لیے بنوایا تھا اور اس کی اسی صفت پر اس گھر کا نام رکھ دیا تھا۔"

"اس تصویر میں فنکار نے ایک اور شرارت کی ہے۔" اس نے پھر مسکرا کر کہا۔ "پابلو نے مٹلڈا سے کبھی شادی نہیں کی مگر ہمیشہ مٹلڈا کے پیچھے کہیں چھپا رہا۔" یہ کہہ کر گونسالو آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے گتے کے کارڈ سے مٹلڈا کا چہرہ اور پیشانی چھپادی۔

ہم سب حیران رہ گئے۔ مٹلڈا کے گھنے بالوں کی چھوٹی چھوٹی لہروں میں پابلو مسکرا رہا تھا۔ وہی چہرہ، وہی پیشانی، وہی گال، وہی ٹھوڑی اور پچکی ہوئی ناک کے نیچے وہی پتلے نیلے مسکراتے ہوئے ہونٹ۔

وہ مٹلڈا کے گھنے بالوں میں، لاچس کولا میں چھپا رہا، لکھتا رہا۔ اس کمرے کے دوسری جانب بنے ہوئے چھوٹے سے مے خانے میں سرخ اور سیاہ انگور کی شراب پیتا رہا۔ کمرے کی دیواروں میں بنی ہوئی جہازی کھڑکیوں سے، دیوار کو چھوتی ہوئی مصنوعی سمندر کی لہروں کو گنتا اور لکھتا رہا۔ اپنی محبتوں کے بارے میں، ان فوجیوں کے بارے میں جو غاصب بھی تھے اور غدار بھی۔ ان سیاسی کارکنوں کے بارے میں جن کی لاشیں راتوں کو ہیلی کاپٹروں میں بھر کر بیچ سمندر میں شارک مچھلیوں کی خوراک بنادی گئیں۔ وہ محبتوں کے دوران اور عشق کے کربناک لمحوں میں بھی ان مزدوروں، صحافیوں اور ان باضمیر انسانوں کا درد لے کر فوجی جنتا کے جسم و روح پر بوجھ بن گیا تھا۔

ہم اب لاچس کولا کے دوسرے کمرے میں پابلو کے چھوٹے سے مے خانے میں اور اس کے ساتھ بنے ہوئے باورچی خانے میں شراب کی پرانی بوتلوں، مختلف انداز و اطوار کے جام اور ہندوستان اور افریقا سے جمع کیے ہوئے برتنوں کو دیکھ رہے تھے۔ اس کمرے کے ساتھ ہی پابلو کی خواب گاہ تھی، پرانے زمانے کا اونچے ستونوں والا پلنگ جیسے کسی جہاز کے کیبن میں رکھا ہوا تھا۔

"پابلو نے دو خواب گاہیں بنائی تھیں۔ ایک یہ اور ایک اوپر، کتابوں کے کمرے کے ساتھ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں کتابوں کا وہ کمرا نہیں دکھا سکوں گا مگر اس خواب گاہ کی ایک خاص بات ضرور بتانا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر گونسالو نے دیوار سے لگی ہوئی الماری کا دروازہ کھول دیا۔ یہ

ایک سادہ سی الماری تھی۔ اس نے بیچ کا دروازہ بھی کھول کر دکھایا۔ یہ بھی ایک سادہ سی الماری تھی جس میں ہینگر لٹکانے کے لیے راڈ لگی ہوئی تھی جہاں پابلو اپنے کپڑے لٹکاتا ہوگا۔ الماری کے تیسرے دروازے کو کھولا گیا تو وہ بھی ایک سادہ سی الماری ہی تھی مگر اوپر سے نیچے تک اس میں کسی ہینگر کی جگہ نہیں تھی۔ غور سے دیکھنے پر پتا لگا کہ درحقیقت الماری کے اندر ایک اور دروازہ تھا۔ اس دروازے کا ایک پوشیدہ ہینڈل تھا۔ گونسالو نے آہستہ سے ہینڈل کو گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ ہم سب الماری کے اس دروازے سے پابلو کے گھر سے باہر آچکے تھے۔

''آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا کہ پابلو کو اس خفیہ دروازے کی کیا ضرورت تھی۔ شاید وہ جاننے والوں سے چھپتا رہا۔ شاید یہ دروازہ فوجی جاسوسوں کو دھوکا دینے کے لیے بنایا گیا تھا۔ خواتین وحضرات! میں گونسالو ایسٹودا، الورتینا کا نواسہ جو پابلو کی محبوبہ تھی، پابلو کے اس راز سے پردہ اٹھانے کے قابل نہیں ہوں۔''

''مجھے پتا ہے آپ لوگ پابلو کی لائبریری دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان بیش قیمت پینٹنگز کو دیکھنا چاہتے ہیں جو پکاسو نے خود بنا کر پابلو کو دی تھیں۔ چلیے میں آپ کو لے چلتا ہوں مگر افسوس کہ آپ انہیں نہیں دیکھ سکیں گے۔''

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا ہم کچھ نہ سمجھتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کے قدموں کے نشان پر چل رہے تھے۔

''یہ سارا مکان لوٹ لیا گیا۔ ایک رات پنوشے کے فوجیوں نے اس پر دھاوا بول دیا۔ بے شمار کتابیں، بیش قیمت پینٹنگز اور پابلو کے جمع کیے ہوئے مختلف نوادرات فوجی اٹھا کر لے گئے۔ آج تک پتا نہیں چل سکا کہ وہ کتابیں، فن کے وہ نادر نمونے کہاں گئے۔ فوجیوں نے جہاں لوٹ مار کی وہاں لاچس کولا کو بھی تباہ وبرباد کردیا۔ جہازی مکان کی کھڑکیاں، کھڑکیوں کے باہر کھڑا ہوا پانی کا نظام جسے پابلو سمندر کی طرح دیکھا کرتا تھا، ان لوگوں نے سب کچھ ختم کردیا۔'' میں نے سوچا فوج کہیں کی بھی ہو، کسی زمانے کی بھی ہو صرف فوج ہوتی ہے۔ حالتِ امن میں بھی لوٹ اور حالتِ جنگ میں بھی لوٹ۔ شاید لوٹ فوجی تربیت کا بنیادی جز ہے۔

لائبریری کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں پابلو اپنے مہمانوں کی دلداری کرتا ہوگا۔ کمرا اب بھی کچھ بچی ہوئی چیزوں سے سجا ہوا تھا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ پابلو ہندوستان میں سفارت کاری بھی کرتا رہا تھا اور افریقا میں بھی گھومتا رہا تھا۔ راجستھان، یوپی، حیدرآباد اور کیرالا سے جمع کی ہوئی چھوٹی چھوٹی خوب صورت چیزیں فوجیوں کی دستبرد سے محفوظ رہی تھیں۔ وہ تمام چیزیں اب بھی پابلو کی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں۔ پابلو کو گلاس جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ ملک ملک کے گلاس، طرح طرح کے پیالے گھر میں موجود الماریوں میں اب بھی سجے ہوئے تھے۔

لوگ انہماک سے پابلو کے جمع کیے ہوئے نوادرات دیکھ رہے تھے۔ میں گونسالو کے قریب کھڑا ہوگیا، پھر میں نے ہمت کرکے دھیرے سے پوچھا۔ ''مجھے اپنی نانی الورتینا کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

وہ ہنس دیا۔ ''تم سارے لوگ، جو ہندوستان سے آتے ہو ایسے ہی سوال کرتے ہو۔ تمہارا اگلا سوال یہ ہوگا کہ میں اس کے بارے میں کیا محسوس کرتا ہوں اور اس کے آگے کے سوال بھی مجھے پتا ہیں لہٰذا میں سارے سوالوں کا ایک ساتھ جواب دے دیتا ہوں۔''

گونسالو دبلا پتلا اٹھائیس تیس سال کا آدمی تھا۔ اس کے گہرے سیاہ بال تھے جو بہت بڑھے ہوئے تھے۔ اس نے بالوں کو پونی ٹیل کی طرح باندھا ہوا تھا۔ اس کی وسیع پیشانی سے بال کھینچ کر پونی ٹیل میں بندھ گئے تھے۔ اس کی بھویں گھنی تھیں اور نمایاں ناک کے ساتھ پتلے پتلے ہونٹ تھے۔ وہ خود بھی ایک خوب صورت آدمی تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کی نانی بھی بہت خوب صورت رہی ہوگی۔

''نہیں ہمیں کوئی پشیمانی نہیں ہے اس بات پہ کہ ہماری نانی الورتینا، پابلو کی محبوبہ تھی۔ درحقیقت یہ بات تو شاید کبھی بھی منظرعام پر نہیں آتی، شاید ہمیشہ ایک راز رہتی۔ دراصل پابلو کی محبت ایک راز ہی تھی۔ پابلو نے خود بھی کہا ہے کہ میں اس زمانے میں دوغلا تھا۔ الورتینا سے محبت کرتا تھا مگر اس کا برسرِعام اقرار نہیں کرسکتا تھا۔ اس وقت چلی اور سانتیا گو روایتوں اور مذہبی انتہا پسندوں کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا۔''

وہ پابلو کا ابتدائی دور تھا۔ وہ ڈرتا رہا، شاعری کرتا رہا، محبت کے نغمے گنگناتا رہا، چھپ چھپ کر الورتینا سے ملتا رہا۔ وہ بھی محبت کے خاموش طوفان میں رہی اور کوشش کرتی رہی کہ اس کے اور پابلو کے تعلقات کو قانونی شکل مل جائے مگر سماج کا نیٹ ورک زیادہ مضبوط تھا۔ وہ دونوں نہ شادی کرسکے نہ ساتھ رہ سکے اور الورتینا کی شادی میرے نانا سے

ہوگئی۔‘‘

’’میں نے پابلو کو اپنی نانی سے سمجھا ہے، پڑھا ہے، دیکھا ہے، محسوس کیا ہے۔ شاید اس دنیا میں پابلو سے سب سے شدید محبت اسی نے کی ہے۔‘‘

’’میرے نانا کے مرنے کے کئی سال کے بعد جب پابلو بھی مر چکا تھا، میری ماں کو جوتے کے دو ڈبوں میں چھپائے ہوئے پابلو کے خطوط مل گئے۔ اس وقت پہلی دفعہ میری نانی نے اقرار کیا کہ وہ پابلو کی محبوبہ رہی ہے۔‘‘

’’شروع میں ہمارے خاندان کے لیے یہ بڑے شرم کی بات تھی مگر میری ماں نے میری نانی کو پابلو سمیت قبول کرلیا۔ وہ ہمارے گھر میں بہت اطمینان سے اپنے بچوں کے درمیان پابلو کی تحریروں، نظموں کو دہراتی ہوئی ایک دن شاید اس کے پاس چلی گئی۔‘‘

گونسالو واقعات کو کسی نظم کی طرح بیان کر رہا تھا۔ اس کا دبلا پتلا جسم اپنے لمبے بالوں کے ساتھ بات کرتے ہوئے زور زور سے ہلتا تھا۔ ’’مجھے تو تم بھی شاعر لگتے ہو۔‘‘ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’ہاں میں بھی شاعر ہوں اور شاعری کرتا ہوں۔ رومانی شاعری، سیاسی شاعری، امریکا کے خلاف، ظلم وغربت کے خلاف، انصاف اور امن کے لیے، علم وآگہی کے لیے، ایک ایسے سماج کے لیے جہاں ظلم نہ ہو، انصاف ہو۔‘‘

’’تمہاری انگلش بہت اچھی ہے۔ چلی میں زبان کا بہت مسئلہ ہے۔ ہر کوئی ہسپانوی بولتا ہے کوئی انگلش سمجھتا ہی نہیں ہے؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’میں امریکا میں پڑھا ہوں اور میری بیوی بھی امریکن ہے، اس وجہ سے میری انگلش میں امریکن انداز ہے۔‘‘

’’تو تم امریکا واپس چلے جاؤ گے اپنی بیوی کے ساتھ؟‘‘

’’نہیں کبھی نہیں۔ امریکا میں کیا ہے۔ نہ تاریخ، نہ زبان، نہ کلچر صرف دوسری اقوام کو محکوم بنانے کی خواہش۔ اگر مجھے چلی چھوڑنا پڑا تو میں یورپ جاؤں گا اسپین، فرانس یا اٹلی۔‘‘

’’سانتیاگو کی یہ خاص بات ہے۔ ریسٹورنٹس میں کام کرنے والے بے شمار بیرے، ٹیکسیاں چلاتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور، ہزاروں کی تعداد میں نظر آنے والے وہ فنکار جو سڑکوں اور چھوٹے موٹے تھیٹروں میں کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں معاشی خوشحالی نہ ہونے کے باوجود امریکا نہیں جانا چاہتے، بلکہ یورپ جانا بڑے فخر کی بات مانی جاتی ہے۔ آخر کیوں؟‘‘ میں نے اس سے ایک طویل سوال کرڈالا۔

’’ارے! یہ تو بہت سادہ سی بات ہے۔ پورے جنوبی امریکا میں زیادہ تر لوگ اپنے آپ کو یورپ کی ان انقلابی تحریکوں سے وابستہ کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور انہیں اپنی شناخت بنانا چاہتے ہیں جن کا مقصد جمہوریت کا حصول، شخصی آزادی کی بالادستی اور انسانی حقوق کی بحالی ہے۔ امریکا میں یہ سب کچھ نہیں ہے، ان کے اصول مختلف اور پیمانے جدا ہیں۔ وہ امریکا میں امریکیوں کے لیے جو چاہتے ہیں وہ سب کچھ دنیا کے عوام کو دینا پسند نہیں کرتے ہیں۔ پابلو جیسے شاعروں کا یہی کمال ہے انہوں نے جنوبی امریکا کے عوام کو اور نوجوانوں کو شناخت دی ہے، ان میں ان بلند انسانی اقدار کی روح پھونکی جس نے انہیں دنیا سے تھوڑا مختلف کردیا ہے۔‘‘

’’پابلو نے مٹلڈا سے شادی کیوں نہیں کی؟‘‘ میں نے ایک اور سوال کیا۔

’’وہ لاچس کولا میں چھپا رہا۔ مٹلڈا کے گھنے بالوں میں اپنے آپ کو چھپا کر اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا رہا۔ اس نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا تھا مگر اس نے مٹلڈا سے بھی شادی نہیں کی۔ شاید وہ شادی کو نہیں مانتا تھا۔ وہ چلی کے اشرافیہ کے اس دوغلے پن سے شدید نفرت کرتا تھا جہاں وہ ایک بیوی اور خاندان کے ساتھ خوش وخرم رہنے کی نمائش کرتے تھے اور ہر ایک نے داشتائیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ یہ اس کی زندگی کا کوئی بھید نہیں تھا بلکہ مکمل طور پر اعلان تھا کہ وہ کس قسم کے سماج پر یقین رکھتا تھا۔ اگر اس کی شادی میری نانی سے ہوجاتی تو شاید اس کی زندگی کچھ اور ہوتی مگر اس کے باوجود بہت سارے سوالات ہیں جن کے جواب نہ مل سکے...... اور نہ کبھی ملیں گے۔‘‘

گروپ کے دوسرے لوگ لاچس کولا کے سامنے والے دروازے پر پہنچ چکے تھے جو سڑک پر کھلتا تھا جس پر حکومت کی جانب سے پابلو کی یادگار کی تعمیر کی گئی تھی۔ ہم لوگوں نے یادگار کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر تصویر کھنچوائی اور پابلو کے پسندیدہ ریسٹوران میں دوپہر کا کھانا کھانے چل دیے۔

ماروی

محی الدین نواب

چونتیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیرّ اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیرّ خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جھمرو اور چاچی فتی کے ساتھ اندرون سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا، وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ گاؤں سے فرار ہوکر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہوبہو مراد کا ہم شکل تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی، برباد کرکے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کرکے اسے اپنی بیٹی ظاہر کرکے الزام مراد پر لگادیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف تجلی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل وجان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بطور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی۔ مراد قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کررہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ ماروی چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے۔ مراد نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کرکے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کرکے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوگیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جارہا تھا۔ خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بو کے ساتھ مل گیا۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آگئی۔ مرینہ دوبارہ MET آفیسر بن گئی تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر ٹمیی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کرکے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجیکشن لگوادیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آگیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہوگئی اور پاکستان آگئی۔ ادھر مراد دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کرکے انڈیا پہنچ گیا۔ مرینہ اور مراد میں پھر ان بن ہوگئی۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ مراد اور مرینہ شدید زخمی ہوئے تاہم مرینہ اور مراد میں پھر صلح ہوگئی۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھانا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آرہی تھی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کرالیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوادیا۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے انڈیا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الرٹ ہوگئے اور وہاں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ درگا نے مراد کو وہاں سے بحفاظت نکال لیا تاہم بشریٰ اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت گھائل ہوگئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کرلیا گیا۔ وہ طیارہ ریاست باب النساء میں اترتا تاہم مراد نے جان پر کھیل کے ہائی جیکرز کو زیر کرلیا۔ مراد ملکہ نگارا کا مہمان بن گیا۔ ملکہ نے مراد کی باتوں سے اندازہ لگالیا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مراد نے بھی قبول کرلیا۔ ادھر مرینہ مراد کے غم میں چل بسی۔ مراد نے ملکہ نگارا سے نکاح پڑھوالیا اور بشریٰ اور بلے کو اپنی سیکرٹ فورس میں شامل کرلیا۔ ماروی کا بھی محبوب سے نکاح ہوگیا۔ مراد اور نگارا میں اختلاف ہوگیا اور یہ اختلاف طلاق پر منتج ہوا۔ مراد برسر اقتدار آگیا۔ بابا اجمیری کی دعاؤں سے مراد کو روحانی طاقت حاصل ہوئی اور وہ ایک سے دو ہوگئے یعنی ایک مراد اور دوسرا اس کا ہم زاد۔ دونوں جب چاہتے نادیدہ ہوجاتے۔ مراد

نے نادیدہ رہ کر دشمنوں کو ناکوں چنے چبوائے۔ مراد کو ایک لڑکی ماہ نور منگی پسند آ گئی۔ مراد نے اسے اپنی شریکِ حیات بنالیا۔ مراد اور ہم زاد کی نادیدہ صلاحیت ختم ہوگئی اب وہ دونوں اس صورتِ حال پر پریشان تھے۔ ادھر ہم زاد کو اس سے زیادہ اپنی محبوبہ جینی کے پاس نہ جانے کی پریشانی تھی، وہ اس کے بیٹے کی ماں بننے والی تھی۔ جینی کو ریاست ارضِ اسلام پہنچانے کے لیے جہاز میں سوار کیا گیا مگر حادثاتی طور پر جینی نے بچے کو جنم دیا اور خود جان کی بازی ہار گئی۔ وہ بچہ عجوبہ تھا۔ پیدا ہوتے ہی اس نے سب کو حیران کرنا شروع کر دیا۔ جینی کی لاش کو جہاز کے ذریعے واپس یہودیوں کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ یہودی اس عجوبہ بچے (عابد علی منگی) کو حاصل کرنا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ان کے مذہب پر چلے۔ وقت گزرتا گیا اور عابی دس برس کا ہوگیا۔ دس برس کا ہونے کے باوجود وہ نوجوان لگ رہا تھا۔ غیر معمولی طاقت کا حامل عابی کئی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ اس کا حافظہ بہت تیز تھا۔ عابی کو یہودیوں نے اغوا کرانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے مگر عابی نے ان کو ٹھکانے لگا دیا۔ دو اغوا کاروں کو عابی نے زندہ رکھا اور خواہش کی کہ وہ دنیا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ خود چلا گیا۔ عابی رومانیہ آ گیا۔ رومانیہ میں اسے پتا چلا کہ یہودی انسانی اعضا کی خرید و فروخت میں ملوث ہیں۔ مراد نے وہاں موجود اس عمارت کو نیست و نابود کر ڈالا۔ ادھر ہم زاد کے ہاں ایک اور بچے کی ولادت متوقع تھی جو عابی کی طرح عجوبہ تھا۔ دراصل وہ بچہ نہیں بچی تھی۔ مراد نے مشورہ دیا کہ بچی کا نام ماروی رکھا جائے تو زیب النساء محفوظ رہے گی۔ یہ ان کے دل کی بات تھی۔ ادھر اچانک خبر ملی کہ ماروی انتقال کر گئی ہے۔ اچانک زیب النساء کی کوکھ میں تین ماہ کی بچی متحرک ہوگئی تھی۔ مراد نے ماسٹر کو بو کی مدد سے اپنا چہرہ تبدیل کرلیا اور حماد کے نام سے اپنے کاغذات تیار کرا لیے۔ حماد کے پیچھے شائلہ شانی کی بیٹی تھی تاہم مراد نے اسے باور کرا دیا کہ وہ حماد کا ہم شکل ہے۔ ادھر ایئرپورٹ پر شائلہ پر حملہ ہوا عابی نے اسے زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا۔ عابی کو ایک پولیس افسر اپنے ساتھ لے گیا۔ تاہم پولیس افسر کو عابی سمیت اغوا کیا گیا۔ پولیس افسر مارا گیا۔ مرتے وقت اس نے اپنی بیٹی کی ذمے داری عابی کے سپرد کر دی۔ عابی نے ماریہ سے نکاح پڑھا لیا۔ عابی اپنے دوست پولیس آفیسر کی موت کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ماریہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ ادھر عابی کا ایک اور دشمن میدان میں اتر چکا تھا جو لوگوں کے دماغ میں گھس کر ان کے خیالات پڑھ لیتا تھا اور انہیں قابو میں کر کے کچھ بھی کروا سکتا تھا۔ کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ وہ کون ہے۔ دشمن خوش تھے کہ سیر پر سوا سیر آ گیا ہے۔ مگر وہ انجان دشمن عابی کے دماغ پر تسلط قائم نہیں کر پا رہا تھا اور پے در پے ناکامی کا منہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے ارضِ اسلام میں بشریٰ کے دماغ پر قابو پایا تاہم وہ اسے ایک ذرا نقصان پہنچا پایا۔ بشریٰ اس کے چنگل سے نکل گئی۔ ادھر شادی کی پہلی رات ماریہ چل بسی۔ سب سمجھنے لگے کہ اسے ان نون نے ہلاک کیا ہے۔ ماریہ عابی کی غیر معمولی طاقت کے زیرِ اثر اپنی جان سے گئی تھی۔ جو بھی ہوا تھا، مشیتِ ایزدی سے ہوا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

یہ دنیا مرد اور عورت کے باہمی تعلقات سے قائم ہے۔ ان تعلقات کے جاری و ساری رہنے سے دنیا آباد اور پُر رونق رہتی ہے۔ انسان پیدا ہوتا ہے، فنا ہوتا ہے۔ اس کی آمد و رفت کے لیے عورت کا وجود اس دنیا میں آنے کا پہلا دروازہ ہے۔

کبھی انسان کی اپنی غلطیوں سے اور کبھی قضائے الٰہی سے اس وجود میں تباہیاں آتی رہتی ہیں۔ ویسے ماریہ کے وجود کی تباہی انوکھی تھی۔ ایک کلی کی تیز و تند دھار سے ماریہ کی ہتھیلی کی پشت زخمی ہوگئی تھی۔ ایسا پہلے کبھی دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا تھا۔ وہ بعد ازاں اسی طرح زخم کھا کر اس دنیا سے گئی تھی۔

دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس عجیب معاملے پر گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ یہ سب ہی سمجھ گئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ پرنس عابی ایک پتھر ہے، جس پھول پر گرے گا وہ بری طرح پس کر رہ جائے گا۔ پرنس کے لیے یہ بحث بھی جاری تھی، کیا وہ فطری تقاضے پورے کیے بغیر پہاڑ جیسی زندگی گزار سکے گا؟

وہ مایوس نہیں تھا۔ آئندہ جو بھی ہونے والا تھا، اس کے لیے منفی انداز میں سوچ کر پریشان نہیں ہو رہا تھا۔ یہ اس کا ایمان تھا کہ اللہ اسے مایوس نہیں کرے گا۔ اسے ایک شریکِ حیات سے محروم نہیں رکھے گا۔ ابھی وہ نہیں جانتا تھا کہ کاتبِ تقدیر نے کیا لکھا ہے؟ وہ فطرتاً ہوس پرست نہیں تھا۔ صابر و شاکر تھا۔ قدرتی معاملہ یہ تھا کہ ماریہ کی قربت سے اس کے مزاج میں کچھ رومانی تبدیلیاں آئی تھیں۔ وہ داغِ مفارقت دینے والی طرح طرح سے یاد آتی تھی۔ کبھی اس کی آواز کا ترنم اور لہجے کی نزاکت سنائی دیتی تھی۔ کبھی خیالوں میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں آ جاتا تھا اور بدن کی نزاکت اور لطافت سینے سے لگ کر دھڑکنے لگتی تھی۔

وہ حسین دوشیزاؤں کو دیکھتا تو ماریہ کی طلب پکارنے لگتی تھی۔ وہ فوراً ہی حسین جلوؤں سے منہ پھیر لیتا تھا۔ نہ کبھی گناہ کا مرتکب ہو سکتا تھا، نہ ہی کسی کی قربت سے کھیلنے اور اسے موت کے گھاٹ اتارنے کا ظلم کر سکتا تھا۔ وہ غلطیوں سے اور گناہوں سے بچنے کے لیے بہت زیادہ محتاط رہنے لگا تھا۔ عورتوں سے کترانے اور پردہ کرنے کی حد تک دور رہنے لگا تھا۔ یہ اٹل فیصلہ کر چکا تھا کہ جب رب راضی ہوگا تب وہ کسی سے راضی ہوگا۔

دوسری طرف دوشیزاؤں اور بھرپور جوان عورتوں کے جذباتی معاملات تھے۔ وہ ماریہ کا انجام دیکھنے کے بعد سہم گئی تھیں پھر بھی خیالوں میں اور خوابوں میں اسے طلب کررہی تھیں۔

بھانت بھانت کی عورتیں اتنا کچھ ہونے کے باوجود اپنے مزاج کے مطابق دعویٰ کررہی تھیں کہ شہ زور پرنس کی قربت حاصل کریں گی۔

عابی کسی کا چیلنج قبول کرکے نہ تماشا کرنا چاہتا تھا، نہ خود تماشا بننا چاہتا تھا۔ اسے کسی نازک بدن کی ہوس نہیں تھی۔ وہ ماریہ جیسی کسی شریف زادی کو اس وقت قبول کرتا جب یقین ہوجاتا کہ اس پیار کرنے والی کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچے گا۔

ان نون اپنے اس جھوٹے بیان پر قائم تھا کہ اس نے ماریہ کو ہلاک کردیا ہے۔ وہ پرنس کی پہلی سہاگ رات کا قاتل بن کر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ جسے عجوبہ اور روبوٹ کہا جاتا تھا، اسے وہ بڑی آسانی سے مات دے رہا ہے۔

وہ رہ رہ کر بیان دے رہا تھا کہ جب تک پرنس اس کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکے گا، تب تک وہ کسی حسینہ کو اس کی خلوت میں آنے نہیں دے گا۔ جو بھی آئے گی، وہ ٹیلی پیتھی کے ہتھیار سے ماری جائے گی۔

ان نون کے ایسے دعوے سن کر پرنس کی آرزو کرنے والی حسیناؤں کو یقین ہورہا تھا کہ اس کی روبوٹ والی قوت نے ماریہ کو ہلاک نہیں کیا تھا۔ یہ ایک طرح سے خوش خبری تھی۔ ان چاہنے والیوں کے حوصلے پھر سے جوان ہورہے تھے۔ بس ایک ہی رکاوٹ سامنے تھی کہ پرنس کی قربت حاصل کرنے کے لیے ان نون کی دشمنی سے بچنا ہوگا۔

پرنس کو دیوانہ وار طلب کرنے والیوں کے دل سے ان نون کے لیے ہائے نکل رہی تھی۔ مسئلہ ایک نہیں تھا۔ کئی تھے۔ پیار سے خلوت میں آنے والیاں ہی طرح طرح کے مسائل پیدا کرنے والی تھیں۔ ادھر ان نون موقع سے فائدہ اٹھا کر ایسی سرپھری حسیناؤں کو بھی اپنا آلۂ کار بنا سکتا تھا۔ آگے بہت کچھ ہونے والا تھا۔

☆☆☆

موجودہ حالات میں ایک نئی عداوت کا راستہ کھل رہا تھا۔ عداوت نئی تھی لیکن اس کا اشارہ زیب النساء کو پہلے ہی خواب کے ذریعے مل چکا تھا۔ اس نے لہو برستے دیکھا تھا۔ باقاعدہ موسلادھار لہو کی بارش دیکھی تھی۔ ایسے تشویش میں مبتلا کرنے والے خواب کی تعبیر واضح تھی...... موت آئے گی یا شامت آئے گی۔

آدمی خواب نہ دیکھے۔ اسے کوئی اشارہ نہ ملے، تب بھی موت آتی ہے اور جب تک نہیں آتی، شامت آتی رہتی ہے۔ زیب النساء اور ہم زاد نے ماروی کی پیدائش سے پہلے دہلی جانے کا مصمم ارادہ کیا تھا۔ بابا صلاح الدین اجمیری بہت یاد آرہے تھے۔ وہ ماروی کو ان کے حجرے میں لے جانا چاہتے تھے۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ بزرگ اس دنیا میں ہیں بھی یا نہیں؟

ہم زاد نے کہا۔ ''وہ ہوں گے تو ماروی کو ان کی دعائیں ملیں گی۔ نہ ہوئے تو وہ حجرے کی مقدس چار دیواری سے گزرنے کے بعد دنیا میں آئے گی۔''

مراد نے کہا۔ ''میں بھی بابا صاحب کے در پر حاضری دینے جاؤں گا۔ وہ ایک عرصے سے ہماری طرف نہیں آرہے ہیں۔ ہم تو ان کے در پر جاسکتے ہیں۔''

ہم زاد نے ایک ریاست کے فرماں روا کی حیثیت سے بھارتی حکومت کو اطلاع دی کہ وہ کسی سیاسی معاملے میں نہیں، روحانی معاملے میں ہندوستان آنا چاہتا ہے۔ بھارتی حکام نے بڑی فراخ دلی سے اسے خوش آمدید کہا لیکن درِ پردہ چوکنے ہوگئے۔ ان کے نقطۂ نظر سے موجودہ دور کا سب سے خطرناک اور ناقابلِ گرفت مجرم مراد علی منگی ان کی دھرتی پر قدم رکھنے والا تھا اور وہ اسے مجرم نہیں کہہ سکتے تھے۔

سپر پاور، دنیا کے تمام چھوٹے بڑے ممالک اور عالمی عدالت اسے ریاست ارضِ اسلام کا ایک نیک نام حکمران تسلیم کرچکے تھے۔ لہٰذا اپنے دیس میں مراد کا شایانِ شان استقبال کرنا بھارتی حکومت کا فرض تھا۔

انڈین پولیس اور انٹیلی جنس والے مراد پر خار کھائے بیٹھے تھے۔ وہ کئی بار ان کے دیس میں آکر قانون کے خلاف رہائش اختیار کرچکا تھا۔ اس نے وہاں اپنی سلامتی اور بہتری کے لیے جو وارداتیں کی تھیں، وہ اس ملک کے قانون کے خلاف تھیں۔

اس حقیقت کو نظر انداز کیا گیا تھا کہ اس نے بھارتی حکومت کے ایک بنیادی اہمیت کے راز کی حفاظت کی تھی۔ ریڈ الرٹ کا سربراہ میکی البرٹ وہ راز چرا کر لے جانا چاہتا تھا۔ مراد نے اسے ہلاک کرکے اس اہم دستاویز کو منسٹر دھرم داس کے حوالے کیا تھا۔

گھا گھرا پلٹن کی سربراہ جگنی بائی نے اور اس پلٹن کی معزز ڈاکٹر، بیرسٹر اور دانشور خواتین نے بیان دیا تھا کہ مراد

علی منگی مجرم نہیں ہے۔ لیکن وہاں مراد کی غیر قانونی رہائش اور اس کی سرگرمیاں انڈین پولیس اور انٹیلی جنس والوں کے لیے چیلنج بن گئی تھیں۔ وہ اسے گرفتار کرنے کا کارنامہ انجام دینے میں ناکام رہے تھے۔

وہ اب تک جسے چھو بھی نہ سکے تھے وہ ان کے سامنے شاہانہ انداز میں آرہا تھا۔ یہ سوچ کر وہ تپ رہے تھے۔ جھنجلا رہے تھے کہ اسے گرفتار کرنے کے بجائے سیلوٹ کرنے والے ہیں۔

محبت کہتی ہے، کھل کے کرو۔ نفرت کہتی ہے چھپ کے کرو۔ دشمنی کا بھی یہی تقاضا ہے کہ دوستی کی طرح کرو۔ گلے لگا کر گلا کاٹو۔ آئی جی آف پولیس کیدار شرما جیسے کئی افسران پلاننگ کرنے لگے کہ اسے خوش آمدید کہیں گے۔ اس سے ہاتھ ملائیں گے پھر اس ہاتھ کو واپس جانے نہیں دیں گے۔ پلاننگ کے دوران ایک اہم نکتے کو سب نے تسلیم کیا کہ مراد کو جسمانی قوتوں سے، ہتھیاروں سے اور مکاریوں سے زیر نہیں کیا جاسکے گا۔ اسے ختم کرنے کے لیے غیر معمولی ہتھکنڈے استعمال کرنے ہوں گے۔

غیر معمولی ہتھکنڈوں میں ایک ٹیلی پیتھی کا علم تھا۔ ان نون ماریہ کو ہلاک کرنے کا دعویٰ کر کے ہیرو بن گیا تھا۔ سب ہی کو یہ یقین دلا چکا تھا کہ آئندہ بھی ٹیلی پیتھی کے ذریعے مراد اور اس کے بیٹے عابی پر مسلط ہوتا رہے گا اور یہ سب ہی تسلیم کر رہے تھے کہ مراد نے اپنی بہو سے محروم ہونے کی بہت بڑی شکست کھائی ہے۔ وہ آئندہ بھی ٹیلی پیتھی کے ہتھیار سے مات کھاتا رہے گا۔

آئی جی شرما اور انٹیلی جنس کے سراغ رساں ان نون سے کسی طرح رابطہ کرنا چاہتے تھے لیکن اس روپوش رہنے والے تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ وہ فی الحال ایک اور غیر معمولی علم کو آزمانے والے تھے اور وہ علم تھا کالا جادو......

ٹیلی پیتھی اور کالے جادو کے دوطرفہ حملے مراد کی کمر توڑ سکتے تھے۔ انہیں پورا یقین تھا کہ وہ دو پُراسرار علوم کے درمیان سینڈوچ بن کر ان کے دانتوں تلے آتا رہے گا۔

رگھو ناتھ کالیا ایک بہت ہی خطرناک اور گھاگ تانترک مہاراج تھا۔ کوئی مسئلہ کتنا ہی پیچیدہ اور جان لیوا ہو، وہ اسے اپنی کالی شکتی سے حل کر دیتا تھا۔ لوگ اس کے کالے کرتوتوں سے خوف زدہ رہتے تھے۔

وہ میلے کچیلے کپڑے پہننے والا، ڈاڑھی بھویں اور سر کے بال بڑھانے والا اور ظاہری حلیے سے دہشت طاری کرنے والا جادوگر نہیں تھا۔ پرانے دور کا گرو گھنٹال نظر نہیں آتا تھا۔ وہ موجودہ دور کے مطابق بہت ہی اسمارٹ جنٹلمین دکھائی دیتا تھا۔ وہ کلین شیو رہتا تھا۔ بہترین تراشیدہ ملبوسات میں رہ کر اونچی سوسائٹی کا ایک معزز شخص کہلاتا تھا اور فرفر انگریزی بولتا تھا۔

اس نے جادوئی ہتھکنڈوں سے اپنا ووٹ بینک اس حد تک بڑھایا تھا کہ اسمبلی میں پہنچ کر ایک شعبے کا منسٹر بن گیا تھا۔ وہ اپنے دیس کا پہلا جادوگر تھا جو بچپن سے تعلیم حاصل کرتے ہوئے، اونچی سوسائٹی کا معزز فرد کہلاتے ہوئے ایک کامیاب مکار سیاستدان بن گیا تھا۔

جادو ہر ملک میں قانوناً جرم ہے۔ جادو کے ذریعے جو لوگ قتل جیسی سنگین واردات کرتے ہیں انہیں گرفتار کیا جاتا ہے اور سزائے موت دی جاتی ہے۔ رگھوناتھ کالیا بہت محتاط رہ کر بڑی رازداری سے واردات کرتا تھا۔ اپنے خلاف کوئی ثبوت نہیں چھوڑتا تھا۔ اس لیے نہ کبھی گرفت میں آتا تھا اور نہ ہی کوئی اس کے منہ پر اسے جادوگر کہنے کی جرأت کرتا تھا۔

آئی جی کیدار شرما سے اور چند سراغ رسانوں سے اس کی دوستی تھی۔ انہوں نے کالیا سے کہا۔ ”ان نون ٹیلی پیتھی کے ذریعے مراد سے مقابلہ کر رہا ہے۔ اس نے ایک زبردست نقصان اسے پہنچایا ہے۔ تم بھی اپنی کالی شکتی سے اسے زیر کر سکتے ہو۔“

اس نے کہا۔ ”میرا ٹارگٹ پرنس عابی ہے۔ اس کی غیر معمولی شکتی کے بڑے چرچے سن رہا ہوں۔ مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ ایک گیارہ یا بارہ برس کا چھوکرا، تنہا پوری ایک فوج کو شکست دے دیتا ہے۔ اسے گولیاں نہیں لگتی ہیں پھر تو وہ میرے جیسا جادوگر ہوگا۔ اسے ہتھیاروں سے اور جسمانی قوتوں سے زیر نہیں کیا جاسکے گا۔ میں اپنی پُراسرار شکتیوں سے اس ہاتھی کو ہڈیوں کا ڈھانچا بنادوں گا۔“

کیدار شرما نے کہا۔ ”وہ پرنس ماں کے پیٹ سے ایک عجیب اور غیر معمولی انسان بن کر آیا ہے۔ اب اس کی ایک بہن بھی پیدا ہونے والی ہے۔ اس کا بھی بڑا چرچا ہے۔ میڈیکل رپورٹ سے اور اس کے ماں باپ کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ وہ بھی اپنے بھائی کی طرح عجیب و غریب صلاحیتوں کی حامل ہوگی۔“

کالیا نے پوچھا۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ مراد کی جو وائف یہاں آرہی ہے، وہ حاملہ ہے۔ اس بچی کو جنم دینے والی ہے؟“

''ہاں، مراد کا پورا خاندان بابا صلاح الدین اجمیری کا عقیدت مند ہے۔ وہ سب ان کے حجرے میں حاضری دینے آرہے ہیں۔''

کالیا نے پوچھا۔ ''اور وہ بچی مسز مراد کے پیٹ میں ہے؟''

''ہاں۔ سنا ہے اسی مہینے ماں بننے والی ہے۔''

وہ خم ٹھونک کر بولا۔ ''پھر تو پرنس عابی تک راز داری سے پہنچنے کا راستہ آسان ہو رہا ہے۔ میں اس پیٹ کی بچی کو اپنی معمولہ اور تابعدار بنالوں گا پھر اس کے ذریعے مراد کے پورے خاندان میں گھس کر ان سب کی کمزوریاں معلوم کرتا رہوں گا۔''

ایک سراغ رساں نے کہا۔ ''تم اس بچی کے اندر گھس کر ایک لمبا گیم کھیلنا چاہتے ہو اور ہم یہاں مراد کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ وہ صرف دو دن کے دورے پر آ رہا ہے۔ تیسرے دن یہاں سے چلا جائے گا۔ کیا ہم پھر منہ دیکھتے رہ جائیں گے؟''

''نہیں۔ شکار خود ہمارے گھر آرہا ہے۔ ہم اسے زندہ جانے نہیں دیں گے۔ ایسی ٹھوس پلاننگ کریں گے کہ وہ ہمارے شکنجے میں پھڑ پھڑا کر رہ جائے گا۔''

مراد نادان نہیں تھا۔ یہ خوب جانتا تھا کہ انڈین پولیس اور انٹیلی جنس والے دل میں کینہ کپٹ رکھ کر اسے اپنی زمین پر برداشت کریں گے اور درپردہ اس سے دشمنی کرنے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس کی اپنی پلاننگ کے مطابق ہم زاد ریاست ارضِ اسلام کا حکمران مراد علی منگی بن کر جارہا تھا۔ اس سے پہلے ہی وہ حماد کے روپ میں دہلی پہنچ گیا تھا۔

شاہی اور سرکاری دورے مختصر ہوا کرتے ہیں۔ وہ صرف دو دنوں کے لیے جارہے تھے۔ عابی پیرس میں تنہا اپنے حالات سے نمٹنے والا تھا۔ مراد نے کہا تھا۔ ''بیٹے صرف دو دنوں کی بات ہے۔ میں تیسرے دن لوٹ آؤں گا۔''

عابی نے کہا۔ ''بابا جانی! میری فکر نہ کریں۔ بابا (ہم زاد) مراد بن کر جارہے ہیں۔ آپ کی تمام بلائیں ان کے سر جائیں گی۔ آپ ان پر توجہ دیں۔''

وہ درست کہہ رہا تھا۔ مراد کی تمام مصیبتیں اس پر ٹوٹنے والی تھیں۔ کسی بھی ملک کے حکمران دوسرے ممالک میں اپنی ذاتی مختصر سی سیکیورٹی فورس کے ساتھ جاتے ہیں۔ ہم زاد کے ساتھ بیس عدد ایسے ماہر جاں باز تھے جو دور سے خطرے کی بو سونگھ لیا کرتے تھے۔ ہم زاد مطمئن تھا۔

اس نے روانگی سے کئی دن پہلے جگنی بائی سے اسکائپ کے ذریعے رابطہ کیا تھا۔ وہ اسکرین پر اسے دیکھتے ہی بولی۔ ''جگ جگ جیو میرے بیٹے...... تم کانٹوں میں گھرے رہتے ہو۔ جانے انجانے دشمنوں سے نمٹتے رہتے ہو اور ایسی سنگین مصروفیات کے باوجود اپنی ماں کو نہیں بھولتے۔ میں تم پر ماں کی جتنی بھی ممتا نچھاور کروں، کم ہے۔''

ہم زاد نے کہا۔ ''ماتا جی...... میں مراد نہیں ہوں۔ اس کا ہم شکل ہوں۔ دو روز کے دورے پر دہلی آرہا ہوں۔ میں بظاہر مراد بن کر آؤں گا۔ مراد کسی کو نظر نہیں آئے گا۔ وہ حماد کے نام سے نئے بہروپ میں آپ کے پاس آرہا ہے۔''

وہ خوشی سے کھل گئی۔ ''ہے بھگوان...... میں خوشی سے مر جاؤں گی۔ وہ کب آرہا ہے؟ میں اسے کیسے پہچانوں گی؟''

اس نے حماد کی کئی تصویریں دکھائیں۔ وہ اسے اپنی ٹی وی اسکرین پر دیکھتی رہی۔ یہ سن کر خوشی سے بے چین ہوتی رہی کہ وہ دوسرے دن کی فلائٹ سے آرہا ہے۔

اس نے گھا گھرا پلٹن کی فائٹر اور شوٹر عورتوں کو الرٹ کردیا۔ ''سن لو کہ میرا بیٹا آرہا ہے۔ دوراتوں کے لیے اپنی نیندیں اڑادو۔ ہتھیاروں اور گاڑیوں کے ساتھ ہر وقت تیار رہو۔ ہم سب جانتے ہیں کہ پولیس اور انٹیلی جنس والوں کے اندر اس کے دشمن چھپے ہوں گے۔ کسی وقت کچھ بھی ہوتا رہے گا۔ میرے بیٹے پر کڑی نظر رکھنی ہوگی۔''

وہ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی میدان ہموار کررہی تھی۔ مراد کی اس ماں کی طرح ایک جان نچھاور کرنے والی بہن بھی تھی۔ اس کا نام درگا تھا۔ وہ بھی غضب کی فائٹر اور شوٹر تھی۔ ایک بار دہلی سے شملہ جاتے ہوئے اس نے اپنے دشمن پتی دیو کے گن فائٹروں سے تنہا مقابلہ کیا تھا پھر مراد اور چمپت راؤ نے درگا اور اس کے بچے کو اس دشمن سے نجات دلائی تھی۔ مراد نے اسے بہن بنا لیا تھا اور چمپت راؤ نے اس سے شادی کرلی تھی۔

چمپت راؤ انڈیا میں ماسٹر کو بوبو کا دستِ راست اور معتمدِ خاص تھا۔ وہ اور درگا بڑی عقیدت سے مراد کو دیوتا مانتے تھے۔ مراد نے انہیں بھی اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ وہ اس کا استقبال کرنے ائرپورٹ آئے تھے۔

جگنی بائی اپنی پلٹن کے ساتھ وہاں آئی تھی لیکن مراد سے دور تھی۔ انٹیلی جنس والے گھا گھرا پلٹن پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ لہٰذا طے پایا تھا کہ وہ بظاہر مراد سے دور

رہیں گے۔ پھر یہ ناٹک کیا جائے گا کہ پیرس سے آنے والے ایک حماد نامی سیاح سے ان... کی شناسائی ہوگئی ہے اور جگنی بائی دہلی میں اس کی گائڈ بن گئی ہے۔

درگا کا وہ بیٹا جسے مراد نے تحفظ فراہم کیا تھا، وہ اب سترہ برس کا جوان ہوگیا تھا۔ اس نے مراد کے سامنے آتے ہی ہاتھ جوڑے پھر اس کے پاؤں چھونا چاہتا تھا۔ مراد نے اسے روک کر گلے لگا لیا۔ درگا نے کہا۔ ”بھیا......! ہم نے اس کا نام کرن مراد رکھا ہے۔“

چمپت راؤ نے کہا۔ ”یہ تمہاری بہن تو پاگل ہے۔ بیٹے کے ساتھ میرا نام ہونا چاہیے لیکن اس نے تمہارا نام رکھا ہے۔“

وہ بولی۔ ”بھگوان میرے بیٹے کو لمبی زندگی دے۔ جب تک یہ جیے گا' دنیا والے اس کے ساتھ میرے بھیا کا نام بھی سنتے رہیں گے۔“

مراد نے دور جگنی بائی کو دیکھ کر سر جھکاتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے۔ پلاننگ کے مطابق وہ قیام کرنے کے لیے جس ہوٹل میں گیا، وہاں جگنی بائی کی ایک شوٹر رنجنا گائڈ بن کر آئی۔ مراد نے اس کی خدمات حاصل کرلیں۔ اس طرح وہ ایک دوسرے سے کسی قدر قریب آگئے۔

وہ سب محتاط رہ کر اجنبی سے شناسا بننے کی راہیں ہموار کررہے تھے تاکہ انٹیلی جنس والوں کو حماد نامی سیاح پر کسی طرح کا شبہ نہ ہو۔ دوسرے دن ہم زاد زیب النساء کے ساتھ وہاں پہنچا تو مراد ائرپورٹ پر موجود تھا۔ اس کے پیچھے جگنی بائی اور چمپت راؤ کے درجنوں شوٹرز چھپے ہوئے تھے۔

ائرپورٹ سے سرکاری مہمان محل تک اتنی گاڑیاں اتنے اسلحہ بردار تھے کہ شاہی مہمانوں پر کسی طرف سے آنچ نہیں آسکتی تھی۔ سرکاری مہمان محل بہت وسیع و عریض تھا۔ اس کے اندر اور باہر سیکیورٹی کے سخت انتظامات تھے۔ جگنی بائی اور چمپت راؤ کے جاسوس اور شوٹرز وہاں تک جانہیں سکتے تھے۔ وہاں آئی جی کیدار شرما اور رگھوناتھ کالیا کی اجارہ داری تھی۔

وہاں تمام بڑے افسران رگھوناتھ کالیا کے رازدار تھے۔ اسے پیلس کے ایک مخصوص حصے میں کالے جادو کے مراحل سے گزرنے کی سہولتیں حاصل تھیں۔ یوں تو پیلس میں درجنوں خدام اور کنیزیں تھیں لیکن نو عدد خاص کنواری لڑکیوں کو زیب النساء کے لیے وقف کردیا گیا تھا۔

کیدار شرما اور چند سراغ رساں مراد کو اپنے طور پر بھی ختم کردینے کی سازشیں کررہے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ مراد کو آج تک ہتھیاروں اور شطرنجی چالوں سے مات نہیں دی جاسکی ہے۔ وہ بھی کالے جادو سے ہی زیادہ امیدیں وابستہ کررہے تھے۔

رگھوناتھ کالیا صرف پیدا ہونے والی بچی پر توجہ دے رہا تھا۔ اسے دنیا میں آنے سے پہلے ہی اپنے پر اسرار منتروں میں جکڑ لینا چاہتا تھا۔ اسی مقصد کے لیے وہاں نو بدنصیب کنواری لڑکیوں کو لاکر رکھا گیا تھا۔

زیب النساء حمل کے نویں ماہ سے گزر رہی تھی۔ جادو بہت ہی غیر انسانی اور گھناؤنا تھا۔ کالیا نو کنواریوں کے لہو سے زیب النساء کو نہلانے والا تھا۔ اسے سحر زدہ کرکے ہر کنواری کے لہو کا ایک گھونٹ اسے پلانے والا تھا۔

اس نے اب تک جادوئی مہارت سے جتنی بھی وارداتیں کی تھیں' ان میں کامیاب رہا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ ناکامی اس کے مقدر میں نہیں ہے۔ وہ پیلس کے ایک خالی کمرے میں گھور تپسیا کررہا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے' چلتے پھرتے منتروں کا جاپ کررہا تھا۔ بڑے اعتماد سے کالے عمل کے مختلف مراحل سے گزر رہا تھا۔

مراد ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد بابا صلاح الدین اجمیری کے حجرے کے سامنے آگیا۔ اس حجرے کو مقفل رکھا جاتا تھا۔ یہ عقیدہ اور یقین تھا کہ بابا صاحب کسی دن ضرور واپس آئیں گے۔ تقریباً پندرہ برس گزر گئے تھے۔ کسی نے انہیں کہیں نہیں دیکھا تھا۔

وہ اچانک کہاں گم ہوگئے تھے؟ کوئی نہیں جانتا تھا اور کوئی ان کی زندگی اور موت کے متعلق ایک رائے قائم نہیں کرسکتا تھا۔ بڑے جذبے اور عقیدت سے یہی کہا جاتا تھا کہ وہ کسی دن واپس آئیں گے۔

اس حجرے کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے دن میں ایک بار کھولا جاتا تھا۔ دروازے کی چابی پیش امام کے پاس رہتی تھی۔ حکومت کی طرف سے پیش امام کو اطلاع دی گئی تھی کہ حضرت صلاح الدین اجمیری کے ایک عقیدت مند ریاست ارضِ اسلام کے حکمران مراد علی منگی اپنی زوجہ کے ساتھ دوسرے دن حجرے میں آئیں گے۔ ان کے لیے دروازہ کھولا جائے۔

مراد نے نماز کے بعد پیش امام سے کہا۔ ”میں بھی بابا صاحب کا عقیدت مند ہوں۔ ان کے حجرے میں دو رکعت نماز نفل ادا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے وہاں تھوڑا وقت گزارنے دیں۔“

انہوں نے کہا۔ ”بابا صاحب کے لاکھوں عقیدت مند ہیں۔ سب ہی وہاں کے فرش کو چومنا چاہتے ہیں۔ ان کے لیے دن رات اسے کھلا رکھنا ہوگا۔ ہمارے لیے بڑی ذمے

داریاں بڑے مسائل پیدا ہوجائیں گے۔''

مراد نے اپنا پاسپورٹ دکھاتے ہوئے کہا۔''میں ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے وہاں دو رکعت پڑھنے آیا ہوں۔ جب ایک ریاست کے حکمران کے لیے دروازہ کھولا جاسکتا ہے تو اسے میرے لیے بھی کھلنا چاہیے۔''

پیش امام نے قائل ہو کر دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''سرکاری افسران بہت پریشان کر رہے ہیں۔ مراد علی منگی کی سیکیورٹی کے لیے انتظامات کیے جارہے ہیں۔ ایک افسر تو جوتوں سمیت اندر جانا چاہتا تھا۔ میں نے اعتراض کیا تو اس نے بابا صاحب کی شان میں گستاخی کی پھر دوسرے افسران کے سمجھانے پر وہ جوتے اتار کر اندر گیا تھا۔''

یہ سنتے ہی مراد کا دماغ گرم ہوگیا۔ اس نے پوچھا۔''کیا آپ اس افسر کو جانتے ہیں؟''

''اسے کون نہیں جانتا۔ وہ آئی جی آف پولیس کیدار شرما ہے۔''

مراد نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ اس آئی جی کو بابا صاحب کی شان میں گستاخی مہنگی پڑنے والی تھی۔ دروازہ کھل گیا۔ اس نے بسم اللہ پڑھتے ہوئے حجرے میں قدم رکھا۔ وہاں رکھے ہوئے مختصر سے سامان کو بڑی عقیدت سے دیکھنے لگا۔ وہاں کی تمام چیزیں بابا صاحب کے استعمال میں رہی تھیں۔ وہ ہر چیز کو بڑی اپنایت سے چھونے لگا۔ دل میں کہنے لگا۔''کہاں ہیں آپ......؟ ہمیں کیوں بھول گئے ہیں......؟ گلاب کانٹوں میں ملتے ہیں۔ ہم شہر دشمناں میں آپ سے ملنے آئے ہیں۔ ہمیں بشارت دیں۔''

فرش پر سفید اجلی چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ وہ قبلہ رو ہو کر نماز کی نیت کرنے لگا۔ ایسے ہی لمحات میں یوں لگا کہ وہ آگئے ہیں۔ اس کے شانہ بشانہ ہیں۔ اس کے ساتھ نماز قائم کر رہے ہیں۔ وہ روحانی مسرتوں سے سرشار ہو کر عبادت میں ڈوب گیا۔

اسے حیران کر دینے والا اعزاز حاصل ہو رہا تھا۔ جن کا وجود برسوں سے نابود تھا، وہ اس کے شانہ بشانہ سجدہ کرنے آگئے تھے۔ پہلے بھی اس کے ساتھ نمازیں پڑھتے رہے تھے۔ وہی گزرا ہوا وقت واپس لے آئے تھے۔

نماز جاری تھی۔ اسے نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنی تھی۔ ایسے وقت وہ بے اختیار اللہ اکبر کہتا ہوا سجدے میں چلا گیا۔ اس کی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہوگئیں لیکن اسے پورا حجرہ نظر آرہا تھا اور وہ حجرے کے باہر بھی دیکھ رہا تھا۔

وہاں سیکیورٹی کے لیے دور دور تک مسلح سپاہی کھڑے ہوئے تھے۔ کیدار شرما دو سراغ رسانوں کے ساتھ اس حجرے میں آیا۔ ان میں سے ایک جاسوس نے اپنے بیگ میں سے ایک بڑا سا موبائل فون نکالا۔ وہ فون نہیں تھا۔ ریموٹ کنٹرولر سے بلاسٹ ہونے والا بم تھا۔ انہوں نے اسے چاندنی اور دری کے نیچے اس جگہ چھپا دیا' جہاں حضرت صلاح الدین اجمیری دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا کرتے تھے اور اپنے عقیدت مندوں کا جسمانی و روحانی علاج کیا کرتے تھے۔

اس دیوار میں ایک ننھا سا سوراخ پہلے ہی بنا دیا گیا تھا۔ بم کے تار کو اس سوراخ سے گزارا گیا تو تار کا وہ سرا حجرے کے باہر نکل آیا۔ ادھر ایک مکینک کھڑا ہوا تھا۔ اس نے تار کے اس سرے پر ریموٹ ریسیور لگا کر ایک ٹیپ کے ذریعے اسے دیوار سے چپکا دیا۔ پھر وہاں دو اینٹیں رکھ کر اس ریسیور کو چھپا دیا گیا۔

مراد کو یہ مناظر کسی فلمی سین کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ہم زاد اور زیب النساء کی حفاظت کے لیے بظاہر سخت انتظامات کیے گئے تھے۔ ان کی کار کے آگے پیچھے مسلح افراد کی کئی گاڑیاں تھیں اور حجرے کے اطراف بھی ہتھیاروں سے لدے ہوئے سپاہی تھے۔

ہم زاد اور زیب النساء کار سے اتر کر حجرے کے اندر چلے گئے۔ گویا موت کے منہ میں پہنچ گئے۔ وہاں سے واپس آنے والے نہیں تھے۔ کیدار شرما اپنے رازدار ساتھی افسروں اور سراغ رسانوں کے ساتھ حجرے سے بہت دور کھڑا ہوا تھا۔ وہاں ہونے والے موت کے دھماکے سے محفوظ رہنے والا تھا۔

لیکن وقت گزر رہا تھا اور جو ہونے والا تھا، وہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ فون کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطے میں تھے۔ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ ریموٹ کنٹرولر کام نہیں کر رہا ہے۔ وہ کیوں ناکارہ ہوگیا تھا؟ یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ مراد کو سجدے میں دکھائی دے رہا تھا۔ حجرے کے باہر جہاں ریموٹ ریسیور کو چھپایا گیا تھا وہاں ایک ننھی سی بچی دوزانو ہو کر نماز پڑھ رہی تھی۔ عبادت کے وقت اس کا ننھا سا وجود آڑے آگیا تھا۔ ریموٹ کنٹرولر کی لہروں کو ریموٹ ریسیور تک پہنچنے سے روک رہا تھا۔

بس...... مراد کو اتنا ہی دکھائی دیا پھر آگہی کے مناظر یکلخت گم ہوگئے۔ اس نے اپنے آپ کو حجرے کے اندر سجدے کی حالت میں پایا۔ اس کی زبان بے اختیار سبحان ربی الاعلیٰ کہہ رہی تھی۔

اس نے بابا صاحب کی آواز سنی۔ وہ بھی سجدے میں اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی کا اعتراف کر رہے تھے۔ اس نے التحیات پڑھنے کے بعد سلام پھیرتے ہوئے دائیں طرف دیکھا تو وہ نظر آئے۔ انہوں نے بھی دائیں طرف سلام پھیرا تھا۔ مراد نے بائیں طرف سر گھما کر کہا۔ ''السلام علیکم ورحمتہ اللہ......''

نماز ادا ہوئی تو وہ بابا صاحب کی طرف گھوم کر بیٹھنا چاہتا تھا لیکن ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ نہیں تھے۔ دل میں ایک درد سا اٹھا۔ اس نے فوراً ہی جھک کر دونوں ہاتھ اس جگہ رکھے، جہاں وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ جگہ گرم تھی۔ یعنی وہ واقعی موجود تھے۔ آہ......! اب نہیں تھے۔

وہ اسی طرح بڑے جذبے سے دونوں ہتھیلیاں وہاں رکھے بیٹھا رہا۔ ان کے گم ہو جانے سے دل دکھ رہا تھا۔ یہ روحانی آسودگی بھی تھی کہ ان کا دیدار ہوا تھا اور اس نے برسوں کے بعد ان کے ساتھ نماز پڑھی تھی۔

وہ حجرے سے باہر آ گیا۔ اب جو آگہی ملی تھی، وہ اس کے اندر چیخ رہی تھی۔ وہ دشمن دوسرے دن ہم زاد اور زیب النساء کے ساتھ پیدا ہونے والی بچی کی بھی موت کا سامان کرنے والے تھے۔ وہ انہیں ایسا کرنے سے روک سکتا تھا۔ اس کے ساتھ کئی جاں نثار تھے۔ چیپت راؤ کے شوٹرز اور جگنی بائی کی گھا گھرا پلٹن تھی۔ وہ دشمنوں کو حجرے میں بم رکھنے سے روک سکتا تھا۔

وہ اپنی کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہاں سے فون پر ہم زاد کو خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے فون نکال کر اس کا بٹن دبانا، رابطہ کرنا چاہا پھر رک گیا۔ کیوں رک گیا؟ وہ تعجب سے سوچنے لگا۔ رکنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے دوسری بار رابطہ کرنا چاہا۔ اس کی انگلی پھر بٹن تک نہیں گئی۔ وہ اپنی انگلی کو حیرانی سے دیکھنے لگا۔ ایسے ہی وقت میسیج ٹون سنائی دی۔ اس کی انگلی نے بے اختیار بٹن کو دبایا تو ننھی سی اسکرین پر مختصر سی تحریر ابھری۔ ''خدا پر چھوڑ دو۔''

وہ بڑی حیرانی سے اور بڑے ایمانی جذبے سے اس تحریر کو دیکھنے لگا۔ وہاں نہ میسیج سینٹر کے نمبر تھے، نہ میسیج بھیجنے والے کا نام لکھا تھا۔ صرف وہ تحریر تھی۔ وہ بھی دیکھتے ہی دیکھتے بجھ گئی۔ اسکرین سادہ ہو گئی تھی۔

اس کا دل بڑی عقیدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے حجرے میں بابا صاحب کی خالی جگہ پر اپنی ہتھیلیاں رکھی تھیں۔ یہاں خالی اسکرین پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

☆☆☆

حضرت صلاح الدین اجمیری پر ایسا اٹل عقیدہ اور ایسا غیر متزلزل اعتماد تھا کہ مراد نے چپ سادھ لی تھی۔ اس نے ہم زاد کو اور دوسرے قابلِ اعتماد چاہنے والوں کو یہ نہیں بتایا کہ دوسرے دن کیا ہونے والا ہے؟

اس شہر میں اسے اپنی ماں کے ساتھ بھی تھوڑا وقت گزارنا تھا۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق گائڈ رنجنا نے اس کی اور جگنی بائی کی ملاقات کرائی تھی۔ دونوں میں شناسائی بڑھائی تھی۔ اسپیشل برانچ والے مراد کو نہیں، حماد کو دیکھ رہے تھے۔ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ان دونوں کے درمیان مختصر سے وقت میں گہری شناسائی کیسے ہو گئی ہے؟

جگنی بائی اسے اپنی کوٹھی میں لے گئی تھی۔ وہاں اس کی تینوں بیٹیوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ تینوں پندرہ برس پہلے اس کی دیوانی تھیں۔ اب ایک مدت گزر چکی تھی۔ وہ دیوانی جوانی اب نہیں رہی تھی۔ وہ تینوں ہی دو دو تین تین بچوں کی مائیں بن چکی تھیں۔

گھا گھرا پلٹن کی ڈاکٹر، بیرسٹر اور دانشور خواتین اس کے ساتھ ڈنر میں شریک ہوئی تھیں۔ ایسے وقت اسپیشل برانچ کے دو افسران نے آ کر جگنی بائی سے پوچھا۔ ''ہماری معلومات کے مطابق مسٹر حماد ایک ٹورسٹ ہیں۔ آپ انہیں کب سے جانتی ہیں؟''

جگنی بائی نے کہا۔ ''آج ہی ملاقات ہوئی ہے۔''

''اور ملاقات ہوتے ہی گھر لے آئی ہیں...... اپنی پوری پلٹن سے ملاقات کرا رہی ہیں؟ مسٹر حماد میں ایسی کیا بات ہے کہ انہیں اتنی اہمیت دے رہی ہیں؟''

''بہت اہمیت ہے۔ مسٹر حماد دنیا کے تمام ملکوں میں جا کر خواتین کے اہم کارناموں کے متعلق سروے کر رہے ہیں اور یہ تو سارا ہندوستان جانتا ہے کہ گھا گھرا پلٹن کی عورتیں کیسے کیسے یادگار کارنامے انجام دیتی رہتی ہیں۔ مسٹر حماد یہاں سے ہماری پوری ہسٹری لے کر جائیں گے۔''

ایک افسر نے مراد سے کہا۔ ''چیپت راؤ ہماری بلیک لسٹ میں ہے۔ وہ ماسٹر کو بوبو کے لیے کام کرتا ہے۔ وہ آپ کا استقبال کرنے اپنے بیوی اور بچوں کے ساتھ آیا تھا۔ ایسے کرمنل سے آپ کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟''

مراد نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا' وہ کرمنل ہے یا نہیں؟ جب ان کا بیٹا دس برس کا تھا، تب وہ لندن آئے تھے۔ میں نے ان کے بیٹے کو دریا میں ڈوبنے سے بچایا تھا۔ تب سے وہ میرے احسان مند ہیں۔ وہ بڑی عقیدت سے میرا استقبال کرنے آئے تھے۔ اس سے زیادہ میں کچھ

نہیں جانتا۔‘‘

دوسرے افسر نے طنزیہ انداز میں کہا۔’’جگنی بائی اور اس کی گھاگھرا پلٹن بھی ہماری بلیک لسٹ میں ہے۔کیا ہمیں حیران نہیں ہونا چاہیے کہ یہاں جو بھی خطرناک مجرم ہیں‘وہ آپ کے شناسا اور قدر دان ہیں؟‘‘

’’آپ حضرات کا کام یہی ہے۔جس پر چاہتے ہیں‘شبہ کرتے ہیں۔مجھ پر بھی شبہ کرتے رہیں۔میں پرسوں یہاں سے چلا جاؤں گا۔‘‘

وہ افسران بڑی پلاننگ کے ساتھ آئے تھے۔جس وقت مراد کا محاسبہ کر رہے تھے،اس وقت ان کا ایک جاسوس اس ہوٹل کے کمرے میں گیا تھا‘جہاں مراد نے قیام کیا تھا۔ہوٹل کے منیجر نے اس سے تعاون کیا تھا۔مراد کے کمرے کو ماسٹر کی سے کھولا تھا۔پھر وہ جاسوس وہاں ایک ریوالور رکھ کر چلا آیا تھا۔

وہ انٹیلی جنس والے جانتے تھے کہ جگنی بائی اور چمپت راؤ جرائم کے چھٹے ہوئے کھلاڑی ہیں۔حماد کو قانون کی گرفت میں آنے نہیں دیں گے۔وہ جاسوس افسران اپنے طریقۂ کار کے مطابق مراد کو حراست میں لے کر اسے سیل میں لے جا کر اس کی اصلیت اس سے اگلوانا چاہتے تھے۔اسے گرفت میں لینے اور اس کے خلاف قانونی...کارروائی کرنے کے لیے اسے جھوٹے الزام میں پھانسنا ضروری ہو گیا تھا۔

جب وہ جگنی بائی سے رخصت ہو کر ہوٹل میں آیا تو وہاں ایک جاسوس افسر سپاہیوں کے ساتھ موجود تھا۔اس نے کہا۔’’ہم آپ کے کمرے کی تلاشی لیں گے۔‘‘

مراد نے اعتراض نہیں کیا۔اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ قانون کے محافظ اسے مجرم ثابت کرنے کے لیے غیر قانونی چال چلیں گے۔اس کے کمرے سے ایک ریوالور برآمد ہوا تو افسر نے کہا۔’’یو آر انڈر اریسٹ۔‘‘

مراد نے ایک گہری سانس لی پھر ناگواری سے کہا۔’’آپ حضرات کیا چاہتے ہیں؟ مجھے مجرم ثابت کرنے کے لیے آگے کیا کرنے والے ہیں؟ یہ مجھے نظر آ گیا ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ مجھے ایک بھی کال نہیں کرنے دیں گے۔‘‘

افسر نے ایک ہاتھ بڑھا کر کہا۔’’اپنا فون دو۔‘‘

مراد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر فون کے ایک بٹن کو دبا دیا۔دوسری طرف خطرے کی گھنٹی بج گئی۔چمپت راؤ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔مراد نے جیب سے فون نکال کر افسر کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

افسر نے غصے سے کہا۔’’یہ آن ہے،تم نے کچھ کیا ہے۔‘‘

’’میں نے کچھ نہیں کیا ہے،یہ لاکڈ نہیں تھا۔بٹن دب گیا ہوگا۔آپ ایسا کریں،اس بٹن کو دبائیں تو فون کا سوئچ آف ہو جائے گا۔‘‘

افسر نے اس بٹن کو دبایا،اس کا سوئچ آف نہیں ہوا۔دوسری طرف جگنی بائی اچھل کر کھڑی ہو گئی۔اس نے اپنی شوٹرز سے کہا۔’’فوراً چلو،میرے بیٹے پر آفت آئی ہے۔‘‘

افسر نے جھنجلا کر گرجتے ہوئے کہا۔’’یہ کیا ہو رہا ہے؟ سوئچ آف نہیں ہو رہا ہے۔‘‘

اس نے پھر بٹن کو دبایا۔مراد نے کہا۔’’میں نے اپنی جیب میں ایک بٹن کو دبایا،تم نے دوسری بار پھر تیسری بار بٹن کو دبایا ہے۔‘‘

اس نے ننھی سی اسکرین کو دور سے دکھاتے ہوئے کہا۔’’یہ دیکھو۔یہاں کیا لکھا ہے؟‘‘

اسکرین پر لکھا تھا۔ڈینجر ون۔اس کے نیچے لکھا تھا۔ڈینجر ٹو پھر اس کے نیچے ڈینجر تھری لکھا تھا۔افسر نے پوچھا۔’’یہ تین بار خطرہ کیوں لکھا ہوا ہے؟‘‘

’’اس لیے کہ یہ ٹائم بم ہے۔تین بار بٹنوں کو دبایا جا چکا ہے۔اسے چوتھی بار دباؤ گے تو یہ بلاسٹ ہو جائے گا۔کیا دبانے کی جرأت کرو گے؟‘‘

افسر نے سہم کر خطرے سے آگاہ کرنے والی تحریروں کو دیکھا پھر فون کو بیڈ پر پھینکتے ہوئے کہا۔’’تم جھوٹ بول رہے ہو۔‘‘

’’تو پھر بٹن کو دباؤ یا اسے بم ڈسپوزل کے ماہر کے پاس لے جاؤ۔‘‘

وہ اپنا فون نکالتے ہوئے بولا۔’’میں ابھی ایک ماہر کو کال کرتا ہوں۔‘‘

مراد نے اچانک بیڈ پر چھلانگ لگائی پھر اپنے فون کو اٹھاتے ہوئے کہا۔’’خبردار......! کسی نے گولی چلائی تو اس سے پہلے یہ چوتھا اور آخری بٹن دب جائے گا۔مجھے مرنا ہی ہے تو تم سب کو ساتھ لے کر مروں گا۔‘‘

سپاہیوں کی گنیں جھک گئیں۔وہ سب ہی سہم کر اس فون کو دیکھنے لگے۔ایک سپاہی نے افسر سے کہا۔’’سر! یہ ہمیں ڈرا رہا ہے۔یہ فون ہے۔ٹائم بم نہیں ہے۔‘‘

مراد نے کہا۔’’ابھی معلوم ہو جائے گا۔میں تین تک گنتا ہوں۔اپنے ہتھیار بیڈ پر پھینک دو۔میں تین کہتے ہی آخری بٹن کو دبا دوں گا اور تم سب کے ساتھ فنا ہو جاؤں گا۔‘‘

پھر اس نے گنتی شروع کی۔اسے ٹھہر ٹھہر کر گننا چاہیے

تھا لیکن اس نے تیزی سے ایک دو تین کہا پھر ایک بٹن کو دبا دیا۔ پھر تو جیسے قیامت آگئی۔ ایسا ہی لگا کہ موت کا دھماکا ہوا ہے۔ وہ سب اچھل کر ادھر اُدھر گرنے پڑنے لگے۔ ہاتھوں سے ہتھیار چھوٹ گئے۔

کوئی دھماکا نہیں ہوا تھا۔ مراد نے نفسیاتی حربہ آزمایا تھا۔ ان کے دماغوں میں پہلے ہی ٹائم بم کی دہشت طاری کر دی تھی۔ ادھر موبائل فون سے آڈیو ریکارڈنگ کی فائرنگ گونج رہی تھی۔ وہ فائرنگ انہیں دھماکا لگی تھی۔

یہ صرف چند سیکنڈ کا تماشا تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ دھماکا نہیں ہوا ہے۔ لیکن یہ سمجھنے میں دیر ہوگئی۔ ان کے تمام ہتھیار مراد نے سمیٹ لیے تھے۔

اس نے اپنے فون کے سسٹم کو تبدیل کرنے کے بعد چمپت راؤ اور جگنی بائی کو کال کی۔ ان سے کہا۔ ''میں خیریت سے ہوں۔ ہوٹل کے کمرے میں آجائیں۔''

وہ دونوں ہی ہوٹل میں پہنچ رہے تھے۔ کال سنتے ہی اس کے کمرے میں آگئے۔ انہوں نے اس افسر کو اور سپاہیوں کو گن کے نشانے پر رکھ کر معلوم کیا کہ اس نے مراد کی غیر موجودگی میں ہوٹل کے منیجر سے ماسٹر کی لے کر اس کمرے کو کھول کر وہاں ایک ریوالور رکھ دیا تھا۔

ہوٹل کے منیجر کو کمرے میں بلایا گیا۔ جگنی بائی نے ان سب سے کہا۔ ''ایک شریف آدمی جرائم سے پاک ہو کر شرافت کی زندگی گزار رہا ہے۔ اس نے تمہارے دیس میں آ کر نہ کسی کو نقصان پہنچایا ہے، نہ پہنچائے گا۔''

چمپت راؤ نے کہا۔ ''نصیحتیں اثر نہیں کرتیں۔ کل صبح یہ کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ یہ قانون کے محافظ حماد نامی ایک سیاح کو گرفتار کرنے آئے تھے۔''

جگنی بائی اور چمپت راؤ اس افسر کو، منیجر کو اور تینوں سپاہیوں کو وہاں سے لے گئے۔ رات کی تاریکی میں پتا نہیں کہاں گئے؟ ویسے جہاں بھی انہیں لے گئے، وہاں سے وہ کبھی واپس آنے والے نہیں تھے۔ صبح سے پہلے وہ دو افسران بھی مارے گئے جنہوں نے جگنی بائی کی کوٹھی میں مراد کا محاسبہ کیا تھا۔

یہ دشمنی اور کدورت رکھنے والے پولیس اور انٹیلی جنس والوں کے لیے عجیب سی بات تھی کہ مراد (ہم زاد) آیا نہیں تھا۔ دو گھنٹے بعد وہاں اپنی زوجہ کے ساتھ پہنچنے والا تھا اور اس کے پہنچنے سے پہلے ہی کئی دشمنی کرنے والے اوپر پہنچ گئے تھے۔

☆☆☆

ہم زاد زیب النساء کے ساتھ آگیا۔ ایئرپورٹ میں شاہی اور سرکاری دستور کے مطابق اس کا استقبال کیا گیا۔ اسے وہاں سے مہمان محل میں جانا تھا۔ اس نے کہا۔ ''پہلے ہم بابا صاحب کے حجرے میں جائیں گے پھر کسی اور چار دیواری میں قدم رکھیں گے۔''

وہ ایئرپورٹ سے سیدھے حجرے کی طرف آگئے۔ وہاں درجنوں مسلح سپاہی ان کی حفاظت کے لیے الرٹ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ دونوں اللہ کا نام لیتے ہوئے اندر چلے گئے۔ کیدار شرما، دیگر افسران اور سراغ رسانوں کے ساتھ وہاں سے دور کھڑا تھا۔ وہ سب دھماکا ہوتے ہی اور دور بھاگنے والے تھے۔ دوسری طرف حجرے کے پیچھے جس افسر کے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرولر تھا، اسے سمجھا دیا گیا تھا کہ جب وہ دونوں ہجرے میں چلے جائیں تو ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد ریموٹ کنٹرولر کا بٹن دبا دیا جائے۔

زیب النساء اور ہم زاد ہجرے کے اندر اس دیوار کی طرف دوزانو ہو کر بیٹھ گئے تھے، جہاں بابا صاحب ٹیک لگا کر بیٹھا کرتے تھے۔ وہ بڑی عقیدت سے سر کو جھکائے انہیں یاد کر رہے تھے۔ ان سے کہہ رہے تھے کہ وہ ہونے والی بچی کی سلامتی اور بہتری کے لیے دعا فرمائیں۔

پھر وہ دونوں قبلہ رو ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ دنیا کی ہر متحرک چیز پل بھر کے لیے رک سکتی ہے لیکن وقت ایک ساعت کے لیے بھی نہیں رکتا۔ وہ گزرتا جا رہا تھا۔

باہر پندرہ منٹ گزرنے کے بعد کیدار شرما اور اس کے ساتھی بے چین ہو گئے۔ وہ سب وہاں سے بھاگنے کے لیے تیار تھے۔ لیکن دھماکا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔

مراد مسجد کی چھت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں کیدار شرما پر تھیں۔ اس نے بابا صاحب کی شان میں گستاخی کی تھی۔ مراد اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ موقع کا منتظر تھا۔ سچوئیشن ایک ذرا موافق ہوتی تو ایک خاموش گولی اس کے نام کر دیتا۔

اس وقت سب ہی ٹینشن میں تھے۔ کیدار شرما فون کے ذریعے پوچھ رہا تھا۔ ''کیا بات ہے؟ آدھا گھنٹا گزر چکا ہے۔ کیا کر رہے ہو؟ کام کیوں نہیں ہو رہا ہے؟''

وہ ریموٹ کنٹرولر ایک جونیئر کے ہاتھ میں تھا۔ وہ جواباً فون پر بولا۔ ''سر! میں کئی بار بٹن دبا چکا ہوں۔ یہ کام نہیں کر رہا ہے۔ یہ مکینک میرے ساتھ ہے۔ کنٹرولر کو کھول کر چیک کر رہا ہے۔ پلیز انتظار کریں۔ یہ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔''

کنٹرولر ٹھیک تھا۔ اس میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ مکینک نے کہا۔ ''یہ پرفیکٹ ہے۔ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔''

جونیئر افسر نے پوچھا۔ ''پھر یہ کام کیوں نہیں کر رہا ہے؟''

انہوں نے دور حجرے کی اس دیوار کو دیکھا' جہاں ریموٹ کے ریسیور کو چھپایا گیا تھا۔ وہاں سے اینٹیں ہٹادی گئی تھیں۔ وہ بم کے تار سے منسلک رہنے والا ریسیور دور سے بھی نظر آرہا تھا لیکن نماز پڑھنے والی وہ ننھی سی بچی نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ ریسیور اور ریموٹ کنٹرولر کے درمیان آگئی تھی۔

مکینک نے کہا۔ ''اس ریسیور میں کوئی خرابی ہوگی۔ اسے چیک کرنا ہوگا۔''

بہت دیر ہوچکی تھی۔ زیب النساء اور ہم زاد حجرے سے باہر آگئے تھے اور کار میں بیٹھ کر جا رہے تھے۔ یقیناً بچی بھی اب وہاں نہیں ہوگی۔ وہ تو ماں کے پیٹ میں تھی۔ روحانی کرشمہ کسی کی سمجھ میں آنے والا نہیں تھا۔

کیدار شرما اور اس کے ساتھی غصے سے جھنجلاتے ہوئے مکینک اور جونیئر افسر کے پاس آئے۔ وہ دونوں حجرے کی دیوار کے پاس ریسیور کو اٹھا کر چیک کر رہے تھے۔ کیدار شرما کے ہاتھ سے شکنجے میں آیا ہوا شکار نکل گیا تھا۔ اس نے غصے سے دہاڑتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟ آپریشن ناکام کیوں ہوگیا؟ میں تم دونوں کو گولیوں سے چھلنی کردوں گا۔''

مکینک کے ہاتھ میں بم کے تار سے منسلک رہنے والا ریسیور تھا۔ جونیئر افسر کے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرولر تھا۔ اس نے کہا۔ ''سر......! آپ خود ہی دیکھیں۔ ہم بٹن دبا رہے ہیں اور یہ......''

اس نے بولتے بولتے بٹن کو دبایا تو یکبارگی قیامت کا دھماکا ہوگیا۔ حجرے کی دیواریں تنکا تنکا ہوکر دور تک اڑتی چلی گئیں۔ آگ بھڑکنے لگی۔ وہاں کھڑے ہوئے افسروں کا' سراغ رسانوں کا اور کیدار شرما کا وجود پلک جھپکتے ہی نابود ہوگیا تھا۔

پرانی کہاوت کے مطابق اکثر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والے خود اس میں گر جاتے ہیں۔ ایک ریاست کا حکمران جس حجرے سے ہوکر گیا تھا' اسے کھنڈر بنا دیا گیا تھا۔ یہ ایسی واردات تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی گونج پوری دنیا میں سنائی دینے لگی۔ تمام نیوز چینل چیخ رہے تھے۔

''دھماکا کیسے ہوا؟''

''کس نے کیا؟''
''کیا مراد علی منگی کو مار ڈالنے کی سازش کی گئی تھی؟''
''حجرے میں نصب کیا جانے والا بم دیر سے بلاسٹ ہوا۔اس لیے مراد اپنی زوجہ کے ساتھ بال بال بچ گیا۔''
بھارتی حکام اور ان کی سیکیورٹی کے انتظامات تنقید کا نشانہ بن رہے تھے۔وہ اپنی طرف سے صفائی پیش کررہے تھے اور مجرموں کو جلد ہی گرفتار کرنے کا دعویٰ کررہے تھے۔
اور جلد ہی انہیں درِ پردہ معلوم ہوگیا تھا کہ وہ واردات کیدار شرما جیسے اعلیٰ افسروں اور سراغ رسانوں نے ایک طے شدہ منصوبے کے مطابق کی ہے۔وہ حکومت کو بدنامی سے بچانے کے لیے سچائی کو چھپانے کی کوششیں کررہے تھے۔

دوسری طرف رگھوناتھ کالیا اپنے کالے اور بھیانک مقاصد حاصل کرنے کے انتظامات کرچکا تھا۔اس بچی کو پیدا ہونے سے پہلے ہی اپنے جادوئی شکنجے میں لانے والا تھا۔اس انتظار میں تھا کہ زیب النساء کسی وقت بھی غسل کرنے جائے گی تو اسے نوکنواریوں کے لہو سے نہلادے گا۔
حجرے میں ہونے والی واردات نے ہم زاد کو محتاط اور چوکنا کردیا تھا۔اس نے فون کے ذریعے مراد سے کہا۔''ہمارے میزبانوں کی درپردہ دشمنی ظاہر ہوگئی ہے۔یہاں ہماری حفاظت کے لیے انٹرنیشنل پولیس آگئی ہے۔پھر بھی یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ہم یہاں سے نکل جانے والے تھے۔آج ہی چلے جائیں گے۔''
مراد نے کہا۔''بے شک۔یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔بھارتی حکام سے کہہ دو کہ آج ہی شام کو چلے جاؤ گے اور یہ اعلان کردو کہ یہاں تمہارے دو نمائندے رہیں گے۔وہ بابا صاحب کے حجرے کی ازسرِنو تعمیر کرائیں گے۔یہاں اپنے لیے حالات کو سازگار بنائیں گے۔آئندہ کبھی پھر بابا صاحب کے در پر حاضری دینے آئیں گے۔''

حکام سے یہی کہا جارہا تھا اور واپس جانے کی تیاری کی جارہی تھی۔وہ رگھوناتھ کالیا کی دشمنی سے بے خبر تھے۔کوئی نہیں جانتا کہ آنے والے لمحات میں اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟وہاں محل کے ایک حصے میں اس کی... پُراسرار سرگرمیاں جاری تھیں۔
ہم زاد کے مطالبے کے مطابق انٹرنیشنل پولیس آگئی تھی۔بظاہر کسی طرح کا اندیشہ نہیں رہا تھا۔کالیا زبردست تانترک اور شکتی شالی تھا۔اس کے جادوئی حصار کے باعث انٹرپول کے جاسوس محل کے اس حصے کو دیکھ نہیں پارہے تھے'جہاں وہ پراسرار عمل میں مصروف تھا۔گویا کالے جادو نے ان آنکھوں والوں کو عارضی طور پر اندھا کردیا تھا۔
اس تانترک کالیا کا انتظار ختم ہوا۔ایک کنیز نے اطلاع دی کہ زیب النساء غسل کرنے کے لیے باتھ روم میں جانے والی ہے۔کالیا نوکنواریوں کو سحرزدہ کرچکا تھا۔انہیں پیلس کی چھت پر لایا گیا تھا۔وہ نہیں جانتی تھیں کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟
اس کے بارہ چیلے لنگوٹ باندھے ہاتھوں میں بغدا لیے کھڑے تھے۔بغدا ایسا بھاری بھرکم ہتھیار ہوتا ہے کہ اس کی ایک ہی ضرب سے گردن تن سے جدا ہوجاتی ہے۔
پیلس کی چھت پر پانی کی ایک بڑی ٹنکی تھی۔اسے خالی کردیا گیا تھا۔وہ نوکنواریوں کے لہو سے بھرنے والی تھی۔کالیا ٹنکی کی چھت پر آسن جمائے بیٹھا تھا۔چشم تصور سے زیب النساء کو دیکھ رہا تھا اور اسے گرفت میں رکھنے کے منتر پڑھ رہا تھا۔

وہ منتر بڑے ہی آزمودہ تھے۔شکار ان کے طلسم سے نکل نہیں پاتا تھا۔کالیا کو یقین تھا کہ زیب النساء منتروں کے شکنجے میں آگئی ہے۔اسے پکڑ کر نہلانے کی ضرورت نہیں تھی۔اسے تو غسل کرنا ہی تھا۔وہ خود ہی باتھ روم میں آگئی تھی۔

وہ اپنی کالی شکتی سے اسے واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔وہ باتھ روم میں رک رک کر آرہی تھی۔جیسے آنا نہ چاہتی ہو۔کوئی انجانی قوت اسے روک رہی تھی۔اس کے باوجود وہ منتر اسے دھکے دے رہے تھے۔آگے بڑھا رہے تھے۔
وہ شاور کے نیچے آگئی۔وہاں پہنچ کر شاور کے ہینڈل کو نہیں گھمارہی تھی۔پریشان ہوگئی تھی۔سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہورہا ہے؟ایسے وقت کالیا شاور کے ہینڈل کو گھور کر دیکھتے ہوئے منتر پڑھنے لگا تو ہینڈل میں ایک ذرا سی لرزش پیدا ہوئی۔وہ کھل رہا تھا۔ٹھیک اسی لمحے میں وہ خواب معتبر ہوگیا۔ایک بچی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ادھر ہینڈل پوری طرح گھوم گیا تھا اور شاور سے پانی کی جگہ لہو برس رہا تھا۔
وہی خواب کا منظر تھا۔لہو کی بارش ہورہی تھی۔زیب النساء پر اس کا ایک چھینٹا بھی نہیں پڑا تھا۔اس ناکامی نے کالیا کو غضبناک بنادیا تھا۔وہ گرج گرج کر منتر پڑھ رہا تھا۔لہو کی ٹنکی پر بیٹھا غصے سے اس پر ہاتھ مار رہا تھا۔اسے وہ بچی نظر نہیں آرہی تھی۔پھر زیب النساء بھی اس کی طلسمی

آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

وہ اچانک ہی طلسمی شکنجے سے نکل کر چیخنے لگی۔ ہم زاد کو پکارنے لگی۔ وہ دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے شدید حیرانی سے اس لہو اگلنے والے شاور کو دیکھا۔ پھر انٹرپول کے سراغ رسانوں نے بھی وہ منظر دیکھ کر اوپر چھت پر جانا چاہا تو انہیں راستہ نہیں ملا۔

وہ چھت پر جانے والے زینے پر چڑھتے تھے لیکن اوپر محل کے کسی اور حصے میں پہنچ جاتے تھے۔ ہم زاد نے کہا۔ ''رگھوناتھ کالیا کو حراست میں لیا جائے۔ وہی خبیث ہم سے دشمنی کر رہا ہے۔''

وہ نظر بندی کے منتر پڑھتا ہوا سراغ رسانوں کو عارضی طور پر اندھا بناتا ہوا اپنی کوٹھی میں چلا گیا۔ انٹرپول کے ایک اعلیٰ افسر نے فون پر اس سے پوچھا۔ ''آپ کہاں ہیں؟ ہم آپ سے ابھی ملنا چاہتے ہیں۔''

اس نے کہا۔ ''میں اپنے پیلس میں ہوں۔ جب چاہیں، آپ یہاں تشریف لاسکتے ہیں۔''

ایسے وقت ان سراغ رسانوں نے پیلس کی چھت پر مسلسل فائرنگ کی آوازیں سنیں۔ کالیا کے بارہ چیلے اس کے طلسمی شکنجے میں رہا کرتے تھے۔ اس نے ان سب کو حکم دیا تھا کہ وہ فوراً آتما ہتیا کریں اور وہ چھت پر بے چون و چرا خود کو گولی مار رہے تھے۔ آخری فائر کے بعد ہی جادوئی حصار ٹوٹ گیا۔ چھت پر جانے کا راستہ کھل گیا۔ وہ سب دوڑتے ہوئے اوپر آئے تو انہیں بارہ چیلوں اور نو کنواریوں کی لاشیں ملیں۔ بڑی ہی درندگی سے ہلاکتیں ہوئی تھیں۔ ایسی بھیانک واردات کرنے والا اپنے پیچھے کوئی ثبوت چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔

انٹرپول کے سراغ رساں اس کے پیلس میں آئے تو وہ دو منسٹروں کے ساتھ بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ وہاں چھیل چھبیلی حسینائیں بھی تھیں۔ دو معزز منسٹر گواہ تھے کہ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے ان کے ساتھ شراب و شباب میں مست ہے۔

رگھوناتھ کالیا ایک معزز منسٹر تھا۔ اس پر شبہ تو کیا جاسکتا تھا لیکن کھل کر اسے ایک ملزم نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وہ گرفت میں آنے والا نہیں تھا۔ پولیس اور سراغ رساں اس مجرم کی موجودگی میں کسی اور کو تلاش کر کے اسے گرفتار کر کے رسمی کارروائی انجام دینے والے تھے۔

مراد نے روانگی سے پہلے ائرپورٹ پر چینلز والوں سے کہا۔ ''اس دیس کے قانون کے محافظ اصل مجرم کو گرفتار کریں یا نہ کریں۔ ہم ابھی جارہے ہیں لیکن خبیث مجرم کے سر پر ننگی تلوار کی طرح رہیں گے۔ اسے جلد ہی ڈھونڈ نکالیں گے۔ وہ ہمارے ہی ہاتھوں سے جہنم میں جائے گا۔''

یہ بیان دے کر وہ زیب النساء کے ساتھ وہاں سے اپنی ریاست میں چلا گیا۔ فی الحال رگھوناتھ کالیا کا یہ باب بند ہوگیا۔ اس سے بعد میں نمٹنا تھا۔ حماد کو عابی کے ساتھ رہنا تھا۔ وہ وعدے کے مطابق تیسرے ہی دن بیٹے کے قریب چلا آیا۔

☆☆☆

عابی نے اعلان کیا تھا کہ وہ تین دنوں تک سوگ منائے گا، اپنی ماریہ سے جو وعدہ کیا ہے، اسے پورا کرے گا۔ کارمن ڈی مورا نے پہلے ماریہ کی ماں کو پھر باپ کو ہلاک کرایا تھا پھر اپنی جان بچانے اور عابی سے چھپنے کے لیے اپنی ماں کے پاس استنبول چلا گیا تھا۔

اس کی ماں کا نام نتالی ووڈ تھا۔ وہ انٹرنیشنل شیطانی سوسائٹی کی ایک اہم رکن تھی۔ اسے کالے جادو میں مہارت حاصل تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو عابی پر حاوی کرنے کے لیے دوبارہ جادوئی حربے استعمال کر چکی تھی۔ ایسے خطرناک منتر پڑھتی رہی تھی جو عابی کو فولاد سے موم بنا دیتے لیکن اس فولاد پر منتروں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوا تھا کہ کوئی اس پر جادو کر رہا ہے۔

نتالی... ان دنوں عابی کو مار ڈالنے کے لیے خطرناک منتروں کے ساتھ چلہ کشی کر رہی تھی۔ کارمن ڈی مورا کو اعتماد تھا کہ جب تک ماں منتر پڑھتی رہے گی، تب تک عابی اس کا سراغ نہیں لگا سکے گا پھر چلہ کشی کے اختتام پر وہ خون تھوک کر مرجائے گا۔ بڑی خوش فہمی تھی۔ دو لڑنے والوں میں کسی ایک کی شامت آتی ہے۔ جس کی بھی شامت آئی ہو، اس سے خیریت دور ہو چکی ہوگی۔

ماسٹر کوبوبو کے ایک کارندے نے کارمن کو اپنی ماں کے ساتھ استنبول کے ائرپورٹ پر دیکھ لیا تھا۔ عابی کو معلوم ہوگیا تھا کہ وہ وچ لیڈی نتالی ووڈ کی ایک پرانی حویلی میں سانسیں لے رہا ہے۔

عابی چھپ کر استنبول نہیں جاسکتا تھا۔ اسے تو جیسے دنیا کے تمام بوڑھے، جوان اور بچے پہچان لیتے تھے۔ پہاڑ جیسا قد، چیتے جیسا لچکتا پلٹتا جھپٹتا ہوا بدن اور چہرے کی مردانگی دور سے پہچان لی جاتی تھی۔ اس نے چہرے کو کبھی میک اپ کے ذریعے نہیں چھپایا تھا اور نہ آئندہ کبھی بھیس بدلنا چاہتا تھا۔

وہ پیرس سے استنبول آیا تو تمام دوست نما دشمنوں کو معلوم ہوگیا۔ سب ہی کھوج لگانے لگے کہ وہ اچانک پیرس

سے استنبول کیوں جارہا ہے۔ یہودی اکابرین نے بھی پوچھا کہ وہ ماریہ کا سوگ منانے کے لیے استنبول کیوں جارہا ہے؟

اس نے جواب دیا۔ ''اس شہر میں ایسا سوگ مناؤں گا کہ میری ماریہ کی روح خوش ہوجائے گی۔ آپ حضرات میرے پیچھے نہ آئیں۔ میں تنہا رہنا چاہتا ہوں۔''

اب وہ یہودی اکابرین سے پیچھا چھڑا رہا تھا۔ ماریہ کی وفات کے بعد وہ جیسے گوشہ نشین ہورہا تھا۔ کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ وہ اکابرین اسے یہودی بنانے کی تدابیر پر عمل کرتے کرتے مایوس اور بے زار ہورہے تھے۔

انہوں نے جینی کی جعلی ویڈیو فلم بناکر ایک ماں کی بھرپور ممتا پیش کرکے بیٹے کے جذبات سے کھیلنے اور ماں کے مذہب کی طرف مائل کرانے کی انتہا کردی تھی۔ اب سوچ رہے تھے کہ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکل رہا ہے۔ ٹیڑھا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔

عابد علی منگی ارضِ اسلام کا شہزادہ تھا۔ ترکی کی حکومت اس کی آمد پر شاہی پروٹوکول دینا چاہتی تھی، اس نے انکار کردیا تھا۔ حکومت سے گزارش کی تھی کہ اسے تنہا رہنے دیا جائے۔ اس کے معاملات میں مداخلت نہ کی جائے۔

مداخلت کیسے نہ کی جاتی؟ وہ ملکی اور عدالتی قوانین کے خلاف انتقامی کارروائی کرنے اور ماریہ کے دشمن کو ہلاک کرنے آیا تھا۔ اسے خلافِ قانون کھلی آزادی نہیں دی جاسکتی تھی۔

فی الحال وہاں کی پولیس اور انٹیلی جنس والے نہیں جانتے تھے کہ اس کے عزائم کیا ہیں؟ وہ دور ہی دور سے اس کی نگرانی کررہے تھے۔ اس کی آمد سے کارمن ڈی مورا کے ہوش اڑ گئے تھے۔ وہ ترکی کے حکام سے کہہ رہا تھا کہ پرنس اسے ہلاک کرنے آیا ہے۔ اس کی ماں نتالی دعویٰ کررہی تھی کہ پرنس اس کے بیٹے کے قریب آئے گا تو اسے جلاکر راکھ کردے گی۔

ایسے وقت ان نون نے نتالی کے دماغ میں آکر کہا۔ ''ہائے وچ لیڈی! کیا میری طرح کسی کی بھی کھوپڑی میں گھس کر اسے مار ڈالنے کا جادو جانتی ہو؟''

وہ حیرانی سے بولی۔ ''اومائی گڈنس، کیا تم وہی پرنس کے دشمن ان نون ہو؟ کیا تم نے اس کی بیوی ماریہ کو ہلاک کیا ہے؟''

''ہاں میں وہی ہوں۔ میں نے پرنس کو پہلی مات دی ہے۔ آئندہ بھی وہ جس مشن پر جائے گا، میں اسے ناکام بنا کر ذلیل کرتا رہوں گا۔''

وہ خوش ہوکر بولی۔ ''تم پرنس کو یہاں بھی مات دوگے۔ اسے بھاگنے پر مجبور کروگے تو میرا بیٹا سلامت رہے گا۔ میں بھی خطرناک منتر پڑھ رہی ہوں۔ یہاں سے تو اس کی لاش ہی جائے گی۔''

وہاں عابی کے خلاف دو زبردست محاذ تھے۔ ایک محاذ کالے جادو کا تھا اور دوسرا ٹیلی پیتھی کا۔ اس کے باوجود وہ دونوں متفکر تھے۔ ایک شیطانی منتروں کے حملے کرکے ناکام رہی تھی۔ دوسرے نے بھی حقیقتاً ماریہ کو ہلاک کرکے عابی کو مات نہیں دی تھی۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ وہاں کس طرح پرنس سے نمٹ سکے گا۔ بظاہر وہ تنہا استنبول آیا تھا لیکن یہ یقین تھا کہ بیٹے کے پیچھے مراد علی منگی ضرور آیا ہوگا۔ ارضِ اسلام سے آنے والے جاں نثار بھی ہوں گے۔ ماسٹر کوبوبو کے شوٹرز بھی ہوں گے۔ وہ تنہا اور خالی ہاتھ نظر آنے والا درپردہ مسلح اور منظم ہوگا۔

عابی نے ماریہ کی وفات کے بعد چینلز کے ذریعے صرف ایک ہی بات کہی تھی کہ ماریہ کی وفات قضائے الٰہی سے ہوئی ہے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے یہی ظاہر ہے۔ لہٰذا ان نون ڈینگیں نہ مارے۔ میں فی الحال اسے لفٹ نہیں دے رہا ہوں۔ اس بیان کے بعد اس نے گہری خاموشی اختیار کرلی تھی۔ ان نون طرح طرح کے بیانات داغ رہا تھا تاکہ عابی مشتعل ہوکر کچھ بولتا رہے اور معلوم ہوتا رہے کہ وہ استنبول میں کب اور... کیا کرنے والا ہے۔

دورانِ جنگ میں خاموشی بہت بڑا ہتھیار بن جاتی ہے۔ دشمن کو الجھاتی اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کرتی رہتی ہے۔ ان نون... جھنجلا رہا تھا۔ عابی سپر پاور سے اور دیگر بڑے ممالک سے اور یہودی اکابرین سے بھی کچھ نہیں بول رہا تھا۔ اگر بولتا تو ان کے ذریعے کچھ معلومات حاصل ہوتی رہتیں۔

وہ استنبول میں آکر یوں وقت گزار رہا تھا جیسے تفریح کے لیے آیا ہو۔ جہاں اس نے قیام کیا تھا۔ وہاں سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک پرانی حویلی میں کارمن ڈی مورا مسلح گارڈز کے سائے میں ماں کے کالے جادو کے ساتھ رہتا تھا۔ عابی ادھر کا رخ نہیں کررہا تھا۔ اپنے ٹارگٹ کو یوں نظرانداز کررہا تھا جیسے اس کی کوئی اہمیت نہ ہو۔

وہ تو جہاں جاتا تھا، وہاں اپنے رب کی ذات میں گم ہوجاتا تھا۔ استنبول مسجدوں، گنبدوں اور بلند و بالا میناروں کا شہر ہے۔ وہ ایک وقت کی نماز ایک مسجد میں تو دوسرے وقت کی نماز کسی دوسری مسجد میں پڑھتا تھا۔ یہ طے کرچکا تھا کہ جب تک اس شہر کی ہر مسجد میں عبادت نہیں کرلے گا، تب

تک وہاں سے نہیں جائے گا۔

عابی نے اس ہوٹل کے قریب قیام کیا تھا جہاں سلطان محمود فاتح نے ایک وسیع وعریض محل تعمیر کروایا تھا۔ اس محل کو توپ قپو یا توپ کاپی کہا جاتا ہے۔ اب یہ محل دنیا کا سب سے قیمتی عجائب خانہ ہے۔ اس کے ایک حصے میں سب سے اہم نوادرات سب سے اہم خزانہ سرور کائنات حضرت محمد ﷺ کی بعض متروکہ متبرک اشیا محفوظ ہیں۔

عابی روز وہاں جاتا تھا جہاں رسول اللہ ﷺ کی ایک چادر، ریش مبارک کے بال، ایک دانت مبارک، ایک دستی چھڑی اور ان کا نقش قدم ایک صندوق میں محفوظ تھے۔ انہیں دور سے دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر دیوانہ وار ان مقدس تبرکات کی سمت کھنچتا چلا گیا تھا۔ وہ تمام نایاب تبرکات ایک صندوق میں بند ہیں۔ صرف 27 رمضان المبارک ... کو کھولے جاتے ہیں۔ عابی خوش قسمتی سے ستائیسویں رمضان کو وہاں پہنچا تھا۔ اس حصے میں تیس رمضان تک تلاوت ہوتی رہتی ہے۔ عابی وہاں دن رات تلاوت کرتا تھا۔ ان تبرکات کو دیکھتا رہتا اور روحانی مسرتوں سے سرشار ہوتا رہتا تھا۔

دنیا میں اور بھی مقدس اشیا ہوں گی۔ یہ تبرکات اس لحاظ سے زیادہ مستند ہیں کہ ان کے صحیح اور سچے ہونے کا سلسلہ ملتا ہے۔ یہ دست بدست تمام مسلمان خلفاء سے منتقل ہوتے ہوئے اس عجائب گھر میں پہنچے ہیں۔ مسلمان فاتح اعظم جہاں گھوڑے دوڑاتے تھے، وہاں اسلامی تہذیب کے جھنڈے گاڑ دیتے تھے۔

عابی اس محل کی بلندی پر کھڑا ہو کر دور تک بے شمار مسجدوں کو دیکھتا تھا۔ یہ اسلامی شان وشوکت ان کے وسیع وعریض گنبد اور آسمان کی سمت انگلیاں اٹھائے ہوئے مینار کہتے تھے...... کبھی مسلمان صدیوں تک حکومت کرتے رہے تھے۔ کیا واقعی ہم کبھی سپر پاور تھے؟ یقین آجائے تو ہر مسلمان رو پڑے گا۔

وہ تین دنوں تک اپنے گھر میں سوگ منا سکتا تھا لیکن اپنا گھر، اپنا شہر، اپنا ملک چھوڑ کر دشمن کے قریب آگیا تھا اور قریب آکر اسے نظرانداز کر رہا تھا۔ موت گھر کے دروازے پر کھڑی رہے، اندر نہ آئے تو مرنے والا دہلتا رہتا ہے۔ پوری طرح جینے سے محروم رہتا ہے۔

کارمن ڈی مورا کی آدھی جان نکل رہی تھی۔ اس نے ان نون سے کہا۔ ''تم اس کے دماغ میں گھس کر معلوم کر سکتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟ کیا کر رہا ہوگا؟ مجھ پر کب حملہ کرے گا اور کیسے کرے گا؟ تم اس کے اندر جاتے کیوں نہیں ہو؟''

اس نے کہا۔ ''کچھ رکاوٹیں ہیں لیکن میں دوسروں کے دماغوں پر قبضہ جما کر اسے دور سے دیکھتا رہتا ہوں۔ وہ پانچوں وقت کسی نہ کسی مسجد میں رہتا ہے۔ کبھی کھلی فضاؤں میں گھومتا پھرتا رہتا ہے۔ کبھی عجائب گھر کے اس حصے میں وقت گزارتا ہے جہاں ایک صندوق میں رسول اللہ ﷺ کا متبرک سامان رکھا ہوا ہے۔ وہ تو اس علاقے کی طرف آتا ہی نہیں ہے جہاں تم رہتے ہو۔''

ڈی مورا نے کہا۔ ''تعجب ہے، کیا وہ پیرس سے اتنی دور صرف عبادت کرنے آیا ہے؟ مجھ سے انتقام لینے نہیں آیا ہے؟''

ایسے وقت ترکی کے حاکم اعلیٰ کے ساتھ عابی کا انٹرویو نشر ہوا۔ اس نے ایک سوال کے جواب میں کہا۔ ''میں اپنی مرحوم زوجہ کا سوگ منا رہا ہوں۔ آج دوسرا دن ہے، کل تیسرا دن گزارنے کے بعد پیرس واپس چلا جاؤں گا۔''

حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ''کارمن ڈی مورا نے آپ کی وائف کی والدہ کو اور پھر والد کو قتل کروایا ہے۔ وہ جنیوا حکومت کو مطلوب ہے۔ آپ اسے گرفتار کرنے یا قتل کرنے آئے ہیں جبکہ اس نے ہمارے ملک میں پناہ لی ہے۔''

عابی نے کہا۔ ''میں آپ کے سامنے ہوں۔ آپ کی پولیس اور انٹیلی جنس والے دن رات میری نگرانی کر رہے ہیں۔ میں کل تیسرا دن گزار کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں نے آج تک کارمن ڈی مورا کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے اور نہ دیکھوں گا۔''

''آنرایبل پرنس! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ ہماری اس ملاقات کے ذریعے یقین دلا رہے ہیں کہ کارمن ڈی مورا کے خلاف کسی طرح کی انتقامی کارروائی نہیں ہوگی۔''

''میں کیسے یقین دلا سکتا ہوں۔ مجرموں کو، قاتلوں کو لازمی سزا ملتی ہے۔ اسے بھی ملے گی تو آپ کی طرح میں بھی دور سے دیکھتا رہوں گا۔''

''محترم پرنس! آپ کا یہ جواب الجھا رہا ہے۔''

''میں آپ کی الجھن دور کرنے کے لیے اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ جب یہاں سے جاؤں گا تو میرے ہاتھوں پر کارمن ڈی مورا کے لہو کے دھبے نہیں ہوں گے۔''

یہ سنتے ہی ان نون چینلز کے ذریعے بولنے لگا۔ ''پرنس خود کو بہت چالاک اور دوسروں کو نادان سمجھ رہا ہے۔ اس کی باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ایک عبادت

گزار فرشتہ بن کر رہے گا۔ اس کی پشت پر آج کا سب سے خطرناک شوٹر اس کا باپ مراد علی منگی ہے۔ یہاں وہ باپ اپنے بیٹے کا کام کرنے آیا ہوگا۔ ان کی مکارانہ چالوں کو سمجھا جائے۔''

ہم زاد نے ارضِ اسلام کے چینل سے کہا۔ ''میں مراد علی منگی بول رہا ہوں۔ یہاں اپنے ملکی معاملات میں مصروف ہوں۔ میرا ہم شکل بھی استنبول میں نہیں ہے۔ کوئی ہماری موجودگی وہاں ثابت نہیں کر سکے گا۔ یہ ان نون کے لیے بہتر ہوگا کہ میرے بیٹے کے خلاف اچھلنا بند کردے۔''

ان نون نے کہا۔ ''تمہارا بیٹا اب ناقابلِ شکست نہیں رہا ہے۔ یہ دنیا دیکھ چکی ہے کہ میں نے اس کی سہاگ رات کو ماتمی رات بنا دیا تھا۔ اس کا زوال شروع ہو چکا ہے۔ وہ آئندہ بھی کسی حسینہ کے ساتھ رنگین لمحات نہیں گزار سکے گا اور اگر استنبول میں کارمن ڈی مورا کی طرف رخ کرے گا تو اس کی لاش ہی وہاں سے جائے گی۔''

ہم زاد نے کہا۔ ''تمہارا باپ بھی پرنس کو کبھی چھو نہیں سکے گا۔ لوگ میڈیکل رپورٹ کو مان رہے ہیں اور تمہارے جھوٹے دعوے پر ہنس رہے ہیں۔ چلو اچھا ہے جوکر بن کر ہنساتے رہا کرو۔ اب تمہارا یہی کام رہ گیا ہے۔''

ہم زاد اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس نے ناگواری سے کہا۔ ''اچھی بات ہے۔ اب مجھے ثابت کرنا ہی ہوگا کہ میں پرنس کو ٹیلی پیتھی کی انگلیوں پر نچا سکتا ہوں۔ یہ تماشا اب میں استنبول میں دکھاؤں گا۔''

وہ چینل سے رابطہ ختم کر کے دماغی طور پر اپنے تاریک ماحول میں حاضر ہو گیا۔ وہ اندھیرے کی آغوش میں رہتا تھا اور وہیں سے جیتے جاگتے روشن دماغوں میں پہنچتا تھا۔ اس وقت وہ ان آلۂ کاروں میں سے ایک کے دماغ میں پہنچا جو اس شہر میں دن رات عابی پر نظر رکھتے تھے۔

اس نے ایک تابعدار کی دماغی آنکھوں سے دیکھا۔ عابی مسجد ابوایوب انصاری میں تھا۔ نماز ادا کرنے کے بعد باہر آ کر اپنی رینٹڈ کار میں بیٹھ رہا تھا۔ ان نون کے تابعدار کے ساتھ تین شوٹرز تھے۔ وہ چاروں دو موٹر سائیکل پر تھے۔

وہ کار میں بیٹھنے کے لیے دروازہ کھول رہا تھا۔ اسی وقت اس کے حکم سے آلۂ کاروں نے ٹی ٹی اور شاٹ گن سے گولیاں چلائیں۔ اس علاقے میں خاصی چہل پہل تھی۔ عورتوں اور مردوں کی آمدورفت جاری تھی۔ ان نون چند روز پہلے یہ دیکھ چکا تھا کہ سیکیورٹی افیسر کے ذریعے چلائی جانے والی گولی ضائع ہوئی تھی۔ عابی کے پاس سے گزر گئی تھی۔

اس بار اس کے چاروں شوٹرز نے اندھادھند گولیاں برسائیں۔ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سب ہی چیختے ہوئے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ ایک شخص کو گولی لگی تھی۔ ایک عورت زخمی ہو کر گر پڑی تھی۔ عابی کے آس پاس سے گزرنے والی گولیوں نے انہیں ہلاک اور زخمی کیا تھا۔

بے گناہوں پر یہ ظلم ہوتے ہی وہ تڑپ گیا۔ اس نے شوٹروں کی طرف چھلانگ لگائی۔ وہ موٹر سائیکلوں پر فرار ہو رہے تھے۔ عابی نے فضا میں اچھل کر قلابازی کھاتے ہوئے ایک موٹر سائیکل کے دو سواروں کو دبوچ لیا۔ وہ پولیس انٹیلی جنس والے جو دور سے عابی کی نگرانی کرتے رہتے تھے، وہ فوراً ہی انہیں گرفتار کرنے آگئے لیکن وہ گرفتار کیسے کرتے؟ عابی کا پہاڑ جیسا وزن ان پر آیا تو ایک اس کے نیچے دب کر مر گیا۔ دوسرے کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ وہ بھاگنے کے قابل نہیں رہا۔

دوسرے دو شوٹرز اپنی موٹر سائیکل پر طوفانی رفتار سے فرار ہو رہے تھے اور عابی کے فی گھنٹے کی رفتار دو سو میل سے زیادہ تھی۔ وہ بہت آگے جانے والوں کے قریب دوڑتا آرہا تھا۔ ان نون موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھے ہوئے شوٹر کے ذریعے حیرانی سے عابی کی طوفانی رفتار کو دیکھ رہا تھا۔

کیا عجوبہ تھا کہ ٹیلی پیتھی کے کسی ہتھکنڈے سے اسے روک نہیں سکتا تھا۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی کہ اسے گولیاں کیوں نہیں لگتی تھیں۔ اس سے کترا کر گزر جاتی تھیں پھر بھی ان نون نے اس تابعدار کے ذریعے گولی چلائی۔ اسی لمحے میں عابی نے بالکل قریب پہنچ کر ایک ہاتھ منہ پر مارا تو ان نون کے دماغ کو یوں جھٹکا لگا جیسے وہ ہاتھ اس کے منہ پر پڑا ہو۔ وہ دماغی طور پر پھر تاریکی میں حاضر ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک گم صم سا رہا۔ اس تابعدار کے ساتھ جو دماغی کنکشن تھا، اس نے سمجھا دیا تھا کہ منہ پر پڑنے والا ہاتھ فولادی ہتھوڑا تھا۔ وہ تابعدار ایک کے بعد دوسری سانس نہیں لے پایا تھا۔

وہ فوراً ہی خیال خوانی کی چھلانگ لگا کر موٹر سائیکل چلانے والے کے اندر پہنچا۔ وہ سڑک کے کنارے پڑا تھا اور سپاہیوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ عابی نے موٹر سائیکل کے ساتھ دوڑتے ہوئے اس کی گردن کو دبوچ کر نیچے گرا دیا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے زخمی ہو کر تڑپ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ میں نہیں جانتا میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کسی نے میرے دماغ کو جکڑ لیا تھا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اب تک اپنی مرضی کے خلاف مجرمانہ

حرکتیں کرتا رہا ہوں۔"

اس کا یہ بیان پولیس کے اعلیٰ افسران تک پہنچا۔ ہوم منسٹر نے ٹی وی چینل، ریڈیو اور پریس میڈیا کے ذریعے کہا۔ "مسٹران نون! تم سے گزارش ہے کہ ہمارے شہر کے امن و امان کو غارت نہ کرو۔ پرنس عابد علی منگی کل رات ہمارے ملک سے چلے جائیں گے۔ اس کے بعد ان سے عداوت کرو۔"

بے شمار ٹی وی چینلز پھر ان دونوں کی گرما گرم خبریں نشر کرنے لگے۔ خبر یہ تھی کہ عابی پر ان نون کا حملہ ناکام رہا ہے۔ اس کے تین آلۂ کار ٹیلی پیتھی کی پناہ میں رہنے کے باوجود عابی کے ہاتھوں مارے گئے ہیں اور ایک کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔

خبروں میں کہا جارہا تھا کہ اب سے پہلے بھی سیکیورٹی افسر کے ذریعے عابی پر کیا جانے والا حملہ بھی ناکام رہا تھا اور ان نون ماریہ کو ہلاک کرنے کا جو دعویٰ کررہا ہے، وہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی روشنی میں کھوکھلا ثابت ہورہا ہے۔

ان نون اچانک ہی ہیرو سے زیرو ہورہا تھا۔ اپنی توہین پر تلملا رہا تھا۔ آئندہ اپنی برتری منوانے کے لیے لازمی ہوگیا تھا کہ وہ کارمن ڈی مورا کو ہر حال میں عابی سے بچالے۔ اس کی غیر معمولی صلاحیتیں کہہ رہی تھیں کہ وہ بڑی خاموشی سے ڈی مورا کو ہلاک کرکے جائے گا۔

یہ سوال اسے ستا رہا تھا کہ ڈی مورا سے دور رہنے والا اسے نظر انداز کرنے والا پرنس کس چور دروازے سے جاکر انتقام لے گا؟

اس نے اپنے چار تابعداروں کو ڈی مورا کی حویلی کے اندر اور باہر رکھا تھا اور خود بھی اس کے دماغ میں آتا جاتا رہتا تھا۔ اب تک کوئی دشمن، عابی کا کوئی آلۂ کار اس حویلی کے قریب نظر نہیں آیا تھا۔ ترک پولیس اور انٹیلی جنس والے بھی ڈی مورا کے باڈی گارڈز بن کر دن رات حویلی میں رہتے تھے۔ ایسی سخت سیکیورٹی میں عابی جادو سے غائب ہوکر حویلی کے اندر جاکر اسے ہلاک کرسکتا تھا اور وہ جادو نہیں جانتا تھا۔

اسی کشمکش میں عابی کے قیام کا تیسرا دن طلوع ہوگیا۔ اس کی روانگی کے لیے شام کی ایک فلائٹ میں سیٹ او کے ہوگئی۔ سیاست کی اور جرائم کی دنیا سے تعلق رکھنے والے دوست نما دشمن ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ عابی سوگ منانے کے لیے استنبول کیوں آیا ہے؟ کیا وہ اپنی بیوی کے والدین کے قاتل کو معاف کرکے شام کو واپس چلا جائے گا؟

یہ ان کی عقل تسلیم نہیں کرتی تھی۔ ان نون تو بھی یقین ہی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ عابی نہ سہی، اس کا باپ مراد علی منگی ڈی مورا کو نہیں چھوڑے گا۔ بیٹے کی وہاں سے روانگی سے پہلے کچھ ایسا کر گزرے گا جو ابھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

عابی ظہر کی نماز سے پہلے عجائب گھر کے ایک حصے میں آکر قرآن مجید کی تلاوت کرنے لگا۔ ایسے وقت کئی گن مین اور کئی سرپھرے ننگی تلواریں لے کر آگئے۔

ان نون ہیجان میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اس نے ہر طرح کے ہتھیار بردار درندوں کو وہاں پہنچا دیا تھا۔ یہ خیال تھا کہ بندوق کی گولیاں کترا جاتی تھیں۔ وہ تیر اور تلوار سے بچ نہیں سکے گا۔

لیکن عجائب خانے کے باہر مسلح آرمی نے ان ہتھیار بردار درندوں کو روک دیا۔ ان سب کو نشانے پر رکھ کر واپس جانے پر مجبور کردیا۔ ان کے جانے کے بعد چار قدآور پہلوان آئے۔ وہ چاروں نہتے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ موت کے ہرکارے ہیں۔ انہیں اندر جانے سے کسی نے نہیں روکا۔ وہ عابی کے قریب آگئے۔ انہوں نے دروازوں کو اندر سے بند کرلیا۔ ایک پہلوان کی لات اس کے سینے پر لگی ساتھ ہی حلق سے ایک کراہ نکلی۔ لات کھانے والے کے سینے سے نہیں، مارنے والے کے حلق سے نکلی تھی۔ اس کے جوتے کا منہ کھل گیا تھا۔ انگلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ وہ تکلیف کے باعث کراہتے ہوئے دوسرے پاؤں پر اچھلنے لگا۔

باقی تین پہلوان بیک وقت اس پر جھپٹ پڑے۔ اس پر سوار ہوکر اسے ہر طرف سے جکڑ لیا۔ اسے گھونسے مارنے لگے۔ یہ دعویٰ تھا کہ ان کی انگلیاں خنجروں کی طرح جسم میں پیوست ہوجاتی ہیں اور مقابل کو چیر پھاڑ دیتی ہیں لیکن دعویٰ غلط ہورہا تھا۔ انگلیاں بدن کے کسی بھی حصے سے ٹکرا کر دوسری بار حملہ کرنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ گھونسے مارنے والی کلائیاں بھی ڈھیلی پڑ رہی تھیں۔

باہر سے دروازوں کو پیٹا جارہا تھا۔ اندر وہ ان کی پٹائی کررہا تھا۔ اس کا تو ایک ہاتھ ایک لات ہی بہت ہوتی تھی۔ وہ تینوں فرش سے نہ اٹھ سکے۔

جس نے عابی کے سینے پر لات ماری تھی، اس نے ایک پاؤں سے اچھلتے ہوئے آکر دروازے کو کھول دیا۔ اسی میں اس کی سلامتی تھی۔ آرمی کے جوان اندر آکر ان چاروں کو لاتیں مارتے ہوئے وہاں سے لے جانے لگے۔

عابی نے کہا۔ ''ان نون! تم ان میں سے کسی کے دماغ میں ہو۔ سن لو کہ میں سوگ منانے کا اختتام کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی کارمن ڈی مورا کی سانسیں ختم ہو رہی ہیں۔ جاؤ اسے بچاؤ۔''

ان نون فوراً ہی خیال خوانی کی چھلانگ لگا کر ڈی مورا کے دماغ میں آیا۔ وہ حویلی کی بالکونی میں کھڑا دور تک مسلح گارڈز اور پولیس فورس کو دیکھ رہا تھا۔ ایسی سخت سیکورٹی تھی کہ ایک پرندہ بھی اڑ کر نہیں آسکتا تھا لیکن آگیا۔

ایک گولی بڑی خاموشی سے آکر اس کے سینے میں پیوست ہوئی، دوسری گولی نے اس کی پیشانی میں سوراخ کیا۔ بالکونی کی ریلنگ کے باہر جھکتے اور گرتے وقت تیسری گولی اس کا تھوڑا سا گوشت ادھیڑتی ہوئی گزر گئی۔

ان نون اس کے دماغ میں تھا۔ اسے گولیاں کھاتے دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے ایک گولی کو بھی اس کی طرف آنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ حویلی کے اندر باہر بھگدڑ مچ گئی۔

کس نے فائر کیا تھا؟ کہاں سے گولیاں آئی تھیں؟

شوٹنگ ٹارگٹ کے حساب سے گولیاں کہیں دور سے نہیں آئی تھیں۔ حویلی کے احاطے کے اندر مسلح گارڈز اور پولیس فورس دور تک تھی۔ ان ہی کے درمیان سے آئی تھیں۔ کوئی نشاندہی نہیں کر سکتا تھا' کوئی بولنے والا نہیں تھا کہ گھر کی بندوق نے ہی گھر والے کو اڑا دیا ہے۔

کارمن ڈی مورا اٹلی کا گاڈ فادر تھا۔ اس کی اہمیت جرائم کی دنیا میں برائے نام تھی۔ وہ اہم سیاسی شخصیت کا حامل ہوتا تو ترک حکومت اسے سیاسی پناہ دیتی۔ مراد نے سفارتی سطح پر ترک حکام سے باہمی تعاون کا معاہدہ کیا تھا۔ مراد علی منگی اور عابد علی منگی دونوں چڑھتے سورج تھے۔ ترک حکام ان سے راضی کیسے نہ ہوتے۔ ان کی انٹیلی جنس نے ایسی رازداری سے اس کا کام تمام کیا تھا کہ دماغوں سے کھیلنے والا ٹیلی پیتھی جاننے والا بھی مراد کی اس خفیہ ڈیلنگ کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

ترک حکام انجان بن کر واویلا کر رہے تھے کہ شہر کے امن وامان کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ پرنس عابد علی منگی کو الزام نہیں دیا جا سکتا۔ آرمی اس کی بے گناہی کی گواہ ہے۔ جب ان نون کے تابعدار پہلوان پرنس عابی پر حملے کر رہے تھے، تب ہی ادھر کارمن ڈی مورا پر گولیاں چلائی گئی تھیں۔

دشمن ان نون خود گواہ تھا کہ عابی نے ڈی مورا کو ہلاک نہیں کیا ہے لیکن وہ مراد کو الزام دے رہا تھا کہ وہ بھیس بدل کر پولیس کی وردی میں آیا ہوگا۔ سب اسے سپاہی سمجھ رہے ہوں گے۔ اس نے پولیس اور گارڈز کے درمیان رہ کر سائیلنسر لگے ہوئے ہتھیار سے بے آواز گولیاں چلائی ہیں۔ کوئی اسے دیکھ نہ سکا۔ وہاں بھگدڑ ہوتے ہی اسے بھاگنے کا موقع مل گیا ہے۔

وہ اس سے آگے یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ مراد نے ارضِ اسلام کے حکمران کی حیثیت سے ترکی کے حکمران سے ڈیلنگ کی ہوگی۔ اس کے کئی تابعدار اس حویلی کے اندر اور باہر تھے۔ وہ ان کے دماغوں میں جا کر معلوم کر رہا تھا کہ حویلی کے کس حصے سے گولیاں چلائی گئی ہیں؟

بالکونی کے سامنے احاطے میں پولیس فورس اور ڈی مورا کے کئی مسلح گارڈز تھے۔ وہیں سے گولیاں چلائی گئی تھیں۔ ایک ہی گن سے چلانے والا کوئی ایک ہی شوٹر تھا۔ بے آواز فائرنگ کے باعث نظروں میں نہیں آیا تھا۔ ان نون کو شبہ تھا کہ پولیس والوں نے بھاری رشوت لے کر اس شوٹر کو اپنا کام کر جانے کا موقع دیا ہوگا۔ وہ کسی ثبوت کے بغیر پولیس والوں کو الزام نہیں دے سکتا تھا۔

ٹیلی پیتھی ایسا علم ہے جس کے ذریعے دماغوں میں کہیں چھپے ہوئے مجرموں کو پکڑ لیا جاتا ہے لیکن ان نون کسی قاتل تک پہنچنے میں ناکام ہو رہا تھا۔

کارمن ڈی مورا کی ماں منتر پڑھنا بھول گئی تھی۔ بیٹے کی لاش پر ماتم کرتی ہوئی ان نون کو باتیں سنا رہی تھی۔ ''ارے او کھوپڑیوں میں آنے والے! بڑی لمبی ڈینگیں مار رہا تھا۔ میرے جادو نے تو اثر نہیں کیا۔ کہاں ہے تیری ٹیلی پیتھی کا جادو؟ تیرے بھروسے پر میرا بیٹا مارا گیا ہے۔''

ان نون نے کہا۔ ''اے بڑھیا! مجھ پر بھروسا نہ کرتی تو بیٹے کو بچانے اور کہاں جاتی؟ میدانِ جنگ میں کوئی ایک ہارتا ہے تو دوسرا جیت جاتا ہے۔ قسمت نے دشمن کا ساتھ دیا ہے۔ وہ جیت گیا ہے لیکن وہ میرے ہاتھوں سے نہیں بچے گا۔ تو جلد ہی اس کی موت کی خوش خبری سنے گی۔''

وہ روتی ہوئی غصے سے بولی۔ ''ارے کتے! میرے بیٹے کی میت پر خوش خبری سنانے کی بات کر رہا ہے۔ کیا اب اسے مارے گا تو میرا بیٹا زندہ ہو جائے گا؟''

اس نے دماغوں پر حکمرانی کرنے والے کو کتا کہا تھا۔ وہ غصے سے چیخ پڑا۔ اس نے بڑھیا کے دماغ کو ایسا جھٹکا پہنچایا کہ وہ تکلیف کی شدت سے فرش پر گر کر ماہیِ بے آب کی طرح پھڑپھڑانے لگی۔

دماغ کو پہنچنے والی چوٹ ناقابلِ برداشت ہوتی

ہے۔ وہ بوڑھی اور کمزور تھی۔ ڈوبتے ہوئے ذہن سے اٹک اٹک کر بولی۔ ”یہ کتا مجھے مار ڈالے گا۔“

ان نون نے تلملا کر دوسرا دماغی جھٹکا پہنچایا تو یکلخت اس کا دم اٹک گیا۔ وہ دوسری سانس نہ لے سکی۔ وہاں پولیس فورس کے افسران اور مقامی ٹی وی کا عملہ موجود تھا۔ لائیو سچویشن کو نشر کر رہا تھا۔ کہا جا رہا تھا کہ وہ ٹیلی پیتھی جاننے والا شہ زور عابی کے مقابلے میں کمزور پڑ رہا ہے۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق اس نے ایک بوڑھی عورت کو مار ڈالا ہے۔

حقیقتاً اس سے اپنی توہین برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ عابی کے مقابلے میں اس کی ناکامیوں کی فہرست طویل ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے پہلا حملہ سیکیورٹی افسر کے ذریعے کیا تھا اور ناکام رہا تھا پھر اس نے دعویٰ کیا تھا کہ پرنس کو اپنی دلہن کے ساتھ سہاگ رات منانے نہیں دے گا۔ اس کا یہ چیلنج بھی اس طرح کمزور ہو گیا کہ وہ دلہن کی خلوت میں گیا تھا۔ ماریہ نے ازدواجی مسرتیں حاصل کرنے کے دوران ہی وفات پائی تھی۔

پھر وہ اپنی ناکامی کو چھپانے کے لیے کہنے لگا کہ اس نے عابی کی دلہن کو ہلاک کیا ہے لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے اس دعوے کو بھی غلط ثابت کر دیا تھا۔ اب کارمن ڈی مورا کی ہلاکت ٹیلی پیتھی کی دہشت کو بڑی حد تک کمزور کر رہی تھی۔ اس کی ناکامی اور جھنجلاہٹ کھل کر سامنے آ رہی تھی۔ اس نے آخری فیصلہ کرنے کے انداز میں چینلز کے ذریعے کہا۔ ”لوگو......! سنو، اب میں اپنی طاقت کا صحیح استعمال کروں گا۔ سنو کہ آج سے عابد علی منگی میرا محکوم ہے۔ وہ میری اجازت کے بغیر نہ کسی ملک میں جائے گا، نہ کسی کی پناہ میں رہ سکے گا۔“

وہ گرجنے کے انداز میں بولا۔ ”میرا حکم ہے، شام کی فلائٹ کینسل کی جائے۔ وہ استنبول سے باہر نہیں جا سکے گا۔ اگر ائرپورٹ میں قدم بھی رکھے گا تو طیارے کو پرواز سے پہلے تباہ کر دیا جائے گا۔ یہ منادی ہے کہ وہ خشکی کے جن راستوں سے جائے گا، ان راستوں میں بم دھاکوں سے گڑھے پڑ جائیں گے۔ وہاں کے بے گناہ لوگ مارے جائیں گے۔ وہ بحری راستے سے جانا چاہے گا تو جہازوں کو سمندر میں غرق کر دیا جائے گا۔ میرا حکم ہے وہ ابھی جس علاقے میں ہے، وہیں تک محدود رہے۔ کسی دوسرے علاقے میں جائے گا تو میرے تابعدار وہاں گولیاں چلائیں گے۔ اگرچہ وہ عجوبہ محفوظ رہے گا لیکن معصوم لوگوں کو بے موت مرتے دیکھتا رہے گا۔“

یہ ایسا شیطانی فیصلہ تھا کہ ترک حکام چیخ پڑے۔ ”مسٹر ان نون......! یہ غیر قانونی اور غیر انسانی فیصلہ ہے۔ تمہاری دشمنی پرنس عابی سے ہے اور تم ترکی کے عوام کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح ہلاک کرنے کی بات کر رہے ہو۔ انسان ہو، انسانوں کو سلامتی دو۔ ہمارے ملک میں بم دھماکے کرو گے، گولیاں چلاؤ گے، ہماری معیشت کو تباہ کرو گے؟ یہ کہاں کا انصاف ہے؟“

وہ بولا۔ ”انصاف چاہتے تو انصاف کرو۔ وہ کارمن ڈی مورا کا قاتل ہے۔ اسے گرفتار کرو، اسے گولی مارو۔“

”اس بات کے معتبر گواہ ہیں کہ ڈی مورا کی ہلاکت کے وقت عابی اس سے تیس کلومیٹر دور عجائب گھر میں تھا۔“

اس نے کہا۔ ”میں ٹیلی پیتھی کے ذریعے اندر کی بات جانتا ہوں۔ اس نے اپنے جاں نثاروں کے ہاتھوں اسے ہلاک کروایا ہے۔ دماغ کے اندر پہنچنے والے کی گواہی قابلِ اعتماد اور ناقابلِ انکار ہوتی ہے۔ میری گواہی سے انکار نہ کرو۔ اسے ابھی گرفتار کرو اور سزائے موت دو۔“

ایک حاکم نے کہا۔ ”تم ہماری مجبوریوں کو سمجھو۔ پرنس عابی کوئی معمولی شخص نہیں ہیں۔ صرف تمہاری گواہی سے ہم ان کا ہاتھ بھی نہیں پکڑ سکیں گے۔“

”اسے نہیں پکڑ سکو گے تو وہ تمہاری حکومت اور تمہارے عوام کے لیے مصیبت بنا رہے گا۔“

عابی نے کہا۔ ”میں استنبول کے عوام کی جان و مال کو نقصان نہیں پہنچنے دوں گا۔ آج شام کی فلائٹ سے نہیں جاؤں گا۔ جس علاقے میں ہوں، وہاں سے باہر قدم نہیں رکھوں گا۔ یہ دنیا دیکھ رہی ہے اور سمجھ رہی ہے کہ ان نون مجھ سے نہیں، ترک حکومت سے اور یہاں کے عوام سے دشمنی کر رہا ہے۔ میں اگلے چوبیس گھنٹوں تک یہ دیکھنا چاہوں گا کہ اقوام متحدہ اور دنیا کے تمام ممالک ترک حکام کو موجودہ مشکلات سے کیسے نکالیں گے؟ یہ ان کے لیے چیلنج ہے۔ اگر نہ نکال پائے تو میں چوبیس گھنٹے بعد یہاں نظر نہیں آؤں گا۔ وہ ٹیلی پیتھی کی آنکھوں سے مجھے یہاں سے جاتے دیکھ نہیں سکے گا۔ میں کہیں بھی لوگوں کے درمیان نظر نہیں آؤں گا تو اس کے تابعدار کس پر گولیاں چلائیں گے؟“

یہ ایسا چیلنج تھا کہ ان نون سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اب تک یہی دیکھتا آیا تھا کہ عابی جو کہتا ہے، اسے کر گزرتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ سہاگ رات منائے گا پھر ان نون کی رکاوٹوں کے باوجود دلہن کی قربت حاصل کر لی تھی۔ وہ تین دنوں کے

اندرڈی مورا کو ہلاک کرنے والا تھا اور اس نے تیسرے دن اسے ہلاک کر دیا تھا۔ ان نون دیکھتا رہ گیا تھا۔

اس نئے چیلنج کو سن کر دماغ چیخ رہا تھا کہ وہ چوبیس گھنٹوں کے بعد ہزار رکاوٹوں کے باوجود وہاں سے چلا جائے گا اور وہ کچھ نہیں کر پائے گا۔ وہ پھر عابی سے کمتر ہو گا پھر اس کی سبکی ہوگی۔

سپر پاور اور تمام بڑے ممالک ان نون کو سمجھانے لگے کہ وہ اپنی اور عابی کی دشمنی کو سیاسی مسئلہ نہ بنائے۔ ایک ملک کو اور اس کے عوام کو جانی و مالی نقصان پہنچانے کی دھمکیاں نہ دے۔ کیا وہ پوری دنیا کی مخالفت مول لے کر اپنی طاقت کا لوہا منوائے گا؟

ان نون سوچ میں پڑ گیا۔ عقل نے سمجھایا کہ وہ بار بار شکست کھانے کے باعث غصے اور جھنجلاہٹ میں بہت بڑی غلطی کر رہا ہے۔ ترک عوام سے دشمنی کر کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ عابی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ وہ مات نہ کھانے والا عجوبہ چوبیس گھنٹے کے بعد ٹھینگا دکھا کر چلا جائے گا۔

بڑے ممالک سے بحث مباحثے میں بائیس گھنٹے گزر گئے تھے۔ اس نے مزید دو گھنٹے بعد چینل کے ذریعے کہا۔ "میں فون کے ذریعے عابی سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد اسے استنبول سے جانے کی اجازت دے دوں گا۔"

ترکی کے ہوم منسٹر نے کہا۔ "چوبیس گھنٹے گزر چکے ہیں، تم کسے جانے کی اجازت دو گے؟ پرنس عابی شاید جا چکے ہیں۔ اپنے علاقے میں کہیں نظر نہیں آرہے ہیں۔"

ان نون کو پھر ایک جھٹکا لگا۔ اس نے کہا۔ "وہ پولیس کی نگرانی میں تھا۔ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کیسے جا سکے گا؟"

"وہ تمہارے بھی تابعداروں کی نگرانی میں تھا۔ ان کے دماغوں میں جا کر پوچھو وہ کیسے غائب ہو گیا ہے؟"

وہ فوراً ہی تمام تابعداروں کے اندر باری باری جا کر پوچھنے لگا۔ وہ سب ہی حیران تھے۔ کسی نے اسے آخری بار مسجد میں کسی نے توپ کاپی کی عمارت میں اور کسی نے ہوٹل میں دیکھا تھا۔ یہ سب ہی کو یقین تھا کہ اس علاقے سے باہر نہیں جا سکے گا۔

اس کے درجنوں تابعدار اور پولیس والے پورے استنبول میں اسے تلاش کرنے لگے۔ عابی کو ایک دنیا جانتی پہچانتی تھی۔ پورے شہر میں یہ اعلان کیا گیا کہ پرنس عابد علی منگی کہیں نظر آئے تو فوراً اطلاع کریں۔ اطلاع دینے کے لیے ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے کئی فون نمبرز بتائے

جا رہے تھے۔

حقیقت یہ تھی کہ اسے کوئی ڈھونڈ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ ہوم منسٹر کی رہائش گاہ میں چھپا ہوا تھا۔ ان نون اس ملک کے تمام اکابرین کے دماغوں میں جا کر اپنا شبہ دور کر رہا تھا۔ ہوم منسٹر اور چند عہدیدار یوگا کے ماہر تھے۔ وہ ان کے چور خیالات نہ پڑھ سکا۔ اسے معلوم نہ ہو سکا کہ ترک حکام ارضِ اسلام کے حکمران مراد علی منگی سے دوستانہ تعاون کر رہے ہیں۔

وہ عابی کے مقابلے میں پھر کمتر ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "پرنس عابی چال بازیاں دکھا رہا ہے۔ اسے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آئندہ میرے خوف سے چھپا رہے گا۔ اس خوف سے کہ جب بھی اور جہاں بھی منظر عام پر آئے گا، میں اس علاقے میں موت کا بازار گرم کر دوں گا اور وہ ہمیشہ کی طرح میرے مقابلے میں مجبور اور بے بس رہے گا اگر پرنس عجوبہ ہے، غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہے اور ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے تو آئے اور مجھے ڈھونڈ نکالے۔ وہ مجھے نہ کبھی ڈھونڈ سکے گا نہ مجھے نقصان پہنچا سکے گا۔"

مراد نے چینل کے ذریعے کہا۔ "یہی چیلنج تمہارے لیے بھی ہے۔ تم بھی آئندہ پرنس کو دور سے بھی نہیں دیکھ سکو گے۔ کبھی اس کا راستہ نہیں روک سکو گے۔ آئندہ تم دونوں اندھیرے میں رہو گے۔ کوئی کسی کو دیکھ نہیں پائے گا۔ ہو سکتا ہے تم دونوں کبھی کسی کو دیکھ نہ پاؤ اور موت دیکھ لے اور سارا قصہ ہی تمام ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کوئی اپنی غلطی سے نظروں میں آجائے پھر یہ دنیا دیکھے گی کہ کون کس کی شہ رگ تک پہنچ گیا ہے۔"

دنیا والوں کے لیے ان دونوں کی عداوت بہت ہی تجسس آمیز اور دلچسپ ہو گئی تھی۔ وہ آئندہ طرح طرح کے دلچسپ اور سنگین تماشے دیکھنے والے تھے۔ یہ دھڑکا بھی لگ گیا کہ ان کی عداوت کے نتیجے میں تماشا دیکھنے والوں کو بھی جانی و مالی نقصان پہنچتا رہے گا۔

عابی کبھی چہرہ بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنے پیدائشی چہرے کے ساتھ پوری زندگی گزارنا چاہتا تھا لیکن مراد اور ہم زاد نے اسے سمجھایا کہ دشمن کی چال کے جواب میں اسی کی چال کو اس پر الٹاؤ گے تو اس کے آگے کھلا ہوا ٹارگٹ بن کر نہیں رہو گے۔ اسے بھی اپنی روپوشی کے اندھیرے میں بھٹکانا لازمی ہے۔

وہ مراد اور ہم زاد کی ہر ہدایت پر سر جھکاتا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ اور اپنا حلیہ تبدیل کرنے کے لیے حالات سے سمجھوتا کر لیا۔ وہ پہلے ہی ان نون کو لوہے کے چنے چبوا رہا

تھا۔ اب اس کی طرح روپوش ہو کر نا قابلِ شکست ہو گیا تھا۔ وہ عابی کو نہ دیکھ سکتا تھا، نہ اس پر حملہ کرنے اور بے گناہوں کو نقصان پہنچانے کی دھمکیاں دے سکتا تھا۔

صرف ان نون ہی نہیں، یہودی اکابرین بھی پریشان ہو گئے تھے۔ عابی نے ان سے بھی رابطہ ختم کر دیا تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے دجال معظم کا نمائندہ، یہودی ماں کا بیٹا کہاں گم ہو گیا ہے؟ وہ اسے پریس میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے پکار رہے تھے۔ انہیں کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ اس کی خاموشی کہہ رہی تھی کہ وہ آئندہ بھی ان سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔

دنیا میں سراغ رسانوں کی جتنی تنظیمیں ہیں، وہ عابی اور ان نون کو تلاش کرنے کے لیے کچھ زیادہ ہی فعال ہو گئی تھیں۔ عابی کے متعلق ان کا خیال تھا کہ اس کے قد، جسامت، چال ڈھال اور لب و لہجے سے شاید اسے پہچانا جائے گا۔ یہ بھی خیال تھا کہ اس کی طرح قد و جسامت رکھنے والے لاکھوں جوان ہوں گے۔ وہ اپنا لب و لہجہ بدل چکا ہو گا اور چیتے کی طرح چلنے والے نے اپنی چال بھی بدل دی ہو گی۔

ان نون کے سائے کو بھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا کھوج لگانے والے ہر اس شخص کو پکڑتے تھے، جو ذرا سا بھی پراسرار دکھائی دیتا تھا۔ مجذوب اور قلندر جیسے نظر آنے والوں کے پیچھے پڑ جاتے تھے۔ لیکن ان نون تک پہنچ نہیں پاتے تھے۔

وہ ٹیلی پیتھی جاننے والا بھی پریشان تھا۔ کہیں بھی عابی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن ایک امید تھی۔ اس بات کا انتظار تھا کہ وہ کبھی تو اپنے کسی اور دشمن سے ٹکرائے گا پھر اس دشمن کی لاش دیکھ کر معلوم ہو جائے گا کہ اس پر کسی روبوٹ کا ہاتھ پڑا ہے اور وہ روبوٹ فلاں ملک، فلاں شہر اور فلاں علاقے میں چھپا ہوا ہے۔

سب ہی دوست اور دشمنوں کو اسی بات کا انتظار تھا۔ عابی کبھی مجبور ہو کر اپنی جسمانی قوت کا مظاہرہ کرتا تو اسے تلاش کرنے والے دور سے دیکھتے اور دور سے ہی کچھ کہے سنے بغیر اس کی نگرانی کرتے کیونکہ دشمنی سے قریب جانے والوں کی شامت آجاتی اور دوستی سے قریب آنے والوں سے وہ معذرت چاہتا پھر روپوش ہو جاتا لیکن ایسا کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ہی روپوش ہو کر اور زیادہ پراسرار بن گئے تھے۔

☆☆☆

دن اور مہینے گزرتے جا رہے تھے۔ ڈھونڈنے والے مایوس ہو رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان کا وجود نہیں رہا ہے۔ وہ دونوں ہی دنیا سے گزر چکے ہیں۔ بہرحال عقل کہہ رہی تھی کہ وہ روپوش رہ کر ایک دوسرے کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ کسی دن اچانک ہی ظاہر ہو جائیں گے۔ فی الحال صبر اور انتظار تھا۔

ادھر زیب النساء کی زچگی کا وقت آن پہنچا تھا۔ ایک اور عجوبہ گل کھلانے آ رہا تھا۔ عابی کی پیدائش سے یہ اندیشے پیدا ہوئے تھے کہ زیب النساء کا انجام بھی جینیفر عرف جینی جیسا ہو گا لیکن اس بار اللہ مہربان تھا۔ میڈیکل رپورٹ کہہ رہی تھی کہ وہ زچگی کے مراحل سے بخیریت گزرے گی پھر بھی ایسے وقت مائیں بننے والیاں تھوڑی بہت تکالیف سے اور اندیشوں سے گزرتی ہیں۔ وہ بھی تکلیف سے گزرتے وقت اللہ کو یاد کر رہی تھی۔

زیب النساء ہر حال میں عبادت کرنے کی عادی تھی۔ اس وقت بھی اس کے ذہن میں ایک آیت گردش کر رہی تھی۔

یہی تجسس تھا کہ اس کے اندر کیا چھپا ہے اور کیا ظاہر ہونے والا ہے۔ زیب النساء کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور ماروی آ گئی لیکن کہاں آئی؟ کسی کو دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اچانک بجلی چلی گئی تھی۔ گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔

وہ ڈاکٹر یا کسی نرس کے ہاتھوں میں نہیں آئی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ''وہ کہاں ہے؟ چارجر لائٹ آن کرو۔''

کسی کو یاد نہیں تھا کہ چارجر لائٹ کہاں رکھی تھی؟ بچی کے رونے کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ نرس نے کہا۔ ''بچی یہیں بیڈ پر ہو گی۔ عنبر...... تم ادھر دیکھو۔''

گہری تاریکی میں وہ کیسے دکھائی دیتی۔ وہ سب اندھوں کی طرح ہاتھ بڑھا کر ادھر ادھر ٹٹول رہے تھے۔ دو نرسیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ اپنا اپنا سر سہلانے لگیں۔

تاریکی نے بچی کو نگل لیا تھا۔ اندھیرا یہاں ہوتا ہے تو وہاں کسی دوسرے مقام پر بھی ہوتا ہے اور اندھیرے میں معلوم نہیں ہوتا کہ مقامات بدل گئے ہیں۔ اس کی جگہ بدل گئی تھی۔ وہاں کئی انسانی سائے متحرک تھے۔ وہ لیڈی ڈاکٹر اور نرسیں نہیں تھیں۔ اندھیرے میں دنیا کالی ہو جاتی ہے۔ لوگ کالے سائے ہو جاتے ہیں۔ صورتیں کالی، وجود کالے ہو جاتے ہیں۔ کوئی کسی کو پہچان نہیں پاتا۔

وہ تاریک دنیا کے باشندے کالے ماحول میں دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں بلی اور چیتے کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نوزائدہ ماروی کی آنکھیں بھی ویسی ہی تھیں۔ ایک سائے نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے گمبھیر

آواز میں کہا۔ ''یہ ہمارے جیسی آ گئی ہے۔''
دوسرے سائے نے پوچھا۔ ''کیا یہ وہی ہے' جس کی تم نے پیش گوئی کی تھی؟''
''اللہ بڑا جلال والا ہے۔ بڑی شان والا ہے۔ یہ وہی ہے۔ یہ ان کی اولاد ہے جو صوم وصلوٰۃ کے پابند رہتے ہیں اور جن کی دستگیری بابا اجمیری فرماتے ہیں۔''
کئی آوازیں بیک وقت گونجنے لگیں۔ ''اللہ اکبر' اللہ اکبر' اللہ اکبر......'' تاریک ماحول ایمان پرور صداؤں سے گونج رہا تھا۔
کہیں دور سے کسی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ اللہ والے کیوں شور مچارہے ہیں؟''
کسی نے جواباً کہا۔ ''وہ کہتے ہیں کہ وہ آ گئی ہے جس کی پیش گوئی کی گئی تھی اور ہمارے کاہن نے اس کی تصدیق کی تھی۔''
''ہاں بے شک ہمارے کاہن نے کہا تھا وہ عجوبہ ہوگی۔ کیا وہ ایسی ہی ہے؟''
''یہ ہمارا طاغوتی سردار جانتا ہے۔''
''اسے خبر دو۔ وہ دماغوں میں چھپے ہوئے بھید معلوم کرلیتا ہے۔ اسے معلوم ہوگا تو ہمیں بھی اس بچی کی حقیقت معلوم ہوگی۔''
پھر وہ تاریک ماحول شیطانی صداؤں سے گونجنے لگا۔ وہ سایہ سایہ جیسے لوگ طاغوتی سردار' ابلیس کے معتمدِ خاص کو پکارنے لگے۔
''ہاہو۔ ہوہو۔ آبنوس کی جے ہو۔ اے عظیم آبنوس! تو ہے دماغوں کا کابوس جس کے اندر جاتا ہے اسے نادیدہ شکنجے میں جکڑ لیتا ہے۔ اے آبنوس! تجھے خبر ہو۔ مسلمان کہہ رہے ہیں کہ وہ آ گئی ہے۔ جس کی پیش گوئی ہمارے کاہن نے کی تھی۔''
وہ آبنوس اندھیرے کے بستر پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ آنکھ کھلتے ہی تاریکی میں دیدے چمکنے لگے۔ وہ ناگواری سے بولا۔ ''یہ میں کیا سن رہا ہوں...... وہ آ گئی ہے؟''
وہ دوسرے ہی لمحے میں ابلیس کے پجاری ایک کاہن کے پاس پہنچ کر بولا۔ ''اے پیشوائے اعظم کیا تیری پیش گوئی درست ہو چکی ہے؟''
کاہن نے کہا۔ ''ہاں' وہ مسلمانوں کی بستی میں آ گئی ہے۔''
''کیا تو وہاں گیا تھا؟ تو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟ تو نے کیسے جانا کہ یہ وہی ہے؟''
''میں نے اسے دور سے دیکھا ہے۔ ہم مسلمانوں سے ملتے ہیں' ان سے باتیں کرتے ہیں۔ ان سے قریبی تعلق رکھتے ہیں لیکن میں اس بچی کے قریب نہیں جاسکا۔ یہی اس کی پہچان ہے۔''
آبنوس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہا ہے؟ اس کے قریب کیوں نہ جاسکا؟''
کاہن نے کہا۔ ''تجھے معلوم ہو جائے گا۔ تو ابھی اس کے پاس جا پھر واپس آ۔ چل میں بھی چلتا ہوں۔''
تاریکی میں مقام بدل گیا۔ وہ دونوں وہاں پہنچے جہاں ننھی ماروی شب دیجور کی آغوش میں تھی۔ اسے چاہنے والے کئی سائے کئی پرچھائیاں اس کے آس پاس تھیں لیکن وہ دونوں اس کے بالکل قریب نہ جاسکے۔ کسی نامعلوم رکاوٹ نے انہیں قریب جانے سے روک دیا تھا۔
آبنوس نے شدید حیرانی سے کہا۔ ''میں جب بھی پرنس عابی پر حملہ کرنے جاتا ہوں' ایسی ہی نامعلوم سی رکاوٹ سامنے آجاتی ہے۔ اے پیشوائے اعظم! یہ بچی کون ہے؟''
کاہن نے کہا۔ ''یہ پرنس عابی کی بہن ہے۔''
آبنوس کے ذہن کو جھٹکا پہنچا۔ اسے پرنس عابی سے دشمنی کے پہلے دن سے معلوم تھا کہ وہ عابی سے بھی مات کھاتا رہے گا بھی کامیاب ہوتا رہے گا لیکن کبھی اس کے دماغ میں تو کیا اس کے جسم کے قریب بھی نہیں جاسکے گا۔ دور ہی دور سے عداوت جاری رکھے گا۔ اور ایسا اس لیے ہوا کہ عابی ابن مراد علی منگی ہے۔ مراد اور اس کے خاندان کے تمام افراد صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں اور ان سب کو بابا صلاح الدین اجمیری کی سرپرستی حاصل ہے۔
ازل سے ایمان اور کفر' پاکی اور ناپاکی کے درمیان جنگ جاری ہے اور یہ قیامت تک جاری رہے گی۔ بابا صلاح الدین اجمیری کی روحانی قوت نے ایک حفاظتی دیوار کھڑی کی تھی۔ طاغوتی قوتیں اس دیوار کو پار کر کے مراد' ہم زاد' زیب النسا' عابد علی منگی اور ماوری تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔
جب پہلی بار آبنوس نے پاتال کی تاریک دنیا سے نکل کر آفتاب و ماہتاب کی روشن دنیا میں حکومت کرنے کا ارادہ کیا تھا تب ہی کاہن نے کہہ دیا تھا کہ وہ ارضی دنیا میں کسی ایک شہ زور سے جنگ لڑتا رہ جائے گا۔ اپنی قوت اور دہشت طاری کرتا رہے گا لیکن کبھی سپر پاور بن کر نہیں رہ سکے گا۔
پھر کاہن نے کہا تھا۔ ''تو دشمن کی روشن دنیا میں جائے گا اور فساد برپا کرے گا تو تیری تاریک دنیا میں بھی

ایک ناقابلِ تسخیر ہستی آئے گی...... اور وہ آگئی تھی۔

☆☆☆

محل کی تاریکی نے نوزائیدہ یاوری کو نگل لیا تھا۔ وہ پیدا ہونے کے بعد نظر نہیں آرہی تھی۔ محل کے باہر بہت بڑے جنریٹر کو چلانے کی کوششیں کی جارہی تھیں اور وہ آن نہیں ہورہا تھا۔ وہ ایک ذرا شور مچا کر اسٹارٹ ہوتا تھا پھر خاموش ہوجاتا تھا۔

پھر ماروی نے آنکھیں کھولیں تو لیڈی ڈاکٹر نے حیرانی سے چیخ کر کہا۔ "وہ دیکھو...... دو ننھی سی آنکھیں چمک رہی ہیں۔"

ایک نرس نے لپک کر اسے چھولیا۔ وہ گمشدہ ہاتھوں میں آگئی۔ ایسے ہی وقت جنریٹر آن ہوگیا۔ پورے ارضِ اسلام کی بجلی بحال ہوگئی۔ پورے محل میں خوش خبری گونجنے لگی کہ بیٹی دنیا میں آگئی ہے اور ماں خیریت سے ہے۔

ہم زاد دوڑا چلا آیا۔ اس نے چاند جیسی بیٹی کو دیکھا جس کے وجود سے واقعی چاندنی پھوٹ رہی تھی۔ عجیب نورانی سی تھی۔ روشنی میں اس کی آنکھیں نہیں چمک رہی تھیں لیکن بہت ہی روشن اور پُرکشش سی تھیں۔

یہ سب نے حیرانی سے دیکھا، وہ نوزائیدہ بچی برہنہ نہیں تھی۔ سفید دھند نے اس کے وجود کو لپیٹ لیا تھا۔ پیدائش کے پہلے لمحے سے ہی معلوم ہورہا تھا کہ وہ آئندہ شرم وحیا کی مثال قائم کرے گی۔

شاہی دستور کے مطابق شہزادی کی آمد پر توپوں کی سلامی دی گئی۔ پھر جیسے پورا ارضِ اسلام نیند سے اٹھ بیٹھا۔ آسمان پر آتش بازی کے تماشے رنگ بکھیرنے لگے۔

مراد نے اسکائپ کے ذریعے ننھی سی ماروی کو دیکھا۔ منی چاچی اور چاچا اسی محل میں رہتے تھے۔ چاچی نے اسے گود میں لے کر چومتے ہوئے کہا۔ "مراد! بچپن میں ماروی کچھ ایسی ہی تھی۔ میری بیٹی واپس آگئی ہے۔ میں نے اسے دودھ پلایا تھا۔ اپنی گود میں رکھ کر اسے جوان کیا تھا۔ یہ میری گود میں پرورش پائے گی۔"

ہم زاد نے کہا۔ "بے شک، ماروی پر آپ کا پورا حق ہے۔ یہ آپ کے سائے میں رہے گی۔"

ایسے وقت چاچی، چاچا اور مراد نے محبوب علی چانڈیو کو یاد کیا۔ ان کے سر جھک گئے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ ماروی کا سچا عاشق تھا۔ اس کی وفات کے بعد اندر ہی اندر گھلتا رہا تھا۔ جب تک زندگی رہی، اسی کے نام سے سانسیں لیتا رہا۔ وہ عاشق آتشِ عشق میں جلتے جلتے معدوم ہوگیا تھا۔

مراد، محبوب اور ماروی کے عشقیہ مثلث کے دو زاویے نابود ہوگئے تھے۔ تیسرا زاویہ بھی کسی دن معدوم ہونے والا تھا۔ اس سے پہلے ہی ماروی ایک نئی داستان کا آغاز کرنے آگئی تھی۔ ماروی ایک نام ہے، پیار ومحبت کا اور شرم وحیا کا۔ ایک ماروی یہ آئی تھی، جو عجوبہ تھی۔ قدرتی اصول کے برعکس پیدا ہوتے وقت ملبوس تھی۔ آئندہ طاغوتی گناہوں کے اندھیرے میں رہ کر حیا کے چراغ جلانے والی تھی۔

ان تون کہلانے والا پریشان تھا۔ وہ نوزائیدہ بچی تاریک دنیا میں آکر پھر چلی گئی تھی۔ اس نے کاہن سے پوچھا۔ "یہاں سورج کی روشنی نہیں آتی، وہ کیسے آگئی تھی؟"

کاہن نے کہا۔ "جیسے تم آفتاب و ماہتاب کی دنیا میں جاتے ہو پھر آجاتے ہو۔"

وہ بولا۔ "مجھے طاغوتی قوت حاصل ہے۔"

"اسے روحانی قوت حاصل ہے۔"

"اس کی آنکھیں ہماری طرح ہیں۔ جب وہ بولنے اور سمجھنے لگے گی تو مجھے صورت سے پہچان لے گی۔ اپنے بھائی کو بتادے گی کہ میں پاتال کے اندھیروں میں رہتا ہوں۔"

"ہاں یہ تو ہوگا۔ جب ذرا عمر گزرے گی۔ وہ اپنے بھائی کے مسائل کو سمجھے گی تو شاید اسے یہاں لے آئے گی۔"

"اس سے پہلے ہی میں اس ننھی کے دماغ میں پہنچ کر......"

وہ بولتے بولتے رک گیا پھر اس نے پوچھا۔ "کیا میں اس بچی کے دماغ میں نہیں جاسکوں گا؟"

"تھوڑی دیر پہلے ہم دونوں اس کے قریب نہ جاسکے، سوچ کہ تو دماغ میں کیسے جاسکے گا؟"

یہ بہت ہی مایوس کرنے والی بات تھی۔ بابا اجمیری کی سرپرستی میں جتنے افراد تھے، ان کے دماغوں میں وہ جا نہیں سکتا تھا۔ عابی کی طرح ماروی سے بھی فاصلہ قائم رہنے والا تھا۔

کاہن نے کہا۔ "کئی ماہ گزر چکے ہیں۔ تم اور عابی ایک دوسرے کو ڈھونڈ نہیں پارہے ہو۔ اب آثار پیدا ہوگئے ہیں۔ اگر عابی اپنی بہن کی مدد سے تجھے دیکھ لے گا تو تو بھی اپنے اس ٹارگٹ کو پالے گا۔ تو اس دنیا کا حکمران بننے کی ضد کررہا ہے اور جنگ رک گئی ہے۔ اسے جاری رکھنے کے لیے روپوشی کو ختم ہونا چاہیے اور یہ اس بچی ماروی کے ذریعے ہی جاری ہوگی۔"

"عقل کہتی ہے وہ ماروی کی مدد سے یہاں نہ آئے۔ اس سے پہلے میں اسے آفتابی دنیا میں ڈھونڈ نکالوں۔"

عابی کو پاتال کی تاریکی میں آنے سے کیسے روکنا تھا؟

اس کے ذہن میں دو تدبیریں گردش کر رہی تھیں۔ ایک تو یہ کہ ماروی کو ہی اپنی دنیا میں آنے سے روک دے۔ اسے ختم کر دے۔ وہ بچی ہے اسے آسانی سے ختم کرنے کے راستے نکل آئیں گے۔ دوسری تدبیر یہ سوجھ رہی تھی کہ باپ کو چھیڑا جائے گا تو بیٹا اس کے پیچھے سے نکل آنے پر مجبور ہو جائے گا۔

مراد علی منگی کا یہ ریکارڈ بھی سامنے تھا کہ آج تک اسے چھیڑنے والے اپاہج اور معذور ہو گئے یا دنیا سے چلے گئے تھے۔ وہ مراد کی سمت رخ کرنے کے متعلق بار بار سوچتا تھا پھر سوچ کر رہ جاتا تھا۔ اگر اس کے ساتھ طاغوتی قوتیں تھیں تو مراد کے ساتھ روحانی قوتیں تھیں۔

☆☆☆

یہ روحانی اور طاغوتی تضادات ازل سے ہیں۔ ابد تک رہیں گے۔ ان میں سے ایک نور ہے۔ دوسرے کی خاصیت تاریکی ہے۔ روشنی میں کچھ چھپایا نہیں جا سکتا۔ سب ہی سامنے آجاتا ہے۔ گویا روشنی سچ کو ظاہر کر دیتی ہے۔

اس دنیا میں ایسے کئی مقامات ہیں جہاں سورج کی روشنی تو پہنچتی ہے لیکن انسانی آنکھیں پہنچ نہیں پاتیں۔

کسی آسیب زدہ مکان میں آہٹیں اور آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن بولنے والا دکھائی نہیں دیتا۔ اسے اسرار کا اندھیرا کہتے ہیں۔

اس زمین میں ایسی سرنگیں ہیں، جن میں اترنے والے کبھی واپس نہیں آئے۔ اس زمین پر نہ سمجھ میں آنے والی باتیں ہیں۔ نہ دکھائی دینے والے وجود ہیں۔ انہیں جادو یا قدرت کے اسرار کہا جاتا ہے۔

ہندوستان کے شمال میں کیلاش پہاڑ اہرام مصر کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں ہزاروں عقیدت مند جاتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کی بلندی تک کوئی چڑھ نہیں پاتا۔ اس پراسرار پہاڑ پر ریسرچ کرنے کے لیے جرمنی کی ایک مہم جو ٹیم گئی تھی لیکن وہاں تک پہنچ نہیں پائی تھی۔ وہاں کے باشندوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس بلندی تک کوئی پہنچ نہیں سکے گا کیونکہ وہاں بھگوان رہتے ہیں۔

فی الحال یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ اس زمین پر وہ تاریک دنیا کہاں چھپی ہوئی ہے، جہاں آبنوس عرف ان نون چھپا رہتا تھا۔ جہاں نوزائدہ ماروی پہنچ گئی تھی جہاں اور کئی پراسرار ہستیاں سانسیں لے رہی تھیں۔

وہاں دماغوں سے کھیلنے والا ایک اور خطرناک کھلاڑی تھا اور وہ ان نون کا استاد کہلاتا تھا۔ اس کا نام بارودا تھا۔ عابی کی طرح حیرت انگیز جسمانی قوتوں کا حامل تھا۔ کسی چٹان پر گھونسے مارتا تو وہ تڑخ جاتی تھی۔

اس کی بیٹی نیلماں بھی عجوبہ تھی۔ وہ ٹھوس وجود رکھتی تھی۔ لیکن جب چاہتی تھی، ٹرانسپیرنٹ ہو جاتی تھی۔ ایسے وقت اس کے آر پار دکھائی دینے لگتا تھا۔

اس تاریکی میں اور بھی پراسرار ہستیاں تھیں۔ ان میں کچھ روحانی صلاحیتیں رکھتی تھیں کچھ شیطانی قوتوں کی حامل تھیں۔

بہت پہلے آبنوس نے بارودا سے کہا تھا۔ ''ہمیں تاریکی سے نکل کر روشن دنیا میں حکومت کرنا چاہیے۔ ہم ٹیلی پیتھی کے ذریعے وہاں کے تمام حکمرانوں کو زیر کرسکیں گے۔''

بارودا نے کہا۔ ''تم جاؤ۔ اپنی ٹیلی پیتھی کی قوتوں کو آزماؤ۔ میں دیکھتا رہوں گا۔ تم جن حالات سے گزرتے رہو گے، انہیں سمجھتا رہوں گا۔''

پھر یہ حقیقت سامنے آئی۔ وہ عابی کے مقابلے میں ناکام ہو رہا تھا۔ بارودا نے کہا۔ ''میں دیکھتا آرہا ہوں۔ اس آفتابی دنیا میں وہی ایک پرنس عابی ناقابلِ تسخیر ہے۔ ایک تو اس کے ساتھ روحانی قوتیں ہیں۔ پھر یہ کہ وہ میری طرح غیر معمولی جسمانی قوتوں کا حامل ہے۔''

آبنوس نے کہا۔ ''تم تو بلا کے شہ زور ہو۔ جسے ایک ہاتھ مارتے ہو وہ مر جاتا ہے۔ تم پرنس کو توڑ کر رکھ دو گے۔ میرے ساتھ چلو۔ ہم اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔''

اس نے کہا۔ ''مجھے اس سے پنجہ لڑانے کی جلدی نہیں ہے۔ تم جلد بازی کے باعث اس سے کمزور ہو گئے ہو۔ بہتر ہے اسے تلاش کرو۔ اس سے فیصلہ کن جنگ لڑو۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔''

پچھلے پانچ مہینوں سے یہ یقین ہو رہا تھا کہ وہ تلاش کرنے سے نہیں ملے گا۔ بارودا نے کہا۔ ''ایک ہی صورت ہے۔ تم اس کے مزاج کے خلاف کچھ ایسا کرو کہ وہ تم سے مقابلہ کرنے کے لیے ظاہر ہو جائے۔''

''میں سوچ رہا ہوں کہ کیا کروں؟ وہ بھی مجھے منظرِ عام پر لانے کی تدبیر کر رہا ہوگا۔''

جمود کو ایک دن ٹوٹنا تھا۔ آخر سکوت میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ انسانی اعضا کے بہت بڑے تاجر ڈی جان ہنٹر نے پولیس کو رپورٹ دی اور پریس میڈیا کے ذریعے بیان دیا کہ کسی نامعلوم شخص نے اسے دھمکی دی ہے کہ اس کی زندگی مختصر ہو گئی ہے۔ وہ آج کل میں دنیا سے جانے والا ہے۔

ڈی جان ہنٹر کے بیان کے مطابق اس کا ایک ہی دشمن پرنس عابی ہے۔ اس نے ایک بار کہا تھا کہ مجرمانہ طریقوں سے انسانی اعضا حاصل کرنے کی سزائیں اسے جلد ہی ملیں گی اور سزا کا وقت آن پہنچا ہے۔

ڈی جان ہنٹر کا دوسرا دشمن ان نون تھا۔ اس کے دماغ کو اپنے شکنجے میں لے چکا تھا۔ اس کے کروڑوں ڈالرز کے کاروبار کو اپنے کسی تابعدار کے نام کر چکا تھا اور یہ وعدہ کیا تھا کہ اس کا محافظ بن کر رہے گا۔ پرنس عابی کو بھی اس کے قریب پہنچنے نہیں دے گا۔

اب وہ اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے ان نون کو پکار رہا تھا۔ ”کہاں ہو تم؟ تم نے کہا تھا میری موت طبعی ہوگی۔ تم مجھے حرام موت مرنے نہیں دو گے۔ تم کہاں ہو؟ ایک نامعلوم شخص نے فون پر کہا ہے کہ میری زندگی مختصر ہوگئی ہے۔ مجھے آج کل میں مار دیا جائے گا۔ میں حرام موت مرنا نہیں چاہتا اور ایسے وقت تم خود ہی پرنس عابی سے منہ چھپا رہے ہو اور میں یقین سے کہتا ہوں ابھی مجھے دھمکی دینے والا وہ نامعلوم شخص پرنس عابی ہے۔ پلیز مسٹر ان نون! تم پرنس کے اور دنیا والوں کے سامنے نہیں آنا چاہتے تو نہ آؤ۔ میرے دماغ میں تو آؤ۔ کیا میرے اندر رہ کر تم پرنس کو مجھ پر حملہ کرنے سے روک نہیں سکو گے؟“

آبنوس سن رہا تھا۔ اس کے دماغ میں پہنچا ہوا تھا لیکن خاموش تھا۔ اس کے خیالات پڑھ رہا تھا۔ کسی نے فون پر اسے دھمکی دی تھی۔ اسے کہا تھا کہ وہ جسے چاہے مدد کے لیے بلا لے۔ یعنی دھمکی دینے والا چاہتا تھا کہ ڈی جان ہنٹر مدد کے لیے ان نون کو بلائے۔ وہ آئے گا، دھمکی دینے والے کو چیلنج کرے گا تو پھر سے عداوت کا بازار گرم ہوگا۔

آبنوس نے ہنٹر کے دماغ سے وہ فون نمبر معلوم کیا جس کے ذریعے دھمکی دی گئی تھی پھر اس نے آواز اور لہجہ بدل کر اس نمبر پر رابطہ کیا۔ ”ہیلو۔ میں ڈی جان ہنٹر بول رہا ہوں۔“

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”تم ہنٹر نہیں ہو۔ مجھے یقین تھا کہ اپنی اوقات بدل کر بولو گے۔“

”مجھے بھی یقین ہے کہ تم بھی اپنی اوقات میں نہیں ہو۔ چوہے کے بل سے نکل آؤ۔“

”تمہاری ٹیلی پیتھی کتنی کمزور ہے۔ چوہے کے بل تک آنے سے معذور ہوگئی ہے۔“

”تم بھی مجھے ڈھونڈ نہ سکے۔“

”میں تمہیں نہیں، تم مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔ تم نے استنبول سے نکلنے کے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ یہ دعویٰ کیا تھا کہ میں جہاں بھی جا کر رہوں گا وہاں کی زمین مجھے پناہ نہیں دے گی۔ دیکھ لو کہ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ میں محفوظ ہوں۔ میں نے تمہیں چوہے کے بل سے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے۔“

”وہ تو نکلنا ہی تھا۔ صرف مجھے ہی نہیں تمہیں بھی کھلی دنیا میں آزادی سے سانس لیتا تھا۔ ڈی جان ہنٹر پیرس کے ایک مضافاتی علاقے میں ہے۔ یہ دیکھو کہ کس طرح تمہارا سراغ مل رہا ہے۔ تم اسے ہلاک کرنے کے لیے وہیں کہیں قریب ہو۔“

عابی نے کہا۔ ”تمہاری معلومات بیس منٹ پرانی ہوگئی ہے۔ اب نہ تو ڈی جان ہنٹر اس علاقے میں ہے اور نہ ہی تم نے میرا سراغ لگایا ہے۔ ذرا اس کی کھوپڑی میں جھانک کر دیکھو۔“

ان نون نے فوراً ہی خیال خوانی کی چھلانگ لگائی۔ ہنٹر کے دماغ میں خاموشی تھی۔ اس کی سوچ کی کوئی لہر نہیں ابھر رہی تھی۔ وہ زندہ تھا لیکن سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس وقت کہیں بے ہوش پڑا تھا۔

وہ فون پر غصے سے بولا۔ ”تم نے اسے بے ہوش کر دیا ہے تاکہ اس کے خیالات سے معلوم نہ کر سکوں کہ وہ کہاں ہے؟“

”اور اب وہ جہاں بھی ہوگا۔ ہوش میں آئے گا تو اس کے خیالات پڑھ کر معلوم نہیں کر سکو گے کہ میں نے اسے کہاں پہنچا دیا ہے۔ یہ دعویٰ غلط ہوگیا کہ تم نے میرا سراغ لگا لیا ہے۔“

”ایک بات کہہ دوں کہ مجھے ڈی جان ہنٹر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ تمہارے ہاتھوں سے مرتا ہے، مر جائے لیکن تم مجھے ڈھونڈ نکالنے میں ہمیشہ ناکام رہو گے۔“

”تمہیں ڈھونڈنا ضروری نہیں ہے۔ میں ایک ہی کام کرتا رہوں گا۔ جب بھی میرے مقابلے میں سوا سیر بننے آؤ گے، تمہیں ایک چھٹانک بنا دوں گا۔ پوری دنیا تمہیں ناکامی کے جوتے کھاتے دیکھتی رہے گی۔“

آبنوس فکر میں مبتلا ہوگیا کہ کیا کرے؟ وہ ایک عرصے کے بعد منظر عام پر آ کر عابی سے مات نہیں کھانا چاہتا تھا۔ اس نے اب تک کسی میڈیا کے ذریعے اپنی آواز نہیں سنائی تھی۔ یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ ڈی جان ہنٹر کو عابی سے بچانے آ گیا ہے۔ وہ فی الحال یہی چاہتا تھا کہ نہ منظر عام پر ظاہر ہو، نہ عابی کو ہنٹر کے معاملے میں چیلنج کرے۔ موجودہ حالات کہہ رہے تھے کہ عابی کا پلڑا بھاری ہے۔ وہ مقابلے

پرآ کر پھر مات کھانے والا ہے۔ وہ دنیا والوں کو یہی تاثر دینا چاہتا تھا کہ ابھی تک کہیں گم ہے اور ڈی جان ہنٹر کے موجودہ حالات سے بے خبر ہے لیکن مراد نے چینلز کے ذریعے پوچھا۔''ان نون خاموش کیوں ہے؟ ڈی جان ہنٹر نے اپنا کروڑوں ڈالرز کا کاروبار اس کے نام کیا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اسے پرنس عابی کی سزا سے بچائے لیکن وہ خاموش کیوں ہے؟''

آبنوس یہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ پریس میڈیا اور ٹی وی میڈیا کے ذریعے مراد کی آواز نہیں سن رہا ہے۔ اس نے کہا۔ ''میں عابی سے غافل رہا تھا۔ اس نے میری غفلت سے فائدہ اٹھا کر ڈی جان ہنٹر کو اغوا کیا ہے۔ اس کے دماغ کو ناکارہ بنادیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اسے بچانے میں ناکام ہو رہا ہوں۔ میں عابی کو وارننگ دیتا ہوں کہ وہ ہنٹر کو رہا کردے۔ وہ ایک کمزور شخص کو ہلاک کر کے شہ زور نہیں کہلائے گا۔ وہ شہ زور ہے تو میرے مقابلے پر رہے۔ وہ اب تک مجھے چھو بھی نہیں سکا ہے۔ پوری دنیا نے دیکھا ہے۔ میں نے اسے پانچ مہینوں تک منہ چھپا کر رہنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ ابھی تک چھپا ہوا ہے۔ صرف اپنی آوازیں سنا رہا ہے۔ کسی کو منہ نہیں دکھا رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جہاں نظر آئے گا۔ میں اسے وہاں سے کہیں جانے نہیں دوں گا۔ پہلے کی طرح اس کے آنے جانے کے تمام راستے بند کردوں گا۔''

وہ اس حد تک درست کہہ رہا تھا۔ عابی اصلی چہرے کے ساتھ منظرِ عام پر نہیں آیا تھا۔ اس نے واقعی اسے مجبور کردیا تھا۔ جب تک وہ نظر نہ آتا عابی سے برابر کا مقابلہ نہ ہوتا۔ کسی حد تک برابر کا مقابلہ اب ہو رہا تھا۔ وہ بھی ان نون کی طرح نادیدہ ہو گیا تھا۔ موجود رہ کر بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ بڑی رازداری سے بڑے لمبے راستوں سے گزرتے ہوئے ارضِ اسلام کے محل میں آ گیا تھا۔ وہاں ہم زاد کے پرسنل سیکریٹری کی حیثیت سے دن گزار رہا تھا۔

اس نے ہم زاد سے کہا۔''بابا! میں پوری دنیا گھومنے نکلا تھا۔ حالات نے واپس لا کر یہاں پھینک دیا ہے لیکن میں تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح ایک ہی جگہ نہیں رہوں گا۔ یہاں سے جلد ہی چلا جاؤں گا۔''

اس نے ننھی ماروی کو ہاتھوں میں لے کر اسے چوم کر کہا۔''یہ اچھا ہے کہ مجھے یہاں آ کر اس کے ساتھ رہنے کا موقع مل رہا ہے۔ یہ بڑی پراسراری سی لگ رہی ہے۔ میں اس کا مشاہدہ کرتا رہوں گا۔''

اب تک یہی دیکھا گیا تھا کہ ہزار جتن سے چھپنے والے خلاف توقع اچانک ہی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ انسان صرف اپنی قبر میں جا کر ہی ہمیشہ کے لیے چھپ سکتا ہے۔

عابی کے حوالے سے یہ اندیشہ تھا کہ وہ اپنے قد، اپنی جسامت اور اپنی حرکات و سکنات سے جلد ہی پہچانا جائے گا۔ لڑکیاں بڑی تیز ہوتی ہیں۔ جسے چاہتی ہیں، اسے ہزار روپ میں بھی پہچان لیتی ہیں۔ وہ عابی کو چہرے سے نہ پہچان کر بھی اس کی شخصیت کے آگے بچھونا بن جاتیں۔

اور نیلماں اسے ہزار جان سے چاہنے لگی تھی۔ وہ اکثر تاریکی سے نکل کر روشنی میں آتی تھی۔ اسے دور ہی دور سے دیکھتی رہتی تھی۔ عابی اس کے باپ کی طرح جسمانی قوت رکھتا تھا۔ اس کا آئیڈیل بن گیا تھا۔ وہ اس سے دوستی کرنا چاہتی تھی لیکن ماریہ پہلے ہی اس کا دل جیت چکی تھی۔ اس لیے وہ پیچھے ہٹ گئی تھی۔

اگر وہ چاہتی تو اپنی غیر معمولی طاغوتی صلاحیتوں سے ماریہ کو اپنے راستے سے ہٹا دیتی لیکن وہ حسد، جلن اور عداوت پالنے والی لڑکی نہیں تھی۔ اس نے صبر کرلیا تھا۔ اب ماریہ کی وفات کے بعد دل نے کہا۔''تقدیر میرے لیے راستہ ہموار کر رہی ہے لیکن خطرے کا سگنل بھی دے رہی ہے۔''

خطرے کا سگنل یہی تھا کہ کوئی بھی چاہنے والی اس کی منکوحہ بن کر ازدواجی مسرتیں حاصل نہیں کرسکے گی۔ وہ دنیا کا پہلا محبوب، پہلا آئیڈیل ہے جو پیار سے گلے لگا کر مار ڈالتا ہے۔

پھر یہ خیال بھی تھا کہ وہ اپنے باپ اور آبنوس کی طرح طاغوتی قوتوں کی حامل ہے اور شیطان کو ماننے والے عابی کے قریب جا نہیں پاتے ہیں۔ وہ بھی اس کے قریب جا نہیں پائے گی۔

ان ہی دنوں اس نے خواب میں ایک بزرگ کو دیکھا۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اس کے سر پر اپنی ہتھیلی کا سایہ کیا پھر کہا۔''دو ہی طاقتیں ازل سے برسرِ پیکار ہیں۔ ایک روحانی قوت ہے، دوسری طاغوتی...... ایک خیر ہے دوسری شر...... اپنی پراسرار قوتوں سے کسی کو مار ڈالو تو یہ کالا جادو ہے۔ سراسر شیطانیت ہے۔ کسی پراسرار قوت سے کسی کو زندگی دو تو یہ روحانیت ہے۔ اللہ کی رضا ہے۔ اللہ تم سے راضی ہے۔ بدی کو نیکی میں، طاغوت کو روحانیت میں بدل دو......''

وہ بزرگ غائب ہو گئے۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ

تاریکی میں تکنے لگی۔سوچنے لگی۔زندگی میں پہلی بار ایک خواب نے کہا تھا کہ وہ طاغوت کے اندھیروں سے نکل کر روحانیت کے اجالوں میں آسکتی ہے۔

وہ ایسا سوچتے وقت عجیب سی طمانیت اور نامعلوم سی روحانیت محسوس کررہی تھی۔شاید شیطانی بوجھ اتر رہا تھا۔وہ خود کو ہلکا پھلکا۔۔محسوس کررہی تھی۔

جب نوزائدہ ماروی تاریک دنیا میں آئی تھی، تب اس نے دور سے اسے دیکھا تھا۔آبنوس اور بارودا کی طرح جانتی تھی کہ اس بچی کے قریب نہیں جاسکے گی۔اب اس نے سوچا۔'میرے دل میں عداوت نہیں ہے۔عابی کے لیے محبت ہے۔اس کی بہن بھی میرے لیے عزیز ہے۔مجھے اس کے قریب جانا چاہیے۔'

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی پھر پلک جھپکتے ہی محل کی خواب گاہ میں پہنچ گئی۔زیب النساء گہری نیند میں تھی۔ماروی اس کے قریب ایک چھوٹے سے بیڈ پر تھی۔نیلماں کے آتے ہی اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

خواب گاہ میں زیرو پاور کی دھیمی سی روشنی تھی۔اس نیم روشنی نیم تاریکی میں ماروی اور نیلماں کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔دونوں ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھ رہی تھیں۔پھر ماروی کی آنکھیں مسکرانے لگیں۔نیلماں کو حوصلہ ہوا تو وہ قریب آگئی۔اس پر ذرا سا جھک گئی۔کسی طرح کی نادیدہ رکاوٹ نہیں تھی۔اس نے دونوں ہاتھ بڑھا کر ماروی کے ایک ہاتھ کو تھام لیا۔

یہ ایک طرح سے اس کے لیے نوید تھی کہ وہ طاغوت کے اندھیروں سے نکل آئی ہے۔اس خاندان میں صوم و صلوٰۃ کے پابند رہنے والے تمام افراد بابا اجمیری کی روحانی سرپرستی میں تھے۔طاغوتی قوتوں کے سائے میں رہنے والے ان کے قریب نہیں جاسکتے تھے۔انہیں چھو بھی نہیں سکتے تھے اور اس نے چھو لیا۔بڑی عقیدت سے بڑی محبت سے دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا۔اس کے چہرے پر اپنا چہرہ رکھا پھر اسے چوم لیا۔ان لمحات میں اس کے احساسات اچانک ہی رومان پرور ہوگئے۔ماروی کو سینے سے لگا کر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ عابی سے آلگی ہو۔

وہ اسے دھڑکنوں سے لگائے محل سے نکل کر اپنی

تاریک دنیا میں آگئی پھر اسے چوم کر بولی۔ ''میرا جی چاہتا ہے تم سے خوب باتیں کروں۔ وہاں تمہاری ماما کی آنکھ کھل جاتی۔ یہاں کوئی نہیں سنے گا۔ ہمیں کوئی نہیں دیکھے گا۔''

وہ اس پر جھک کر بولی۔ ''تم مجھ سے بول نہیں سکو گی۔ میرے دل کی باتیں سنتی رہو گی۔ تم نہیں جانتیں کہ میرے دل میں کون دھڑک رہا ہے؟''

ننھی ماروی مسکرانے لگی۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم مسکرا رہی ہو۔ کیا میرے دل کی بات جانتی ہو؟''

ماروی نے پلک جھپکائی۔ صاف طور سے سمجھ میں آیا کہ 'ہاں' کہہ رہی ہے۔

نیلماں کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ''ہائے ماروی......! کیا تم مجھ سے بول رہی ہو؟ کیا میری باتیں سمجھ کر عجیب انداز میں اشاروں سے جواب دے رہی ہو؟''

اس نے پھر ایک بار پلک جھپکائی۔ یہ یقین کرنے والی بات نہیں تھی کہ دو دن کی بچی باتیں سمجھ رہی ہے اور جواب دے رہی ہے۔ اس نے فرطِ حیرت سے اسے دھڑکنوں سے لگا کر بھینچ لیا۔ ''اوہ ماروی......! میں نے سنا تھا' پیدائش سے پہلے ہی تمہیں بھی عابی کی طرح عجوبہ کہا جا رہا ہے اور واقعی جو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا' وہ دیکھ رہی ہوں۔ تم حیران کر رہی ہو۔ بے شک تم اپنی دنیا والوں سے الگ ہو۔ اسی لیے پیدا ہوتے ہی ہماری تاریک دنیا میں آپ ہی چلی آئی تھیں جبکہ یہاں کوئی آ نہیں سکتا۔ صرف یہاں کے لوگوں کو' صرف ہمیں ہی یہ قدرتی قوت حاصل ہے۔ ہم چشم زدن میں اس دنیا سے اس دنیا میں' جہاں چاہتے ہیں' پہنچ جاتے ہیں۔ میری ننھی سی گڑیا یہ قوت تمہیں حاصل ہے۔ تم پیدا ہوتے ہی از خود یہاں آگئی تھیں۔ اوہ ماروی......! بے شک تم عجیب و غریب ہو۔''

تاریکی میں دونوں کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ نیلماں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں تمہاری صورت میں تمہارے بھائی کو دیکھ رہی ہوں۔ وہ آبنوس کی عداوت کے باعث روپوش رہتا ہے۔ اس کی آزادی ختم ہوگئی ہے اگر میں عابی کو بتا دوں کہ آبنوس یہاں تاریک دنیا میں رہتا ہے تو اس کی آزادی بھی ختم ہو جائے گی۔ وہ بھی بھاگتا اور چھپتا پھرے گا۔''

اس بات پر ننھی بہن کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں اور چمک پیدا ہوگئی۔ وہ آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ ''اللہ کرے وہ دشمن میرے بھائی کی نظروں میں آجائے......''

نیلماں نے کہا۔ ''ہم مجبور ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ یہ تاریک دنیا کہاں ہے؟ صرف ہم ہی نادیدہ ہو کر یہاں آتے جاتے ہیں۔ کسی کو ساتھ نہیں لا سکتے مگر ہاں......''

وہ سر ہلا کر بولی۔ ''آبنوس جب بھی روشن دنیا میں عابی کو نقصان پہنچانے آئے گا تو میں عابی کو بتا دوں گی کہ وہ کس ملک کے کس شہر' کس علاقے میں چھپ کر اس پر حملہ کرنے آیا ہے۔''

اس بات پر دو دن کی بچی نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ نیلماں نے فوراً ہی اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ وہ ننھا سا ہاتھ زبانِ بے زبانی سے کہہ رہا تھا۔ ''یہ میرا نہیں' بھائی کا ہاتھ ہے۔ اسے تھام لو۔ بھائی کو دشمن کی صورت دکھا دو۔''

اس ننھی بچی کے اشاروں کی زبان پیچیدہ نہیں تھی۔ نیلماں سمجھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''پہلے یہ ضروری ہے کہ تمہارے بھائی سے شناسائی ہو۔ ہمارے درمیان دوستی اور اعتماد پیدا ہو۔''

ہاں' یہ ضروری تھا۔ ان لمحات میں ماروی نے کرشمہ دکھایا۔ اس نے چشم زدن میں جگہ بدل دی۔ اپنے محل میں آگئی۔ نیلماں بھی اس کے ساتھ آگئی لیکن وہ اپنے اور زیب النساء کے بیڈروم میں نہیں آئی تھی۔ اس دوسری خواب گاہ میں ایک صحت مند قد آور جوان آرام دہ بیڈ پر سو رہا تھا۔

نیلماں اپنی غیر معمولی صلاحیت سے کسی کو بھی بہروپ میں (پلاسٹک سرجری کے میک اپ کے باوجود) پہچان لیتی تھی۔ وہ پرنس عابد علی منگی عرف عابی تھا۔

اس کے دل کی دھڑکنیں یکلخت تیز ہوگئیں۔ وہ پہلی بار عابی کے قریب آگئی تھی اور کوئی نادیدہ رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ماروی کو محبت سے چوم کر اسے بھائی کے پہلو میں لٹا دیا۔ اس نے کہا تھا' پہلے تمہارے بھائی سے شناسائی ہو۔ ان کے درمیان دوستی اور اعتماد پیدا ہو۔ اس کی یہ طلب پوری ہوگئی تھی۔ بہن نے اسے بھائی کے پاس پہنچا دیا تھا۔

اس وقت عابی کے سرہانے لگے ہوئے اسپیکر سے...

ہم تراو کی آواز ابھری۔ ''عابی! اٹھو' آنکھیں کھولو۔ غضب ہو گیا ہے۔ ماروی گم ہوگئی ہے۔ اسے پورے محل میں ڈھونڈا جا رہا ہے۔ فوراً آؤ۔''

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ بیڈ سے اترتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ آپ ہی آپ کہیں جا نہیں سکتی۔ کوئی دشمن محل کے اندر آ نہیں سکتا۔ میں آ رہا ہوں۔''

وہ بولتے بولتے دروازے کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔ بچی کے ہمکنے کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو بہن گم نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بیڈ پر پہنچی

ہوئی تھی۔ اس نے دوڑتے ہوئے آکر اسے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ حیرانی سے بولا۔ ''بھائی کی جان..... تم یہاں کیسے آگئیں؟''

''میں لائی ہوں۔''

اس نے چونک کر دیکھا۔ نیلماں ایک پردے کے پیچھے سے جھلک رہی تھی۔ اس نے تیور بدل کر پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

''دشمن نہیں ہوں۔ اگر ہوتی تو اسے یہاں نہ لاتی۔''

''دشمن نہیں ہو۔ دوست اور شناسا بھی نہیں ہو۔ میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''پہلے اپنی بہن ماروی کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ پیدا ہوئی ہے تو میں بھی پیدا ہوگئی۔ میں اس کی سہیلی ہوں۔''

وہ ذرا چپ ہوئی۔ عابی نے کہا۔ ''آگے بولو۔''

''اسے ماں کے بیڈ سے اٹھا کر تمہارے پاس لائی ہوں، تمہارا اعتماد حاصل کرنے۔ اس سے دشمنی نہیں کر رہی ہوں۔''

''تم کون ہو..... میری بہن میں دلچسپی کیوں لے رہی ہو؟''

''میں اس کے بھائی میں بھی دلچسپی لے رہی ہوں۔ مجھے یہ دل تمہارے پاس لے آیا ہے۔''

اس نے پہلی بار نیلماں کو توجہ سے دیکھا۔ وہ حسین تھی۔ پرکشش تھی اور وہ شجرِ ممنوعہ سے گزر کر آیا تھا۔ آرزوئیں پکارتی تھیں لیکن حالات کا تقاضا تھا کہ صبر کرے اور بہتری کی طرف جانے کا انتظار کرے۔

وہ بول رہی تھی۔ ''یہ دیکھو کہ تم نے بھیس بدلا ہے۔ کوئی تمہیں پہچان نہیں سکتا۔ میں پہچان رہی ہوں۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا پراسرار علوم جانتی ہو؟''

''ہاں۔ یہ علم ہی مجھے یہاں لایا ہے۔''

''اگر دل سے آئی ہو تو اسرار کے پردے اٹھاؤ۔ کون ہو؟ اپنی ہسٹری سناؤ۔''

دروازے پر دستک سنائی دی۔ باہر سے ہم زاد نے پوچھا۔ ''تم ابھی تک کمرے میں ہو؟''

وہ فوراً پردے کے پیچھے چلی گئی۔ عابی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول کر بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ ماروی یہاں ہے۔''

زیب النساء دوڑتی ہوئی ماروی کے پاس آئی پھر اسے بیڈ سے اٹھا کر سینے سے لگالیا۔ ہم زاد نے پوچھا۔ ''یہ یہاں کیسے آگئی؟''

عابی نے جواب دینے سے پہلے سر گھما کر پردے کی طرف دیکھا۔ اس کا ایک ذرا سا لباس جھلک رہا تھا۔ اس نے ہم زاد سے کہا۔ ''ہم ماروی کی پیدائش سے پہلے سمجھ گئے تھے کہ یہ میری طرح عجوبہ ہوگی۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ وہاں سے یہاں کیسے آگئی؟ اللہ کا شکر ہے کہ محفوظ اور سلامت ہے۔''

زیب النساء نے کہا۔ ''بے شک۔ اللہ تعالیٰ سلامتی دینے والا ہے۔ یہ عجوبہ ہے۔ آئندہ بھی ہم عجیب وغریب حالات سے گزرتے رہیں گے۔''

وہ باتیں کرتے ہوئے ماروی کو لے کر چلے گئے۔ عابی نے دروازے کو بند کرکے وہاں سے گھوم کر دیکھا۔ وہ پردے سے باہر آکر بیڈ کے سرے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں اندھیرے کی پروردہ ہوں۔ ایک ایسی دنیا سے آئی ہوں، جہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچتی۔ میں نے نہ بزرگوں سے سنا ہے، نہ کتابوں میں پڑھا ہے۔ پاتال میں، سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں سورج کی روشنی پہنچ نہیں پاتی۔ ہماری دنیا شاید وہیں کہیں ہے۔ ہم ہزاروں کی تعداد میں وہاں رہتے ہیں۔''

''تعجب ہے۔ تم اپنی دنیا کا جغرافیہ نہیں جانتی ہو۔ کسی سمت کسی راستے کے بغیر وہاں سے کیسے آئی ہو؟ واپس کیسے جاؤ گی؟''

''میں نہیں جانتی۔ تاریک دنیا کا کوئی باشندہ نہیں جانتا۔ ہمیں ایک نامعلوم سی ماورائی قوت حاصل ہے۔ ہم جب چاہتے ہیں پلک جھپکتے ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ ہزاروں میل دور پہنچ جاتے ہیں، پلک جھپکنے کے مختصر سے لمحے میں معلوم نہیں ہوتا کہ کہاں سے گزر کر مقامِ مطلوب تک آئے ہیں۔''

عابی نے پوچھا۔ ''کیا وہاں کے اور بھی لوگ ہماری دنیا میں آتے ہیں؟''

اس کے جواب نے اسے چونکا دیا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ''ہاں۔ ان نون وہیں سے آتا ہے۔''

عابی ایک صوفے پر بیٹھنے جا رہا تھا۔ یکلخت اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ''کیا کرنٹ لگا ہے؟''

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''تم سچ کہہ رہی ہو؟''

''تم سب سچے دین کے سچے عبادت گزار ہو۔ میں طاغوتی ماحول میں پرورش پاتی رہی ہوں۔ تمہاری محبت اور کشش مجھے سچائی کی طرف لارہی ہے۔''

''کیا تمہاری دنیا میں شیطان کی پرستش ہوتی ہے؟ کیا ان نون شیطان کا پجاری ہے؟''

''ہاں۔ اس کا نام آبنوس ہے۔ آبنوس کے درخت کی

طرح بہت ہی سیاہ، بہت ہی سخت ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ جلد ہی تمہیں ہلاک کر کے تمہاری دنیا کا سب سے طاقتور حکمران بن جائے گا۔ میرے پاپا اس سے زیادہ ٹیلی پیتھی کے ماہر ہیں۔ ایسے طاقتور ہیں کہ تمہاری طرح روبوٹ کہلاتے ہیں۔ وہ جلد ہی تمہارے خلاف آبنوس کی طاقت بننے والے ہیں۔''

''تم مجھ سے عداوت رکھنے والے کی بیٹی ہو۔ محبت سے یہاں کھنچی چلی آئی ہو۔ عداوت اور محبت کے درمیان رہ کر میرے ان مخالفین تک مجھے پہنچا سکو گی؟''

''یہ جانتی ہوں کہ بڑی مخالفتوں سے بڑی مشکلات سے گزرنا ہوگا۔ پاپا سے مخالفت مہنگی پڑے گی۔ آبنوس سے نمٹ لوں گی۔ تمہیں اس کا چہرہ دکھا دوں گی۔ تاریک دنیا میں نہ کوئی جا سکتا ہے، نہ ہم کسی کو وہاں لے جا سکتے ہیں۔ میں تمہیں بتا دیا کروں گی کہ وہ تم پر حملہ کرنے کے لیے کس ملک میں، کس علاقے میں موجود ہے۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''تم تو میری تمام مشکلیں آسان کر رہی ہو۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہو جائے کہ وہ ان نون یعنی آبنوس کون ہے اور مقابلے کے دوران میں کہاں رہتا ہے پھر تو اسے تاریک دنیا میں جا کر چھپنے کا موقع ہی نہیں دوں گا۔''

پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا واقعی میں کسی طرح اس تاریک دنیا میں نہیں جا سکوں گا؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''ناممکن ہے۔ وہاں جانے کی قدرتی صلاحیت صرف ماروی کو حاصل ہے۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہی ہو؟''

''ہاں، یقین کرو۔ وہ پیدا ہوتے ہی ہماری دنیا میں آئی تھی۔ پتا نہیں یہ کیا بھید ہے؟ کیسے آئی تھی؟ وہاں... پُراسرار علوم کے ماہر کہتے ہیں کہ وہ ہمارے جیسے غیر معمولی علوم کی اور عجیب و غریب صلاحیتوں کی حامل ہوگی۔''

وہ خوش ہو کر بڑے جذبے سے بولا۔ ''جلِ جلالہ و جلِ شانہ میری بہن تمہاری دنیا میں جا سکتی ہے۔ وہاں اس کے بارے میں پیش گوئیاں کی جا رہی ہیں۔''

پھر اس نے نیلماں کو بڑی اپنایت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم میرے لیے عطائے خداوندی ہو۔ میرے لیے آبنوس تک پہنچنا ناممکن سا ہو رہا تھا۔ اب تم ممکن بناتی رہو گی۔ تم اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔ وعدہ کرتا ہوں، تمہاری چاہت کا جواب ہمیشہ چاہت سے دیتا رہوں گا۔''

وہ خوشی سے لہرا گئی۔ اک ادائے ناز سے چلتی ہوئی قریب آ گئی۔ اس نے کہا۔ ''نیلماں......! کیا تم جانتی ہو کہ میری قربت موت بن جاتی ہے؟''

وہ ایک آہ بھر کر بولی۔ ''ہاں۔ سنا ہے۔''

''تو پھر سوچو۔ تم میری زندگی میں آنے کے لیے اپنے باپ کی اور شیطان کے پرستاروں کی مخالفتیں مول لو گی۔ میرا دین قبول کرو گی پھر میری منکوحہ بنو گی۔ پھر کیا ہوگا......؟ سوچو اور سمجھو۔ وہی ہوگا جو میڈیکل رپورٹ کہہ چکی ہے۔ تمہاری محبت اور قربانیاں اس رپورٹ کو بدل نہیں سکیں گی۔''

وہ بڑے عزم سے بڑے اعتماد سے بولی۔ ''میں بدل دوں گی۔''

''کیسے بدل دو گی؟''

''ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ حیا مانع ہے۔ میری اس بات کا یقین کرو کہ تم میری موت کا سبب کبھی نہیں بنو گے۔''

وہ اور قریب آ کر بولی۔ ''تم روبوٹ ہو۔ کسی کو بھی پکڑ کر کپڑے کی طرح نچوڑ دیتے ہو۔ میری مرضی کے بغیر مجھے چھو بھی نہیں سکو گے۔''

وہ اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھا کر بولی۔ ''میں کہتی ہوں، مجھے چھو نہیں سکو گے۔ لو میرے دعوے کو جھٹلاؤ۔''

عابی نے ایک ذرا سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑ لی۔

نہ پکڑ سکا۔ حیران رہ گیا۔ وہ ٹرانسپیرنٹ ہو گئی تھی۔ کانچ کا مجسمہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے وجود کے آر پار نظر آ رہا تھا۔ کلائی عابی کی مٹھی میں تھی لیکن وہ گوشت پوست کی نہیں تھی۔

وہ مسکرا کر بولی۔ ''سمجھ لو کہ مجھے تم سے نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں پھر آؤں گی۔ ابھی جانا ضروری ہے۔''

یہ کہتے ہی وہ نادیدہ ہو گئی۔ کانچ کا وجود گم ہو گیا۔

☆☆☆

مراد پیرس میں تھا اور پرنس عابد علی منگی کا رول ادا کر رہا تھا۔ اس کے فون کالز کے کوڈ نمبرز سے سب ہی کو یقین ہو گیا تھا کہ پرنس عابی پیرس میں ہے۔

یہودی اکابرین اسے بار بار کہہ رہے تھے کہ پہلے کی طرح ان کی سیکورٹی میں رہے۔ ڈی جان ہنٹر کے کاروبار سے یہودیوں کا بہت گہرا تعلق تھا۔ وہ مراد کو پرنس سمجھ کر اس سے گزارش کر رہے تھے کہ ہنٹر کو معاف کر دے۔ اسے باقی زندگی جی لینے دے۔

مراد نے کہا۔ ''ڈی جان ہنٹر کا وجود خالص نہیں ہے۔ اس کی بینائی ختم ہو رہی تھی۔ اس نے کسی کو اغوا کروا کے اس کی آنکھیں حاصل کی تھیں۔ میرے ڈاکٹر نے اس کی وہ آنکھیں نکال لی ہیں۔''

کریگ ہوسٹن نے صدمے سے کہا۔ ''پرنس! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ ہماری یہودی تنظیم کا ایک اعلیٰ عہدیدار ہے۔ اس پر ظلم نہ کرو۔''

مراد نے کہا۔ ''اس پر کوئی ظلم نہیں ہوا ہے۔ میں نے چوری کا مال اس سے واپس لیا ہے۔''

''پلیز ہمیں بتاؤ، وہ کہاں ہے؟ اسے ہمارے حوالے کردو۔''

''وہ ایک اسپتال میں ہے۔ اس کے گردے بھی اپنے نہیں تھے لہٰذا انہیں بھی نکال لیا گیا ہے۔ اس کا دل بھی اپنا نہیں تھا۔ اسے بھی اس کے سینے سے نکالنے والے تھے لیکن اس سے پہلے ہی کمبخت مر گیا۔''

ہوسٹن نے سخت لہجے میں کہا۔ ''پرنس! آپ نے بڑی درندگی کا ثبوت دیا ہے۔''

''ٹھیک وہی درندگی ہنٹر کے ساتھ کی گئی ہے جو وہ دوسروں کے ساتھ کر چکا ہے۔ چور سے چوری کا مال واپس لینا اور اسے سزا دینا عین انصاف ہے۔''

اس واقعے کے بعد یہودیوں کے تیور بدل گئے۔ وہ پرنس کو ابتدا سے اپنے دائرۂ اثر میں رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے تھے۔ اس یہودی ماں کے بیٹے کو کٹر یہودی بنانے کے لیے تل ابیب لے جا رہے تھے لیکن یہ دیکھتے آرہے تھے کہ دینِ اسلام اس کی رگ رگ میں لہو کی طرح دوڑتا ہے۔ اس کی ہر سانس اللہ کے نام سے آتی جاتی ہے۔ وہ بہت ہی ضدی اور خودسر تھا۔ ان اکابرین کے منہ پر قرآن مجید کی ایسی آیتیں پڑھتا تھا جو یہودیوں کو مفسد اور شر پسند ثابت کرتی ہیں۔

وہ اکابرین سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے اور یہ آخری فیصلہ کر رہے تھے کہ اسے اپنے مزاج اور اپنے مذہب کے سانچے میں نہیں ڈھال سکیں گے۔ اگر وہ واقعی ان کے دجال کا خاص نمائندہ ہے اور یہودی قوم کو عروج کی سمت لے جانے آیا ہے تو وہ خود ہی اپنا موجودہ رویہ تبدیل کرے گا۔ اپنے دین سے باز آکر ان کا دین قبول کرے گا۔

کریگ ہوسٹن نے کہا۔ ''ہم پچھلے ایک برس سے دن رات اس کے آگے پیچھے رہتے آرہے ہیں۔ اس کی دلجوئی کے لیے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہم نے کیا نہیں کیا ہے؟ اپنے مذہب کے خلاف اس کی سخت باتوں کو برداشت کیا ہے۔ مجھے تو یقین ہوگیا ہے کہ یہ ہمارا کبھی نہیں ہو سکے گا۔''

ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ''میں تو کہتا ہوں ہمارے پیشوائے اعظم کی یہ پیش گوئی بالکل ہی غلط ہے۔ یہ پرنس کیا ہے؟ دو کوڑی کی ایک ماڈل کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ یہ قوم یہود کا معتبر نمائندہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم نادانی میں اپنا وقت اور اپنی دولت ضائع کرتے آرہے ہیں۔''

ایک نے کہا۔ ''ہم اسے چھوڑ دینے کی بات کر رہے ہیں جبکہ وہ ہمیں چھوڑ چکا ہے۔ اس نے پچھلے پانچ ماہ سے نہ ملاقات کی نہ دور سے ہی صورت دکھائی ہے۔ وہ دشمن سے منہ چھپا رہا ہے۔ ہم سے تو نہیں چھپانا چاہیے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''اور اب فون پر کسی سے بولتا ہے اور سم بدل دیتا ہے۔ اس نے ڈی جان ہنٹر کو درندگی سے ہلاک کر کے جتا دیا ہے کہ وہ جب چاہے گا' یہودیوں کا لہو اچھالتا رہے گا۔''

''کیا ہم اتنے بے بس اور مجبور ہیں کہ اس کے ہاتھوں نقصانات اٹھا کر ذلتیں اٹھا کر چپ چاپ بیٹھے رہیں۔''

ایک نے اپنی ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''اس نے اب تک ہمارے خلاف جتنی آیتیں پڑھی ہیں' ان کا جواب دینا ہوگا۔''

''جواب کیسے دیں گے؟ وہ ناقابلِ شکست ہے۔ کیا مشکل ہے۔ کوئی اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا ہے۔ اس کا ہاتھ کھاتے ہی پھڑ پھڑا کر مر جاتا ہے۔''

''ہم اسے مار نہیں سکیں گے۔ اس کے لیے مسائل تو پیدا کر سکیں گے۔ اسے نہیں چھیڑیں گے۔ دور ہی دور سے اس کی زندگی کو کانٹوں کا بستر بنا سکیں گے۔''

''مگر کیسے؟ کوئی تدبیر ہے؟''

''ہاں، ایک تدبیر ہے۔ ان نون سے دوستی کریں گے۔''

''وہ مقابلے میں بڑی حد تک کامیاب ہے۔ اس نے عابی کے قدم اکھاڑ دیے ہیں۔ اسے منہ چھپا کر رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ کبھی آزادی سے منظرِ عام پر نہیں آسکے گا۔ آئے گا تو ان نون پھر اس کے آس پاس گولیاں چلائے گا۔ دھماکے کرے گا۔ تباہی مچائے گا۔ اسے پھر بھاگنا اور منہ چھپانا ہوگا۔''

''بے شک یہ ان نون کی کامیابی ہے۔ مراد علی منگی بھی ناقابلِ شکست کہلاتا ہے۔ وہ بھی ان نون کے خلاف

کوئی کارروائی نہیں کر رہا ہے۔ ہم پہلی بار مراد کو کمزور اور مجبور پا رہے ہیں۔''

''واقعی صاف نظر آ رہا ہے۔ ان نون نے ان باپ بیٹے کو روپوشی کے اندھیرے میں پھینک دیا ہے۔ وہاں سے وہ باہر آنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔''

''ہمیں ان نون سے دوستی کرنے کے لیے اس کا اعتماد حاصل کرنا چاہیے۔ ہم ابھی اسے مخاطب کریں گے۔''

پرنس عالی اور ان نون سے رابطے کے لیے ایک چینل کو مخصوص کروایا گیا تھا۔ کریگ ہوسٹن نے اپنی آواز اور لہجہ بدل کر فون کے ذریعے اس چینل سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ''میں ان نون سے مخاطب ہوں۔ اگر وہ پرنس عالی کو چوہے کے بل سے نکالنا چاہتا ہے تو مجھ سے فون پر بات کرے۔''

اس نے فون نمبر بتایا پھر وہ تمام اکابرین انتظار کرنے لگے۔ ادھر بارودا نے آبنوس سے کہا۔ ''کوئی پرنس کی روپوشی توڑنے کا بہت بڑا دعویٰ کر رہا ہے۔ اس سے بات کرو۔''

آبنوس نے کہا۔ ''پرنس کوئی چال چل رہا ہوگا۔''

''چلنے دو۔ فون پر بولو گے تو وہ تمہارا کیا بگاڑ لے گا؟ جاؤ شاید تمہارے لیے راستہ کھل رہا ہے۔''

اس نے اپنے فون پر وہ نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہونے پر بولا۔ ''میں ہوں ان نون۔ کیا تم جانتے ہو پرنس کہاں چھپا ہوا ہے؟''

''پہلے یقین دلاؤ کہ تم ان نون ہو۔''

''تمہارے دماغ میں آ کر یقین دلا رہا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ خیال خوانی کے ذریعے اس کے دماغ میں آیا۔ ہوسٹن نے سانس روک کر سوچ کی لہروں کو بھگا دیا۔ پھر ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں نادان نہیں ہوں کہ اپنا دماغ، اپنی آزادی تمہیں دے دوں۔ تم سے محتاط رہنے کے لیے میں نے پہلے ہی تنویمی عمل کے ذریعے اپنے دماغ کو مقفل کروا لیا ہے۔ اس طرح ہم آقا اور غلام نہیں رہیں گے۔ برابری کی سطح پر معاملات طے کریں گے۔''

''تم کام آؤ گے تو میں بھی تمہارے کام آؤں گا۔ ابھی کام کی بات کرو، پرنس کہاں چھپا ہوا ہے؟''

ہوسٹن نے کہا۔ ''اپنے گھر میں ہے۔ ارضِ اسلام کے محل میں یا وہیں کہیں بہروپ بدل کر رہ رہا ہے۔''

''اتنی سی عقل ہمیں بھی ہے کہ وہ اپنی مملکت میں زیادہ محفوظ رہنے کے لیے وہیں چھپا ہوگا۔ میں کئی بار اس محل کے قریب جا چکا ہوں۔ جہاں مراد کے خاندان کا ایک بھی فرد ہو، وہاں جانے میں ناکام رہتا ہوں۔ میں نے دور سے مراد کو یا اس کے ہم شکل کو اس کی وائف زیب النساء اور اس نوزائیدہ بچی کو دیکھا ہے۔ محل کے اندر یا باہر وہ دشمن نہیں آیا۔''

''کیسے نظر آئے گا؟ اس کا چہرہ اور حلیہ بدل چکا ہے۔ جب تمہیں اتنی عقل ہے اور تم سمجھ رہے ہو کہ وہ اپنی ریاست میں ہے تو وہاں بھی وہی دھمکی دو کہ وہ خود کو ظاہر نہیں کرے گا تو تم ارضِ اسلام میں بم دھماکے کرو گے۔ گولیاں برساؤ گے۔ وہ اپنی ریاست کے لوگوں کو کبھی بے موت مرتے نہیں دیکھے گا۔ مجبور ہو کر اپنے بل سے باہر آ جائے گا۔''

''آخری راستہ یہی ہے میں یہی کرنے والا ہوں۔''

''کب کرنے والے ہو؟ پانچ مہینے گزر چکے ہیں۔ ایسی کیا رکاوٹ ہے کہ جو دھمکی استنبول اور پیرس میں دے چکے ہو، وہ ارضِ اسلام میں نہیں دے رہے ہو؟''

''تمہارے اس سوال کا جواب جلد ہی ملے گا۔ دنیا والے پہلی بار ارضِ اسلام میں قیامت برپا ہوتے دیکھیں گے۔''

ان نون فون کا رابطہ ختم کر کے اپنی دنیا کی تاریکی میں آیا۔ بارودا اپنی بیٹی نیلماں کے ساتھ کھانے کی میز پر تھا۔ آبنوس نے پوچھا۔ ''کیا میں آ سکتا ہوں؟''

بارودا نے کہا۔ ''آ بھی سکتے ہو، کھا بھی سکتے ہو اور فون پر ہونے والی باتیں بھی بتا سکتے ہو۔''

وہ کرسی پر بیٹھ کر ایک پلیٹ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''وہ کہہ رہا تھا کہ عالی اپنے محل میں چھپا ہوا ہے۔''

بارودا نے کہا۔ ''یہ تو ہم بھی سمجھ رہے ہیں۔''

''وہ کہہ رہا ہے، جب ہم سمجھ رہے ہیں تو وہی دھمکی کیوں نہیں دے رہے ہیں جو استنبول میں پہلی بار دی گئی تھی اور تب سے وہ منہ چھپا رہا ہے۔ یہ درست ہے۔ ہم دھماکے کریں گے تو وہ محل سے ضرور برآمد ہوگا۔''

نیلماں نے کہا۔ ''ارضِ اسلام ان کا مضبوط قلعہ ہے۔ آبنوس! تمہیں وہاں بھی ناکامی ہوگی۔''

بارودا نے کہا۔ ''کوئی مضبوط قلعہ نہیں ہے۔ ٹیلی پیتھی کے دھماکے سے وہ دھنکی ہوئی روئی کی طرح اڑ جائے گا۔ کاہن کی پیش گوئی نے آبنوس کو روک رکھا ہے۔''

''پاپا! کاہن کیا کہتا ہے؟''

''وہ کہتا ہے، ریاست ارضِ اسلام میں ناکامی ہوگی۔ آبنوس کو ادھر نہیں جانا چاہیے۔ یہ کسی مصیبت میں پڑ سکتا ہے۔''

آبنوس نے کہا۔ ''میں نہیں مانتا کہ مجھ پر کوئی مصیبت

آئے گی۔ اس اندھیرے سے باہر کی دنیا میں کسی نے میری صورت نہیں دیکھی ہے اور نہ دیکھ سکے گا۔ میں ہمیشہ کی طرح وہاں جا کر ان کی کھوپڑیوں میں گھس کر زلزلے پیدا کرتا رہوں گا تو عابی اُس کا باپ اور ریاست کی فوج سب ہی بے بسی سے گھٹنے ٹیک دیں گے۔''

بارودا نے سرہلا کر کہا۔ ''کاہن کی پیش گوئی درست ہوا کرتی ہے۔ لیکن یہ سمجھ نہیں آتا کہ تم پر مصیبت کیسے آئے گی، جبکہ تم دشمن کو نظر نہیں آؤ گے۔''

''یہی تو میں کہتا ہوں۔ وہاں جاؤں گا۔ دو چار کو اپنا تابعدار بناؤں گا۔ ان کے ذریعے محل میں دھماکے کرواؤں گا۔ اگر مصیبتیں آئیں گی تو ان تابعداروں پر۔ میرا کیا جائے گا۔ میں تو مکھن کے بال کی طرح نکل آؤں گا۔''

مقدر کی ہیرا پھیری انسان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کی سب سے قابلِ اعتماد نیلماں مصیبت کا ذریعہ بن کر کاہن کی پیش گوئی کو درست کردے گی۔

بارودا نے کہا۔ ''میرا مشورہ ہے کہ آزمائش کے طور پر محل کے اندر یا باہر ایک دھماکا کرو۔ وہاں پہلی بار ان کی قریبی ہستیاں ماری جائیں گی تو عابی اور اس کا باپ بوکھلا جائیں گے۔ ہم ان کا ردعمل دیکھیں گے کہ کیا کرتے ہیں۔ ایک بات تو طے ہے کہ وہ تمہارے خلاف کچھ نہیں کرسکیں گے۔''

''بے شک۔ میری ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ وہاں ایک واردات ہو ہی جائے۔''

''اچانک حملہ نہ کرو۔ پہلے اسے للکارو، وارننگ دو، یہ دہشت طاری کرو کہ اس کی ریاست کا امن و امان غارت ہونے والا ہے۔ مراد اپنی ریاست کے عوام کی سلامتی چاہتا ہے تو بیٹے کو پردے سے باہر لے آئے۔''

وہ کھا رہے تھے، بول رہے تھے اور نئے منصوبے کے ہر پہلو پر بحث کر رہے تھے۔ نیلماں سن رہی تھی۔ کبھی کبھی سرہلا کر منصوبے کی تائید کر رہی تھی۔

دوسرے دن آبنوس نے خاص چینل کے ذریعے اعلان کیا۔ ''لوگو! قیامت آ رہی ہے۔ ریاست ارضِ اسلام میں قیامت آ رہی ہے۔ پرنس عابی وہاں کے شاہی محل میں چھپا ہوا ہے۔ سنو کہ میں عدالت ہوں، میں ہی منصف ہوں۔ پرنس عابد علی منگی کے خلاف فیصلہ سناتا ہوں۔ وہ کارمن ڈی مورا اور ڈی جان ہنٹر کا قاتل ہے۔ لہٰذا اسے سزائے موت دی جا رہی ہے۔ اگر وہ بارہ گھنٹے کے اندر سزا پانے کے لیے منظرِ عام پر نہیں آئے گا تو آج رات ٹھیک بارہ بجے شاہی محل کے اندر اور باہر موت کے دھماکے ہوں گے۔ اس اطراف میں معصوم اور بے گناہ لوگ مارے جائیں گے۔ وہاں کا حکمران مراد علی منگی اپنی رعایا کے جان و مال کا محافظ ہے۔ آج دنیا دیکھے گی کہ وہ صرف اپنے بیٹے کا محافظ ہے۔ اسے چھپائے رکھنے کے لیے اپنی وفادار رعایا کو خون میں نہاتے ہوئے دیکھتا رہے گا۔ پہلے بم دھماکوں کے بعد بھی عابی سزا پانے کے لیے منظرِ عام پر نہیں آئے گا تو اس ریاست کی ہر گلی کوچے میں ہر گھر میں موت رقص کرے گی۔ ہر پندرہ منٹ کے بعد وہاں کی ایک عورت، ایک مرد، ایک بچہ اور ایک بوڑھا مارا جائے گا۔''

یہ بڑی لرزہ خیز دھمکیاں تھیں۔ مراد، ہم زاد اور عابی اپنی ریاست کے ہر گھر میں جا کر آبنوس کو قاتلانہ حملوں سے نہیں روک سکتے تھے۔ وہ اب تک کسی کو نظر نہیں آیا تھا اور ٹیلی پیتھی کا ہتھیار بھی نادیدہ ہوتا ہے۔ جو عداوت نظر نہ آئے اس سے کیسے مقابلہ کیا جاسکتا تھا؟

سپر پاور اور دیگر بڑے ممالک کہہ رہے تھے کہ ریاست ارضِ اسلام پر پہلی بار کامیاب حملے ہوں گے۔ مراد ہمیشہ کی طرح منہ توڑ جواب نہیں دے سکے گا۔ جرائم کی دنیا میں وہ کبھی زیرِ زمین نہیں ہوا تھا۔ اس سے شکست کھانے والے تمام خطرناک مجرم خوش تھے کہ ایک ٹیلی پیتھی کا ہتھیار اس کی مضبوط ریاست کو کمزور اور کھوکھلا کرنے والا تھا۔

اور یہودیوں کی تو جیسے صدیوں کی دعائیں قبول ہو رہی تھیں۔ ایک مستحکم اسلامی جمہوری ریاست پر ایسا حملہ ہونے والا تھا جسے مراد، ہم زاد اور عابی اپنی ذہانت سے اور غیر معمولی صلاحیتوں سے روک نہیں سکتے تھے۔

وہ سب ہی منتظر تھے۔ رات کے بارہ بجے تک مراد کو ناقابلِ برداشت صدمہ پہنچنے والا تھا۔ اس کا بیٹا، اس کا جانشین عابد علی منگی عوام کی سلامتی کے لیے ان تون سے سزائے موت پانے والا تھا۔

آبنوس بہت محتاط تھا۔ وہ مقررہ وقت سے بہت پہلے ریاست میں آکر حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ محل کے اندر ہم زاد، زیب النساء، ماروی اور عابی تھے۔ ادھر نادیدہ رکاوٹوں کے باعث نہیں جا سکتا تھا۔ محل کے باہر مسلح آرمی تھی۔ پہلے اس نے آرمی کے ایک افسر کے دماغ کو جکڑ لیا۔ اسے اپنا تابعدار بنا لیا۔ اسلحے کے اسٹور میں بڑی قوت کے ٹائم بم رکھے ہوئے تھے۔ وہ انہیں ایسی جگہ نصب کرانا چاہتا تھا جہاں بلاسٹنگ کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ آرمی کے جوان مارے جائیں۔

وہ اپنے تابعدار کے دماغ سے کھیلنے کے لیے وہاں موجود تھا۔ محل سے کچھ فاصلے پر ایک اوپن ریسٹورنٹ کی میز کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ کوئی اس پر شبہ نہیں کرسکتا تھا۔ اگر بدقسمتی سے کوئی پہچان بھی لیتا' کوئی خطرہ پیش آتا تو وہ پلک جھپکتے میں وہاں سے تاریک دنیا میں چلا آتا۔ اسے کسی طرح کا اندیشہ نہیں تھا۔

وہ اب تک ایسی محفوظ زندگی گزار رہا تھا کہ کبھی خوف یا اندیشے اسے پریشان نہیں کرتے تھے۔ وہ مطمئن تھا کہ ابھی نہ موت آئے گی نہ شامت آئے گی۔

اور شامت پیچھے لگی تھی۔ نیلماں تاریک دنیا سے اس کا پیچھا کرتی ہوئی آئی تھی۔ ٹرانسپیرنٹ ہوکر ایک جگہ چھپی ہوئی تھی پھر وہاں سے محل کے اندر عابی کے پاس آگئی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ آبنوس جب بھی چیلنج کرنے اور مقابلہ کرنے تاریکی سے نکل کر آئے گا اور جہاں وہ مصروف رہے گا، وہاں عابی کو اس کے سامنے پہنچا دے گی۔

اس نے کہا۔ ''میں وعدے کے مطابق آگئی ہوں۔ محل سے کچھ فاصلے پر ایک اوپن ریسٹورنٹ ہے۔ تمہارا نادیدہ رہنے والا دشمن وہاں موجود ہے۔ فوراً چلو۔ میں اس کی صورت دکھاؤں گی۔''

وہ اسی وقت محل سے نکل کر تیزی سے چلتا ہوا ریسٹورنٹ کی سمت جانے لگا۔ نیلماں عبا اور نقاب میں تھی۔ اس کے ساتھ چلتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ ''یاد رکھو' اس کے پاس پہنچتے ہی اسے جکڑ کر نہیں رکھو گے تو وہ خطرے کو بھانپ کر اسی لمحے میں نظروں سے اوجھل ہوجائے گا۔ تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

''میں ہاتھ آنے والے کو پھسلنے نہیں دوں گا۔''

اس نے ریسٹورنٹ میں پہنچ کر پوچھا۔ ''کہاں ہے وہ؟''

نیلماں نے کہا۔ ''وہ دیکھو' جس میز پر گلدان میں سورج مکھی کے پھول ہیں۔ وہاں وہ کمبخت ایک مسلمان مولوی کے بھیس میں بیٹھا ہے۔''

عابی نے اسے دیکھا۔ وہ زیر لب تسبیح پڑھ رہا تھا۔ حقیقتاً خیال خوانی کے ذریعے آرمی کے افسر کو اپنا تابعدار بنا رہا تھا۔ عابی نے دبے قدموں پیچھے سے آکر اس کی گردن دبوچ لی۔ اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ ایسی سخت گرفت تھی کہ دوسری بار کراہنے کی بھی سکت نہ رہی۔ ہاتھ سے تسبیح چھوٹ گئی۔ اس نے فوراً ہی غائب ہوکر تاریکی میں جانا چاہا لیکن نہ جاسکا۔ اس کا وجود آزاد ہوتا تو پلک جھپکتے ہی نجات پالیتا۔

اس کے پھیلے ہوئے دیدے دائیں بائیں حرکت کررہے تھے۔ دیکھنے کی کوشش کررہے تھے کہ کس نے گردن دبوچی ہے؟ اور کون ہوگا؟

دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اونٹ پہاڑ کے نیچے آگیا ہے۔ وہ عابی کے شکنجے میں ہے۔ گردن کی ہڈی ایسے دکھ رہی تھی جیسے اب تب میں ٹوٹنے والی ہو۔

وہ تکلیف کی شدت سے بول نہیں پا رہا تھا۔ اس نے ایک انگلی سے اپنی گردن کی طرف اشارہ کیا۔ عابی نے گرفت ذرا ڈھیلی کردی پھر دور کھڑے ہوئے ایک افسر کو حکم دیا۔ ''اسپیشل چینل کو کال کرو ہری اپ......''

رپورٹر اور کیمرا مین وغیرہ محل کے احاطے میں ہمہ وقت رہتے تھے۔ وہ دوڑے چلے آئے۔ ایک ذرا وقت ضائع کیے بغیر لائیو پروگرام شروع ہوگیا۔ عابی اسپیشل چینل کی اسکرین پر آبنوس کے ساتھ دکھائی دینے لگا۔

دیکھنے والوں کو ایک صحت مند' قدآور جوان دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ایک جوان مولوی کی گردن دبوچ رکھی تھی۔ عابی نے کہا۔ ''میں عابد علی منگی ولد مراد علی منگی ہوں۔ یہ چہرہ جو دکھائی دے رہا ہے، یہ میک اپ زدہ ہے۔ دشمن نے مجھے بھیس بدل کر رہنے پر مجبور کردیا تھا۔ ناظرین تھوڑی دیر بعد میرا پیدائشی چہرہ دیکھ سکیں گے۔ ان لمحات میں مجھے دیکھنے والوں سے گزارش ہے کہ وہ ابھی اپنے اپنے فون کے ذریعے اپنوں اور بیگانوں تک اس لائیو پروگرام کی خبر پہنچائیں۔ ابھی کچھ دیر میں بہت اہم انکشاف ہونے والا ہے۔''

ریاست ارض اسلام کے سرکاری ذرائع سے سپر پاور اور دوسرے تمام ممالک تک یہ خبر پہنچ رہی تھی۔ تمام یہودی تنظیموں نے بھی اسپیشل چینل کو آن کردیا تھا۔ اسکرین پر بریکنگ نیوز کی تحریر کہہ رہی تھی۔ ''یہ پرنس عابد علی منگی ہیں۔ انہوں نے کس کی گردن دبوچ رکھی ہے' یہ ابھی معلوم ہوگا۔''

پھر عابی نے آبنوس سے کہا۔ ''بولو' تم کون ہو؟ اور میں نے تمہاری گردن کو کیوں دبوچ رکھا ہے؟''

وہ ہچکچانے لگا۔ دنیا والوں سے بولنا نہیں چاہتا تھا۔ وہاں سے کسی طرح فرار ہونا چاہتا تھا۔ عابی نے اپنی گرفت سخت کی تو وہ تکلیف سے چیخ پڑا۔

عابی نے کہا۔ ''نہیں بولو گے تو ایک منٹ کے اندر گردن کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔''

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ ''بول رہا ہوں' میری گردن تو چھوڑو۔ نہیں تو میں مرجاؤں گا۔''

اس نے گرفت ڈھیلی کی۔ وہ ایک گہری سانس لے کر

بولا۔ ”میں...... میں ان نون ہوں۔“

تمام سننے والے دنگ رہ گئے۔ جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ آج رات بارہ بجے سے پہلے پرنس کو سزائے موت دے گا، وہ پرنس کی گرفت میں بے دست و پا بیٹھا ہوا تھا۔ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔

عابی نے اس کی گردن کو ذرا جھٹکا دے کر کہا۔ ”کم آن...... اپنی ہسٹری سناؤ۔“

وہ سنانے لگا۔ لوگوں کو یہ معلوم ہونے لگا کہ اس دنیا میں ایک ایسی دنیا بھی ہے، جہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچتی۔ وہ ایک تاریک دنیا کا باشندہ ہے۔ اس کا نام آبنوس ہے۔ وہ بول رہا تھا کہ اس تاریکی میں اور بے شمار لوگ غیر معمولی اور عجیب و غریب صلاحیتوں کے حامل ہیں اور یہ عجیب بات تھی کہ وہ اپنی تاریک دنیا کا جغرافیہ نہیں جانتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ کہاں رہتے ہیں؟ انہیں وہاں تک جانے اور وہاں سے آنے کی ماورائی یا طلسمی قوت حاصل ہے۔ وہ پلک جھپکتے ہی ادھر سے ادھر پہنچ جاتے ہیں۔

عابی نے پوچھا۔ ”تم ٹیلی پیتھی کے خطرناک ہتھیار سے خود کو کیوں نہیں بچا رہے ہو؟“

”تمہاری آہنی گرفت نے میرے دماغ کو کمزور کر دیا ہے۔ میں اس وقت خیال خوانی کے قابل نہیں ہوں۔“

”تم اپنی طلسمی یا ماورائی قوت سے پلک جھپکتے ہی یہاں سے فرار ہو کر اپنی دنیا میں جاسکتے ہو...... پھر کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟“

”تم نے مجھے جکڑ لیا ہے۔ جیسے ہی چھوڑو گے، یہاں سے گم ہو جاؤں گا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، میں تمہیں چھوڑ دوں گا؟ تم ہماری ریاست کے امن و امان کو غارت کرنے آئے تھے۔ ہر پندرہ منٹ کے بعد یہاں کی ایک عورت، ایک مرد، ایک بچے اور ایک بوڑھے کو قتل کرنے والے تھے۔ خدانخواستہ میں تمہارے شکنجے میں آجاتا تو تم مجھے زندہ نہ چھوڑتے۔ تم بھی یہاں سے زندہ اپنی تاریک دنیا میں نہیں جاؤ گے۔“

وہ چیخ کر بولا۔ ”نہیں، میں مرنا نہیں چاہتا۔ بارودا......! میری مدد کر۔ مجھے بچالے...... میں تیرا چیلا ہوں، تیرا غلام بن کر رہوں گا۔“

بارودا اسے ایک ٹی وی اسکرین پر دیکھ رہا تھا۔ ابھی وہ عابی اور مراد سے الجھنا نہیں چاہتا تھا اور آبنوس کی ہلاکت بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اچانک ہی تاریکی سے نکل کر اس ریسٹورنٹ میں پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے عابی کے منہ پر ایک گھونسا جما دیا۔ وہ غفلت میں مار کھا کر دو قدم پیچھے گیا پھر سنبھلنے سے پہلے ہی اس کے سینے پر لات پڑی۔ وہ پھر لڑکھڑا کر پیچھے چلا گیا۔

اتنی مہلت کافی تھی۔ آبنوس اس کے شکنجے سے نکلتے ہی ناظرین کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی بارودا بھی تاریک دنیا میں آگیا۔ وہ شہ زور کھڑا نہ رہ سکا۔ بیڈ پر گر پڑا۔ اس نے جس پاؤں سے عابی کے سینے پر کک ماری تھی اس پاؤں کی ہڈیاں دکھ رہی تھیں اور گھونسا مارنے والی انگلیاں بھی تکلیف کی شدت سے بے جان ہو رہی تھیں۔

وہ تاریک دنیا کا روبوٹ تھا۔ یہ دعویٰ تھا کہ اس کے جیسا جسمانی قوت رکھنے والا اور کوئی نہیں ہوگا۔ اب تکلیف سے بے حال ہو کر سوچ رہا تھا کہ عابی کیسا طاقت ور ہوگا۔ اس نے جوابی حملہ نہیں کیا تھا۔ صرف اس کے بدن سے ٹکرانے کے نتیجے میں اس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں عارضی طور پر ناکارہ ہو گیا تھا۔

نیلماں ریسٹورنٹ میں دور چھپی ہوئی تھی۔ اپنے باپ کو اچانک وہاں دیکھ کر چونک گئی تھی۔ وہ خلافِ توقع آندھی کی طرح آیا تھا اور آبنوس کو رہائی دلا کر طوفان کی طرح گزر گیا تھا۔ وہ بھی ان کے پیچھے تاریکی میں آئی۔ باپ نے تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا۔ ”لعنت ہے اس پر۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسا فولاد کا بنا ہوا ہوگا۔“

نیلماں نے درد کو مارنے والی دوا باپ کو کھلائی۔ آبنوس بستر پر اوندھا پڑا ہوا تکلیف سے کراہتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”گردن کی ہڈی دکھ رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ٹوٹ رہی ہے۔ کاہن کو بلاؤ۔ وہ طاغوتی منتروں سے آرام پہنچائے گا۔“

نیلماں ان دونوں کا حشر دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس نے چشم تصور میں عابی کو دیکھا۔ اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھا پھر اس کے قریب پہنچ گئی۔ وہ محل کے ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا تھا۔ ٹی وی کیمرے اور صدا بندی جاری تھی۔ ایک عالم اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ”یہ سب نے دیکھا ہے جو بھی ہوا ہے، وہ اچانک میری لاعلمی میں ہوا ہے۔ وہ ناگہانی بلا کی طرح آیا اور آبنوس کو لے گیا۔ کوئی بات نہیں، دورانِ جنگ بازیاں پلٹ جایا کرتی ہیں۔ آج مجھے اور ناظرین کو ان کے متعلق بہت کچھ معلوم ہوا ہے۔ ہم کسی تاریک دنیا کے بارے میں نہیں جانتے تھے۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ وہاں کے لوگ پراسرار علوم جانتے ہیں۔ اب تک ان نون کہلانے

والا آبنوس ہماری دنیا میں آیا تھا۔ آئندہ اور بھی آئیں گے بلائیں منتظر ہیں۔ وہ ہم پر مسلط ہو کر ہماری دنیا پر حکومت کرنا چاہیں گے۔ انہوں نے یہاں آکر سب سے پہلے مجھے ٹارگٹ بنایا ہے۔ وہ اپنے عزائم کے راستے میں مجھے سب سے بڑی رکاوٹ سمجھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مجھ سے پسپا ہوتے آرہے ہیں۔ آج انہیں بہت ہی تلخ تجربہ ہوا ہے۔ وہ ریاست ارضِ اسلام میں قدم رکھتے ہی بے نقاب ہوگئے ہیں۔ ہم سب نے آبنوس کو اور اس کے مددگار کو چہروں سے پہچان لیا ہے۔ آئندہ انہیں ہماری دنیا میں بھیس بدل کر آنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عزت، فتح و نصرت عطا فرمارہا ہے۔ وہ آئندہ بھی ارضِ اسلام میں قدم رکھیں گے تو ان کی گردنیں ہمارے شکنجے میں آجایا کریں گی۔ وہ پھر آئیں پھر آزمائیں...... موت ان کی منتظر ہے۔''

پوری دنیا میں عابد علی منگی کی دھوم مچ گئی۔ اندھیروں سے پیدا ہونے والی طاغوتی قوتیں ایک چھوٹی سی ریاست میں قیامت برپا کرنے والی تھیں۔ انہیں دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی تھی۔ صرف عابد علی منگی نے اچانک ہی طاغوت کی گردن دبوچ کر پہلے سے زیادہ اپنی طاقت کا لوہا منوالیا تھا۔

بعض کینہ اور عداوت رکھنے والے دشمن بھی آڈیو اور ویڈیو کے ذریعے اسے سلام کررہے تھے۔ وہ سب پریشان ہوگئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ تاریک پُراسرار قوتیں پھر حملہ کریں گی۔ وہ دہشت زدہ کردینے والے طاغوتی حربے جانتے تھے۔ وہ اپنے ناپاک عزائم سے باز آنے والے نہیں تھے۔ آئندہ نامعلوم مدت تک عذاب بن کر رہنے والے تھے۔

عداوتوں اور عذابوں کی مسموم ہوائیں چل رہی تھیں۔ ایسے وقت ہر سمت سے عشق و محبت کے مہکتے ہوئے تازہ ہوا کے جھونکے بھی آنے لگے۔ دل سے مجبور ہونے والی لڑکیاں پہلے ہی اس کی آرزو میں پاگل ہورہی تھیں۔ یہ کوئی نہیں جانتی تھی کہ عالی سے دوستی کرنے اور اس کا دل جیتنے کی خوش نصیبی نیلماں کو حاصل ہوگئی ہے اور کیوں نہ حاصل ہوتی؟ اسی نے آبنوس کو بے نقاب کیا تھا اور خون خرابے کے بغیر اسے بڑی آسانی سے اس کی گردن تک پہنچایا تھا۔ اس کا باپ بارودا اور آبنوس حیران تھے کہ عالی نے اسے کیسے پہچان لیا تھا جبکہ کبھی اس کے سائے کو بھی نہیں دیکھا تھا۔

بارودا نے کہا۔''تم نے استنبول اور پیرس میں اور کئی علاقوں میں اس پر حملے کیے۔ اس کے سامنے کچھ فاصلے پر بھی رہے لیکن اسے شبہ تک نہیں ہوا کہ تم ہی ٹیلی پیتھی جاننے والے دشمن ہو۔''

وہ بولا۔''یہی تو سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے کہ اس نے اپنی ریاست ارضِ اسلام میں مجھے کیسے پہچان لیا؟''

''ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ انہوں نے ارضِ اسلام میں کوئی ایسا روحانی عمل کیا ہے کہ کوئی بھی ان سے دشمنی کرنے میں وہاں ناکام ہوجاتا ہے۔''

آبنوس نے سر ہلا کر کہا۔''سپر پاور اور دوسرے طاقتور ممالک کبھی اس ننھی سی ریاست کو اپنے زیر اثر نہ لاسکے۔ وہاں چالباز اور خطرناک مجرم بھی کوئی واردات بھی نہ کرسکے۔ ایسا کرنے والوں تک وہ جانے کیسے پہنچ جاتے ہیں جیسا کہ وہ میری گردن توڑنے پہنچ گیا تھا۔

''او مائی ماسٹر بارودا......! ان کی روحانی قوتیں بہت خطرناک ہیں۔ ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ ان پہاڑوں کو کاٹنے کے لیے خوب سوچ سمجھ کر پلاننگ کرنی ہوگی۔''

نیلماں بھی ان کے پاس بیٹھ کر بھی چھپ کر ان کی باتیں سنتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ گرہستی کے کام سے ان کے کمرے میں آئی تو بارودا نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر آبنوس سے کہا۔''ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا جہان کی حسینائیں پرنس کی آرزو میں پاگل ہورہی ہیں۔''

اس نے چونک کر باپ کو دیکھا۔ وہ بول رہا تھا۔ ''ابھی ابھی ایک آئیڈیا دماغ میں آیا ہے۔ اس پرنس کو حسیناؤں کے جال میں پھانسا جائے۔ عورت کی قربت مرد کی ذہانت کو کچرا کردیتی ہے۔ ہمیں پرنس کی جسمانی طاقت کو ہی نہیں' اس کی دماغی صلاحیتوں کو بھی کھوکھلا کرنا ہوگا۔''

''تم بڑی دانائی کی بات کہہ رہے ہو۔ دماغی قوت سے ہی جسم حرکت کرتا ہے۔ دماغ بیمار ہوجائے تو جسمانی قوت بستر پر گرجاتی ہے۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

وہ بولا۔''اگر ہم اپنی دنیا کی غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والی حسیناؤں کو عالی کے پیچھے لگادیں تو وہ مسلمان بن کر خود کو روحانی صلاحیتوں کی حامل ثابت کرکے اس کا دل، اس کا اعتماد حاصل کریں گی اور ہماری پلاننگ کے مطابق اس پہاڑ کو چیونٹی بنادیں گی۔''

نیلماں وہاں سے چائے کی پیالیاں اٹھا کر جانے لگی۔ آبنوس نے کہا۔''نیلماں حسن و جمال میں یکتا ہے۔ یہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے اسے دم ہلانے والا کتا بنادے گی۔''

وہ دروازے پر رک کر بولی۔ ”بکواس مت کرو۔ میں کسی کو پھانسنے والی سستی لڑکی نہیں ہوں۔ میں مانتی ہوں کہ پرنس بہت ہینڈسم ہے۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔لیکن سو سوری...... میں کبھی دشمنی سے اس کے قریب نہیں جاؤں گی۔“

بارودا نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے تم جاؤ۔“

پھر وہ سر جھٹک کر بولا۔ ”میں اپنی بیٹی پر اس دشمن کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا۔“

وہ کمرے سے باہر آکر رک گئی۔ ان کی باتیں سننے لگی۔ اس کا باپ کہہ رہا تھا۔ ”لارا بہت حسین ہے۔ غضب کی صحت اور کشش رکھتی ہے۔ ہماری طرح دماغوں میں گھسنا جانتی ہے۔ اگرچہ عابی کے دماغ میں نہیں جاسکے گی لیکن اس کے آس پاس رہنے والوں کے اندر جاکر حالات کو بدل سکے گی۔ پھر یہ کہ وہ جب چاہتی ہے، اپنا روپ بدل لیتی ہے۔ وہ دوسری تیسری حسینہ بن کر اسے الو بناتی رہے گی۔“

نیلماں سن رہی تھی پھر بڑے اعتماد سے مسکراتی ہوئی وہاں سے کچن کی طرف چلی گئی۔

اس تاریک دنیا میں بھی خیر وشر کے درمیان جنگ جاری رہتی تھی۔ شیطان کے پجاری اور پیش امام اور مولوی حضرات امن وامان سے رہنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ مسلمانوں میں بھی کئی طرح کی غیر معمولی صلاحیتیں تھیں لیکن کوئی ٹیلی پیتھی نہیں جانتا تھا۔ ویسے بارودا اور آبنوس کے مقابلے میں وہ سب یوگا کے ماہر تھے۔ ٹیلی پیتھی کا حملہ ہوتے ہی سانس روک کر انہیں بھگا دیتے تھے۔

مسلمان بارودا کی جسمانی قوت کے آگے اکثر کمزور پڑ جاتے تھے۔ جب وہ پہلی بار عابی سے ٹکرا کر آیا تو یہ بات پھیل گئی کہ وہ پہلی بار کسی کے مقابلے میں زخمی ہوگیا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کی ہڈیوں کو نقصان پہنچا ہے۔ کاہن اس کا علاج کررہا ہے۔

پیش امام نے بارودا کے پاس آکر کہا۔ ”آبنوس مغرور ہے۔ وہ ٹیلی پیتھی جاننے کے غرور میں ارضی دنیا کا حکمران بننے گیا تھا۔ پرنس عابی نے اسے ذلت آمیز شکست دی ہے اور وہ پرنس کے ہاتھوں ہلاک ہونے والا تھا۔ تم اسے بچا کر لے آئے۔ اس کا مطلب ہے آئندہ دو ٹیلی پیتھی جاننے والے عابی پر مسلط ہوتے رہیں گے۔ وہ اللہ کا نیک بندہ ہے۔ صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے۔ میں تمہیں سمجھانے آیا ہوں۔ اس نمازی سے دشمنی نہ کرو۔“

بارودا نے کہا۔ ”دشمنی تو پکی ہوگئی ہے۔ میں زخمی ہوکر آیا ہوں۔ مجھے اپنے زخموں کا حساب لینا ہے۔ اب تو ہمارے کئی غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والے ساتھی بھی یہاں سے جائیں گے اور اس کا جینا حرام کردیں گے۔“

”تو پھر سن لو کہ ہم مسلمان بھی روحانی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ عابی کی سلامتی کے لیے ہم بھی اس تاریک دنیا سے باہر نکلنے پر مجبور ہوجائیں گے۔“

پیش امام اس کا جواب سنے بغیر وہاں سے جانے لگے۔ بارودا نے غصے سے کہا۔ ”جاؤ اور عابی کی دنیا میں اس کی میت اٹھانے جاؤ۔ یہ جلد ہی معلوم ہوجائے گا کہ اس کی زندگی مختصر ہوگئی ہے۔ اس کے ساتھ تم سب مارے جاؤ گے۔“

☆☆☆

بارودا اپنی پلاننگ کے مطابق عابی کو ٹریپ کرنے کے لیے لارا کو استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن وہ حسن وشباب کا آتش فشاں تھی۔ بیٹے سے نہیں بیٹے کے باپ سے متاثر ہوگئی تھی۔ اس کا دل مراد علی منگی پر آگیا تھا۔

عابی جن دنوں ماریہ کے ساتھ سہاگ رات کا جشن منا رہا تھا، انہی دنوں لارا نے خوشیوں کے میلے میں مراد کو دیکھا تھا۔ وہ حماد کے بہروپ میں تھا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ جو اپنی شخصیت سے متاثر کررہا ہے۔ وہ پرنس عابی کا باپ مراد علی منگی ہے۔ وہ اپنے دل کو ٹٹولنے لگی، یہ سمجھنا چاہتی تھی کہ ایک اچھی خاصی عمر والے سے کیوں متاثر ہورہی ہے؟

بیٹا جس پیلس میں پہلی بار ازدواجی مسرتیں حاصل کرنے والا تھا۔ وہاں کے تمام حفاظتی انتظامات باپ نے سنبھال رکھے تھے۔ اس کی مصروفیات سے لارا کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ پرنس کے قریبی قابل اعتماد لوگوں میں سے ہے۔ نام حماد ہے اور خاندانی رئیس ہے۔

یہ اس نے اوپر ہی اوپر معلومات حاصل کی تھیں۔ ٹیلی پیتھی جانتی تھی۔ اس کے دماغ میں جانے کی کوشش کی تو اس نے سانس روک کر اپنے اندر آنے نہیں دیا۔ جہاں بیٹھا ہوا تھا، وہاں سے اٹھ کر دور تک متلاشی نظروں سے دیکھنے لگا۔

وہاں کئی مہمان کھانے پینے میں مصروف تھے۔ مراد نے اس بھیڑ میں اسے دیکھا لیکن اس پر شبہ نہیں ہوا۔ وہ اسے چور نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ڈائننگ ہال میں حسین عورتوں کی کمی نہیں تھی۔ مراد کی نظریں دور تک بھٹکنے کے بعد پھر لارا پر آکر ٹھہر گئی تھیں۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کیا مجھ پر شبہ ہوگیا ہے؟

شبہ نہیں ہوا تھا۔ اس میں ایسی کشش تھی کہ اس نے مراد کی توجہ کو کھینچ لیا تھا۔ وہ ٹہلنے کے انداز میں مہمانوں سے

باتیں کرتا ہوا اس کے پاس آیا پھر بولا۔ ''ہائے بے بی! تم بڑی دیر سے پلیٹ ہاتھ میں لیے ٹہل رہی ہو۔ کوئی چائنیز ڈش پسند کرو گی؟''

وہ بولی۔ ''میں بے بی نہیں ہوں۔ اس وقت چوبیس برس چار مہینے اور دس دن کی ہوں۔''

''تعجب ہے۔ لڑکیاں عمر چھپاتی ہیں...... کم سن اور نوخیز بن کر رہتی ہیں اور تم......''

وہ بات کاٹ کر بولی۔ ''میں بھی ایسی ہی ہوں۔ میں بھی عمر چھپاتی ہوں لیکن یہاں بارہ برس کے پرنس عابی کی ہم عمر بننے والی پاگل لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ ان سب کی دھڑکنوں کو سنو وہ کہہ رہی ہیں کہ پرنس ایک دلہن پر اکتفا نہ کرے۔ وہ بھی تو پڑی ہیں راہوں میں اور میں گری پڑی نہیں ہوں۔ ایسی نادان نہیں ہوں کہ بارہ برس کے بچے سے عشق کروں۔''

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''واقعی تم نادان نہیں ہو۔ سستے عشقیہ جذبات کے پیچھے نہیں بھاگ رہی ہو۔''

پھر وہ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میرا نام حماد علی ہے اور میں بارہ برس کا نہیں ہوں۔''

وہ ہنستی ہوئی مصافحہ کرتے ہوئے بولی۔ ''میری طرح زندہ دل ہو۔ میں چار دنوں کی زندگی کو ہنستے بولتے گزارنے کی قائل ہوں۔''

''اکیلی ہو یا فیملی کے ساتھ آئی ہو؟''

لارا نے اپنے بوڑھے باپ سے تعارف کروایا۔ اس نے تاریک دنیا سے نکل کر ٹیلی پیتھی کے ذریعے اپنی ایک فیملی بنائی تھی۔ وہ بوڑھے اس کے تابعدار بن کر رہتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کی بیٹی پندرہ برس تک امریکا میں رہنے کے بعد آئی ہے۔ کوئی اس پر شبہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ تاریک دنیا سے لائف انجوائے کرنے وہاں آئی ہے۔ ان دنوں لارا کے ذہن میں کوئی عداوتی منصوبہ نہیں تھا۔ وہ دور رہ کر ان نون اور عابی کے عداوتی تماشوں میں دلچسپی لے رہی تھی۔ اسے آبنوس (ان نون) سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اس لیے عابی کے خلاف کچھ کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔

وہ مراد کو بھی حماد کے روپ میں نہیں پہچان رہی تھی۔ بھرپور جوان تھی۔ عمر کا تقاضا تھا۔ اس لیے مراد پر دل آگیا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ حماد پرنس عابی کے معاملات میں مصروف رہتا تھا۔ اس کا معتمد خاص تھا۔ اس وقت لارا کے ذہن میں یہ بات تھی کہ کبھی عابی کے خلاف محاذ آرائی ہوگی تو حماد کو بڑے پیار سے آلہ کار بناتی رہے گی۔

وہ شیطان کی پرستش کرتی آئی تھی۔ عابی کو زیر کرنے کے لیے کسی وقت بھی آبنوس کا ساتھ دے سکتی تھی۔ اس کی فطرت میں دوغلا پن بھرا ہوا تھا۔ اسے مسلمانوں سے نفرت تھی لیکن جوانی کی دھوپ حماد کی چھاؤں میں گزارنے کا ارادہ تھا۔

وہ مراد کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ٹیلی پیتھی کے ذریعے ناکام ہو چکی تھی۔ اس نے ایک بار سانس روک کر اسے بھگا دیا تھا۔ ابھی دوسرے ذرائع تھے۔ اس کی دوسری پراسرار صلاحیت یہ تھی کہ وہ پلک جھپکتے ہی روپ بدل لیتی تھی۔ چہرہ اور حلیہ بدل جاتا تھا۔ لارا سے مونا، روزی یا میریا بن جاتی تھی۔

ابھی مراد سے شناسائی ہوئی تھی۔ دیر تک ساتھ رہنے والی دوستی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس کے قریب رہ کر اس کی پرسنل لائف کو دیکھنا چاہتی تھی۔ مراد پیلس کے جس حصے میں تھا وہاں ایک کیٹی نام کی ملازمہ اور دو ملازم تھے۔ اس نے کیٹی کے دماغ پر قبضہ جما کر اسے اپنے گھر میں بلایا۔ اسے تابعدار بنا کر حکم دیا کہ وہ اس گھر میں رہے گی، باہر نہیں نکلے گی۔

پھر اس نے قدآدم آئینے کی طرف پلٹ کر دیکھا تو کیٹی بن چکی تھی۔ لارا گم ہو گئی تھی۔ اس طرح وہ ملازمہ بن کر کسی رکاوٹ کے بغیر پیلس میں آگئی۔ وہاں کیٹی کے جو فرائض تھے انہیں انجام دینے کے دوران مراد کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کی مصروفیات کو دیکھتی رہی۔ وہ بھی فون پر کسی سے بولتا تو چھپ کر سنتی تھی۔ اسے پہلے دن معلوم ہوا کہ وہ بہت ہی سنگین معاملات پر بولتا ہے اور وہ زیادہ تر کوڈ ورڈز استعمال کرتا ہے۔

اکثر آبنوس کو تلاش کرنے کے سلسلے میں ہدایات دیتا رہتا تھا۔ اس نے دو بار ماسٹر سے گفتگو کی تھی۔ لارا جرائم کی دنیا کے کسی بھی ماسٹر کو، سربراہ کو اور گاڈ فادر کو نہیں جانتی تھی۔ ویسے اندازہ ہو گیا تھا کہ حماد مجرموں کے ذریعے آبنوس کو تلاش کر رہا ہے۔

دوسرے ہی دن ماریہ نے سہاگ کی سیج پر وفات پائی تو جیسے پوری دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ شاید کسی دلہن کے ساتھ اب تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کی چاہت میں پاگل رہنے والی حسینائیں سہم گئی تھیں۔ پرنس عابی کی غیر معمولی جسمانی قوت کہہ رہی تھی کہ آئندہ جو بھی اس کی خلوت میں جائے گی، اس کا یہی انجام ہوگا۔

لارا کو عابی سے کسی طرح کا جذباتی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ تو اس کے باپ سے متاثر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سیاسی معاملات

میں بھی بہت ہی گہرا بہت ہی بااثر شخص دکھائی دے رہا تھا۔

لارا نہیں جانتی تھی کہ مراد ہم زاد کے ذریعے سپر پاور اور کئی بڑے ممالک سے اپنے مطالبات منواتا تھا اور عابی کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کی سہولتیں حاصل کرتا رہتا تھا۔ وہ سن کر حیران ہوتی تھی کہ وہ فون پر کن لوگوں سے بولتا رہتا ہے؟

پھر عابی ڈی مورا کو سزائے موت دینے کے لیے استنبول گیا تو لارا نے دیکھا کہ حماد بھی دوسری فلائٹ سے وہاں چھپ کر جا رہا تھا۔ وہ ملازمہ کیٹی کے بہروپ سے نکل آئی۔ استنبول میں اس کی مصروفیات کو دیکھنے کے لیے قریب نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ وہاں اس کی کوئی ملازمہ نہیں تھی۔ وہ ایک نئے عارضی بہروپ میں وہاں پہنچی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ترکی حکومت بڑی رازداری سے حماد کو وی آئی پی ٹریٹمنٹ دے رہی تھی۔

وہ ہوم منسٹر کے سرکاری محل میں مہمان خاص تھا۔ ترک حکام انتہائی رازداری سے اسے آبنوس کے خلاف سہولتیں فراہم کر رہے تھے۔ لارا اس محل کی ایک ملازمہ کو بھی ٹریپ کر کے مراد کے قریب آگئی تھی۔ وہاں ان کی باتیں سن کر دنگ رہ گئی تھی۔ حیرت سے منہ کھل گیا۔ منسٹر اور دوسرے اعلیٰ عہدیدار اس کا نام نہیں لے رہے تھے، اسے یور آنر کہہ رہے تھے۔ تب اسے معلوم ہوا کہ وہ پرنس عابی کا باپ ہے اور وہ دور حاضر کے سب سے خطرناک شخص مراد علی منگی کو پھانسنے کی کوشش کر رہی ہے۔

وہ تھوڑی دیر تک دم سادھے بیٹھی رہی۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ جسے دل لگی بنا رہی تھی، وہ اب دل کو لگ گیا تھا۔ پتا نہیں وہ کیا تھا کہ حواس پر چھا رہا تھا۔ ٹیلی پیتھی کی لہروں کی طرح دماغ میں گھس رہا تھا اور دھڑکنوں کی طرح دل میں شور مچا رہا تھا۔

وہ دل میں عہد کر رہی تھی کہ اس سے سچا عشق کرے گی۔ اسے آہستہ آہستہ اپنے رنگ میں رنگے گی یا پھر اس کے رنگ میں رنگ جائے گی۔ کچھ بھی کرے گی، پیچھا نہیں چھوڑے گی۔

اس نے دور ایک کمرے میں آکر اپنا فون نکالا۔ اس میں وہ سم لگائی جس کے ذریعے اب تک تین بار اس سے رابطے میں رہی تھی اور مراد نے بڑے پیار سے باتیں کی تھیں۔

اس نے رابطہ کیا۔ مراد ہوم منسٹر سے بہت اہم باتیں کر رہا تھا۔ ایسے وقت کسی کا فون اٹینڈ نہیں کرتا تھا لیکن اسکرین پر لارا کا نام پڑھ کر بے اختیار مسکرانے لگا۔ وہ اس کی طرف مائل تھا۔ ماہ نور کی وفات کے بعد نہ اس نے شادی کا ارادہ کیا تھا نہ ہی کسی حسینہ کی طرف مائل ہوا تھا۔ ایک مدت کے بعد لارا کو شریکِ حیات بنانے کے متعلق سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔

اس نے فون کا بٹن دبایا پھر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ”ہیلو...... لارا! کہاں ہو؟ کیسی ہو؟“

اس نے شکایت کی۔ ”مسیحا منہ پھیر کر چلا جائے تو مریضہ کیسی ہوگی؟ یہ سمجھ سکتے ہو؟“

”سوری حالات ایسے تھے کہ فوراً استنبول آنا پڑا۔ تم سے رابطہ نہ کر سکا پھر ایک بار سوری۔“

”سوری نہ کہو۔ اسپتال مریض کے پاس نہیں آتا۔ مریض اسپتال میں آتا ہے۔ میں آگئی ہوں، اسی شہر میں ہوں۔“

”کیا واقعی؟ یا خدا......! تمہیں یہاں آنے سے پہلے مجھے بتانا چاہیے تھا۔“

”کیا مجھے تمہارے پاس نہیں آنا چاہیے؟“

”صرف یہاں نہیں آنا تھا۔ حالات ایسے سنگین ہیں کہ میں روپوش رہتا ہوں۔ تم سے مل نہیں پاؤں گا۔ ان نون نے مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ اسے یہاں سے کسی طرح نکالنا ہے۔ جو رکاوٹیں کھڑی کی گئی ہیں، انہیں توڑنا ہے۔“

وہ دل میں بولی۔ ”مراد علی منگی تمہارے لیے کوئی مشکل، مشکل نہیں ہے۔“

پھر وہ فون پر بولی۔ ”میرا دل کہتا ہے تم پرنس کی تمام مشکلات دور کر دو گے۔ میری فکر نہ کرو۔ میں یہاں برسوں رہ کر تمہارا انتظار کروں گی۔“

”تمہارا یہ پیار، یہ انتظار، یہ ادائیں دل کو چھو رہی ہیں۔ مجھے بتاؤ کہاں ہو؟ عابی کے حالات سے نمٹتے ہی تم سے ملوں گا۔“

وہ مسکرانے لگی۔ وہ پوچھ رہا تھا...... کہاں ہو؟ جبکہ اس کے قریب ہی ایک چھت کے نیچے تھی۔ اس نے بات بنائی۔ ”یہ نہ پوچھو کہاں ہوں؟ بالکل تمہارے دل کے پاس ہوں۔ جس دن، جس وقت بلاؤ گے، دوڑی چلی آؤں گی۔“

”ٹھیک ہے، انتظار کرو۔ ہم جلد ہی ملیں گے۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ سم بدل کر اس کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ مراد وہاں ہوم منسٹر سے باتیں کر رہا تھا۔ یہ بات اس کے خواب و خیال میں بھی نہ آتی کہ وہ انتظار نہیں کر رہی ہے، اس کے پاس ہی رہتی ہے۔

لارا نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مراد جیسا شہ زور اور

ناقابلِ شکست مرد اچانک آ کر اس کے حواس پر چھا جائے گا۔ اس نے دل ہی دل میں قسم کھائی کہ اس پر اپنی اصلیت ظاہر نہیں کرے گی۔ ورنہ وہ دین دار دیانت دار اور ایمان دار ہے۔ طاغوت کی پرستار کو کبھی منہ نہیں لگائے گا۔

وہ ایمان والا ارادے کا پکا تھا۔ جو دل میں ٹھان لیتا تھا' اسے کر دکھاتا تھا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ میرے بیٹے نے جب ڈی مورا.... کی موت کا فیصلہ سنا دیا ہے تو پھر اس کی موت لازمی ہے۔

آبنوس اسے بچانے کے لیے خود اس کے قریب موجود رہتا تھا۔ اسے ٹیلی پیتھی کے مضبوط قلعے میں بند کر چکا تھا۔ مراد اور عابی ادھر جا نہیں سکتے تھے۔ ڈی مورا... تک پہنچنے کے تمام راستے بند کر دیے گئے تھے۔ ایسے وقت لارا نے دیکھا تھا۔ ترک فوج کے افسران نے مراد کے لیے سہولتیں پیدا کی تھیں۔ مراد ایک فوجی افسر کی وردی پہن کر اس حویلی میں گیا تھا جہاں ڈی مورا.... کی حفاظت کے لیے فوج کا سخت پہرا تھا اور آبنوس کے مسلح تابعدار بھی دن رات الرٹ رہتے تھے۔

مراد ایک آرمی افسر کی حیثیت سے گیا تھا۔ اس نے فوج کے درمیان رہ کر ان کی نگرانی میں ناممکن کو ممکن بنا دیا تھا۔ بڑی رازداری سے مورا کو گولیوں سے اڑا دیا تھا۔

وہ ریاست ارضِ اسلام کا حکمران تھا۔ اس نے سیاسی چال بازی سے دو ملکوں کے باہمی تعاون سے مورا کی موت کو آسان بنا دیا تھا۔

یہ قصہ پرانا ہو گیا تھا۔ نیا قصہ یہ تھا کہ آبنوس نے ارضِ اسلام میں تباہی مچانے اور عابی کو رات بارہ بجے سے پہلے مار ڈالنے کا فیصلہ سنایا تھا۔ اس ریاست کے عوام... پندرہ منٹ کے بعد ایک ایک کر کے مرنے والے تھے۔ ٹیلی پیتھی کی تاریکی سے آنے والی اندھی موت کو وہ باپ بیٹے روک نہیں سکتے تھے۔ بیٹے عابی کی موت کا بھی یقین ہو گیا تھا۔ ایسے وقت لارا نے دیکھا کہ مراد ایک ذرا پریشان نہیں تھا۔ ایسے مطمئن تھا جیسے درپردہ دشمن سے نمٹنے کے انتظامات کر چکا ہو۔

لارا نے اس وقت مراد سے رابطہ کیا تھا۔ بڑی محبت سے اپنی پریشانی ظاہر کی تھی۔ ''حماد! مجھے پرنس سے ہمدردی ہے۔ اس بار اسے کیسے بچاؤ گے؟''

اس نے کہا۔ ''پرنس کو صرف اللہ بچائے گا۔''

وہ بولی۔ ''یہ تمہارا عقیدہ ہے۔ ایسے وقت اللہ پر ہی بھروسا کیا جاتا ہے لیکن عقیدے سے اور اللہ پر بھروسا

کرنے سے نہ دشمن ٹلیں گے اور نہ موت ٹلے گی۔''

''اللہ ایسے ہی وقت نور دیتا ہے۔ جب تاریکی چھٹنے کا نام نہیں لیتی۔ تم خدا کی شان دیکھو گی۔ رات بارہ بجے سے پہلے جنگ کا نقشہ بدل جائے گا۔''

پھر یہی ہوا تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فرعون بن کر عابی کی موت کا فیصلہ سنانے والا آبنوس اچانک بے نقاب ہو جائے گا اور عابی پوری دنیا کے سامنے اس کی گردن دبوچ لے گا۔

لارا نہیں جان سکتی تھی کہ نیلماں نے عابی کی محبت میں یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ بھی مراد کی محبت میں ایسا کر سکتی تھی۔ باپ اور بیٹے کی زندگی میں جو محبوبائیں آئی تھیں، وہ تاریکی کی پروردہ تھیں۔ دونوں شیطان کی فیملی سے تعلق رکھتی تھیں لیکن مزاجاً ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔

لارا جان گئی تھی کہ حماد کے پیچھے مراد ہے اور وہ اپنے بیٹے عابی کی جنگ لڑتا رہتا ہے۔ وہ اس جنگ میں حصہ لے سکتی تھی۔ مراد کی مشکلیں آسان کر سکتی تھی لیکن اس کے دل میں انسانی محبت نہیں شیطانی ضرورت تھی۔ مراد سے جو محبت تھی، وہ جسمانی اور فطری ضرورت کے مطابق تھی۔

وہ چاہتی تھی کہ عابی، آبنوس سے مات کھائے۔ دونوں باپ بیٹے طاغوتی قوتوں کے سامنے جھکتے اور گرتے چلے جائیں۔ یہ سوچ تھی کہ مراد کو ساری دنیا کے مقابلے میں شہ زور رہنے دے۔ صرف اپنے شیطان کے آگے اسے جھکاتی رہے۔ وہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے اور اپنی پراسرار صلاحیتوں کے ذریعے ایسا کرنے والی تھی۔

وہ باپ بیٹے خطرناک طاغوتی حملوں سے فی الحال بچ گئے تھے۔ مراد کو ایک ذرا عافیت اور آسودگی حاصل ہوئی تھی۔ اس نے لارا سے کہا۔ ''میرے دین میں حکم ہے کہ نامحرم سے دور رہو یا پھر نکاح کے بول پڑھا کر اسے محرم بنالو۔''

''میرے دل کی بات کہہ رہے ہو۔ میں بھی جلد سے جلد رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جانا چاہتی ہوں۔''

''شادی کی شرط یہ ہے کہ میری شریکِ حیات مسلمان ہو اور صوم و صلوٰۃ کی پابند ہو۔''

''یہ ضروری نہیں ہے۔ اکثر مسلمان اپنے دین سے باہر لڑکیوں سے شادی کرتے ہیں۔''

''میں دین سے باہر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم اچھی طرح سوچو۔ خود کو بھی سمجھو۔ کیا میرا دین قبول کرو گی؟ پانچوں وقت نمازیں پڑھو گی؟ حجاب میں رہا کرو گی؟''

وہ آزاد فضاؤں میں اڑنے پھرنے والی عبا اور نقاب

میں نہیں رہ سکتی تھی۔ شیطان کی عبادت کرنے والی اللہ تعالیٰ کے آگے نہ جھک سکتی تھی۔ نہ ہی جھکنا چاہتی تھی۔

وہ بولی۔ ''پلیز انتہا پسند نہ بنو۔ دنیا کے تمام مذاہب کے درمیان شادیاں ہوا کرتی ہیں۔ شادی کے بعد بھی تمہارا دین تمہارے ساتھ، میرا دین میرے ساتھ رہا کرے گا۔''

''سوری' شادی کے بعد پوری زندگی گزارنے کے لیے دریا کے دو کناروں اور ریل کی دو پٹریوں کی طرح نہیں رہوں گا۔''

''اوہ گاڈ......! تم اتنی صاف گوئی سے بول رہے ہو۔ کیا مجھ سے محبت نہیں ہے؟''

''میری محبت پہلے اللہ سے پھر تم سے رہا کرے گی۔ میں تمہیں دیکھتا اور سمجھتا آرہا ہوں۔ تم عیسائی ہو۔ عیسائی رہنا چاہتی ہو۔ اچھی بات ہے۔ تمہیں اپنے مذہب اپنے ماحول میں رہ کر ازدواجی زندگی گزارنی چاہیے۔''

''میں کوئی کٹر عیسائی نہیں ہوں۔ کبھی بھولے بھٹکے چرچ میں جایا کرتی ہوں۔ تمہارا دین ابھی قبول کرسکتی ہوں۔ جس طرح شادی کے بعد میکے سے تمہارے گھر آؤں گی، اسی طرح عیسائیت کے خانے سے نکل کر اسلام کے خانے میں آجاؤں گی۔ میری زندگی کا ایک ہی مقصد ہے۔ کہیں بھی رہوں عیش و عشرت سے آزادی سے رہوں۔ میں خوامخواہ بحث کررہی تھی۔ مجھے منظور ہے۔ چلو ابھی مسلمان بناؤ...... کیسے بناتے ہیں؟''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''کیا میز کرسی بنانے کو کہہ رہی ہو؟ یہ صرف محبت نہیں ہے۔ صرف دل کا معاملہ نہیں ہے۔ عشقِ خداوندی ہے۔ اللہ دل سے گزرنے والی روح کی گہرائیوں میں ہے۔ ہمارے سجدوں کو وہاں تک پہنچانے کے لیے پاکیزگی اور عبادت کی سچائی لازمی ہے۔ تم میری ہوس میں کلمہ پڑھوگی اور مسلمان کہلانا چاہوگی تو یہ مجھے منظور نہیں ہے۔''

وہ جلدی سے بولی۔ ''ایسا نہ کہو کہ میرے اندر پاکیزگی اور سچائی نہیں ہوگی۔ مجھ سے قسم لے لو۔ میں دل کی گہرائیوں سے تبدیل ہونا چاہتی ہوں۔''

''میں کیسے یقین کروں جبکہ تمام پابندیوں سے آزاد رہ کر عیش و عشرت سے زندگی گزارنا چاہتی ہو؟''

''میں تمہاری محبت میں اپنی دنیا بدل دوں گی۔ تم شادی کے بعد دیکھتے رہوگے۔ اگر میں تمہارے دینی احکامات کی پابند نہیں رہوں گی تو مجھے طلاق دے دینا۔ ہم الگ ہوجائیں گے۔''

وہ قائل ہو کر سر ہلا کر بولا۔ ''مجھے منظور ہے۔ میں تمہاری بڑی سے بڑی غلطیوں کو نظرانداز کردیا کروں گا لیکن دینی فرائض کی ادائیگی میں کسی طرح کی کوتاہی برداشت نہیں کروں گا۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''تم دیکھو گے کہ میں تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی۔ یہ بولو شادی کب ہوگی؟''

''جس دن کہوگی۔ اس سے پہلے ایک ضروری بات ہے۔ نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں جو ہوں، وہ نہیں ہوں۔ جو نہیں ہوں، وہ ہوں۔''

لارا سمجھ رہی تھی کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔ اس نے انجان بن کر پوچھا۔ ''یہ کیا بول رہے ہو' میں سمجھی نہیں؟''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''میرا نام حماد نہیں ہے۔ میں ریاست ارضِ اسلام کا فرماں روا مراد علی منگی ہوں۔''

اس نے حیرت زدہ ہو کر چونکنے کی ایکٹنگ کی۔ شدید حیرانی سے چیخ کر بولی۔ ''نہیں......تم مراد علی منگی؟ تم......ایک ریاست کے فرماں روا ہو؟......کیوں مذاق کررہے ہو؟''

اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ''کیا میری صورت ایسی نہیں ہے کہ کسی ریاست کا حکمران کہلاسکوں؟''

''تمہاری صورت' تمہاری شخصیت ایسی ہے کہ ہفت اقلیم کے بادشاہ کہلاؤ۔ میں مانتی ہوں' تم مذاق نہیں کررہے ہو۔ تم مراد علی منگی ہو۔ یہ خوش خبری مجھے دنیا کی سب سے خوش نصیب لڑکی بنارہی ہے۔ کیا میں شادی کے بعد ریاست کی ملکہ کہلاؤں گی؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''نہیں' وہاں میرا ہم شکل میرا ہمزاد رہتا ہے۔ اس کی شریک حیات ملکہ کہلاتی ہے۔ میں ریاست سے باہر اپنے بیٹے کے پیچھے بھٹکتا رہتا ہوں۔ تم بے شک ملکہ کہلاؤ گی لیکن وہاں نہیں، میرے ساتھ رہا کروگی۔''

''مجھے حکومت نہیں' تمہاری محبت چاہیے۔ جیسا کہوگے ویسے رہوں گی۔ میری ایک بات مانو۔ شادی خوب دھوم دھام سے کریں گے۔ میں ساری دنیا کو دکھانا چاہتی ہوں کہ میں نے ارضِ اسلام کے فرماں روا مراد علی منگی کو جیت لیا ہے۔''

''شادی دھوم دھام سے نہ ہو' تب بھی پریس میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا پوری دنیا میں اس خبر کو اچھالتے رہیں گے۔ ہم عابی کی شادی کا جشن منا کر بہت تلخ تجربات سے گزر چکے ہیں۔ دشمنوں کو کھل کر عداوت کا موقع مل جاتا

ہے۔ وہ آبنوس مات کھانے کے بعد عارضی طور پر خاموش ہے۔ ہم اپنی شادی کی خوشیاں منائیں گے تو وہ رنگ میں بھنگ ڈالنے ضرور آئے گا۔ مجھے ابھی سے محتاط رہنا ہوگا۔''

لارا نے دل میں کہا۔ ''آبنوس سے میں نمٹ لوں گی۔ کاہن اور بارودا اسے میری خوشیاں برباد نہیں کرنے دیں گے۔''

وہ سوچ رہی تھی ''مجھے تو ساری عمر ایک مسلمان شوہر سے نمٹنا ہوگا۔ دکھاوے کی نمازیں پڑھنی ہوں گی۔ حجاب میں رہنا ہوگا۔ کوئی بات نہیں۔ یہ چوبیس گھنٹے میرے ساتھ نہیں رہے گا۔ میں لارا سے مونا، روزی یا پامیلا بن کر آزادی سے کھلی فضاؤں میں اڑتی پھروں گی۔ واپس آکر پھر پردہ نشین بن جایا کروں گی۔ مراد......! میں پھول بن کر تمہیں خوشبو دوں گی۔ پھر جب چاہوں گی، پیروں تلے کانٹے بچھاتی چلی جاؤں گی۔ تمہارے فرشتے بھی نہیں جان سکیں گے کہ کون تم سے عداوت کر رہا ہے۔ میں تو محبت اور وفا کی مثال بن کر رہوں گی۔ اپنی طاقت اور حاضر دماغی سے دنیا کو نچانے والے اب میں تمہیں نچاؤں گی۔ جس محل سے دور رکھنا چاہتے ہو وہاں رہ کر اسی ریاست کی ملکہ بن کر دکھاؤں گی۔ اے اہرمن......! اے آگ کے دیوتا مجھے شکتی دے۔'

☆☆☆

بارودا کو اپنی جسمانی قوت پر بڑا ناز تھا۔ اب عابی سے ٹکرانے کے بعد جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اسے گھونسا مارنے کے نتیجے میں انگلیاں جیسے تڑخ گئی تھیں۔ لات مارنے کے باعث پاؤں کی ہڈی پر ورم آ گیا تھا۔ لنگڑا کر چلتا تھا۔ کاہن جڑی بوٹیوں سے اس کا علاج کر رہا تھا۔

آبنوس کی گردن بڑی دیر تک عابی کے شکنجے میں رہی تھی۔ وہ فی الحال گردن ہلانے اور سر گھمانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ نک کالر پہن کر رہتا تھا تاکہ گردن سیدھی رہے اور اچانک جھٹکا نہ پہنچے۔ کاہن نے کہا تھا کہ وہ جلد ہی گردن ہلانے کے قابل ہو جائے گا۔

موجودہ حالات میں وہ دونوں صاحبِ فراش تھے۔ اپنی تاریک دنیا سے باہر جانے کے قابل نہیں تھے۔ کاہن نے کہا۔ ''میں نے پیش گوئی کی تھی۔ آبنوس کو سمجھایا تھا کہ ریاست ارضِ اسلام میں نہ جائے۔ مصیبتیں نازل ہوں گی۔ کیا ہم تم کبھی یہ سوچ بھی سکتے تھے کہ عابی تمہیں پہچان لے گا؟''

آبنوس نے کہا۔ ''نہیں میں حیران ہوں۔ اس نے مجھے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ مجھے صورت سے پہچانتا نہیں تھا۔ تعجب ہے کہ کیسے پہچان گیا؟''

بارودا نے کہا۔ ''یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس نے روحانی قوت سے پہچانا ہوگا۔''

''میں نے پیرس میں کئی بار اس پر حملے کیے۔ اس کے قریب سے گزرتا رہا، تب اس نے کیوں نہیں پہچانا تھا؟''

''یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔''

کاہن نے کہا۔ ''مجھے شبہ ہے کہ تاریک دنیا کے کسی مسلمان نے مخبری کی ہے۔ جب آبنوس اس ریاست میں گیا تھا، تب اس مخبر نے عابی کے پاس جا کر نشاندہی کر دی کہ یہی آبنوس ہے۔''

''ہاں، کسی مسلمان مخبر نے یہی کیا ہے۔ ورنہ عابی مجھے قیامت تک پہچان نہ پاتا۔ ہماری تاریک دنیا میں یہ مسلمان آستین کے سانپ ہیں۔''

''ہم ثبوت کے بغیر انہیں الزام نہیں دے سکتے۔ ویسے ان کی دشمنی کھل کر سامنے آرہی ہے۔ پچھلی بار پیش امام نے کہا تھا کہ وہ مسلمان بھی روحانی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ اب وہ عابی کی سلامتی کے لیے تاریک دنیا سے باہر نکلیں گے۔''

بارودا نے کہا۔ ''ہمیں ان مسلمانوں سے نمٹنا ہوگا۔ بڑی مشکل ہے کہ زخمی ہو گئے ہیں۔ فی الحال کسی بھی پلاننگ پر عمل کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ ہمیں بڑے صبر سے انتظار کرنا ہوگا۔''

ایسے وقت لارا وہاں آگئی۔ بارودا نے کہا۔ ''کہاں اڑتی پھر رہی ہو؟ تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''میں بھی اپنی زندگی کی بہت اہم بات کہنے آئی ہوں۔''

''تو پھر تم پہلے کہو۔''

''نہیں۔ پہلے تم کہو پھر میں بولوں گی۔''

اس نے کہا۔ ''ہم نے عابی کو حسین عورتوں کے ذریعے پھانسنے کی پلاننگ کی ہے۔ تمہارا حسن لاجواب ہے۔ تم ٹیلی پیتھی بھی جانتی ہو۔ چشم زدن میں اپنی صورت اور شخصیت بدل دیتی ہو۔ عابی کو بڑی کامیابی سے ٹریپ کر سکوگی۔''

یہ سنتے ہی لارا نے قہقہہ لگایا۔ بارودا نے کہا۔ ''کیوں ہنس رہی ہو...... میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے؟''

وہ بولی۔ ''کیا یہ لطیفہ نہیں ہے کہ ایک بھرپور جوان لڑکی سے کہہ رہے ہو وہ بارہ برس کے بچے کو ٹریپ کرے۔''

''وہ ماریہ جیسی بھرپور لڑکی کو دلہن بنا چکا ہے۔ بچہ نہیں ہے۔''

وہ ذرا تن کر بولی۔ ''میں نے اس کے باپ کو پھانسا ہے۔ لہٰذا میرے لیے تو بچہ ہی ہے۔''

انہوں نے اسے بے یقینی سے دیکھا پھر کہا۔ ''کیا کہہ رہی ہو؟ اس کے باپ کو پھانسا ہے؟ مراد علی منگی کو؟''

کاہن نے بھی حیرانی سے پوچھا۔ ''ریاست ارضِ اسلام کے حکمران کو؟''

وہ بڑے فخر سے ایک ادائے ناز سے چلتی ہوئی ان کے سامنے سے گزرتی ہوئی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ یوں بدن کے للچانے والے زاویے پیش کرکے بولی۔ ''میں ایسی مقناطیس ہوں کہ پتھر کا دماغ اور فولاد کا کلیجا رکھنے والے بھی کھنچے چلے آتے ہیں۔ وہ بہت ہی سخت دین دار ہے۔ کسی عورت کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا، کسی حسینہ کو فون پر بھی منہ نہیں لگاتا۔ ابلیس معظم مجھ پر مہربان ہے۔ دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ حسین عورتیں ہیں لیکن میرے حسن مجسم نے اثر کیا ہے اور وہ اسیر ہوگیا ہے۔''

کاہن نے کہا۔ ''جیوے ہمارا ابلیس جیوے۔ یہ تو کمال ہوگیا۔ تمہیں اس کے خاندان میں دور تک لہو کے رشتوں کے اندر پہنچنے کا راستہ مل گیا ہے۔ کیا وہ تم سے شادی کرے گا؟''

''وہ شادی کے بغیر بھی مجھے حاصل کرسکتا ہے اور میں راضی رہوں گی لیکن بہت ہی بے وقوف مسلمان ہے۔ محرم اور نامحرم کے چکر میں پڑا رہتا ہے۔ شادی کے بعد ہی مجھے ہاتھ لگائے گا۔''

بارودا نے کہا۔ ''تو پھر ہاتھ لگانے کے لیے جلد ہی شادی کرے گا۔''

''ہاں۔ کئی بیویوں کو کھا چکا ہے۔ آخری بیوی کے بعد ایک مدت سے بھوکا بیٹھا ہے۔ میرے پاس آنے کی جلدی ہے لیکن عجیب سرپھرا مسلمان ہے۔ پہلے مجھے مسلمان بنائے گا پھر شادی کرے گا۔''

''وہ کب تمہیں مسلمان بنائے گا اور کیسے بنائے گا؟''

''کل صبح ایک عالم دین کے پاس لے جائے گا۔ آج اس نے پہلا کلمہ اور دوسرا کلمہ پڑھایا ہے تاکہ میں اچھی طرح یاد کرلوں تاکہ پہلے اسلام قبول کرتے وقت فرفر پڑھ سکوں۔''

کاہن نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں اس کا دین متاثر کررہا ہے؟''

''ہرگز نہیں۔ اس کے دین میں پابندیاں ہی پابندیاں ہیں۔ ہر کام سے پہلے بسم اللہ پڑھو۔ اپنا چہرہ اپنا بدن چھپا کر رکھو۔ شادی سے پہلے کسی سے محبت نہ کرو۔ کسی کی آغوش میں نہ جاؤ۔ ہمارا ابلیس اعظم جیوے ہی جیوے۔ اس نے ہمیں آزادی ہی آزادی دی ہے۔ شادی کی پابندی نہیں ہے۔ ہم کسی کے ساتھ بھی لائف انجوائے کرسکتے ہیں۔ جب چاہیں مرد بدل سکتے ہیں۔''

آبنوس نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''اس کے باوجود تم نے کبھی خود کو چھونے تک نہیں دیا۔''

''اور تم جبراً مجھے چھو بھی نہیں سکتے۔ میرے اہرمن میرے آگ کے دیوتا نے مجھے ایسی شکتی ایسی صلاحیتیں دی ہیں کہ دنیا کے تمام مردوں کو تگنی کا ناچ نچا سکتی ہوں اور اب سب سے شہ زور اور ناقابلِ شکست مرد کے ساتھ ناچنے والی ہوں۔''

بارودا نے کہا۔ ''میں اور آبنوس زخمی ہیں۔ کچھ دنوں تک ناکارہ رہیں گے۔ ہمارا اہرمن جو کرتا ہے، بہتری کے لیے کرتا ہے۔ اس نے ہمیں کسی مصلحت سے آف کرکے تمہیں آن کردیا ہے۔ تم زبردست کامیابی حاصل کرتی ہوئی اس کی ریاست میں اس کے خاندان میں گھسنے والی ہو۔''

لارا نے کہا۔ ''اے محترم کاہن! میرے لیے خاص پوجا کا اہتمام کر۔ اہرمن سے التجا کر۔ میں بھی کرتی رہوں گی کہ جلد ہی اس کے بچے کی ماں بن جاؤں۔ ایک بچہ، اس کا صرف ایک بچہ میری کوکھ میں آجائے تو وہ بھی عابی کی طرح غیر معمولی اور عجوبہ ہوگا۔ میں طاغوتی حصار میں اس کی ایسی پرورش کروں گی کہ وہ آگے چل کر مسلمان باپ کے چھکے چھڑادے گا۔''

کاہن، بارودا اور آبنوس نے بیک زبان ہوکر کہا۔ ''اہرمن......! اہرمن......! کوئی نہ پائے تیری طاقت تیرا وزن۔ اہرمن......! اہرمن......! لارا کے عزائم تیرے عزائم ہیں۔ اک بچہ...... ہاں اک بچہ...... دین اور ایمان کے قدم اکھاڑے گا۔ اہرمن دے، اپنی سوغات دے۔ منتظر ہے لارا کا تن بدن۔ اہرمن اے اہرمن......!''

وہ شیطان کی مناجات کررہے تھے۔ دعائیں مانگ رہے تھے۔ لارا کے دونوں ہاتھ سینے پر تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ ان لمحات میں دعائیں مانگتی ہوئی مراد علی منگی کی سیج پر پہنچی ہوئی تھی۔ شیطان میں بہکانے کی قوت بادرجۂ اتم ہے۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

آفتاب کے سنہرے نقاروں نے کائنات میں زندگی کی بیداری کا بگل بجایا تو بشر اپنی ادھوری و تشنہ خواہشات کی تکمیل کے لیے از سرِ نو جدوجہد کے مدار میں بھٹکنے لگا لیکن عضوِ معطل کے مانند کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہیں اس مدار کی مسافت نے آبلہ پائی کے سوا کچھ بھی نہ دیا تھا اور اب وہ حسرت سے اپنے خونِ جگر سے سینچی گئی نسل کو اسی مسافت میں ہلکان دیکھ کر ایک بے بس سی خاموشی میں خود کو محبوس پاتے تھے۔ اس متعفن زدہ کمرے سے باہر بھی زندگی کی چہل پہل عروج پر تھی۔ سماعت میں پڑنے والی آوازوں سے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ گھر کے مکین اس نحیف وجود سے دانستہ تغافل برت رہے ہیں۔ گھریلو انتظام و انصرام کے لیے متعین کردہ جز وقتی ملازمہ کمرے میں جھانک کر انتہائی ناگوار منہ بناتی ہوئی چلی گئی تھی۔ اب آنے والے لمحات کی شرمندگی کا کڑا احساس اس نحیف وجود کے لیے اپنے آس پاس پھیلے تعفن سے کہیں زیادہ باعثِ اضطراب تھا۔ اس نے کرب سے اپنی سال خوردہ آنکھیں

جیسی کھیتی ویسی فصل کے مصداق زمین پر بسنے والوں کا انجام

زمین کے بارے میں اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بے حد پُراسرار بنایا ہے... لیکن یہ بھید کچھ لوگوں کی سمجھ میں ان لمحات میں آتا ہے جب زندگی کی بساط لپٹ رہی ہو اور بکھرتی سانسیں سمٹ نہ پا رہی ہوں یعنی... موت سے پہلے کسی بڑی آزمائش سے گزرنا... وہ بھی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا مرجانے سے خوف زدہ تھا مگر... موت تو پھر بھی آنی تھی، سو آگئی۔

خسارہ

زویا اعجاز

میچ لیں لیکن اہلِ خانہ کی سرچڑھی ملازمہ کے اہانت کی حد تک صاف گو تبصرے، سماعتوں میں زہر گھول رہے تھے۔

''آئے ہائے، باجی جی! آپ کا گھر تو گندے جوہڑ جیسا لگنے لگا ہے اب۔ ان بابا جی کو کہیں کسی ادارے میں داخل کروادیں نا۔'' ملازمہ بناوٹی ہمدردی لہجے میں سمو کر بولی۔

''میں تو بارہا کہہ چکی ہوں ان سے مگر ان کے کانوں پر جوں رینگے تب نا۔'' بہو کی تنفر زدہ آواز ابھری۔ ''بلواتی ہوں ابھی فیتے کو۔ دھلا دے گا بڈھے کو۔''

''باجی جی! خاکروب سے صاف کروائیں گی انہیں؟ صاحب کو علم ہوا تو......''

''تو جاؤ خود کر دو جا کے تم۔ بڑی آئی ہمدرد۔'' وہ کڑوے لہجے میں بولی۔ ''پتا نہیں کب ختم ہوگا یہ عذاب۔''

اس کے شوہر نے واضح الفاظ میں ان کے لیے ایک کل وقتی ملازم رکھنے کی ہدایات جاری کر رکھی تھیں لیکن اسے اپنے پاس جدہ بلوانے سے انکار کر دیا تھا۔ نتیجتاً وہ منتقم مزاجی کی آخری حدیں چھونے لگی تھی اور سیانے کہتے ہیں انتقام لینے میں عورت اور ناگن میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

☆☆☆

لکشمی پور کی اس نواحی بستی میں فلک پہ چھائی گھنگھور گھٹائیں چھاجوں برس رہی تھیں۔ فضا میں رچی مٹی کی سوندھی خوشبو اور بارش کی دلفریب جلترنگ دلوں میں بلاوجہ ہی ترنگ بیدار کر رہی تھی لیکن بستی کے انتہائی شمالی کونے میں موجود ایک گھر کے نفوس حسرت و یاس کے عالم میں بیٹھے اداس نظروں سے بارش کے قطروں کو زمین کی کوکھ میں سماتے دیکھ رہے تھے۔ باہر لڑکے بالے نیکر بنیان پہنے کاغذ کی کشتیاں اور جہاز بنا کر پانی میں چھپاک چھپاک کھیل رہے تھے۔ دس سالہ الیاس اور آٹھ سالہ وسیم برآمدے میں بچھے تخت پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے تھے۔ ان کے سبھی دوست بارہا انہیں بلانے آچکے تھے لیکن ان کی یاسیت دیکھ کر وہ پھر سے لوٹ جاتے۔ مبارک علی باورچی خانے میں سیلن زدہ لکڑیوں پر آگ جلانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا تھا۔ اس کی نظر ادھ ٹوٹی کھڑکی سے باہر بیٹھے بیٹوں پر پڑی تو اسی پل کئی ماہ سے چھایا تذبذب ختم ہوگیا اور ایک فیصلہ انتہائی آسان ہوگیا۔

☆☆☆

''کہتے تو تم ٹھیک ہو بھائی مبارک...... گھر تو ہمیشہ عورت ہی بناتی ہے۔ اب پھر کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟'' لکشمی پور کے سردار نے اپنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے استفسار کیا۔

''میں نے بھی سوچا ہے سردار کہ کسی سمجھ دار عورت سے عقد ثانی کرلوں جو میرے بیٹوں کو اپنی اولاد اور میرے گھر کو اپنا گھر سمجھے لیکن پھر خیال آتا ہے کہ اگر غلط انتخاب کر بیٹھا تو بچے خوار نہ ہوجائیں۔'' تیس سالہ متوسط قدوقامت، سانولی رنگت اور کھردرے نقوش والا مبارک علی الجھن کا شکار تھا۔ اس کی اہلیہ چھ ماہ پہلے سانپ کے ڈسنے کی وجہ سے راہی عدم ہوگئی تھی۔ بستی کے بڑے بازار میں اس کا کپڑے کا خاصا چلتا کاروبار تھا۔ اس کا گھر ایک بڑے کشادہ کمرے، کچے صحن اور بیرونی دروازے کے پاس ایک چھوٹی سی کوٹھری پر محیط تھا...... پیشہ ورانہ مصروفیات کے ساتھ ساتھ گھر اور بچوں کی ذمے داریوں نے اسے بوکھلا رکھا تھا۔ بیوی کی وفات نے ذاتی تسکین میں بھی خلل پیدا کر دیا تھا۔ شب و روز مچلنے والے فطری تقاضوں نے اسے بے حد چڑچڑا بنا دیا تھا۔ دوسری شادی اس کے لیے اب ناگزیر ہو چکی تھی۔ اس کے آگے پیچھے کوئی بھی نہ تھا جو اس کی سونی زندگی کی آرائش کے لیے اہتمام کرتا لہٰذا اس مسئلے کے حل کی غرض سے وہ بستی کے سردار کے پاس موجود تھا۔

''دیکھ مبارک علی! یہ عورت ذات زندگی سے بھی زیادہ بے اعتبار شے ہے۔ اپنی اولاد کے لیے طوفانوں کے آگے سینہ سپر ہو جانے والی یہی عورت سوکن کی اولاد کے لیے جانے کیوں اتنی کٹھور ہو جاتی ہے۔ میرا مشورہ مان تو کسی ایسی عورت سے شادی کرنا جو پہلے ہی اس رتبے پر فائز ہو۔ کسی یتیم کے سر پر ہاتھ رکھے گا تو رب تیری اولاد کا بھی بھلا کرے گا۔'' سردار نے تلے انداز میں کہا۔

''بات تو دل کو لگتی کر رہے ہو سردار! مگر میں ایسی عورت کہاں ڈھونڈوں اب۔'' وہ بے کلی سے بولا۔ اسے گھر بسانے کے لیے بس ایک عورت درکار تھی۔

''میری نظر میں ہے تو سہی ایک...... ملازمہ ہے میری بیوی کی۔ ایک کملی بیٹی ہے اس کی جس کی فکر میں ہلکان رہتی ہے۔ اگر تو ہاتھ تھام لے اس کا تو رب بھلی کرے گا۔''

''ٹھیک ہے سردار! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' مبارک علی کے بھاگوں تو چھینکا ٹوٹا تھا۔

''میں سکینہ کی مرضی بھی دریافت کر لیتا ہوں۔ اگر وہ راضی ہوئی تو اگلے چاند کی دس تاریخ کو چار گواہ اور مولوی لے آنا۔'' مبارک الوداعی کلمات کے بعد وہاں سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

خاکروب اپنی نشے سے مخمور آنکھوں میں بیزاری

سموئے، میلے کچیلے ہاتھوں سے اس کے غلاظت میں لتھڑے کپڑے تبدیل کروا رہا تھا۔ چرس کی ناگوار بدبو اس مختصر سے کمرے کی متعفن فضا کو مزید بوجھل بنا رہی تھی۔ لباس کی تبدیلی کے دوران جب فیقے کا جسم اس سے مس ہوتا تو ایک بے عنوان احساس اسے گھیر لیتا۔ اگلے ہی لمحے اس کی مفلوج زبان سے بے معنی سی کراہیں اور مخصوص الفاظ ادا ہونے لگے۔ ''لا......لا......لا۔''

وہ عرصہ دراز سے صاحبِ فراش تھا۔ داہنا ہاتھ اور ٹانگ مفلوج تھی۔ ضعیفی نے بائیں اعضا کو بھی متاثر کر دیا تھا۔ اس کی بات سمجھنا ایک دشوار ترین امر بن چکا تھا۔ اس کے مخصوص کلمات کو سبھی نے اسمِ الٰہی ''اللہ'' گردان رکھا تھا لیکن ایک بات تو طے تھی کہ اس کے ان الفاظ میں موجود کرب اور تڑپ گھر والوں میں عجیب سی بیزاری پیدا کرتی تھی اور سبھی اس سے مزید کھنچاؤ کا شکار ہو گئے تھے۔ اس دن بھی صوتی اتار چڑھاؤ سے تنگ آ کر اس کی بہو نے کمرے کا دروازہ بڑبڑاتے ہوئے بند کر دیا۔

''ہو گئے شروع اپنے راگ الاپنے یہ......خود کا تو بیٹا چلا گیا یہاں سے۔ میرے لیے یہ آزمائش چھوڑ گیا ہے۔ جانے کب چھٹکارا ملے گا۔''

ان الفاظ نے اس کے کرب کو مزید دو چند کر دیا۔

☆☆☆

سکینہ اپنی مخبوط الحواس بیٹی کے تحفظ و علاج کی خاطر دوسری شادی کے لیے رضامند ہو گئی تھی۔ اس کا شوہر موسمی بخار کی لپیٹ میں آ کر اسے بیوگی کی چادر عطا کر گیا تھا۔ حمید اس کا یتیم چچا زاد بھائی تھا جسے اس کے والد ہی نے بچپن سے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ سکینہ کی شادی اس سے ہوتے ہی وہ تو جیسے اجل سے بغل گیر ہونے کا ہی منتظر تھا۔ نبیلہ کی ذہنی حالت موروثی بیماریوں کا شاخسانہ تھی۔ والد اور شوہر کی رحلت کے بعد پیٹ کا جہنم بھرنے کے لیے سکینہ کو گھروں میں کام کر کے گزر بسر کرنی پڑی لیکن اس کی اپنی قلیل تنخواہ میں بیٹی کی پرورش و علاج قطعی ناممکن تھا۔ سات سالہ نبیلہ ذہنی طور پر ہم عمر بچوں سے بہت پیچھے تھی۔ بستی کے اکلوتے حکیم سے ملنے والی مقوی دیسی ادویات بھی سکینہ کے لیے بہت مہنگی تھیں۔ بیٹی ہر وقت ماں کو نظروں کے سامنے دیکھنا چاہتی تھی ورنہ چیخ پکار سے سارا گھر سر پر اٹھا لیتی۔ ایسے میں ملازمت کے فرائض نبھانا ممکن نہ تھا۔ وہ اگر اسے اپنے ساتھ لے بھی جاتی تو اپنے اردگرد اجنبی چہروں کی موجودگی اسے مزید ہراساں کرتی تھی۔

خطبۂ نکاح کے بعد بستی کی اکلوتی مسجد کے مولانا نے مبارک علی کو علیحدگی میں تحمل سے کہا۔

''تیرے کندھوں پر ایک بہت بڑی ذمے داری عائد ہو چکی ہے مبارک! یتیموں کے حقوق میں اونچ نیچ کی بڑی سخت پکڑ ہے۔ دھیان رکھنا بس۔''

مبارک بے دلی سے ہوں، ہاں کرتا رہا۔ اس کا ذہنی ارتکاز صرف اپنی نئی نویلی بیوی کے وجود سے کشید ہونے والی مسرتوں اور کیف آمیز لمحات کے تصور میں مگن تھا۔ اس کے دونوں بیٹے بھی نئی ماں کی آمد کی نوید سن کر بہت خوش تھے۔ اپنی حقیقی ماں کی جدائی سے پیدا ہونے والے جذباتی خلا اور گھریلو ذمے داریوں سے چھٹکارا ان کے لیے باعثِ مسرت تھا۔

شادی کی اگلی صبح سکینہ نے بڑی چاہت سے سب کے لیے ناشتا بنا کر دسترخوان پر نبیلہ کو بھی لا بٹھایا جو حسبِ معمول ایک سہمی ہوئی ہرنی کے مانند بدکی ہوئی تھی۔ الیاس اور وسیم اپنی اس ''چھوٹی بہن'' کی آمد پر بہت خوش تھے۔ سکینہ اہلِ خانہ سے بڑے متوازن انداز میں پیش آ رہی تھی لیکن نبیلہ سے ماں کی توجہ میں شراکت برداشت نہ ہوئی۔ اس نے سالن کا ڈونگا مبارک کو پکڑاتے دیکھ کر پوری قوت سے ہاتھ مارا۔ گرما گرم شوربے کے چھینٹے اڑ کر اس کی آنکھوں میں پڑے تو اس کے منہ سے بے اختیار مغلظات برآمد ہونے لگیں۔ نبیلہ اس غراہٹ سے ناآشنا تھی وہ چیختی ہوئی کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ سکینہ فوری طور پر اس کے پیچھے لپکی۔ مبارک کی جلتی آنکھوں نے بڑی دور تک ان کا تعاقب کیا پھر وہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

پوس کے مہینے کی اولین تاریخوں کا ٹھٹھرا ہوا چاند آسمان پر اپنے ہم جولیوں کے ساتھ داستان گوئی میں مصروف تھا۔ بڑے کمرے سے نبیلہ کی چیخوں کی آواز نے کوٹھری میں موجود سکینہ کو ایک تڑپ میں مبتلا کر دیا۔ وہ بیٹی کے اس مزاج سے بخوبی واقف تھی اور اس کی وہاں موجودگی اب ازحد ضروری تھی لیکن مبارک اسے ابھی وہاں سے رخصتی نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کی چیخ و پکار نے ماں کو بیوی کے فرائض فراموش کر دیے اور وہ برہنہ پا پابستہ فرش پر دوڑتی ہوئی کوٹھری سے باہر نکل آئی۔ مبارک نے طیش کے عالم میں کف اڑاتے اسے عقب سے دبوچ لیا۔ قمر تو کب اپنی داستان گوئی روک کر بشر کے اس ''شر'' کو دیکھ کر ساکت رہ گئے جو اس وقت اپنی بیوی کی لمبی چوٹی کو جھٹکے دے رہا تھا۔

''میں کہتا ہوں یہ نوٹنکی کب ختم ہوگی سکینہ؟ کب تک یہ لڑکی یونہی آزار بنی رہے گی۔ چار مہینے ہو گئے ہیں شادی کو لیکن کوئی دن ایسا نہیں جب یہ مجھے سکون لینے دے۔''

''وہ جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کرتی جی!'' سکینہ کی ممتا پر بڑی کاری ضرب لگی۔ ''آپ اس کی حالت جانتے ہیں۔'' سکینہ کا لہجہ یکدم رندھ گیا۔

''اس کا باپ بھی اسی کارن ہی مرا ہوگا۔ خود تو چلا گیا لیکن یہ عذاب میرے لیے چھوڑ گیا۔'' وہ تنفر سے اس کی چوٹی کو زوردار جھٹکے سے مروڑتے ہوئے بولا۔ ''اسے کسی پاگل خانے میں داخل کروادو سکینہ۔ میں اب اسے مزید برداشت نہیں کرسکتا۔''

''اگر یہ پاگل خانے گئی تو میں بھی چلی جاؤں گی ہمیشہ کے لیے اس کے ساتھ۔ مت بھولو میں نے اسی کے تحفظ کے لیے شادی کا طوق گلے میں ڈالا ہے۔'' اس کی زخمی ممتا پورے جلال میں آچکی تھی۔ مبارک نے جھنجلاہٹ میں اسے ایک زوردار تھپڑ رسید کیا اور دانت پیستا ہوا واپس ہولیا۔

☆☆☆

توازن اس کائنات کا حسن اور خمیر قرار پایا گیا ہے جس کی عدم موجودگی بگاڑ اور طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ سکینہ کی ذات بھی اسی طوفان کی زد میں تھی۔ معذور بیٹی اور فرعونیت زدہ شوہر کے مابین اس کا وجود بری طرح پستا جا رہا تھا۔ مبارک کی موجودگی میں نبیلہ کی ہنگامہ آرائیاں مزید بڑھتی جارہی تھیں تو دوسری جانب اسے دیکھ کر مبارک کی تیوریاں چڑھنے لگتی تھیں۔ شوہر سے علیحدگی کی صورت میں وہ معاشرے میں انسانی لبادوں میں ملبوس بھیڑیوں کے لیے انتہائی تر نوالہ ثابت ہوتی اور بیٹی کی پرورش و علاج کے اخراجات بھی اس کے بس کا روگ نہ تھے۔ بے حد سوچ بچار کے بعد اس نے شوہر سے التجا کرنے کی ٹھان لی قسمت بھی اس پر مہربان تھی کہ ایک بہترین موقع اس کے ہاتھ آ ہی گیا۔

اس رات مبارک اپنے بڑے بیٹے الیاس کی پڑھائی کے متعلق بہت فکرمندانہ انداز میں اسے بتانے لگا۔

''بستی میں مزید تعلیم کے مواقع نہیں ہیں، میں سوچ رہا ہوں اسے شہر کے کسی اسکول میں داخل کروادوں۔ خود تو پڑھ نہ سکا اولاد کو تو بہتر مستقبل مل جائے گا۔'' پھر اس کی سوچتی ہوئی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ ''تم کیا کہتی ہو؟''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ یہاں رہ کر وہ گلی محلوں میں ہی کھیلنے میں وقت ضائع کرے گا۔'' وہ کامل خلوص سے بولی۔ ''لیکن وہاں وہ رہے گا اکیلا؟''

''تم قائل کروگی اسے تو ضرور رہے گا۔ تمہاری بات مان لیتا ہے وہ۔'' سکینہ کی الیاس اور وسیم کے لیے محبت میں اسے چنداں شبہ نہ تھا۔

''اچھا، میں کرلوں گی بات اس سے...... لیکن وہ...... میں۔'' وہ متذبذب لہجے میں گویا ہوئی۔

''کیا کوئی مسئلہ ہے سکینہ...... کھل کے بات کرمجھ سے۔'' وہ آج کافی ترنگ میں تھا۔

''وہاں کسی بڑے اسپتال میں نبیلہ کو اگر دکھا لیتے ہم تو شاید کچھ بہتری کی صورت پیدا ہوجاتی۔''

''ہوں! ٹھیک ہے دکھا لیں گے۔ کیوں فکر کرتی ہو؟'' وہ مخمور نگاہوں سے اسے دیکھ کر بولا۔ نبیلہ کی بہتری میں اس کا اپنا مفاد پوشیدہ تھا اور کوئی بشر اپنے مفاد سے بھلا چشم پوشی کرتا ہے؟ ستاروں کی بزم میں آج رات یہی... چہ میگوئیاں تھیں۔

☆☆☆

''آپ لوگوں نے بہت دیر کردی بچی کے علاج میں۔ سات سال سے زیادہ عمر ہوچکی ہے اس کی۔ ابتدائی عمر میں ادویات استعمال کروائی جاتیں تو بہتر نتائج سامنے آسکتے تھے۔'' مقامی اسپتال کا ڈاکٹر انہیں نبیلہ کی میڈیکل رپورٹس کے متعلق اختصار سے بتا رہا تھا۔

''لیکن اب بھی تو کوئی صورت ہوگی نا... ڈاکٹر صاحب؟'' سکینہ کی امید تا حال توانا تھی۔

''امید تو ہے، بالکل ہے لیکن علاج بہت طویل ہے۔'' ڈاکٹر خوش خلقی سے بولا۔

''کتنا طویل؟'' مبارک نے پہلی بار اس گفتگو میں حصہ لیا۔

''کم از کم پانچ سال تو لگ ہی جائیں گے۔ اسے ادویات باقاعدہ استعمال کروائیں اور نرمی سے برتاؤ کریں۔'' ڈاکٹر نے محتاط لہجے میں بتایا۔

مبارک کے منہ میں کڑواہٹ سی گھل گئی۔ ایک ان چاہے وجود پر اتنے اخراجات کا تصور ہی اس کی تنگ دلی کو انتہائی ناگوار گزر رہا تھا لیکن چہرے پر مصنوعی بشاشت کا نقاب اب بھی قائم تھا۔

☆☆☆

سکینہ اب مبارک علی کی مزید زیر بار ہوچکی تھی۔ بیٹی کی کامل شفا اس کا دیرینہ خواب تھی۔ وہ اپنی حیات میں ہی

اسے محفوظ مستقبل دے دینا چاہتی تھی لیکن پھر شوہر کے ایک مطالبے نے اسے نئے امتحان میں ڈال دیا۔

''بس اب مزید برداشت نہیں ہوتا مجھ سے۔ اسے کوٹھری میں منتقل کردو تو بہتر ہوگا۔'' اس نے بے رخی سے بیوی سے کہا۔

''کوٹھری میں کیسے رہے گی وہ بھلا؟ اللہ کے واسطے کچھ تو خیال کیجیے۔''

''خیال ہی تو کررہا ہوں سکینہ بی بی اس کا...... اور اللہ ہی کے واسطے کررہا ہوں...... لیکن میرے بھی کچھ حقوق ہیں یا نہیں تم پر؟'' وہ شاطرانہ انداز میں اس کے گرد جال بچھا رہا تھا۔

''بالکل ہیں آپ کے حقوق...... میں کب منکر ہوں۔ میں نے کب پورے نہیں کیے آپ کے حقوق؟'' سکینہ کی آواز آنسوؤں سے بوجھل ہوچلی تھی۔

''بس بس! زیادہ ٹسوے مت بہا۔ میں دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں۔ بیٹی کی ایک پکار تجھے سب کچھ بھلا دیتی ہے۔''

''مگر آپ کی اولاد اور گھر کو تو کبھی نظر انداز نہیں کیا میں نے...... پھر بھی آپ مجھ سے راضی نہیں۔''

''میں راضی تب ہوں گا سکینہ جب تو مجھے بیٹی پہ ''فوقیت'' دے گی۔ میں نے صاف بتا دیا ہے تجھے۔ منظور ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ خود ہی کرواتی پھرنا علاج اس کا۔'' وہ حتمی لہجے میں کہہ کر باہر چلا گیا اور سکینہ موت سے بدتر سختی میں جکڑی گنگ وہیں بیٹھی رہ گئی۔

نبیلہ کے بہتر مستقبل کے لیے سکینہ نے اسے کوٹھری میں منتقل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ مبارک علی کا مزاج قدرے بحال ہوچلا تھا۔ نبیلہ کے بے ضرر وجود سے باندھا جانے والا بیر اسے بے حس اور کسی حد تک بے ضمیر بنا چکا تھا۔ سکینہ کی الیاس اور وسیم سے بے لوث محبت نبیلہ سے زیادہ نہیں تو کم بھی ہرگز نہ تھی لیکن اب بات احساس و انسانیت کی نہ رہی تھی۔ ایک جنگ بن چکی تھی...... انا کی تسکین کی جنگ اور یہ انا وغرور ہی تو تھا جس نے ابلیس کو بھی راندۂ درگاہ قرار دلوایا تھا۔

سکینہ کی لہولہو ممتا نے اسے نہ چاہتے ہوئے بھی شوہر کے لیے ایک برف زار بنا دیا تھا۔ مبارک کے وجود میں ایک لاوا کھولنے لگا تھا۔ سمجھوتا کرنا اس کی فطرت کا حصہ کبھی نہ رہا تھا اور اب بھی وہ اس لاشعوری سرد مہری کو ہرگز معاف کرنے کو تیار نہ تھا۔

☆☆☆

شب وروز کا تغیر اور فلکی نظام کی نیرنگیاں جاری تھیں۔ زندگی اسی ڈگر پر رواں دواں تھی۔ بستی میں بننے والے ایک ہائی اسکول کی وجہ سے وسیم کو بغرضِ پڑھائی شہر نہ بھیجا گیا۔ سکینہ دو ہفتوں سے شدید موسمی بخار کی لپیٹ میں تھی بیماری اور نقاہت میں گھریلو ذمے داریوں کی ادائیگی کے بعد وہ تھکن سے چور ہوکر لیٹتی تو صبح کی خبر ہی لاتی۔ مبارک دو دن سے دکان کے لیے مال کی خریداری اور الیاس سے ملنے کی غرض سے شہر گیا ہوا تھا۔ بیوی سے اس کے خودساختہ ''گلوں'' کی افزائش فزوں تر ہوتی چلی جارہی تھی۔

بیساکھ کے تپتے مہینے کی اس قہر برساتی رات کو وہ تھکا ہارا شہر سے گھر لوٹا تو کوٹھری کی کھڑکی سے جھانکتی دو سراسیمہ آنکھوں کی جھلک نے اسے ٹھٹک کر رکنے پر مجبور کردیا۔ عرصہ دراز سے وجود میں پنپنے والے آتش فشاں کو بہاؤ کا فوری راستہ درکار تھا۔ اس نے دبے قدموں آہستگی سے کواڑ کھولا اور نبیلہ کے قریب جاکر کھڑا ہوگیا۔ وہ اس کے خشونت زدہ انداز سے پہلے ہی خائف رہتی تھی، اسے سامنے پاکر مزید خوفزدہ ہوگئی۔ رات کی تاریکی، منہ زور نفس اور انتقامی جذبات میں

بہہ کر وہ تمام تر اخلاقی حدود فراموش کر بیٹھا۔ نبیلہ کے منہ میں اسی کا دوپٹا ٹھونس کر اس نے وحشت و درندگی کی نئی داستانیں رقم کر ڈالیں۔ اس کی گھٹی گھٹی کربناک آوازیں اس کے دل میں ٹھنڈک برسا کر اس کی حیوانیت کو مہمیز کر رہی تھیں۔ اسی پر تسکین نہ ملی تو اس کے ادھ موئے وجود کو ٹھوکروں کی زد میں رکھ کر اطمینان سے کپڑے جھاڑتا ہوا باہر نکل آیا۔ صحن میں کھڑے ہو کر دزدیدہ نظروں سے اس نے چاروں طرف دیکھا پھر کسی خیال کے تحت سکینہ کے کمرے کے بیرونی کواڑ سے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کے بعد سرشار انداز میں چہرہ آسمان کی جانب اٹھا کر آنکھیں موند لیں اور ایک بھرپور انگڑائی لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ عرشی دنیا کے داستان گو... ملائک انسان کے اس مکروہ روپ کی تاب نہ لا پائے اور بادلوں کی اوٹ میں چھپ گئے۔

☆☆☆

رات بستی کے کنارے بہنے والی نہر پر گزار کر وہ خود کو سنبھال چکا تھا۔ اپنی اس حرکت پر اسے کوئی ملال یا پشیمانی نہ تھی۔ اگلی صبح پو پھٹتے ہی وہ بڑے مگن انداز میں چہل قدمی کرتا ہوا گھر پہنچا تو وہاں حسب توقع ایک کہرام برپا تھا۔ سکینہ کے بین کی آوازیں اسے گلی کے نکڑ تک سنائی دے رہی تھیں۔ گھر کے اندرونی و بیرونی حصوں میں تاسف میں گھرے کئی مرد و خواتین موجود تھے۔ اس نے بھی چہرے پر مصنوعی فکرمندی اور سراسیمگی کا نقاب اوڑھ کر اپنے ہمسائے دین محمد کا بازو دبوچ لیا اور لڑکھڑاتے لہجے میں بولا۔

''کک...... کک...... کیا ہوا بھائی؟ یہ اتنا ہنگامہ کیوں برپا ہے یہاں؟ سب خیریت تو ہے نا؟''

دین محمد ترحم آمیز نگاہوں سے اسے دیکھ کر ایک جانب لے گیا اور دھیمے انداز میں بولا۔

''بس اللہ کی رضا ہے بھائی مبارک۔ جس کی قضا آئی ہو اسے کون ٹال سکتا ہے مگر اس قدر بھیانک انجام...... اللہ کی مار ہو اس درندے پر......''

مبارک بجلی کی طرح لپک کر اندر بڑھا۔ کھلے صحن میں نبیلہ کا نیلو نیل وجود اس پر گزری قیامت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ ٹھٹک کر رکا لیکن جب بلکتی ہوئی سکینہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر روئی تو اسے ناقابل بیان فرحت محسوس ہوئی۔ بیوی کے وجود پر اب اس کا مکمل تصرف تھا۔ اس خیال نے اسے ندامت کا رتی بھر احساس نہ ہونے دیا۔

☆☆☆

سکینہ کا جذباتی انحصار مبارک کی انا کو بے حد تسکین دینے لگا تھا۔ اپنے قبیح ترین فعل پر اسے فخر سا ہونے لگتا تھا۔ نبیلہ کی عدم موجودگی کا احساس اسے ہمہ وقت سرشار رکھنے لگا تھا۔

''غلاظت کی پوٹلی تھی۔ ہونہہ...... اس کے وجود سے پاک ہو کر گھر کتنا خوشگوار معلوم ہوتا ہے اب۔'' وہ خود کلامی کرتے ہوئے اکثر سوچتا تھا۔ گھر والوں پر اس کی نوازشات کا سلسلہ بھی کافی بڑھنے لگا تھا لیکن سکینہ کی آنکھوں میں تاحال ویرانیوں کے ڈیرے اسے اب بھی چڑاتے تھے مگر وہ خود اعتمادی سے اسے بہلانے کی بھرپور سعی میں مگن رہتا تھا۔

اس روز بھی وہ دکان جلدی بند کر کے گھر جانے کے لیے پر تول رہا تھا جب وسیم ہانپتا ہوا اس کے پاس آیا۔

''ابا جی...... ابا جی! جلدی گھر چلیے ذرا۔''

''کیا ہوا؟ خیریت ہے نا سب؟'' وہ تیوریوں چڑھا کر بولا۔

''اماں کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے...... بے ہوش ہو گئی ہے وہ۔''

مبارک یکدم بوکھلا گیا اور دکان بند کر کے بیٹے کے ساتھ ہو لیا۔ گھر پہنچ کر دیکھا تو سکینہ کا بدن کسی بھٹی کے مانند جھلس رہا تھا۔

''صبح قے بھی کر رہی تھیں۔ میں نے بہتیرا کہا چلو حکیم صاحب کے پاس چلتے ہیں مگر مانی ہی نہیں۔ بس نبیلہ کا نام لے کر روتی رہیں۔'' وہ روہانسا ہو رہا تھا۔

مبارک خاموشی سے دانت پیستا ہوا حکیم کے مطب میں جا کر اسے گھر لے آیا جس نے چند اشیا کی تشخیص کے بعد اسے کچھ پڑیاں تھما دیں اور دہلیز سے جاتے وقت ایک پل کے لیے رکا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے بولا۔

''وچھوڑے کی کوئی دوا نہیں ہوتی مبارکے! یہ دکھ بڑا جان لیوا ہوتا ہے اور اس بے چاری نے تو اولاد کا وچھوڑا اور بے حرمتی کا درد ایک ساتھ سہا ہے۔ اسے اولاد کا سکھ دے۔ رب خیر کرے گا۔'' مبارک ایک گہری سانس بھر کے رہ گیا۔

ماں کی بیماری کا سن کر الیاس بھی چھٹیوں میں فوری گھر آ گیا تھا۔ اس کے دونوں بیٹوں کی سکینہ سے والہانہ عقیدت اسے اکثر ششدر کر دیتی تھی۔ سوتیلے رشتوں میں محبت کی ایسی نظیر اس کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا۔ اس کا لاشعور سکینہ کے ظرف سے ہمہ وقت تقابلی جائزے میں الجھا رہتا تھا۔ اس بیماری نے اس کے ہونٹوں پر ایک جامد

چپ ٹھہرا دی تھی۔ وہ کسی معمول کے مانند گھریلو ذمے داریاں سر انجام دیتی...... ہاں مگر اس کی نمازوں کے سجدے طویل سے طویل تر ہوتے جارہے تھے۔ نبیلہ کی موت کے بعد سکینہ کا اس پر جذباتی انحصار اسے اب ایک گم گشتہ خواب محسوس ہوتا تھا۔ جانے کیوں اس رشتے میں ایک طویل لامتناہی صحرا محیط نظر آنے لگا تھا۔ الیاس اور وسیم کا دم بھرنے والی سکینہ میں اپنی اولاد کی خواہش کی کوئی رمق موجود نہ تھی۔ مبارک نے کئی بار ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے اپنی تمنا کے متعلق جتانے کی کوشش کی لیکن وہ محض ایک ہی بات پر اکتفا کرتی۔

''میں ایک ناکارہ زمین ہوں۔ آپ کی نسل داغ دار نہیں کرنا چاہتی۔''

''مگر میرے بیٹے تندرست اولاد ہیں۔ تو پھر کاہے کا ڈر۔'' وہ زچ ہوکر کہتا۔

''اللہ کے سپرد کردیجیے۔ ضروری نہیں ہر خواہش کی ناؤ کنارے بھی لگے۔'' اس کا سپاٹ انداز مبارک کے تمام الفاظ کو گنگ کردیا کرتا تھا۔

☆☆☆

مبارک علی کی خواہش کی ناؤ ساحل پر پہنچ کر ڈوب چکی تھی۔ سکینہ کے دل و دماغ کو مسخر و تابع کرنے کی تمنا لاحاصل ہی رہی اور اولاد ان کے متوازی آن کھڑی ہوئی۔ بیٹے شادی کے قابل ہوئے تو انہیں گھر کی تعمیر نو کے لیے والد سے شدید تحفظات درپیش ہونے لگے۔ وہ گھر کی بنیادیں از سرِ نو استوار کرنے کا خواہش مند تھا لیکن الیاس اور وسیم کوٹھری مسمار کرنے کے حق میں نہ تھے۔ آئے روز بحث کا بازار گرم رہنے لگا۔

''مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگتے کبھی دیکھا نہ سنا۔ تم لوگ کیوں مصر ہو اس احمقانہ خیال پہ۔'' مبارک جھنجلاہٹ کی انتہا پر تھا پھر سکینہ سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''تم ہی کچھ سمجھاؤ انہیں۔''

''ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں یہ۔ کوئی مضائقہ بھی نہیں ویسے اس میں۔'' سکینہ کا ٹھنڈا لہجہ اسے یک دم جھلسا گیا۔

''تم...... ساری زندگی ایک ہی جوگ لے کر بیٹھی رہیں...... نحوست ہی طاری رکھی تم نے بس۔'' وہ کف اڑاتے ہوئے بولا۔

''یہ دکھ تو ہمارے دلوں میں بھی تاحال تازہ ہے ابا جی! اور یہ تو پھر ماں تھیں اس حرماں نصیب کی۔'' الیاس سکینہ کے گرد بازو پھیلا کر بولا۔

مبارک کے وجود میں غصے کی تیز لہر ابھری لیکن وہ مصلحت کے تحت خاموش رہا۔ ذہن کے کسی گوشے میں سکینہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا خیال اب بھی کلبلا رہا تھا لیکن گھر کی تعمیر شروع ہوتے ہی اسے شدید بخار نے ایک بار پھر دبوچ لیا۔ وہ سارا دن چت لیٹی کوٹھری کی دیواروں کو خالی نظروں سے گھورتی رہتی۔ آنسو آنکھوں کی منڈیر عبور کر کے تکیے میں جذب ہوتے رہتے تھے۔ گھر کے اندرونی کمروں یا صحن میں اب اس کا دل ہی نہ لگتا تھا۔ مبارک کے صبر کا پیمانہ بالآخر لبریز ہوگیا اور وہ طیش سے پھٹ پڑا۔

''بس کردے سکینہ اب! کیا چاہتی ہے تو آخر؟''

''میں نے تو کبھی کچھ چاہا ہی نہ تھا...... بس اپنی کملی بیٹی کا تحفظ ہی تو چاہا تھا۔'' اس کے کھوئے کھوئے انداز نے مبارک کے دل میں یکدم عجیب سی بے کلی پیدا کردی لیکن وہ بے نیازی سے بولا۔

''غلطی تیری تھی نا...... تو نے بیرونی دروازہ بند رکھا ہوتا تو کیونکر کوئی داخل ہو پاتا گھر میں؟''

''ہاں ٹھیک کہا! غلطی میری ہی تھی۔ میں نے اپنی قیمتی متاع کا ضامن ایک چور کو ٹھہرا ڈالا۔ غلطی تو میری ہی تھی ہاں، میری ہی تھی۔'' وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

''بخار تیرے دماغ کو چڑھ گیا ہے شاید۔ کیا اناپ شناپ بکے جارہی ہے؟''

''مبارک علی!'' وہ سرسراتے لہجے میں بولی۔ ''کوئی پل تو ایسا آیا ہوگا جب تجھے اس پر ترس آیا ہوگا۔ کوئی تو پل آیا ہوگا۔ کیا نفرت نے تیرے دل میں ایک بار بھی رحم نہ آنے دیا تھا؟''

مبارک کے سر پر ساتوں آسمان جیسے یکدم ٹوٹ پڑے۔ ''یہ...... کک...... کیا کہہ رہی ہے تو...... میں نے......'' اس کا سارا وجود سن ہونے لگا۔

''ہاں! تم نے...... تم ہی تھے وہ درندے...... تبھی معلوم ہوگیا تھا مجھے۔ تم نے ہر پہلو پر نظر رکھ لی لیکن اپنے سامان سے ریلوے کا وہ ٹکٹ نکالنا بھول گئے جس پر تمہاری واپسی کی تاریخ درج تھی...... نہیں! بھولے کہاں تھے تم...... تم نے تو بڑی ہوشیاری سے سارا میدان سجایا تھا۔ لیکن میری معصوم بچی کی آہیں وہ نیلی چھتری والا تو سن رہا تھا نا...... وہ کیسے تیرا یہ ظلم اوجھل رہنے دیتا۔ اس انصاف کرنے والے حاکم نے فراموش کروایا تجھ سے یہ۔'' وہ بے تکان بولتی چلی گئی پھر یکدم اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

''یہی سوچ رہا ہے نا کہ اتنے سال میں خاموش کیوں

رہی...... کیوں نہ چھوڑ گئی تبھی تجھے؟" اس کے ہاتھوں میں بخار کی حدت کے بجائے برف کی سی ٹھنڈک نے مبارک کا سارا وجود منجمد کر دیا۔ "میں چلی جاتی تو کوئی دوسری سکینہ لے آتا تو اور کوئی دوسری نبیلہ روندی جاتی۔ میں چاہتی تو تیری اولاد بھی بربادی کے راستے پر ڈال دیتی لیکن میں نے اللہ کو گواہ بنا کر کیے گئے عقد کی پاسداری کی۔ اپنے حصے کی ایمانداری نبھا دی۔ تیری اولاد سنوار دی۔ اپنی بچی کے آخری سفر کی آسانیوں کا لالچ مجھے تیری سطح تک نہ لا سکا لیکن میں تجھے کبھی معاف نہ کر پائی۔ تو نے عورت کے من میں نفس کی آنکھ سے جھانکا بس...... میں تو تیرے پاؤں دھو دھو کر پیتی اگر تو ایک بار میری بچی کو اپنا لیتا۔" وہ بولتے ہوئے ہانپنے لگی۔

"میں نے ایسا کچھ......" وہ کھوکھلے لہجے میں بولا۔

"چپ رہ بس...... آج مجھے بولنے دے......" مبارک کو اس دھان پان سی عورت سے یکلخت خوف محسوس ہونے لگا تھا لیکن وہ آج تمام تر حساب چکتا کر دینا چاہتی تھی۔

"میں نے تیرے بیٹے پال کر جوان کر دیے اور تیرے لیے اپنے صبر کا ایندھن چھوڑے جا رہی ہوں۔ اسے سنبھالے رکھنا بس اور یہ بھی مت سوچنا کہ میں تجھے معاف کر دوں گی۔"

اچانک ایک خدشہ اس کے ذہن میں کلبلایا اور اس کے وجود کو شل کر گیا مگر نہ جانے کیوں اس کے اندر پیدا ہونے والی ہر سوچ کسی عکس کی طرح سکینہ کے سامنے جھلک رہی تھی تبھی وہ ایک تھکی ہوئی مسکراہٹ سے بولی۔

"نہیں! میں تیری طرح نہیں بن سکی۔ کچھ نہیں بتایا تیری اولاد کو...... مگر چاہ ضرور رکھی دل میں...... کہ تو اپنی بوئی فصل کا اناج ضرور چکھے۔"

مبارک علی کی برداشت اب ختم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ خوفزدہ انداز میں الٹے پیروں وہاں سے نکل آیا اور سیڑھیوں پر گھٹنوں میں سر دیے کر دبک کر بیٹھ گیا۔ اس کے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ خالی الذہنی کے عالم میں جانے کب تک وہ وہیں بیٹھا رہا۔ ہوش تو تب آیا جب الیاس نے اس کے کندھے کو جھنجھوڑ کر رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"اماں چلی گئی ہمیشہ کے لیے ہمیں چھوڑ کر۔"

"چلی گئی...... ایسے کیسے چلی گئی؟ میری سن تو لیتی ایک بار۔ ایک بار تو بولنے دیتی مجھے بھی۔" وہ پھٹے ہوئے لہجے میں بولا اور بھاگ کر کوٹھری میں داخل ہوا تو سکینہ کے چہرے پر طاری ابدی سکون نے اسے یکدم چکرا کر رکھ دیا۔ وہ بے جان ٹانگوں سے اس کی چارپائی کے پاس ڈھے گیا۔

☆☆☆

سکینہ کے صبر کا بار اس کا وجود ریختہ کر گیا تھا۔ اسے رعشے کا مرض بری طرح لاحق ہو گیا۔ داہنے دھڑ پر فالج کے حملے نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی اور وہ مکمل طور پر صاحبِ فراش ہو گیا۔ ہر گزرتا دن اس کی حالت بد سے بدتر کر رہا تھا۔ بیٹوں نے اپنی پسند سے بیاہ رچا لیے لیکن بہوؤں کو اس کا وجود باعثِ آزار محسوس ہوتا تھا۔ شوہروں کی ہدایات کے باوجود وہ اس سے تغافل برتتی تھیں۔ تاریخ اپنے آپ کو پھر سے دہراتی محسوس ہو رہی تھی۔

الیاس صبح کا گیا رات کو گھر آتا تھا۔ وہ اس کی ادویات و علاج معالجے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا لیکن اس کا حقیقی مداوا تو کسی کے پاس بھی نہ تھا۔ وسیم کی بسلسلۂ ملازمت جدہ منتقلی کے بعد اس کی بیوی کے تنفر و انتقام نے مبارک کے وجود کو تختۂ مشق بنا ڈالا۔ اس کے قویٰ اس قدر نڈھال ہو چکے تھے کہ رفع حاجت کی اب مکمل محتاجی درپیش تھی جس کے باعث اسے اسی کوٹھری میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کا گھناؤنا ماضی ہر پل اسے عذابِ مسلسل میں مبتلا رکھتا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنا چاہتا تھا لیکن گویائی بے سکت تھی۔ کرب حد سے سوا ہوتا تو نبیلہ کے خیالی ہیولے کی منت سماجت کرتا لیکن زبان سے لا...... لا...... لا کے سوا کچھ بھی ادا نہ ہو پاتا۔ صبر کا ایندھن اسے سوختہ کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

ہر رات کی طرح بھادوں کی وہ شب بھی اس کے لیے عذاب بن کر نازل ہوئی تھی۔ نبیلہ کا ہیولا اسے چھت کی کڑیوں سے جھانکتا دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے وجود سے اٹھنے والے تعفن نے اس پر دیوانگی طاری کر دی۔ اس نے پوری قوت لگا کر اپنے وجود کو گھسیٹا اور چارپائی سے نیچے گر گیا۔ اس کا بالائی دھڑ دہلیز سے باہر جا پڑا۔ اب مزید حرکت کی سکت تھی نہ ہمت۔ اس کی نظریں آسمان کی لامتناہی وسعتوں میں معافی کی تلاش میں بھٹکنے لگیں۔

قمر و کواکب کی بزم میں آج اداسیوں کا راج تھا۔ داستان گوئی یکایک خاموشی و سکوت کے لبادے میں کھو گئی۔ قمر نے تاسف سے ٹھنڈی آہ بھری اور ہم نشینوں سے مخاطب ہو کر گویا ہوا۔

"قسم ہے زمانے کی! بے شک انسان خسارے میں ہے...... بے شک انسان خسارے میں ہے......"

عفریت

ثمر عباس

بعض اوقات خاموش طبع انسان اپنے اندر کسی بہت بڑے طوفان کا شور لیے پھرتا ہے... اسے باہر کا نہ کچھ دکھائی دیتا ہے، نہ سنائی دیتا ہے، وہ تو بس سارے مذاکرات اپنے اندر کے انسان سے کررہا ہوتا ہے۔ وہ بھی کسی ایسی ہی مہم میں مصروف تھا اور اس کے سائے تک کو خبر نہ تھی کہ ایک دن وہ کیا دھماکا کرنے والا ہے... مگر تقدیر نے اچانک بازی پلٹ دی۔

انسانی خون سے پیاس بجھانے والے ایک عفریت کا ماجرا

پورے چاند کی روشنی نے ماحول کو سحر انگیز اور رومان پرور بنا دیا تھا۔ وہ چاروں جھیل کے کنارے ایک تنے پر بیٹھے بیئر سے شغل فرما رہے تھے جو مسٹر گالٹ کے فریج سے چرائی گئی تھی۔ ان کے دونوں جڑواں لڑکے اور رابرٹ باری باری بیئر کا کین ایک دوسرے کو دے رہے تھے جبکہ سینڈی کوک سے دل بہلا رہی تھی۔ وہ ان تینوں لڑکوں سے ایک سال چھوٹی تھی اور گزشتہ دنوں اس کی گیارھویں سالگرہ منائی گئی تھی۔ دونوں جڑواں لڑکوں میں سے ایک نے جیب سے چرایا ہوا سگریٹ نکال کر سلگایا لیکن پہلا کش لیتے ہی اسے کھانسی کا دورہ پڑگیا اور اس نے بے حال ہو کر وہ سگریٹ پھینک دیا۔

ڈیوی اور ڈینس مقامی لڑکے تھے اور وہ اپنے ساتھیوں

کو مقامی کہانیاں سنا کر محظوظ کر رہے تھے۔ ہر کہانی کا آغاز ایک ہی انداز سے ہوتا تھا۔ مثلاً یہ کہ وہ مکان قصبے سے باہر تھا یا یہ کہانی شمال میں واقع ایک قصبے سے تعلق رکھتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ رابرٹ اور سینڈی لارنس کا تعلق نیویارک سے تھا اور وہ اپنے والدین کے ہمراہ تعطیلات منانے یہاں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ سب کہانیاں پہلے بھی سن رکھی تھیں اس لیے وہ اس وقت کسی خاص دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے۔

''ایک منٹ......'' رابرٹ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔''جب وہ کار چلاتے ہوئے گھر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ گاڑی کے دروازے کے ساتھ ایک ہک لٹک رہا ہے۔''

اس پر ایک قہقہہ پڑا اور کہانی یہیں پر ختم ہوگئی۔ رابرٹ اور سینڈی کا کوئی اور کہانی سننے کا موڈ نہیں تھا لیکن ڈینس بھی رکنے والا نہیں تھا۔ اس نے نئی کہانی شروع کردی۔''کالج کے لڑکے ایک پارٹی میں جا رہے تھے کہ انہیں سڑک کے کنارے ایک خوب صورت لڑکی ملی۔ انہوں نے اسے اپنی کار میں بٹھالیا......''

اس سے پہلے کہ ڈینس کہانی کا اگلا حصہ بیان کرتا، سینڈی اچانک بول پڑی۔''وہ ڈانس کرتے وقت سردی سے ٹھٹھر رہی تھی۔ ان میں سے ایک لڑکے نے اسے اپنا سویٹر پہننے کے لیے دے دیا۔ دوسرے دن وہی سویٹر انہیں قبرستان سے ملا جو اس کی قبر کے سرہانے کتبے پر بڑی صفائی سے تہ کر کے رکھا گیا تھا۔ یہی کہانی ہے نا؟''

ڈینس نے اسے گھور کر دیکھا اور بیئر کے کین کی طرف ہاتھ بڑھا دیا لیکن اس کے بھائی نے آگ کے شعلوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔''یہ بالکل سچی کہانی ہے اور یہ واقعہ یہیں جھیل کے کنارے پیش آیا تھا۔'' اس نے اپنی بات میں ڈرامائی تاثر پیدا کرنے کے لیے وقفہ لیا اور بولا۔''درحقیقت ایسے واقعات اب بھی ہوتے رہتے ہیں۔''

یہ سنتے ہی سب اس کی جانب متوجہ ہوگئے۔ رابرٹ نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ پونے دس بج چکے تھے۔ ویسے تو انہیں دس بجے تک اپنے کیبن میں واپس پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن ڈیڈی نے انہیں رعایت دے دی تھی۔ وہ اس پر خوش تھے کہ ایک ہفتے تک بور ہونے کے بعد گزشتہ روز ان بچوں کی ملاقات مقامی لڑکوں سے ہوگئی تھی لہٰذا انہوں نے کیمپ فائر کو ایک گھنٹا آگے بڑھانے کی اجازت دے دی تھی اور اس طرح انہیں ایک اور طویل کہانی سننے کے لیے وقت مل گیا تھا۔

''بس اس کے بعد ہم کوئی اور کہانی نہیں سنیں گے۔'' رابرٹ نے احسان جتاتے ہوئے کہا۔

ڈیوی نے اپنی آواز دھیمی کردی جیسے سرگوشی کر رہا ہو اور وہ سب اس کے قریب ہو کر سننے لگے۔ جیسے ہی ڈیوی نے بولنا شروع کیا تو رابرٹ کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کا احساس ہونے لگا۔

''یہ مکان اس قصبے سے باہر واقع ہے۔''

یہ سنتے ہی سینڈی طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ اسے لگا جیسے پرانی کہانی ایک بار پھر دہرائی جا رہی ہے۔

''نہیں، یہ حقیقت ہے۔'' ڈیوی زور دیتے ہوئے بولا۔''وہاں مسٹر بیلڈن رہتے ہیں۔ تمہیں اس کے قریب جانے کی ضرورت ہے۔ وہ قصبے کو جانے والی سڑک سے ہٹ کر جنگل کے سرے پر واقع ایک فارم ہاؤس ہے جس میں ایک گودام اور بہت بڑا کھیت ہے۔ لوکس بیلڈن واقعی پراسرار شخصیت ہے۔ اس کی عمر تقریباً پچاس برس ہوگی جبکہ اس کی بیوی دس سال پہلے دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر چکی ہے لیکن لوگوں کا خیال کچھ اور ہے۔ اس کی بیوی ایک بدمزاج عورت تھی اور بیلڈن کی ہر بات پر اعتراض کیا کرتی تھی۔ وہ اس سے تنگ آچکا تھا لہٰذا اس نے جان چھڑانے میں ہی عافیت سمجھی۔''

''ہمارے ڈیڈی کا کہنا ہے کہ مسٹر بیلڈن وہاں اس وقت سے رہ رہے ہیں جب وہ سب بچے تھے۔ ڈیڈی نے ان کے ساتھ اسکول میں پڑھا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ لوکس بیلڈن بچپن سے ہی پراسرار واقع ہوا ہے۔ وہ اپنا سارا وقت کھیل کود کے بجائے لائبریری میں گزارتا تھا۔ اس کی کسی لڑکے سے دوستی نہیں تھی۔ اس کے ڈیڈی انہیں چھوڑ کر کسی دوسری عورت کے ساتھ چلے گئے تھے اور ماں نے اس کی پرورش بڑے مشکل حالات میں کی تھی۔ وہ اپنے کھیت میں پیدا ہونے والی سبزیاں اور پھل بازار میں فروخت کرتی اور گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے جو لوگ یہاں آتے، ان کے کپڑے دھو کر کچھ پیسے کماتی تھی۔ ڈیڈی یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ ہر وقت نشے میں دھت رہتی اور لوکس پر چلاتی رہتی تھی۔ حالات کی تلخی نے اسے حد درجہ بدمزاج بنا دیا تھا۔''

''کہانی کے اصل حصے کی طرف آؤ ڈیوی۔'' اس کے بھائی نے لقمہ دیا۔

''لوکس بیس سال کا تھا جب اس کی ماں کا انتقال ہوگیا اور اس کے فوراً بعد ہی لوکس نے شادی کرلی۔ وہ عورت بہت مال دار تھی اور اس کے مرنے کے بعد وہ ساری دولت کا مالک بن گیا۔ کچھ لوگوں کے خیال میں اس کے پاس لاکھوں ڈالرز کے اثاثے ہیں مگر اس نے دوسری شادی

نہیں کی اور اپنے فارم پر تنہا زندگی گزار رہا ہے۔ وہ اپنی پرانی پک اپ میں ہفتے میں ایک بار کھانے پینے کی اشیا خریدنے کے لیے قصبے کا رخ کرتا ہے لیکن کسی سے بات نہیں کرتا اور نہ ہی لوگوں سے ملنا جلنا پسند کرتا ہے۔ ممی کہتی ہیں کہ وہ جس انداز میں دیکھتا ہے، وہ دوسروں کو خوف زدہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ البتہ اسے جانوروں سے بڑی محبت ہے۔ اس کے پاس ایک کتا، کچھ بلیاں، گائے، مرغیاں اور دو عدد گھوڑے بھی ہیں۔''

''گھوڑے!'' سینڈی بے اختیار چلائی۔ ''مجھے گھوڑے بہت اچھے لگتے ہیں۔''

''شش......'' ڈیوی نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''اس کی انہی عادتوں کی وجہ سے لوگوں نے اسے تنہا چھوڑ دیا ہے لیکن چند سال پہلے ایک عورت یہاں سے غائب ہوگئی تو بیلڈن کے بارے میں بھی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ڈیڈی بتاتے ہیں کہ وہ ایک ڈانسر تھی اور نیویارک سٹی سے اپنے کسی کام کے سلسلے میں یہاں آئی ہوئی تھی کہ اچانک ایک رات اپنے کیبن سے پراسرار طور پر غائب ہوگئی...... اسے ہر جگہ تلاش کیا گیا یہاں تک کہ جھیل کی تہ میں بھی غوطہ خور اس کی لاش ڈھونڈتے رہے لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ تم لوگ جس کیبن میں ٹھہرے ہوئے ہو، اس کے مالک مسٹر سائمن کا کہنا تھا کہ انہوں نے اس عورت کو آخری بار جھیل کے کنارے کسی شخص سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں راز و نیاز میں مصروف تھے اور بے تکلفی کی حد تک ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے تھے۔ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے وہ مرد کی شکل واضح طور پر نہ دیکھ سکے لیکن ان کا خیال ہے کہ وہ لوکس بیلڈن تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں ایک ساتھ جنگل کی طرف چلے گئے پھر اس عورت کو دوبارہ کسی نے نہیں دیکھا۔''

وہاں گہری خاموشی تھی اور رابرٹ ٹکٹکی باندھے ڈیوی کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ سینڈی کھسک کر اس کے مزید قریب آگئی تھی۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔

''پھر کیا ہوا؟ کیا اسے گرفتار کرلیا گیا؟''

''نہیں۔'' ڈیوی نے جواب دیا۔ ''شیرف فولے نے اس سے پوچھ گچھ کی تھی مگر اس کا کہنا تھا کہ اس رات وہ قصبے کے سینما گھر میں فلم دیکھ رہا تھا۔ اس کی تصدیق تھیٹر کے عملے نے بھی کردی جو اسے اچھی طرح جانتے تھے لیکن میرے ڈیڈی کو شبہ ہے کہ وہ فلم کے دوران اٹھ کر آگیا ہوگا اور اس عورت سے ملنے کے بعد فلم ختم ہونے سے پہلے دوبارہ سینما میں جا کر بیٹھ گیا ہوگا۔''

رابرٹ نے پلکیں جھپکائیں۔ وہ اس فضول کہانی کے انجام سے متفق نہیں تھا لہٰذا بولا۔

''جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں، وہ یہ ہے کہ ایک عورت ڈوب گئی یا کسی مرد کے ساتھ جنگل میں گئی اور اس نے اسے مار دیا اور تم لوگوں نے فوراً ہی اس کا الزام لوکس بیلڈن پر عائد کردیا۔ یہ بالکل احمقانہ سی بات لگتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ عورت کو کیوں قتل کرے گا؟''

''تم یہاں کے رہنے والے نہیں ہو اس لیے اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔'' ڈینس نے کہا۔

ڈیوی نے اپنے بھائی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''ابھی یہ کہانی ختم نہیں ہوئی۔ بہت کچھ باقی ہے۔ وہ واحد عورت نہیں تھی جو یہاں سے پراسرار طور پر غائب ہوئی۔ گزشتہ چند سالوں میں دو عورتیں مل فیلڈ اور ایک اسٹانس بری سے غائب ہوچکی ہیں۔''

''پائن ڈیل......'' اس کے بھائی نے تصحیح کی۔

''اچھا اچھا۔ وہی، اس کے علاوہ ایک اور عورت گرین ٹری سے بھی غائب ہوئی تھی۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ وہ سب گمشدہ عورتیں طوائفیں تھیں۔''

''تمہارا مطلب ہے ہوکر۔'' سینڈی چلائی۔

ڈیوی کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''میں بھول گیا تھا کہ تم لوگ نیویارک سٹی کے رہنے والے ہو۔ ٹھیک ہے تم انہیں ہوکر، کہہ سکتی ہو۔ ان میں سے کسی کی لاش نہیں ملی لیکن یہاں سب لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ان واقعات کے پیچھے بیلڈن کا ہاتھ ہے۔''

رابرٹ نے سر ہلایا۔ اس کے اور سینڈی کے درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا۔ اس کے ڈیڈی وکیل تھے اور وہ سارا دن عدالت میں اپنے موکلوں کا دفاع کیا کرتے تھے لہٰذا وہ بھی بہت سی باتوں کو سمجھتے تھے۔ ان کی ماں ایک دو مرتبہ انہیں مقدمے کی کارروائی دکھانے کے لیے عدالت لے گئی تھی جہاں انہوں نے اپنے ڈیڈی کو دلائل دیتے ہوئے دیکھا تھا۔

رابرٹ نے اپنے باپ کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''گزشتہ کئی سالوں کے دوران چار طوائفیں مختلف مقامات سے غائب ہوگئیں جن کی نہ تو لاشیں ملیں اور نہ ہی کوئی ثبوت لیکن اس کے باوجود یہاں ہر شخص کا خیال ہے کہ انہیں لوکس بیلڈن نے قتل کیا ہوگا کیونکہ وہ اسے پسند نہیں کرتے جبکہ ان میں سے ایک عورت جب غائب ہوئی تو

اسے ایک بوڑھے شخص نے ایک ایسے بندے کے ساتھ دیکھا جو دور سے مسٹر بیلڈن جیسا نظر آرہا تھا جبکہ وہ اس وقت قصبے کے سینما میں فلم دیکھ رہا تھا اور اس کی گواہی کئی لوگ دے چکے ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی اس پر شک کرنے کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔''

سینڈی مسکرائی اور اپنے گرد کمبل لپیٹتے ہوئے بولی۔ ''تم تو بالکل ڈیڈی کی طرح بول رہے ہو۔''

دونوں جڑواں بھائی آگ پر نظریں جمائے بیٹھے تھے پھر ڈینس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''بظاہر تو کوئی گنجائش نظر نہیں آتی لیکن میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ اسی کی حرکت ہے۔ وہ انتہائی گھٹیا شخص ہے۔''

''وہ درمیان میں فلم چھوڑ کر سینما سے آسکتا ہے۔'' ڈیوی بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''اور اس عورت کو قتل کرنے کے بعد دوبارہ سینما واپس جاسکتا ہے۔''

''چلو، میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے تمہارا موقف پسند آیا۔ واقعی یہ ایک عمدہ کہانی ہے لیکن تم نے یہ کیسے فرض کرلیا کہ بیلڈن ان عورتوں کو قتل کرنا چاہتا تھا؟''

اس سوال کا دونوں بھائیوں کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد ڈیوی بولا۔ ''میرے ڈیڈی کہتے ہیں کہ جن لوگوں کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تو ان کی انگلیوں میں کھنچاؤ پیدا ہونے لگتا ہے اور وہ اسے دور کرنے کے لیے کوئی حرکت کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔''

''اچھا!'' رابرٹ زبردستی چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ واقعی یہ عجیب وغریب جگہ تھی لیکن اسے یہ لڑکے اچھے لگے تھے اور وہ ان سے کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ انہیں ابھی ایک ہفتہ اور یہاں قیام کرنا تھا۔ ڈیڈی مچھلیاں پکڑنے میں مشغول تھے اور مما اپنی نئی کتاب پر کام کررہی تھیں۔ اس لیے ان دونوں بہن بھائیوں کو زیادہ وقت انہی لڑکوں کے ساتھ گزارنا تھا۔ وہ چہرے پر بشاشت لاتے ہوئے بولا۔

''کل صبح تم دونوں کیا کررہے ہو؟''

''صبح اسکول جانا ہے۔'' ڈینس اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ہماری چھٹی دو بجے ہوجاتی ہے۔ تم چاہو تو تین بجے جھیل پر ملاقات ہوسکتی ہے پھر ہم تیراکی کے لیے جائیں گے۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''شام کو ہم ممی، ڈیڈی کے ساتھ ہائی وے پر واقع تفریحی پارک بھی جائیں گے جو ونڈر لینڈ کے نام سے مشہور ہے۔ کیا تم ہمارے ساتھ چلو گے؟''

''زبردست!'' ڈیوی بولا۔ ''اگر تمہارے ممی، ڈیڈی ساتھ جارہے ہیں تو پھر ہمیں بھی اجازت مل جائے گی۔''

''یقیناً!'' اس کے بھائی نے کہا۔

اچانک ہی رابرٹ کی جیب میں رکھے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ مما کا فون تھا جو کہہ رہی تھیں کہ دس بج کر پانچ منٹ ہوچکے ہیں۔ اب انہیں واپس آجانا چاہیے۔

''اب ہم چلتے ہیں۔'' رابرٹ نے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر کل ملاقات ہوگی۔''

''خداحافظ دوستو!'' سینڈی جاتے ہوئے بولی۔ وہ ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اپنے کیبن کی طرف جارہے تھے۔ راستے میں سینڈی نے کہا۔ ''میں گھوڑے دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''انگلیوں میں کھنچاؤ۔'' رابرٹ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''واقعی یہ عجیب وغریب جگہ ہے اور یہاں کے لوگ بھی بڑے عجیب ہیں۔''

''یہ بات تو طے ہے کہ انہیں قانون کے بارے میں کچھ علم نہیں۔'' سینڈی بولی۔ ''میں گھوڑے دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''مجھے بھی انہیں دیکھنے کا اشتیاق ہے۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''گھر جاکر ڈیڈی سے کچھ مت کہنا۔ میں خود انہیں پوری بات بتاؤں گا۔''

دوسری صبح وہ لوگ اپنے کیبن کے باہر بیٹھے ہوئے تھے جب رابرٹ نے ڈیڈی کو یہ قصہ سنایا۔ اس وقت تک وہ دونوں ناشتے کے برتن دھو چکے تھے جبکہ مما میز کے دوسرے سرے پر اپنا لیپ ٹاپ لیے ہوئے بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے کافی کا مگ رکھا ہوا تھا۔ تینوں جانتے تھے کہ جب وہ کچھ لکھ رہی ہوں تو انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں۔ اس لیے وہ دھیمی آواز میں گفتگو کررہے تھے۔

''تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟'' ڈیڈی نے پوچھا۔

''گزشتہ شب ہم کیمپ فائر پر گئے تھے۔ وہیں ڈیوی اور ڈینس نے ہمیں اس شخص کے بارے میں بتایا۔''

رابرٹ نے اس کے پہلو میں کہنی سے ٹھوکا دیا اور تیوری چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''وہ ہمیں ایک ڈراؤنی کہانی سنا رہے تھے۔ ان کے خیال میں قاتل اسی جنگل کے کنارے رہتا ہے۔''

ڈیڈی نے ایک نظر ساحل کے ساتھ بنے ہوئے کیبنوں

پر ڈالی پھر جھیل میں تیرتی ہوئی کشتیوں کو دیکھا اور بولے۔
''بچو! آج تمہارا کیا پروگرام ہے؟''
سینڈی کچھ کہنے والی تھی کہ رابرٹ اس سے پہلے بول اٹھا۔ ''آج ہم قصبے کی سیر کریں گے اور سہ پہر میں ان دونوں بھائیوں کے ساتھ تیراکی کریں گے۔''
ڈیڈی سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ''ان کا فون نمبر ضرور نوٹ کر لینا۔ میں ان کے والدین سے انہیں ونڈر لینڈ لے جانے کی بات کروں گا۔''
''ٹھیک ہے۔'' رابرٹ نے کہا اور اپنی بہن کے ہمراہ سیڑھیوں کی جانب بڑھنے لگا۔
''ایک منٹ۔'' ڈیڈی بولے۔ ''اگر تم شہر جا رہے ہو تو میرے لیے تھوڑی سی نائلون کی ڈوری لیتے آنا۔''
یہ کہہ کر انہوں نے اپنے پرس سے پیسے نکالے اور رسی کی خالی چرخی انہیں تھماتے ہوئے بولے۔ ''باقی پیسے تم دونوں رکھ لینا۔ لیکن خیال رہے کہ تمہاری واپسی دوپہر بارہ بجے تک ہو جانی چاہیے۔ میں زیادہ انتظار کرنا پسند نہیں کروں گا۔''
''ایسا ہی ہوگا سر!'' رابرٹ نے کہا۔ یہ کہہ کر وہ دونوں دوڑتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ کچھ دور آگے جانے کے بعد رابرٹ سانس لینے کے لیے رکا اور بولا۔ ''اب تو ہمیں واقعی شہر جانا ہوگا۔ چلو اس بہانے کچھ پیسے تو ہاتھ آ جائیں گے۔ میرا دل تو کوئی اچھی سی چیز کھانے کو چاہ رہا ہے۔''
''ہم بچے ہوئے پیسوں سے آئس کریم کون خرید سکتے ہیں۔'' سینڈی بولی۔ ''واپسی میں گھوڑے بھی دیکھ لیں گے۔''
انہوں نے وہاں سے گزرتے ہوئے لوکس بیلڈن کے فارم پر نظر ڈالی لیکن دونوں میں سے کسی نے بھی ایک لفظ نہیں کہا۔

☆☆☆

وہ دونوں نائلون کی ڈوری خریدنے کے لیے دکان پر پہنچے تو وہاں بھی سینڈی گھوڑوں کی ہی بات کر رہی تھی۔ دکان دار نے سن لیا اور بولا۔ ''تمہیں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ لوکس بیلڈن کی طرف جانا ٹھیک نہ ہوگا۔ وہ بہت عجیب شخص ہے۔''
رابرٹ نے ڈوری اور بقیہ پیسے لیے اور بولا۔ ''ہم انہیں بالکل تنگ نہیں کریں گے۔ میری بہن صرف ان گھوڑوں کو دیکھنا چاہتی ہے جبکہ یہاں قریب میں کوئی دوسرا فارم بھی نہیں ہے۔''
''ٹھیک ہے پھر اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرو۔'' دکان دار بڑبڑاتے ہوئے بولا۔
آئس کریم کی دکان پر کھڑی ہوئی عورت نے بھی ان کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ انہیں کون دیتے ہوئے بولی۔
''وہ لیڈی کلر کے نام سے مشہور ہے اور وہ لوگوں کا آنا پسند نہیں کرتا۔ کچھ لڑکے وہاں جا کر اس کے گھر پر پتھراؤ کرتے ہیں۔ ایک دفعہ اس کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا تو وہ ان لڑکوں کے پیچھے شاٹ گن لے کر بھاگا تھا۔ شاید یہ وہی گن ہوگی جس سے اس نے ان عورتوں کو قتل کیا تھا۔ تم لوگ اس جگہ سے دور رہو۔ اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے۔''
''کیا اس نے ان عورتوں کو گولی ماری تھی؟'' رابرٹ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔
''خدا ہی بہتر جانتا ہے۔'' وہ عورت بولی۔ ''کہ اس نے ان عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ وہ بالکل پاگل ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ تم آئس کریم کھاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ دوسرے گاہک کی جانب متوجہ ہو گئی۔
''میں نہیں سمجھتا کہ لیڈی کلر سے اس کی کیا مراد تھی۔'' رابرٹ واپس جاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے پورا یقین ہے کہ وہ عورت اس کے لیے غلط لفظ استعمال کر رہی تھی۔''
''یہ ہے وہ سینما۔'' سینڈی نے ایک فلم کے پوسٹر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک جانب اپنا سر گھمایا اور بولی۔ ''یہاں سے جھیل تک پیدل جانے میں کتنا وقت لگے گا؟''
رابرٹ نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر بولا۔ ''تقریباً دس منٹ۔''
وہ اپنا ہونٹ چباتے ہوئے حساب لگانے لگی۔ ''دس منٹ آنے اور دس منٹ جانے کے۔ اگر اس نے ایک گھنٹا بھی اس عورت کے ساتھ گزارا تو اس کے پاس کافی وقت تھا کیونکہ زیادہ تر فلمیں تقریباً دو گھنٹے کی ہوتی ہیں۔''
''تم کس کی بات کر رہی ہو؟''
''لوکس بیلڈن کی۔ ڈیوی نے بتایا تھا کہ اس رات وہ فلم دیکھنے گیا ہوا تھا۔ کیا تم نے اس قصبے میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا سینما دیکھا؟''
رابرٹ نے خالی سڑک پر نگاہ دوڑائی اور بولا۔ ''کیا تم مذاق کر رہی ہو؟''
''یہی وہ سینما ہے جہاں وہ فلم دیکھنے آیا تھا۔ وہ درمیان میں ہی فلم چھوڑ کر چلا گیا اور عورت کو قتل کر کے واپس آ گیا۔ اس طرح اس کے ہاتھوں تین یا چار عورتیں ماری گئیں۔''

رابرٹ نے زوردار قہقہہ لگایا اور اس کے بازو پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''جب میں ڈیڈی کی طرح وکیل بن جاؤں گا تو تمہیں اپنا سراغ رساں رکھ لوں گا۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ اس نے ان عورتوں کو مارا ہوگا؟'' سینڈی نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہوگا اور تمہیں بھی یہ نہیں کہنا چاہیے کہ وہ عورتیں مر چکی ہیں۔ یہاں کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے اس لیے ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ وہ سیاح خاتون بھی طوائف نہیں بلکہ ایک ڈانسر تھی۔''

ان کی آئس کریم ختم ہو چکی تھی۔ اچانک ہی رابرٹ چلتے چلتے رک گیا اور اپنی بہن کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔ ''سنو!''

وہ بھی رک گئی اور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا؟''

''یہ آوازیں کیسی ہیں؟''

وہ دونوں آنکھیں بند کر کے ان آوازوں کو سننے لگے۔ یوں لگا جیسے ہزاروں مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ انہوں نے ایسی آوازیں شہر میں بھی نہیں سنی تھیں۔ جب آنکھیں کھولیں تو ان کی نظر فارم ہاؤس پر گئی جو سڑک کے دوسری جانب پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ رابرٹ نے بے یقینی کے عالم میں دیکھا۔ دونوں کی نظریں آپس میں ملیں اور پھر انہوں نے اس جانب بڑھنا شروع کر دیا۔

''گودام مکان کے پیچھے ہے۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''گھوڑے وہیں ہوں گے۔ ہمیں وہاں تک پہنچنے کے لیے پرائیویٹ پراپرٹی میں داخل ہونا ہوگا۔''

اگر ڈیڈی کو اس منصوبے کا علم ہو جاتا تو وہ یقیناً انہیں ایسا کرنے سے منع کرتے۔ اس لیے رابرٹ نے انہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس معاملے میں قانون کتنا سخت ہے اور بچوں کو بھی کسی کی ذاتی رہائش گاہ میں داخلے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر انہیں کم عمر ہونے کی وجہ سے جیل نہ بھیجا جاتا تب بھی کوئی مشقت ضرور برداشت کرنا پڑتی۔ ڈیڈی کہا کرتے تھے کہ کم سن مجرموں کو کسی ایسے کام پر لگا دیا جاتا ہے جس میں بہت زیادہ مشقت ہو۔ اس کے باوجود رابرٹ نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اس شخص کو دیکھنا چاہ رہا تھا جس نے پورے قصبے کو خوف زدہ کر رکھا تھا۔

سینڈی چلتے چلتے رک گئی اور فارم ہاؤس پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ ''اگر ہم دبے پاؤں مکان کے پاس سے گزرتے چلے جائیں تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔''

''یقیناً۔'' وہ بولا۔ ''ہم ان درختوں کے درمیان سے رینگتے ہوئے آگے بڑھیں گے اور گودام کے عقب میں پہنچ جائیں گے۔ وہاں سے ہمیں اندر کا منظر نظر آ سکے گا اور ہم گھوڑے بھی دیکھ سکیں گے۔''

سینڈی نے اب بھی اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی اور بولی۔ ''اگر اس نے ہمیں پکڑ لیا تو کیا ہوگا؟''

رابرٹ نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ''کچھ نہیں ہوگا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ہمارا پیچھا کرے گا لیکن ہمیں پکڑ نہیں سکتا۔''

''وہ ہم پر گولی چلا سکتا ہے۔'' سینڈی نے ممکنہ خطرے کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں، وہ ایسا کیوں کرے گا۔ ہم اس کے گھر پر پتھراؤ کرنے نہیں جا رہے۔ اس لیے وہ ہم پر گولی نہیں چلائے گا۔''

سینڈی ایک بار پھر اپنا ہونٹ چبانے لگی پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور قدم آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''ٹھیک ہے، دیکھتے ہیں۔''

رابرٹ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ اب انہیں پیٹ کے بل رینگتے ہوئے درختوں کے درمیان سے گودام کی پچھلی طرف جانا تھا کہ اچانک انہیں گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز آئی۔

☆☆☆

سڑک کے دوسری جانب ایک طویل باڑھ نظر آ رہی تھی اور اس کے پیچھے مکان کے برابر میں ایک وسیع و عریض چراگاہ تھی۔ اس کے عین وسط میں ایک شخص پرانی جینز اور ڈینم کی قمیص پہنے کھڑا ہوا تھا۔ اس کی پشت ان دونوں کی جانب تھی۔ اس کے برابر میں ایک بڑا سا شکاری کتا ٹہل رہا تھا اور کچھ فاصلے پر دو گھوڑے آزادانہ دوڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک گھوڑا گہرے بھورے رنگ کا تھا جبکہ دوسری گھوڑی تھی اور اس کا رنگ سفید تھا۔ وہ دونوں دوڑتے ہوئے باڑھ کی دوسری طرف جا رہے تھے۔

سینڈی انہیں دیکھ کر خوشی سے چلائی اور تیزی سے باڑھ کی جانب بڑھی جبکہ رابرٹ قدرے محتاط تھا اور اس کی آنکھیں مسلسل اس شخص کی پشت پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ قد میں اس کے ڈیڈی سے بھی زیادہ تھا حالانکہ وہ بھی چھ فٹ دو انچ کے تھے۔ اس نے کروکٹ انداز میں اپنے سفید

ہوتے بال ترشوار کھے تھے لیکن رابرٹ اس کی عمر کا اندازہ نہ لگا سکا۔ البتہ اسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ انہیں کسی کی پرائیویٹ پراپرٹی میں داخل ہونے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور وہ باڑھ کے باہر سے ہی کھڑے ہو کر گھوڑوں کو دیکھ سکتے تھے۔ یہ کوئی جرم نہیں تھا جس پر انہیں گرفتار کیا جاتا۔

اس شخص نے اپنے ہونٹوں سے ایک مخصوص قسم کی سیٹی بجائی۔ دونوں گھوڑے فوراً ہی پلٹے اور اس جانب دوڑنے لگے جہاں وہ دونوں کھڑے ہوئے تھے۔ رابرٹ نے گھبراہٹ میں قدم پیچھے ہٹائے اور باڑھ سے دور ہٹ گیا لیکن سینڈی نے ریلنگ کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور آگے کی طرف جھک کر اپنا دایاں بازو گھوڑوں کی جانب بڑھا دیا۔ وہ اس منظر سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی۔ گھوڑے اس آدمی کے پاس سے ہوتے ہوئے ان کی جانب بڑھے اور باڑھ کے قریب پہنچ کر ان کی رفتار سست ہو گئی پھر وہ ان سے چند فٹ کے فاصلے پر آ کر رک گئے۔ براؤن گھوڑے نے اپنے سر کو جھکا دیا اور قدم مضبوطی سے زمین پر جما دیے لیکن سفید گھوڑی آگے بڑھتی رہی۔ لگتا تھا کہ ایک لڑکی کو وہاں دیکھ کر اس کی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ وہ نزاکت سے چلتی ہوئی سینڈی کے قریب آئی اور اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو سونگھنے لگی۔

''ہیلو!'' سینڈی نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا پھر اس کا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ ''رابرٹ! دیکھو یہ مجھے پیار کر رہی ہے۔''

رابرٹ آگے بڑھا اور گھوڑی کو دیکھنے لگا جو اپنی زبان سے سینڈی کا ہاتھ چاٹ رہی تھی۔ رابرٹ مسکرایا اور پیار سے اس کی ناک پر ہاتھ پھیرا۔ اچانک ہی ایک مضبوط ہاتھ ان کی جانب بڑھا۔ رابرٹ کی سانس سینے میں ہی اٹک گئی جبکہ سینڈی کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ برآمد ہوئی۔ ان کی نظریں اوپر اٹھیں۔ لوکس بیلڈن کا چہرہ ان کے سامنے تھا۔

وہ اتنا عمر رسیدہ نہیں تھا جیسا کہ ڈیوی نے بتایا تھا۔ وہ تقریباً ڈیڈی کا ہم عمر تھا۔ اس نے کلین شیو کر رکھا تھا اور اس کی آنکھیں گہری بھوری تھیں۔ وہ باڑھ کی دوسری جانب اپنے گھوڑوں کے درمیان کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی اور نہ ہی وہ غصے میں نظر آ رہا تھا۔ رابرٹ کو اس کا چہرہ بے تاثر لگا۔ وہ ڈیڈی کی طرح ہینڈسم نہیں تھا لیکن اس کا شمار بدصورتوں میں بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ محض ایک عام سا شخص تھا۔ رابرٹ نے یہی سب کچھ سوچ کر سکون کا سانس لیا۔

اس شخص نے رابرٹ کو دیکھ کر سر ہلایا پھر وہ سینڈی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''ان دونوں کو ایک ایک ٹکڑا دے دو۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جس پر شکر کے دو ڈلے رکھے ہوئے تھے۔ سینڈی نے بھائی کی طرف دیکھا پھر آگے بڑھ کر کانپتی انگلیوں سے اس کے ہاتھ پر سے وہ ڈلے اٹھا لیے۔

''ان کے نام کیا ہیں؟'' اس نے آدمی کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ اس کی نظریں گھوڑوں پر تھیں۔

''یہ پرنس ہے۔'' وہ بھورے گھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اور دوسری کا نام پرنسس ہے۔''

''ہائے پرنس، ہائے پرنسس۔'' سینڈی مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم بہت خوب صورت ہو۔'' اس نے ایک ٹکڑا دونوں ہتھیلیوں پر رکھا ہوا تھا۔ دونوں گھوڑوں نے انہیں اٹھانے کے لیے اپنے سر نیچے کر دیے۔ وہ آدمی خاموش کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔

رابرٹ نے محسوس کیا کہ کوئی چیز اس کے ہاتھ سے رگڑ کھا رہی ہے۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ شکاری کتا اپنی ناک باڑھ سے نکال کر کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس کے برابر میں بیٹھ گیا اور اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا تا کہ وہ اس کی انگلیوں پر لگی ہوئی آئس کریم چاٹ سکے۔ اس نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ شخص بولا۔

''یہ کنگ ہے۔''

''ہیلو کنگ!'' رابرٹ نے اس کا کان پکڑتے ہوئے کہا۔ کتے نے اس کی جانب اداس آنکھوں سے دیکھا اور رابرٹ سمجھ گیا کہ وہ اتنی خاموشی سے کیوں بیٹھا ہوا ہے اور وہ دو اجنبی چہروں کو دیکھ کر کیوں نہیں بھونکا۔ دراصل وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے دوڑنے اور بھونکنے کے دن گزر چکے تھے۔

اب رابرٹ نے فارم ہاؤس کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہ پرانا ضرور تھا لیکن اس کی ٹھیک ٹھاک دیکھ بھال کی گئی تھی اور دیکھنے سے لگتا تھا کہ حال ہی میں اس پر رنگ و روغن کیا گیا ہے۔ مکان کے پیچھے گودام کا جو کونا نظر آ رہا تھا، اس پر سرخ اور سفید دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ لان کی گھاس ہموار تھی جبکہ درختوں اور جھاڑیوں کی بھی فالتو ٹہنیاں اور شاخیں کاٹ دی گئی تھیں۔ مجموعی طور پر یہ جگہ سرسبز و شاداب نظر آ رہی تھی۔ گھوڑوں اور کتے کی دیکھ بھال بھی بہت اچھے انداز میں کی جا رہی تھی۔ خود وہ شخص بھی دیکھنے میں گھٹیا نظر

نہیں آرہا تھا۔ رابرٹ نے بہت تھوڑے وقت میں یہ سب باتیں بھانپ لیں اور کنگ کے سر پر تھپکی دیتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

''ڈیڈی نے کہا تھا کہ بارہ بجے تک واپس آجانا۔'' اس نے اپنی بہن کو یاد دلایا جو ابھی تک گھوڑوں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ ''ہمیں اب چلنا چاہیے۔''

سینڈی مسکراتے ہوئے اس شخص سے بولی۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ جناب۔''

بیلڈن نے سر ہلایا اور گھوڑوں کو لے کر گودام کی طرف بڑھ گیا۔ کتا بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ رابرٹ ... اور اس کی بہن انہیں جاتا ہوا دیکھتے رہے پھر سڑک پار... کر کے اپنے کیبن کی طرف جانے والے راستے پر ہو لیے۔

''کتنے خوب صورت گھوڑے ہیں۔'' سینڈی نے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ شخص قاتل ہو سکتا ہے۔''

''ہاں۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''وہ بہت دولت مند ہے اور لوگوں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتا۔ اس طرح کے چھوٹے قصبوں میں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں لوگ ایک دوسرے سے بہت جڑے ہوئے ہوتے ہیں اسی لیے وہ اسے پسند نہیں کرتے۔ اسی لیے وہ یہاں کے لوگوں کی نظروں میں معتوب ہے اور وہ اپنی نفرت کا اظہار اس کے گھر پر پتھراؤ کی صورت میں کرتے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ کہیں ڈیوی اور ڈینس بھی ان پتھر مارنے والے لڑکوں میں شامل تو نہیں ہیں۔''

''وہ غیر مہذب ضرور ہیں لیکن دل کے اچھے ہیں۔ میں انہیں پسند کرتی ہوں۔''

''میں بھی مسٹر بیلڈن کو بہت پسند کرتا ہوں۔'' رابرٹ بولا۔ ''لیکن ہمیں دوبارہ ان کو زحمت نہیں دینا چاہیے کیونکہ ہم گھوڑے دیکھ چکے ہیں۔''

''ہاں۔'' سینڈی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''ہاں۔ کتنے پیارے گھوڑے تھے۔''

''وہ تمہارے پیچھے آرہے ہیں۔'' رابرٹ چلایا۔

اس کے ساتھ ہی دونوں نے دوڑ لگا دی۔ رابرٹ نے زوردار قہقہہ لگایا تو سینڈی بری طرح جھینپ گئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گھوڑوں کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ وہ اپنی جھینپ مٹانے کے لیے بولی۔ ''اب رفتار آہستہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ دوڑتے رہو۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ ڈیڈی ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

رابرٹ دوڑتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ڈیڈی کے لیے عدالت میں بیلڈن جیسے شخص کا دفاع کرنا کتنا آسان ہو گا۔ کوئی بھی جیوری لیک ویو میں رہنے والوں کی بکواس پر یقین نہیں کرے گی۔ اسے اور سینڈی کو ایک ہفتہ مزید یہاں گزارنا تھا پھر وہ اپنے اسی بڑے شہر چلے جاتے جہاں کے وہ رہنے والے تھے لیکن آج موسم بہت اچھا تھا اور وہ اپنے دوسرے پروگرام کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور دوڑتے ہوئے جھیل کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

لوکس بیلڈن انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ قہقہے لگاتے ہوئے سڑک پر دوڑتے ہوئے جا رہے تھے۔ لوکس یہ منظر دیکھ کر مسکرایا۔ اس نے گھوڑوں کو گودام میں بند کیا اور ان بچوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ یہاں کے لڑکوں سے بالکل مختلف تھے جو اس کے گھر پر پتھراؤ کرتے اور آوازے کستے تھے۔ وہ دونوں شہر سے آئے ہوئے سیاح لگ رہے تھے جن کی پرورش بڑے اچھے انداز میں ہوئی تھی۔

اس نے گھوڑوں کو چارا اور پانی دیا پھر خود کھانا کھا کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ آج کی رات بہت مناسب رہتی۔ ویسے بھی گزشتہ واردات کو ایک سال ہو گیا تھا اور اس کی انگلیوں میں دوبارہ اینٹھن شروع ہو گئی تھی۔

رابرٹ اور سینڈی اپنے کیبن میں پہنچے تو وہاں ایک بالکل مختلف منظر دیکھنے میں آیا۔ ڈیڈی نے سارا سامان گاڑی میں رکھ دیا تھا اور شاید انہی کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی وہ بولے۔ ''جلدی سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ ہمیں فوراً یہاں سے روانہ ہونا ہے، تمہارا لنچ پیک کر دیا ہے۔ راستے میں کھا لینا۔''

''مگر کیوں؟'' رابرٹ نے احتجاج کیا۔ ''ہمیں تو مزید ایک ہفتہ یہاں رکنا تھا؟''

''اب پروگرام بدل گیا ہے۔'' ڈیڈی نظریں چراتے ہوئے بولے۔ ''مجھے ایک اہم مقدمے کے سلسلے میں کل کورٹ میں پیش ہونا ہے۔ اس لیے ہم ایک دن بھی نہیں رک سکتے۔''

ڈیڈی ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ انہوں نے رابرٹ اور سینڈی کو بیلڈن کے فارم ہاؤس کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ بیلڈن کی شہرت کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ یہاں رکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے کیونکہ اپنے بچوں کو اس عفریت سے بچانا ان کی پہلی ذمے داری تھی۔

چھٹی صدی ہجری میں دو خاندانوں نے بخارا سے ہجرت کی اور برصغیر کا رخ کیا۔ یہ دونوں خاندان سادات کے تھے۔ انہوں نے لاہور میں سکونت اختیار کی پھر معلوم نہیں..... کیوں، دونوں خاندان والے لاہور سے بھی اکتا گئے اور یوپی کے شہر بدایوں میں جا بسے۔ ان میں سے ایک خاندان کے بزرگ خواجہ علی نے اپنے صاحبزادے سید احمد کو دوسرے خاندان کے بزرگ خواجہ عرب کی صاحبزادی زلیخا سے رشتۂ مناکحت سے جکڑ دیا۔ اس طرح یہ دونوں خاندان آپس میں رشتے دار بھی

محبوب الٰہی

ضیا تسنیم بلگرامی

ولیوں کا پیدا ہونے کے لیے گھرانوں کا انتخاب... اور پھر ان کی تربیت اور پرورش کے لیے انسانوں کا انتخاب... اس کے بعد حالات اور تعلیم کا سلسلہ... اگر غور کیا جائے تو یہ تمام مراحل عام انسانوں سے کس قدر مختلف اور دشوار ہوتے ہیں۔ گویا اللہ کے خاص بندوں میں شمار ہونے کے لیے آزمائشیں اور کٹھن مرحلے پہلے سے کاتبِ تقدیر لکھ دیتا ہے اور پھر دیکھتا ہے کون اس کے امتحان پر پورا اترتا ہے وہی اس کا برگزیدہ بندہ کہلائے گا... خواجہ نظام الدین سے کون واقف نہیں... کیا شان ہے آپ کی... تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو کئی نامور اولیا سے ہوتے ہوئے بابا فرید شکر گنج کی خدمت میں پہنچے جنہوں نے عنایات کی بارش کے بعد کہا۔ ”بابا نظام الدین! ہم نے تمہیں ہندوستان کی ولایت دی اور خلافت عطا کی۔“ اور پھر حضرت بختیار کاکی کی دستار اور اپنا عصا بھی عطا فرمایا۔ اللہ کے مقبول بندوں کی یہی تو نشانیاں ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیا کی زندگی کے نشیب و فراز

ہو گئے۔ سید احمد کو بادشاہ نے بدایوں کا قاضی مقرر کر دیا۔

پھر ان دونوں کے ہاں 27 صفر 636 ہجری میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ دادا نے اس بچے کا نام محمد رکھ دیا۔

یہ بچہ اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ باپ اپنے بچے سے اتنی زیادہ محبت کرتا تھا کہ جب وہ اپنے گھر سے باہر ہوتا تو اس کے خیال میں مست و مگن رہتا لیکن یہ بچہ ابھی پانچ ہی سال کا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا اور ماں نے ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو مدرسے میں داخل کرا دیا۔ ان دنوں بدایوں میں جن اساتذہ کا شہرہ تھا ان میں علاء الدین اصولی سرفہرست تھے۔ انہوں نے بچے کو قدوری پڑھائی۔ قدوری پڑھا چکنے کے بعد مولانا اصولی نے ایک تقریب منعقد کی اور اپنے ہم عصر علما و مشائخ کو اس تقریب میں شامل ہونے کی دعوت دی۔

محفلِ تقریب میں آخری سرے پر مولانا اصولی اپنے ہونہار اور سعادت مند شاگرد کے ساتھ بیٹھے تھے اور ان کے سامنے شہر بھر کے علما اور مشائخ جمع تھے۔ مولانا اصولی نے کھڑے ہو کر پہلے تو اپنے شاگرد کی تعریفیں کیں اور حاضرین کو بتایا کہ ان کا شاگرد محمد کتنا ذہین ہے اور سعادت مند بھی۔ اس کے بعد اعلان کیا کہ میں اس کے دستارِ فضیلت باندھنا چاہتا ہوں۔

کئی عالموں نے اس بچے کا امتحان بھی لیا۔ انہوں نے اپنی دانست میں اس بچے سے کئی ایسے مشکل سوالات کیے جن کے جواب اس بچے کے بس کی بات نہیں تھی لیکن ذہین بچے نے ان کے شاندار جواب دے کر ان علما کو خاموش کر دیا۔ علما کے بعد مشائخ کی باری آئی اور وہ بھی بچے کے جوابات سے بہت متاثر ہوئے۔

اس کے بعد مولانا اصولی نے انہیں کتب متداولہ اور علم لغت کا درس دیا۔ آخر انہوں نے ان کی والدہ کے پاس جا کر عرض کیا۔ ”محترمہ! اس بچے کو مجھ سے جو کچھ بھی پڑھنا تھا پڑھ لیا۔ اب اگر اسے مزید تعلیم دلوانی ہے تو آپ کو اس بچے کے ساتھ دہلی جانا پڑے گا۔“

ماں اپنے بیٹے کو مزید پڑھانا چاہتی تھیں، بولیں۔ ”ہاں، میں اپنے بچے کو مزید پڑھانا چاہتی ہوں اور اس کے لیے میں دہلی کا سفر بھی کروں گی بس آپ اتنی مہربانی فرمائیں کہ دہلی کے کسی لائق استاد کا نام بتا دیں۔“

استاد نے جواب دیا۔ ”مولانا شمس الدین دامغانی۔ ان کے فضل و کمال کا کوئی جواب نہیں۔ بادشاہ نے انہیں شمس الملک کا خطاب دے رکھا ہے۔“

اس وقت محمد کی عمر سولہ سال کی تھی۔ ماں انہیں لے کر دہلی چلی گئیں اور کوشش کر کے اپنے بیٹے کو مولانا شمس الدین کے شاگردوں میں داخل کرا دیا۔

مولانا ناغہ کرنے والے شاگردوں سے بہت چڑتے تھے لیکن یہ نیا شاگرد ایسا تھا کہ ناغہ کرتا ہی نہ تھا۔ ایک دن اس نئے شاگرد نے دیکھا کہ مولانا کئی دن غیر حاضر رہنے والے ایک شاگرد سے نہایت طنز اور سادگی سے فرما رہے ہیں۔ ”صاحبزادے! میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا کہ تم کئی دن سے غیر حاضر ہو، مجھے تم میرا قصور بتا دو تاکہ میں پھر وہی قصور کروں اور تم درس میں نہ آسکو۔“

نئے شاگرد نے ڈرتے ڈرتے مولانا سے سوال کیا۔ ”حضرت! یہ آپ کیا فرمایا کرتے ہیں؟ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟“

مولانا نے نہایت شفقت سے جواب دیا۔ ”صاحبزادے! میں بدمذاق اور بے پروا شاگردوں کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ اس لیے یہ چاہتا ہوں کہ جن کو پڑھنے کا شوق نہ ہو میرے حلقۂ درس میں نہ آئیں۔“

انہوں نے مولانا سے حریری کے چالیس مقامات پڑھے۔

دہلی میں ہلالِ طشت دار کی مسجد کے نیچے جو حجرے بنے ہوئے تھے، محمد انہی میں سے ایک میں رہا کرتے تھے۔ ان کے پڑوس میں شیخ نجیب الدین متوکل نامی ایک بزرگ رہتے تھے۔ ان کے توکل اور استغنا کا لوگوں میں بڑا چرچا تھا۔ محمد بھی ان سے بہت متاثر تھے اور اس تاثر نے انہیں متوکل کی صحبت میں پہنچا دیا۔ یہاں پتا چلا کہ متوکل بابا فرید الدین گنج شکر کے بھائی ہیں۔ یہ اپنے بھائی گنج شکر کا ذکر بڑی محبت سے کیا کرتے تھے۔ محمد کو ان کی صحبت میں پہنچنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔

ادھر مولانا شمس الدین کا درس ختم ہوا اور محمد نے علمِ حدیث کی تحصیل کے لیے مولانا کمال الدین کا تلمذ اختیار کیا۔ مولانا کمال الدین نہ صرف جید عالم تھے بلکہ زہد و تقویٰ میں بھی ان کا جواب نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ سلطان بلبن نے ان کے علم و تقویٰ سے متاثر ہو کر اپنے دربار میں بلوایا مگر مولانا نہیں گئے اور کہلا دیا۔ ”میرے پاس نماز کے سوا کوئی چیز نہیں اور آپ اسے بھی مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں۔“

سلطان بلبن اس جواب سے مرعوب ہو گیا اور اس نے پھر کبھی نہ بلایا۔
محمد نے مولانا کمال الدین سے علمِ حدیث حاصل کیا اور اس میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ ادھر سے فارغ ہونے کے بعد دوسرے مشاہیر سے رجوع کیا اور علمِ ہیئت، فقہ، علمِ تفسیر، اصول اور ہندسہ میں مشق بہم پہنچائی۔
محمد کا متوکل کی صحبت میں آنا جانا جاری رہا اور یہاں ہر روز ہی بابا فرید الدین گنج شکر کا ذکر ہوتا تھا۔ آخر ایک دن یہ بے قابو ہو گئے اور متوکل سے کہا۔ ''میں بابا فرید سے شرفِ ملاقات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''
شیخ متوکل نے جواب دیا۔ ''اس کے لیے تمہیں اجودھن پاک کا سفر کرنا ہوگا۔''
محمد نے کہا۔ ''میں اجودھن پاک تو کیا، بابا فرید کی خاطر سات سمندر پار بھی جا سکتا ہوں۔''
شیخ متوکل کسی سوچ میں پڑ گئے، پھر بولے۔ ''بسم اللہ، پھر دیر کیوں؟ یہ تامل کیسا؟''
محمد نے بابا فرید کے لیے اپنے دل میں ایک کسک سی محسوس کی، وہ اجودھن پاک جانے کے لیے بے چین رہنے لگے۔ رات کو سوتے تو خواب بھی بابا فرید ہی کا دیکھتے۔ ایک دن علی الصباح مسجد کے منارے سے موذن کی آواز سنی تو تلملا گئے۔ آپ اذان بڑی توجہ سے سنتے رہے۔ جب اذان ختم ہوگئی تو موذن نے قرآن پاک کی یہ آیت نہایت پُرسوز لہجے میں پڑھی۔
ترجمہ: کیا اس کا وقت نہیں آیا کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں، ان کے دل ذکر الٰہی سے جھک جائیں۔
اس آیت نے آپ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ فوراً مسجد تشریف لے گئے۔ نمازِ فجر ادا کی اور ادھر ادھر شیخ متوکل کو تلاش کرنے لگے۔ وہ کہیں نظر نہ آئے تو سیدھے ان کے گھر پہنچے۔ شیخ متوکل رات سے بیمار پڑے ہوئے تھے۔ محمد نے جاتے ہی سوال کیا۔ ''حضرت! آج آپ مسجد تشریف نہیں لائے؟''
بابا متوکل نے جواب دیا۔ ''ہاں، آج میری طبیعت خراب تھی۔''
محمد کچھ دیر کھڑے بابا متوکل کی صورت دیکھتے رہے۔ بابا متوکل نے پوچھا۔ ''تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ کیا کسی کا انتظار ہے؟''
انہوں نے جواب دیا۔ ''میں آپ کی اجازت کا منتظر ہوں۔''
شیخ متوکل نے فرمایا۔ ''میری طرف سے اجازت ہے۔ جاؤ اور اسی وقت جاؤ۔''
محمد نے نہ تو زادِ سفر لیا، نہ کچھ اور شیخ متوکل کی صحبت سے اٹھے اور پڑاؤ کی طرف روانہ ہو گئے۔ پڑاؤ پر گئے وہاں کئی قافلے جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ان میں ایک قافلہ ملتان کی طرف جا رہا تھا۔ محمد نے اس قافلے میں شامل ہو کر سفر شروع کر دیا۔
جب یہ اجودھن پہنچے تو شوقِ دید اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا...... بدھ کا دن تھا۔ چھ رجب چھ سو چھپن ہجری۔ یہ شیخ فرید الدین گنج شکر کے روبرو پہنچے تو انہوں نے دیکھتے ہی فارسی کا ایک شعر پڑھا۔

اے آتشِ فراقت دل ہا کباب کردہ
سیلابِ اشتیاقت جاں ہا خراب کردہ

پھر فرمایا۔ ''اے نظام احمد بدایونی! میں تیرا انتظار ہی کر رہا تھا۔''
انہوں نے شرما کر عرض کیا۔ ''بابا! میرا نام محمد ہے۔''
بابا فرید نے جواب دیا۔ ''اس نام کی حرمت کر۔ تو نظام بدایونی ہے۔ نظام الدین بدایونی۔ میں اور اللہ کی مخلوق تجھے نظام نام سے پہچانے گی۔''
اس کے بعد محمد ابن سید احمد نظام الدین اور بعد میں نظام الدین اولیا اور محبوب الٰہی ہو گئے۔
بابا فرید یہ فرما کر اٹھے اور اپنی کلاہ چہارتر کی نظام الدین کے سر پر رکھ دی اور خرقہ خاص اور نعلین چوبیں (غالباً کھڑاؤں) بھی عطا فرما دیں۔ یہ چیزیں دے کر فرمایا۔ ''نظام! میں نعمتِ سجادہ اور ولایت ہند کسی کو دینا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں کئی نام میرے ذہن میں تھے مگر جب مجھے معلوم ہوا کہ تم راستے میں ہو اور میرے پاس آ رہے ہو، میں رک گیا، پھر ہاتفِ غیبی نے مجھے مطلع کیا... فرید! ٹھہر جاؤ، نظام بدایونی آ رہا ہے یہ ولایت اسے دینا۔''
نظام الدین پر سکتہ طاری ہو چکا تھا۔ انہوں نے کوشش کی کہ اپنے اشتیاق کا حال بابا سے عرض کریں مگر قوتِ گویائی جواب دے گئی۔ بابا فرید کا دبدبہ قوتِ گویائی پر غالب آ گیا۔ بابا فرید نے خود ہی فرما دیا۔ ''بابا نظام! تم جتنا اشتیاق ظاہر

کرتے ہو یہ اس سے کہیں زیادہ ہے اس لیے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

اس کے بعد بابا فرید نے نظام الدین کو اپنے پاس ہی رکھ لیا اور ان کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہو گئے۔ بابا فرید کی مالی حالت بڑی خراب تھی اور خانقاہ میں عسرت اور تنگدستی کا راج تھا۔ بابا کے مریدوں میں سے چند نے اپنے ذمے کوئی نہ کوئی خدمت لے رکھی تھی۔ مولانا بدرالدین لنگر خانے کے لیے جنگلوں سے لکڑیاں کاٹ کر لایا کرتے تھے۔ شیخ جمال الدین بھی جنگل سے لکڑیاں لیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی کھانا بھی پکا دیا کرتے تھے۔ حسام الدین کابلی کے سپرد پانی کی ذمے داری تھی۔ برتنوں کی صفائی بھی انہی کے ذمے تھی۔ نظام الدین کے سپرد سبزی پکانے کا کام کر دیا گیا۔

ایک دن خواجہ نظام الدین سب کے لیے سبزی پکانے کھڑے ہوئے تو پتا چلا کہ نمک تو ہے ہی نہیں فکر مند ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ پیسے بھی پاس نہیں تھے۔ بابا فرید سے کہنے میں شرم محسوس کر رہے تھے۔ قریب ہی بنیے کی دکان تھی۔ نظام الدین اس کی دکان پر گئے اور نمک ادھار لے لیا۔ کھانا پک گیا سب کے لیے نکالا گیا۔ مولانا بدرالدین اسحاق، شیخ جمال الدین ہانسوی اور خواجہ نظام الدین تینوں ایک ہی پیالے میں کھا رہے تھے۔ بابا فرید نے پیالے میں ہاتھ ڈالا تو آپ نے اس میں گرانی سی محسوس کی اور آپ سے لقمہ اٹھ نہیں سکا، فرمایا۔ ”ازیں بوئے اسراف می آید (اس میں سے اسراف کی بو آتی ہے)“

خواجہ نظام الدین سکتے میں آ گئے۔ بابا فرید نے پوچھا۔ ”نظام! یہ نمک کہاں سے آیا تھا؟“

خواجہ نظام پر بابا فرید کے سوال سے لرزہ طاری ہو گیا، سہم کر جواب دیا۔ ”ادھار لیا تھا۔“

بابا فرید نے فرمایا۔ ”درویش فاقے سے مرجائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنے نفس کی خواہش پوری کرنے کے لیے کسی سے قرض لے۔ توکل اور قرض میں زمین، آسمان کا فرق ہے۔ یاد رکھو اگر مقروض درویش کو اچانک موت آ جائے تو قیامت کے دن قرض کے بوجھ سے اس کی گردن جھکی رہے گی۔“

اس کے بعد آپ نے سبزی سے ہاتھ کھینچ لیا اور اسے غریبوں میں تقسیم کر دیا۔

خواجہ نظام اپنی اس کوتاہی پر اتنے نادم ہوئے کہ تنہائی میں جا کر آنسو بہاتے رہے اور دل میں یہ عہد کر لیا کہ اب وہ کبھی بھی کسی سے قرض نہیں لیں گے۔ بابا فرید اچانک ان کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت ان کے ہاتھ میں وہ کملی بھی تھی جس پر وہ بیٹھتے تھے۔ کملی خواجہ صاحب کو دے دی اور فرمایا۔ ”نظام! انشاء اللہ آئندہ تمہیں کبھی قرض کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“

بابا فرید نے انہیں اپنے پاس تقریباً ساڑھے سات ماہ رکھا۔ اس دوران ان کی شاندار تربیت فرمائی۔ ایک دن بابا فرید نے فرطِ جوش میں فرمایا۔ ”خواجہ نظام! جو چاہو مانگ لو۔“

خواجہ نظام نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں استقامت کا طالب ہوں۔“

بابا فرید نے فرمایا۔ ”دیا۔“ پھر فرمایا۔ ”اپنا منہ کھولو۔“

خواجہ نظام نے منہ کھول دیا۔ بابا فرید نے اپنا لعابِ دہن ان کے ہونٹوں سے مس کر دیا۔ فرمایا۔ ”تم کلام پاک حفظ کرو گے؟“

خواجہ نظام نے وعدہ کیا۔ ”ضرور حفظ کروں گا۔“

بابا فرید نے مزید فرمایا۔ ”خواجہ نظام! اللہ نے تمہیں دنیا و دین دونوں ہی دیے ہیں یہاں سب موجود ہے لہٰذا تم ہندوستان کا ملک لو۔“ پھر خلافت عطا کر کے فرمایا۔ ”خواجہ نظام! اللہ تعالیٰ نے تمہیں علم، عقل اور عشق بخشا ہے اور جس میں یہ تینوں صفتیں موجود ہوں، وہی خلافت کا حق دار ہے اور سنو، خوب غور سے سنو۔ قرض سے بچنا اور اگر کسی مجبوری سے قرض لینا ہی پڑ جائے تو اسے جلد لوٹا دینا۔ اپنے دشمنوں کو ہر حال میں خوش رکھنے کی کوشش کرنا۔ انہیں دکھ نہ دینا اور نہ ہی انہیں ناراض کرنا۔“

یہ دور بیع الاول 656 ہجری کا ذکر ہے۔ بابا فرید کی صحبت میں اہلِ صفا موجود تھے، ان میں خواجہ نظام الدین بھی شامل تھے۔ بابا فرید نے ان سب کی موجودگی میں فرمایا۔ ”بابا نظام الدین! ہم نے تمہیں ہندوستان کی ولایت دی اور خلافت عطا کی۔“

خواجہ نظام الدین نے سر جھکا لیا اور پھر زمیں بوس ہو گئے۔

بابا فرید نے حکم دیا۔ ”بابا نظام! سر اوپر اٹھاؤ۔“

خواجہ نظام الدین نے جیسے ہی سر اٹھایا، بابا فرید نے اپنی دستار اتار کر ان کے سر پر رکھ دی، فرمایا۔ ”بابا نظام الدین

یہ دستار حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی ہے۔" پھر اپنا عصا بھی دے دیا اور اپنے ہاتھ سے خرقہ پہنایا اور فرمایا۔ "بابا دوگانہ ادا کرو۔"

خواجہ نظام الدین قبلے کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ بابا فرید نے ان کا ہاتھ پکڑ کر آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ "بابا! میں نے تمہیں خدا کے سپرد کیا۔"

اس کے بعد انہیں دہلی واپس جانے کی اجازت مل گئی۔

خواجہ نظام الدین نے دہلی کا سفر اختیار کیا۔ دہلی پہنچ کر وہ اپنے ایک عزیز کے پاس قیام پذیر ہوئے۔ آپ نے اپنے اس عزیز سے ایک کتاب مستعار لے رکھی تھی مگر یہ کتاب گم ہو گئی تھی۔ آپ نے اپنے عزیز سے کہا۔ "افسوس کہ آپ کی کتاب مجھ سے گم ہو چکی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کتاب کو کسی سے حاصل کر کے نقل کر دوں۔"

عزیز نے شرمندگی سے جواب دیا۔ "نہیں، ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اس کو معاف کر دیا۔"

آپ نے اپنے اس عزیز کا شکریہ ادا کیا۔

پھر آپ کو یاد آیا کہ انہوں نے ایک بزاز سے ادھار کپڑا لے رکھا ہے۔ آپ سیدھے اس بزاز کے پاس پہنچے۔ اس وقت آپ کے پاس کچھ رقم موجود تھی۔ آپ نے بزاز سے فرمایا۔ "بھائی! میں تمہارا مقروض ہوں، اس وقت میرے پاس کچھ رقم موجود ہے، اسے قبول فرما کر مجھے شکر گزاری کا موقع دیجیے۔"

بزاز نے رقم لینے سے انکار کر دیا۔ آپ نے اصرار کیا، فرمایا۔ "تمہیں مجھ سے یہ رقم لینی ہی پڑے گی۔"

جب آپ نے بہت زیادہ اصرار کیا تو بزاز نے کہا۔ "حضرت، میں ایک شرط پر یہ رقم لوں گا۔"

آپ نے فرمایا۔ "کون سی شرط؟"

بزاز نے جواب دیا۔ "اگر میں آپ سے یہ رقم لوں گا تو آپ بقیہ رقم کی واپسی پر مصر نہیں ہوں گے۔"

خواجہ نظام الدین نے فرمایا۔ "یہ کس طرح ممکن ہے۔ میں ادھار کی رقم تو بہر حال ادا کروں گا۔"

بزاز نے عرض کیا۔ "تب پھر میں یہ رقم بھی نہیں لوں گا۔"

خواجہ نظام الدین نے بڑے تحمل سے کہا۔ "بھائی! اگر تو اتنا ہی ضدی ہے تو میں بھی خاموش ہوا جاتا ہوں۔"

بزاز نے تھوڑی سی رقم لے کر انہیں معاف کر دیا۔ آپ نے بزاز کا شکریہ ادا کیا۔

آپ نے قرآن پاک حفظ کرنا شروع کر دیا۔ آپ کا قیام شہری آبادی کے بیچ میں تھا۔ لوگوں نے حاضریاں دینا شروع کر دیں اور اس میں اتنا زیادہ اضافہ ہو گیا کہ آپ کی عبادت و ریاضت میں خلل پڑنے لگا۔ آپ نے ان لوگوں سے دور رہنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب قرآن پاک کو حفظ کرنے کا وقت آتا، آپ جنگل کی طرف چلے جاتے۔

آپ قرآن پاک کی چند آیتیں حفظ کرنے کے بعد جنگل سے شہر کی طرف جانے ہی والے تھے کہ ایک درویش نے آپ کا راستہ روک لیا، پوچھا۔ "نظام الدین! کہاں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "شہر واپس جا رہا ہوں۔"

درویش نے کہا۔ "بابا! شہر میں فسق و فجور کا زور ہے، اس حال میں شہر میں رہ کر کیا کرو گے؟"

آپ نے پوچھا۔ "پھر میں کیا کروں؟"

درویش نے کہا۔ "میں کیا جانوں کہ تم کیا کرو۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ شہر میں رہنے سے ایمان خطرے میں رہتا ہے۔"

آپ اس وقت تو شہر چلے گئے لیکن درویش کی باتوں پر مسلسل غور کرتے رہے، آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ شہر میں رہنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ آپ نے اسی وقت شہر چھوڑ دیا اور شہر کے باہر موضع غیاث پور چلے گئے۔ اس کے پاس ہی جمنا بہہ رہی تھی۔ آپ نے اپنے درویش ساتھیوں کی مدد سے چند جھونپڑیاں بنائیں اور ان میں رہنے لگے۔

آپ کی والدہ بھی آپ کے ساتھ ہی رہ رہی تھیں۔ معاشی حالات بہت خراب تھے۔ کئی کئی دن فاقے سے گزر جاتے۔ ایک دن کسی ارادت مند نے آپ کی والدہ سے پوچھا۔ "اس وقت گھر میں کچھ کھانے کے لیے ہے یا نہیں؟"

والدہ نے جواب دیا۔ "آج ہم اللہ کے مہمان ہیں۔"

ماں کا یہ فقرہ آپ کو بہت پسند آیا اور جس دن گھر میں آسودگی پائی جاتی، آپ افسوس کرتے کہ آج میری ماں یہ پُرلطف فقرہ نہیں کہہ سکیں گی کہ آج ہم اللہ کے مہمان ہیں۔

آپ کی عسرت اور تنگ دستی کی خبریں مشہور ہونے لگیں۔ سلطان جلال الدین خلجی آپ کے ارادت مندوں میں سے تھا۔ جب اس نے یہ خبر سنی تو آپ کی خدمت میں کہلا بھیجا۔ ''اگر حضور اجازت دیں تو خدمت گزاروں کی بسر اوقات کے لیے چند گاؤں آپ کی نذر کردوں۔''

اس وقت جو چند درویش آپ کے پاس موجود تھے، آپ نے ان کی طرف دیکھ کر دریافت فرمایا۔ ''بادشاہ کی اس پیشکش کا آپ کے پاس کیا جواب ہے؟''

درویشوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا اور آخر کار ان سب کی طرف سے ایک نے جواب دیا۔ ''حضرت! موجودہ حالات میں تو ہم آپ کے ہاں کبھی کبھی روٹی کھالیتے ہیں لیکن اگر آپ نے بادشاہ کے یہ گاؤں قبول کرلیے تو ہم سب آپ کے ہاں کا پانی پینا بھی گوارا نہ کریں گے۔''

آپ کو درویشوں کا یہ جواب بہت پسند آیا اور سلطان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔

آپ کے ساتھ جو درویش رہتے تھے ان میں شیخ برہان الدین غریب اور شیخ کمال الدین یعقوب جیسے عظیم بزرگ بھی شامل تھے۔ فاقوں نے ان کا حال بھی برا کر رکھا تھا۔ ان پر ایک ایسا وقت بھی آگیا کہ انہیں چار دن تک فاقے سے رہنا پڑا۔ ان کے پڑوس میں ایک ایسی خاتون بھی رہ رہی تھیں جو خواجہ نظام الدین سے بیعت تھیں' جب ان خاتون کو درویشوں کے فاقے کا علم ہوا تو کچھ آٹا ان کی خدمت میں بھجوا دیا۔

شیخ کمال الدین یعقوب نے یہ آٹا مٹی کے ایک برتن میں ڈال کر آگ پر رکھ دیا۔ اتنے میں درویشوں کے لباس میں ایک مسافر وارد ہوا اور ان سے کھانا مانگا۔ خواجہ نظام الدین پاس ہی موجود تھے۔ انہوں نے برتن اٹھا کر درویش کے سامنے رکھ دیا۔ کھانا بہت گرم تھا۔ درویش نے گرم گرم لقمے ہی منہ میں ڈال لیے اور پھر برتن کو زمین پر پٹخ دیا۔ خواجہ نظام الدین اور دوسرے درویش یہ منظر دیکھتے رہ گئے۔

ایک درویش نے پوچھا۔ ''یہ آپ نے کیا کیا؟''

درویش نے جواب دیا۔ ''شیخ فریدالدین گنج شکر نعمت باطن شیخ نظام الدین اولیا ارزانی داشت ومن دیگ فقر ظاہری او بشکستم حالا سلطان ظاہری و باطنی شدی (شیخ فریدالدین گنج شکر نے تمہیں نعمتِ باطنی دی اور ہم نے تمہارا فاقہ توڑا)

کہتے ہیں اس کے بعد ان کی معاشی حالت بالکل بدل گئی۔ عسرت کا دور جاتا رہا۔ خوشحالی نے ڈیرہ ڈالا۔

☆☆☆

آپ کو مال و زر کی کوئی کمی نہ رہی، لنگر جاری کر دیا گیا۔ امرا آپ کی خدمت میں نذرانے پیش کرتے اور آپ انہیں مسترد فرما دیتے۔

آپ اپنے مریدوں اور ارادت مندوں کو نصیحتیں فرما رہے تھے کہ کسی نے آپ کو مطلع کیا کہ ایک امیر باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔

آپ نے فرمایا۔ ''حاضر کیا جائے۔''

اس امیر کو آپ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ امیر کے پیچھے پیچھے اس کا خدمت گار بھی تھا۔ خدمت گار نے ایک پوٹلی کاندھے پر رکھی ہوئی تھی۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی خدمت گار کو حکم دیا کہ پوٹلی خواجہ نظام الدین کے قدموں میں ڈال دی جائے۔

حکم کی تعمیل ہوئی اور خدمت گار نے آپ کے قدموں میں تنکوں (اس عہد کے سکے) کا ڈھیر لگا دیا۔

آپ نے امیر سے پوچھا۔ ''کیا تو اسی لیے میرے پاس آیا ہے؟''

امیر نے جواب دیا۔ ''اس میں کیا شک! میں یہ نذرانہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''لیکن مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں، انہیں واپس لے جا۔''

امیر نے عاجزانہ گزارش کی۔ ''حضرت! میری اس حقیر نذر کو قبول فرمالیں، میں اسے اپنی سعادت سمجھوں گا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں اسے اس لیے قبول نہیں کر رہا ہوں کہ کل یہ تیرے کام آئے گا۔ میرے پاس اور مال ہے۔'' پھر آپ نے اس سے فرمایا۔ ''ذرا اپنی بائیں سمت تو دیکھ۔''

امیر نے اپنے بائیں جانب جو دیکھا تو وہاں اشرفیوں کا ڈھیر نظر آیا۔ وہ آپ کے قدموں میں گر گیا اور اپنا نذرانہ

واپس لے گیا۔

دور دور سے لوگ آرہے تھے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔ انہی دنوں اٹاوہ کے قصبے پٹیالی کے ایک امیر سیف الدین محمود نے اپنے دونوں بیٹوں کا ہاتھ پکڑا اور خواجہ نظام الدین کی بارگاہ میں پہنچ گیا۔ امیر اپنے دونوں بیٹوں کو خواجہ نظام الدین کی مریدی میں دینا چاہتا تھا لیکن امیر کا چھوٹا بیٹا اس پر تیار نہیں تھا۔ جب امیر خواجہ نظام الدین کے دروازے پر پہنچ گیا تو چھوٹے بیٹے نے اپنے باپ سے دریافت کیا۔ ''باوا جان! آپ ہمیں یہاں کیوں لائے ہیں؟''

باپ نے جواب دیا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تیرے بڑے بھائی کو حضرت نظام الدین کی بیعت میں دے دوں۔''

چھوٹے بیٹے نے عرض کیا۔ ''تب پھر آپ دونوں اندر تشریف لے جائیں۔ میں باہر آپ دونوں کا انتظار کروں گا۔''

باپ نے اندر چلنے پر اصرار کیا۔ ''تو بھی اندر چل، آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔''

لیکن چھوٹا بیٹا اندر نہیں گیا۔ جب وہ دونوں اندر چلے گئے تو چھوٹے بیٹے نے بیٹھے بیٹھے دو شعر موزوں کیے اور اپنے دل میں کہا کہ اگر خواجہ نظام الدین کامل ہیں تو اپنے نورِ باطن سے دونوں شعروں کا حال معلوم کرلیں گے اور میرے دونوں شعروں کا جواب شعروں سے دے کر مجھے طلب فرمائیں گے پھر میں اندر جا کر بیعت کرلوں گا لیکن اگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو میں اپنے باپ اور بھائی کے ساتھ پٹیالی واپس چلا جاؤں گا۔

چھوٹے بیٹے نے درج ذیل شعر موزوں کیے۔

تو آں شاہے کہ بر ایوانِ قصرت
کبوتر گر نشیند باز گردد
غریبے مستمندے بر درآمد
بیاید اندروں یا باز گردد

(تو ایسا بادشاہ ہے کہ اگر تیرے محل کے کنگورے پر کبوتر بیٹھے تو وہ تیری برکت سے باز بن جائے۔ ایک غریب حاجت مند تیرے دروازے پر آیا ہے۔ وہ اندر آجائے یا واپس چلا جائے)

ابھی یہ شعر موزوں کر کے بیٹھے ہی تھے کہ اندر سے ایک شخص آیا اور کہا۔ ''صاحبزادے! مجھے میرے مرشد نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ باہر ایک ترک زادہ بیٹھا ہے اسے میرے دو شعر سنا کر واپس آجاؤ۔'' اس کے بعد اس نے دونوں شعر سنا دیے۔

بیاید اندروں مردِ حقیقت
کہ باما یک نفس ہم راز گردد
اگر ابلہ بود آں مردِ ناداں
ازاں راہے کہ آمد، باز گردد

(حقیقت کے میدان کا مرد اندر چلا آئے تا کہ ہمارے ساتھ کچھ دیر ہمراز بن جائے۔ اگر وہ آنے والا نادان اور ناسمجھ ہے تو جس راستے سے یہاں آیا ہے اسی راستے سے واپس چلا جائے)

امیر کا چھوٹا بیٹا دیوانہ وار اپنی جگہ سے اٹھا اور اندر داخل ہو گیا۔ خواجہ نے اسے نہایت محبت بھری نظروں سے مسکرا مسکرا کر دیکھا۔ یہ آپ کے قدموں میں گر گیا۔ آپ نے فرمایا۔ ''آجا آجا اے مردِ حقیقت اور ذرا سی دیر کے لیے میرا ہمراز بن جا۔''

سامنے امیر سیف الدین اور ان کا بڑا بیٹا اس عجیب منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

شاعر بیٹے نے عاجزی سے درخواست کی۔ ''حضور! میں شرفِ بیعت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں تیار ہوں۔''

آپ نے اس شاعر کو اسی وقت بیعت فرما لیا، بعد میں یہ شاعر جمیع اوصاف قرار پایا اور دنیا آج بھی اسے امیر خسرو کے نام سے جانتی ہے۔

☆☆☆

جب سلطان جلال الدین خلجی کو قتل کر کے علاء الدین خلجی برصغیر کا بادشاہ بنا تو اس نے بھی خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی

سے اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا۔ بادشاہ کی خواہش تھی کہ آپ ایک بار اس کے پاس حاضر ہوجائیں تو یہ اس کی خوش قسمتی ہوگی مگر آپ اس پر بھی تیار نہ ہوئے۔
ایک دن بادشاہ کا ایک آدمی آپ کے پاس آیا اور عرض کیا۔ ''حضرت! بادشاہ نے فرمایا ہے کہ حضور کم از کم ایک بار تو دربار میں حاضر ہوجائیں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''جا اپنے بادشاہ سے کہہ دے کہ میں ایک گوشے میں پڑا ہوں اور تیرا کچھ بھی نہیں بگاڑ رہا۔ میں یہاں سے بادشاہ اور تمام مسلمانوں کے لیے دعائے خیر کرتا رہتا ہوں اگر بادشاہ نے میری حاضری پر اصرار کیا تو میں یہاں سے کہیں اور چلا جاؤں گا۔''
بادشاہ کا آدمی واپس گیا اور آپ کے جواب سے بادشاہ کو مطلع کر دیا۔
بادشاہ نے کہا۔ ''تو دوبارہ ان کی خدمت میں جا اور ان سے کہہ دے کہ اگر وہ خود تشریف نہیں لاتے تو نہ لائیں' میں خود ہی آپ کے دربار میں حاضر ہوجاؤں گا۔''
جب بادشاہ کا یہ پیغام آپ تک پہنچا تو آپ نے جواب میں کہلا دیا۔ ''اے شخص' بادشاہ سے کہہ دے کہ وہ میرے پاس آنے کی زحمت نہ کرے۔ میں یہیں سے بادشاہ کے لیے دعا گو ہوں۔ بادشاہ سے کہہ دے کہ غیب کی دعا زیادہ پُراثر ہوتی ہے اور بادشاہ کو یہ بات بھی بتا دے کہ فقیر کے مکان کے دو دروازے ہیں۔ بادشاہ ایک دروازے سے داخل ہوگا' فقیر دوسرے دروازے سے باہر نکل جائے گا۔''
بادشاہ آپ کے اس جواب سے ناراض نہیں ہوا۔ خاموش ہوگیا اور جب تک زندہ رہا اس کوشش میں رہا کہ محبوب الٰہی اگر شرفِ ملاقات نہیں بخشتے تو اس کے نذرانے ہی قبول فرمالیں مگر آپ نے اس کے نذرانے بھی قبول نہیں فرمائے۔
آپ کے مقبول ترین مریدوں میں سید محمد امام نامی ایک بزرگ بھی تھے، جو لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے وہ ان کا سہارا لیتے۔ ایک دن ایک پریشان حال اور حواس باختہ شخص آپ کے در پر آیا اور سید محمد امام سے عرض کیا۔ ''جناب! میں اسی وقت پیرو مرشد سے ملنا چاہتا ہوں۔''
سید محمد امام نے پوچھا۔ ''کسی غرض سے یا یونہی؟''
اس شخص نے جواب دیا۔ ''جناب میں ایک غرض لے کر حاضر ہوا ہوں۔''
سید محمد نے اس شخص کو اندر پہنچا دیا۔ آپ نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تو میرے پاس کیوں آیا ہے؟''
اس شخص نے کہا۔ ''حضور! میری جاگیر کی سند گم ہوگئی ہے۔ میں نے بادشاہ کے اہل کاروں سے اس کی نقل مانگی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ اب آپ ہی فرمائیں میں کیا کروں؟''
آپ نے مسکرا کر پوچھا۔ ''پھر میں کیا کروں' یہ معاملہ تو بادشاہ اور اس کے اہلکاروں سے تعلق رکھتا ہے۔''
اس شخص نے جواب دیا۔ ''حضرت! آپ ہی کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ دعا تو کر سکتے ہیں۔''
آپ بہت خوش تھے از راہِ مذاق فرمایا۔ ''میں خالی خولی دعا نہیں کرتا، اگر تو مجھے گرما گرم حلوا کھلا دے تو میں تیرے لیے ضرور دعا کروں گا۔''
غرض مند باؤلے نے فوراً جواب دیا۔ ''حضرت! میں ابھی لایا، آپ کے لیے حلوا۔''
یہ شخص بھاگا بھاگا حلوائی کی دکان پر پہنچا اور آپ کے لیے حلوا خریدا۔ حلوائی نے حلوے کے لیے کاغذ جو اٹھایا تو اس شخص کی اس پر نظر پڑ گئی۔ یہ اس کی جاگیر کی سند تھی۔ اس نے کہا۔ ''بھائی یہ کاغذ مجھے دے دو اور حلوا کسی دوسرے کاغذ میں دے دو۔''
حلوائی نے یہ کاغذ اس شخص کو دے دیا اور حلوا کسی اور کاغذ میں باندھ دیا۔
اس شخص نے حلوا تو آپ کی خدمت میں پیش کر دیا اور جاگیر کی سند کی بابت کہا۔ ''حضرت! میری سند مجھے مل گئی' اس وقت میں بہت خوش ہوں۔''
آپ نے تجاہل عارفانہ سے فرمایا۔ ''سند؟ یہ کہاں چلی گئی تھی؟''
اس شخص نے جواب دیا۔ ''میں نے جب حلوائی سے حلوا خریدا تو میری سند ردی کاغذات میں پڑی دکھائی دی چنانچہ میں نے حلوائی سے اپنی سند مانگ لی۔''

آپ نے پوچھا۔ ''حلوا، کہاں ہے؟ میرا حلوا؟''
اس نے حلوا آپ کے سامنے رکھ دیا، کہا۔ ''حاضر ہے تناول فرمائیں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''میں حلوا کیا کھاؤں گا اسے اپنے گھر لے جا اور حضرت شیخ العالم کی نیاز دے کر بچوں میں تقسیم کردے۔''
وہ شخص خوش خوش اپنے گھر چلا گیا اور ہمیشہ کے لیے آپ کا مرید ہو گیا۔
ان دنوں علاء الدین خلجی کا نامور سپہ سالار ملک کافور دکن کی مہمات میں الجھا ہوا تھا۔ دکن کی دیوگڑھ ریاست کو تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔ راجا کا خاندان تتر بتر ہو چکا تھا۔ ریاست کا راج کمار مہندر ہردیو تباہ حال دہلی پہنچا، اتفاق سے اس کی ملاقات امیر خسرو سے ہو گئی۔ امیر خسرو دہلی دربار سے وابستہ ہو چکے تھے۔ خسرو نے اس آوارہ وطن کو اپنا مہمان بنا لیا۔
مہندر ہردیو نے خواجہ نظام الدین کا شہرہ سنا تھا اور وہ ان سے ملاقات کا خواہش مند تھا۔ خسرو نے اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ کسی دن اپنے پیرو مرشد سے ضرور ملوا دیں گے۔
رات کو دیر تک خسرو اور مہندر ہردیو میں باتیں ہوتی رہیں۔ جب دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو دو تہائی رات گزر چکی تھی۔ خسرو راجکمار کو چھوڑ کر اپنی خواب گاہ میں چلے گئے اور مہندر ہردیو اپنے بستر پر۔ راج کمار کو اتنی گہری نیند آئی کہ دیر تک سوتا رہا۔ دن چڑھے بیدار ہوا تو خسرو کے نوکروں نے بتایا کہ خسرو دربار جا چکے ہیں کیونکہ وہاں کوئی جشن ہو رہا ہے۔
مہندر ہردیو کے رشتے دار ایک دوسری جگہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ راجکمار نے سوچا اب خسرو سے ملاقات مشکل ہے اس لیے اپنی قیام گاہ پر چلنا چاہیے۔
مہندر ہردیو اپنی قیام گاہ جاتے ہوئے اس بازار سے گزرا جہاں بخارا، ترکستان اور ایران کا سامان بکتا تھا۔ اس بازار میں کپڑے، پوشتیں، کمبل، قالین، ڈھالیں، تلواریں، خنجر اور تیر کمانوں کی دکانیں تھیں۔ مہندر ہردیو ایک ترک کی دکان پر کھڑا ہو گیا۔ یہاں خنجر، تلواریں اور ڈھالیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس دکان کا ملازم ہندوستانی تھا۔
مہندر ہردیو نے ہندوستانی ملازم سے باتیں شروع کر دیں۔ ملازم نے پوچھا۔ ''تم کہاں سے آئے ہو اور کون ہو؟''
راجکمار نے اپنا تعارف کرایا اور کہا۔ ''دولت اور ریاست آنی جانی چیزیں ہیں، یہ کسی ایک کے پاس نہیں رہتیں، اس لیے میں اپنی قسمت یا فاتح کی چیرہ دستیوں کی کوئی شکایت نہیں کرتا۔''
ملازم نے پوچھا۔ ''یہاں دہلی میں کیا کر رہے ہو؟''
راجکمار نے جواب دیا۔ ''ابھی تک میں تو کچھ بھی نہیں کر رہا۔ خسرو سے میری دوستی ہو گئی ہے، میں خسرو کے توسط سے حضرت نظام الدین کی خدمت میں حاضری دینا چاہتا ہوں، آگے کا حال معلوم نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ جو قسمت میں ہے پیش آئے گا۔''
ملازم نے کراہیت سے منہ بنایا، بولا۔ ''تم کس کے پاس جاؤ گے؟ نظام الدین دکاندار کے پاس؟ ارے بھائی تم اس دنیا دار بے دین سے ملو گے جو علانیہ گانا سنتا ہے۔ خسرو تو بے دین ہے ہی، اس کا پیر بھی اس سے کم نہیں۔''
راجکمار کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، بولا۔ ''جناب! اس سے آگے نہ بڑھیں اور اپنی زبان قابو میں رکھیں۔ میں ان دونوں کے خلاف مزید نہیں سن سکتا۔''
ملازم نے سر سے پیر تک اسے حیرت سے دیکھا، بولا۔ ''لیکن تم نے تو مجھے ابھی یہ بتایا تھا کہ ہندو ہو۔ اگر تم ہندو ہو تو تمہیں ان بے دین مسلمانوں سے کیا دلچسپی؟''
مہندر ہردیو نے جواب دیا۔ ''جناب، میں نے دکن سے دہلی تک کا سفر محبوب الٰہی کے لیے کیا ہے، میں امیر خسرو اور محبوب الٰہی کی بابت ایک بات اچھی طرح جانتا ہوں یہ دونوں کچھ بھی ہوں مگر ان میں مکر و فریب نہیں پایا جاتا۔''
ملازم نے جل کر کہا۔ ''چونکہ تم ہندو بت پرست ہوتے ہو اس لیے تمہیں یہ دونوں بت پرست اچھے لگے، اب میں اور کیا کہہ سکتا ہوں۔''
مہندر ہردیو نے جواب دیا۔ ''میں ایک کمزور نوجوان ہوں مجھے افسوس ہے کہ میں یہاں کیوں ٹھہرا۔''
ملازم ہنس کر بولا۔ ''تم ایک مسافر اور اجنبی ہو، ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت ہے۔ تم اس کے ذمّی ہو اس لیے میں

تمہیں برائی سے روکنا چاہتا تھا۔" مہندر نے پوچھا۔ "یہ ذمی کیا ہوتا ہے؟"
دکاندار نے جواب دیا۔ "جس کی حفاظت مسلمان حکومت کے ذمے ہوتی ہے، اسلامی شریعت میں اسے ذمی کہتے ہیں۔"
مہندر نے خوش ہو کر کہا۔ "شکریہ، تم نے ایک لفظ کا مطلب سمجھا کر مجھ پر احسان کیا ہے میں تمہیں اپنا استاد مانتا ہوں، میں تم سے ایک درخواست کرتا ہوں جس طرح تم نے مجھے ایک برائی سے روکنا چاہا ہے اسی طرح میری خواہش ہے کہ تم بھی ایک غلط فہمی سے پیدا ہونے والے گناہ سے بچ جاؤ۔ تم ایک بار محبوب الٰہی کی مجلس میں ضرور جاؤ اور پھر کوئی رائے قائم کرو۔"
دکاندار نے ہنس کر جواب دیا۔ "اچھا، میں کل رات کو وہاں ضرور جاؤں گا۔"
مہندر نے کہا۔ "میں تم کو وہیں ملوں گا۔"
دکاندار نے کہا۔ "تب پھر تم ایک وعدہ کرو، وہاں تم اس ملاقات کا ذکر کسی سے نہیں کرو گے کیونکہ اس طرح میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ خواجہ نظام الدین کو میرے خیالوں کی خبر ہوتی ہے یا نہیں۔"
مہندر نے کہا۔ "تب پھر ایسا کرو کہ کل کے بجائے آج ہی چلو، میں دکان پر رکا جاتا ہوں، شام کو ہم دونوں ساتھ ہی چلیں گے اس طرح تم کو یقین رہے گا کہ میں نے اس ملاقات اور بات چیت کا ذکر کسی سے بھی نہیں کیا۔ میں مجلس میں کسی ایسی جگہ بیٹھوں گا جہاں حضرت کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔" دکاندار راضی ہو گیا۔
شام کو ان دونوں نے ایک ساتھ محبوب الٰہی کی بارگاہ کا رخ کیا۔ دونوں خانقاہ میں داخل ہوئے وہاں بڑی بھیڑ تھی۔ مہندر نے دکاندار کا ساتھ چھوڑ دیا اور سب سے پیچھے بیٹھ گیا۔ دکاندار گستاخانہ آگے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ محبوب الٰہی کے بالکل قریب چلا گیا اور السلام علیکم کہہ کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ پوری مجلس اس گستاخی پر مشتعل ہو گئی، لوگوں کے چہرے سرخ ہو گئے۔
آپ نے اس دکاندار کو خوش اخلاقی سے اور زیادہ قریب کر لیا۔ پوچھا۔ "غالباً تم اسی شہر کے رہنے والے ہو؟"
دکاندار نے جواب دیا۔ "ہاں میں اسی شہر کا ہوں۔ حدیث میں آیا ہے کہ یہ دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور ہر مسلمان اس دنیا میں مسافر ہے۔"
آپ نے فرمایا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو، تم نے مجھے حدیث یاد دلائی مجھ پر بڑا احسان کیا۔ میں بھی جب گانا سنتا ہوں تو رسول اللہ کی وہ حدیث یاد آجاتی ہے کہ ایک بار رسول مقبول ﷺ دو لڑکیوں کا دف پر گانا سن رہے تھے۔ اتنے میں حضرت عمرؓ آگئے اور انہوں نے ان لڑکیوں کو گانے سے روکا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ عمر! ان لڑکیوں کو گانے بجانے سے مت روکو۔ ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے اور آج ان لڑکیوں کی عید کا دن ہے۔"
دکاندار نے گھبرا کر مہندر کو تلاش کیا۔ وہ بہت خوف زدہ نظر آرہا تھا۔
آپ نے مزید فرمایا۔ "ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کے کلام اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کو یاد رکھے۔ قرآن پاک میں آیا ہے کہ فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں اور قرآن پاک میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے ماں باپ اور بھائیوں نے سجدہ کیا تھا۔ یہ دونوں خبریں قرآن پاک میں موجود ہیں مگر ایسا کوئی حکم قرآن پاک میں نہیں ہے کہ مسلمانوں کو کسی کے سامنے ایسا تعظیمی سجدہ نہیں کرنا چاہیے جیسا فرشتوں نے آدم کو، یعقوب علیہ السلام پیغمبر نے اپنے بیٹے کو کیا تھا۔ یوں بھی عبادت کے سجدے اور تعظیمی سجدے میں فرق ہوتا ہے۔ ادب اور تعظیم سے اطاعت پیدا ہوتی ہے۔ ہم درویشوں کے مسلک میں ادب اور تعظیم ہی سب سے بڑی چیز ہے۔ اللہ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو۔ رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور جو تم میں صاحبِ امر ہوں، ان کی اطاعت کرو۔"
دکاندار آپ کی باتیں نہایت انہماک سے سنتا رہا۔ اس کے بعد ایک چیخ مار کر آپ کے قدموں میں گر گیا، روتے ہوئے کہا۔ "حضرت مجھے معاف کر دیجیے۔ میں بڑی گمراہی میں تھا۔"
آپ نے سید امام کو بلا کر حکم دیا۔ "اس کو پانی پلاؤ، کھانا کھلاؤ کیونکہ یہ بہت پریشان نظر آتا ہے۔ اس کے لیے حلوا لاؤ کیونکہ اس نے ایک حدیث سنائی ہے۔"
اس کے بعد آپ نے پوچھا۔ "میرا ہندو مہمان ہردیو کہاں ہے اس کو میرے پاس لاؤ۔"
مہندر نے آپ کی آواز سنی تو ادب سے کھڑا ہو گیا اور ہاتھ جوڑ کر دور ہی سے عرض کیا۔ "حضرت! میں یہاں ہوں، حاضر ہوں۔"

آپ نے مہندر کی طرف اشکبار آنکھوں سے دیکھا۔ ”مہندر! ہم سب خدا کے ذمّی ہیں، کوئی انسان کسی انسان کا ذمّی نہیں ہوسکتا کیونکہ کسی انسان کو حفاظت کی خدا جیسی قدرت حاصل نہیں ہے۔“

دکاندار نے پھر ایک چیخ ماری اور تڑپنے لگا۔

سید محمد امام کھانا، پانی اور حلوا لے آئے۔ آپ نے دکاندار کو اپنے ہاتھ سے ایک نوالہ کھلایا۔ اس کی طبیعت ٹھہر گئی۔ اس کے بعد دکاندار نے اپنے ہاتھ سے کھایا پیا، حلوا بھی کھایا اور ادب سے عرض کیا۔ ”حضرت! مجھے بیعت کر لیجیے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”سید محمد امام میرے پیر کا نواسا ہے تم اس سے بیعت کرو پھر میرے پاس آنا۔“ اس کے بعد سید امام سے کہا۔ ”تم اس کو اپنے گھر لے جاؤ اور تعلیم دو۔“ مہندر سے کہا۔ ”اور تم بھی ان دونوں کے ساتھ چلے جاؤ۔“

مہندر ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور پھر یہ تینوں وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

رات کو خواجہ نظام الدین نے حکم دیا۔ ”خواجہ حسن سنجری، امیر خسرو، خواجہ سید محمد، خواجہ سید موسیٰ اپنی بہن کے پوتے سید محمد رفیع الدین ہارون اور دیو گڑھ کے مہندر ہردیو سنبھل دیو، چیتل دیو اور ستین دیو کو نام بنام میرے پاس بلا لاؤ۔“

آپ کے حکم کی دیر تھی کہ یہ سارے آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپ نے ان سے فرمایا۔ ”جانتے ہو میں نے تم لوگوں کو کیوں بلایا ہے؟“ پھر خود ہی وضاحت بھی کر دی۔ ”یہ بات کون نہیں جانتا کہ اب اس ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مل جل کر رہنا ہے لیکن دونوں کے لیے زبان کا مسئلہ دشواری کا سبب بنا ہوا ہے۔ باہر کے مسلمان یہاں کی مقامی زبان نہیں سمجھتے اور مقامی لوگ مسلمانوں کی زبان نہیں سمجھ پاتے لیکن میں نے اس کا حل سوچ لیا ہے۔“

امیر خسرو نے پوچھا۔ ”ارشاد، ہمارے لائق جو کام ہو، ہم اس کے لیے تیار ہیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تم سب مل کر ایک ایسی زبان تیار کرو جو ہندوستان کے رہنے والے ہندو اور باہر سے آئے ہوئے مسلمان آپس کی بات چیت اور لین دین میں کام میں لائیں۔“ اس کے بعد آپ نے امیر خسرو اور خواجہ سید محمد کی طرف دیکھ کر بطورِ خاص فرمایا۔ ”میں تم دونوں سے پہلے بھی یہ بات کہہ چکا ہوں۔“

خواجہ سید محمد نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں تو پہلے ہی سرگرم عمل ہوں۔“

امیر خسرو نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں نے اس مقصد کے پیشِ نظر بچوں کی تعلیم کے لیے ایک چھوٹی سی کتاب بھی لکھنا شروع کر دی ہے اور کتاب کا نام خالق باری تجویز کیا ہے۔“

اس کے بعد امیر خسرو نے خالق باری کے چند شعر بھی سنائے۔ آپ نے انہیں پسند فرمایا اور بولے۔ ”یہ بہت مفید چیز ہے مگر ہندی زبان میں بھی ایسے اشعار لکھو کہ لوگ انہیں یاد کرنے پر مجبور ہو جائیں۔“

خواجہ نظام الدین نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد مزید فرمایا۔ ”آج کل ہماری فارسی اور خسرو کی ترکی زبانوں کے ساتھ ہندوؤں کی بول چال کے بہت سے لفظ مل گئے ہیں اور اب لوگ اپنے گھروں اور مجلسوں میں بھی ہندی کے الفاظ بولنے لگے ہیں لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو فارسی اور عربی اور ترکی میں ہندی کی آمیزش نہیں چاہتے ہیں اس لیے ان لوگوں کو سمجھانا چاہیے کہ ان کا اور ان کی حکومت کا فائدہ اسی میں ہے کہ ہندوستانیوں کو اپنے دل کی بات سمجھا سکیں اور خود ان کے دلوں کی حالت سمجھ سکیں اور یہ اس وقت ہوگا کہ وہ ضد کو چھوڑ دیں اور ہندی بول چال کا پرچار بڑھائیں۔“

آپ کی باتوں کا یہ اثر ہوا کہ امیر خسرو نے اس سمت میں خاص کام کیا۔ ان کی کہہ مکرنیاں، پہیلیاں، بابل اور دوسرے علاقائی گیت اتنے عام ہوئے کہ وہ آج بھی عام ہیں اور ایک ایسی زبان وجود میں آگئی جو آج اردو کہلاتی ہے اور ہندوستان میں ہندوستانی۔

جب اس موضوع پر گفتگو ختم ہو گئی تو کافی دیر بعد مہندر نے کہا۔ ”حضرت! میں مسلمان ہو جانا چاہتا ہوں اس سلسلے میں مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

آپ نے فرمایا۔ ”جب تو خدا کو ایک مان لے گا اور رسول ﷺ کی رسالت کو تسلیم کر لے گا تو، تو مسلمان ہو جائے گا۔“

مہندر نے عرض کیا۔ ”حضرت اگر مسلمان ہونا اتنا ہی آسان ہے تو مجھے اسی وقت مسلمان کر لیجیے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”مسلمان کرنا اور چیز ہے اور مسلمان ہونا اور چیز۔“

مہندر نے پوچھا۔ ”ان دونوں میں کیا فرق ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”مسلمان کرنے کا لفظ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا جبر، دباؤ، لالچ یا ذاتی غرض شامل ہے

اور مسلمان ہونا ان سب سے بے لوث ہے۔ اس کے لیے کسی ایجاب وقبول کی کوئی ضرورت نہیں ...... مثلاً آج اس وقت تو اس بات کا یقین کرلے کہ اللہ بس ایک ہی ہے اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں تو اس یقین کے ساتھ ہی تو مسلمان ہوجائے گا۔''

مہندر گھبرا گیا۔ ''بیشک، مجھے پورا یقین ہے کہ خدا ایک ہے اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تو بس تو مسلمان ہے۔''

مہندر نے کہا۔ ''مجھے بیعت بھی کرلیجیے۔''

فرمایا۔ ''ابھی اس کا وقت نہیں آیا اور نہ ہی ابھی اس کی ضرورت ہے کہ تو اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرے اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ تیرا نام بدلا جائے البتہ تو محمد امام سے وضو سیکھ لے اور وہی تجھے نماز بھی سکھا دیں گے۔''

اس بات کو کئی دن گزر چکے تھے۔ آخر ایک دن مہندر نے پھر وہی درخواست کی۔ ''حضرت! مجھے بیعت فرمالیں۔''

آپ نے اسے بیعت فرمالیا اور کلاہ چارتر کی مہندر کے سر پر رکھ دی۔ ادھر سے فارغ ہونے کے بعد مہندر نے عرض کیا۔ ''حضرت! اب میں دیوگڑھ اپنے والدین کے پاس جانا چاہتا ہوں۔''

آپ نے جانے کی اجازت دی، فرمایا۔ ''تو جاسکتا ہے اور اگر تیرے ماں باپ اجازت دیں تو واپس آجانا اور اگر وہ تیرے ساتھ آنا چاہیں تو انہیں اپنے ساتھ دہلی لے آنا۔''

مہندر نے دیوگڑھ جانے کی تیاریاں شروع کردیں۔

یکا یک خواجہ سید محمد کا خادم ملیح مہندر کے پاس پہنچا اور کہا۔ ''کوتوال علاء الملک کا ایک آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

مہندر نے جواب دیا۔ ''میں یہاں اکیلا ہوں، اسے یہیں بلالو۔''

جب کوتوال کا آدمی اندر داخل ہوا تو مہندر اس کی شکل دیکھتے ہی سہم گیا۔ وہ مسلح تھا، لمبی ڈاڑھی اور خونخوار صورت۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی خونخوار نظروں سے ماحول کا جائزہ لیا پھر مہندر کو گھور کر دیکھنے لگا۔ اس نے مہندر سے پوچھا۔ ''کیا ہردیو مہندر تیرا ہی نام ہے؟''

مہندر نے جواب دیا۔ ''ہاں، ہردیو مہندر میرا ہی نام ہے آپ کون ہیں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں کوتوال کا آدمی ہوں۔'' پھر پوچھا۔ ''کیا تو اجمیر، ہانسی، ملتان، لاہور اور بدایوں بھی گیا تھا؟''

مہندر ہردیو نے کہا۔ ''ہاں، میں نے ان مقامات کی سیاحت کی ہے مگر کیوں؟ کیا سیاحت کرنا جرم ہے؟''

اس نے درشت لہجے میں کہا۔ ''سیاحت جرم نہیں ہے البتہ سلطان کے خلاف بکواس کرنا جرم ہے۔'' پھر کہا۔ ''میں کوتوال کا حکم لے کر آیا ہوں اور اس وقت تجھے اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

مہندر ہردیو کا برا حال تھا، اس سے بولا نہیں جارہا تھا۔ بمشکل جواب دیا۔ ''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ میں نے سلطان کے خلاف کہیں بھی کوئی بات کی ہے لیکن انسان بات چیت کے وقت بے اختیار ہوجاتا ہے ممکن ہے میری زبان سے کوئی ایسی بات نکلی ہو جس میں سلطان کا ذکر ہو۔''

اتنے میں خواجہ سید محمد، خواجہ سید موسیٰ اور مولانا احمد نیشاپوری بھی آگئے۔ انہوں نے حالات کی نزاکت کا جائزہ لیا اور مہندر کی پریشانی کو محسوس کرلیا۔ کوتوال کا نمائندہ ترک تھا۔ مولانا نیشاپوری نے اس سے ترکی میں باتیں شروع کردیں۔ انہوں نے کہا۔ ''یہ ہمارا مہمان ہے اور حکومت کا ذاتی ہے اس کے علاوہ یہ حضرت کا مرید بھی ہے اور دیوگڑھ حکومت کے شاہی خاندان کا فرد ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر تمہیں میری رائے درکار ہو تو میں یہ کہوں گا کہ تم کوتوال کے پاس واپس جاؤ اور اس سے کہو کہ وہ خود آکر سلطان المشائخ سے بات کرلے۔''

کوتوال کا آدمی بالکل اجڈ تھا۔ اس نے نہایت کرخت لہجے میں کہا۔ ''یہ باغی ہے اس نے کئی شہروں میں ہندوؤں سے ملاقاتیں کیں اور ان سے کہا کہ میرے راجہ، رام دیو کو علاء الدین نے لوٹا تھا۔ ہندوؤں کو علاء الدین سے انتقام لینا چاہیے۔ ایسے سنگین جرم کی سزا موت ہے۔''

اسی وقت خواجہ نظام الدین کا خادم خاص خواجہ اقبال اندر داخل ہوا۔ اس نے کوتوال کے آدمی سے کہا۔ ''حضرت نے فرمایا ہے کہ ہم ہردیو کو نہیں جانے دیں گے، اپنے کوتوال کو ہمارے پاس بھیج دو تاکہ اس سے ہردیو کا جرم معلوم کیا جائے۔''

کوتوال کے آدمی نے جواب دیا۔ ''مگر یہ تو بتا کہ تیرے حضرت کو یہ بات کس طرح معلوم ہوگئی کہ میں ہردیو کو گرفتار کرنے آیا ہوں؟''

خواجہ اقبال نے جواب دیا۔ ’’حضرت روشن ضمیر ہیں۔‘‘

کوتوال کے آدمی نے برا سامنہ بنایا۔ ’’میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔ وہ کوتوال کے پیر ہوں یا وزیر کے پیر ہوں‘ مجھ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوسکتا۔ میں تو شاہی مجرم کو لینے آیا ہوں۔ میں اس کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور اگر کسی نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں مجرم اور اس کے حمایتیوں کے سر لے جاؤں گا۔‘‘

خواجہ سید محمد نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔ ’’کس کی مجال ہے کہ ہمارے مہمان کو ہمارے حضرت کی اجازت کے بغیر یہاں سے لے جائے۔‘‘

کوتوال کے آدمی نے تلوار کھینچ لی۔ سید محمد نے دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور تلوار چھین لی۔ مولانا نیشاپوری نے سید محمد کی مدد کی۔ کوتوال کے آدمی کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ وہ گالیاں بکنے لگا۔ دونوں مرید بھائیوں نے اسے بے بس کر کے بٹھا دیا۔

اسی وقت علاء الملک کوتوال اپنے دس بارہ ہتھیار بند آدمیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس نے خواجہ سید محمد کو ادب سے سلام کیا۔ اس کی نظر جونہی اپنے نائب پر پڑی‘ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ پوچھا۔ ’’یہ کیا قصہ ہے؟‘‘

سید محمد نے سب کچھ تفصیل سے بتادیا۔ کوتوال نے اپنے نائب سے کہا۔ ’’تم نے میرے پیر کی شان میں گستاخی کی، بہت برا کیا۔ میں نے پہلے بھی تمہاری شکایتیں سنی ہیں۔ تم کوتوالی واپس جاؤ، اگر آئندہ تم نے کوئی ایسی حرکت کی تو تم نوکری سے الگ کر دیے جاؤ گے۔‘‘

کوتوال کے آدمی اس کو لے کر چلے گئے، اب کوتوال ہردیو سے مخاطب ہوا۔ ’’تو نے ملتان، لاہور اور اجمیر میں فلاں فلاں ہندوؤں سے سلطان کے خلاف باتیں کیں یا نہیں؟‘‘

ہردیو نے جواب دیا۔ ’’میں نے ملتان کے سوا کسی شہر میں کسی ہندو سے ملاقات نہیں کی اور چونکہ وہ میرے ہم وطن تھے۔ انہوں نے مجھ سے سلطان کے اس حملے کا ذکر کیا جو سلطان نے بادشاہ ہونے سے پہلے دیوگڑھ پر کیا تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ حکومتوں میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے کیا ہمارے ہندو راجا دوسرے ہندو راجاؤں کے ساتھ ایسا نہیں کرتے؟‘‘

کوتوال نے کہا۔ ’’تو سچا معلوم ہوتا ہے ملتان کے وہ ہندو گرفتار کیے جاچکے ہیں جنہوں نے تجھ سے باتیں کی تھیں‘ وہ سب دہلی لائے جاچکے ہیں تم مجھے ہر بات سچ سچ بتادو۔ میں تمہیں بچالوں گا کیونکہ تم میرے پیر بھائی بھی ہو۔‘‘

ہردیو نے جواب دیا۔ ’’میں نے سچ بات ہی کہی ہے۔ اس کے علاوہ میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔‘‘

کوتوال ہردیو کو خواجہ نظام الدین کے پاس لے گیا بولا۔ ’’حضرت......‘‘

آپ نے فرمایا۔ ’’علاء الملک کو معلوم ہونا چاہیے کہ میرے آدمیوں کو ستانا اچھی بات نہیں ہے۔ ہردیو پاک دل اور پاک عمل ہے۔‘‘

کوتوال نے عرض کیا۔ ’’آپ نے جو کچھ فرمایا ہے میں سلطان سے عرض کردوں گا لیکن سلطان ہردیو کو دیکھنا بھی چاہتا ہے اس لیے میں اس کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔‘‘

آپ نے فرمایا۔ ’’لے جاؤ ہردیو کو، سلطان اس کو دیکھ لے ہم سلطان کو دیکھ لیں گے۔‘‘

آپ کے تند و تیز لہجے نے کوتوال پر کپکپی طاری کردی۔ وہ ہردیو کے ساتھ الٹے قدموں چل کر باہر نکلا اور اپنے آدمیوں کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ ہردیو کو بھی ایک گھوڑا پیش کردیا گیا۔ وہ اس پر بیٹھ گیا۔

شاہی محل کے قریب کوتوال نے گھوڑے سے اتر کر ہردیو کو بھی اتارا، اپنے آدمی سے تلوار لے کر ہردیو کے گلے میں ڈالی‘ ہردیو کی پگڑی بھی اس کے گلے میں ڈال دی۔ اس حال میں وہ ہردیو کو لے کر بادشاہ کے دربار میں پہنچا۔

اس وقت بادشاہ ایک چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کوتوال نے ہردیو سے کہا۔ ’’تو یہاں بھی سچ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑے گا۔ سب کچھ سچ سچ بتادے گا۔‘‘

ہردیو نے جواب دیا۔ ’’میں نے عرض جو کیا، میں بے گناہ ہوں۔‘‘

کوتوال نے سب کچھ سلطان کے گوش گزار کردیا۔

علاء الدین کچھ دیر تو خاموش رہا، پھر ترکی زبان میں کوتوال سے کہا۔ ’’اس کا چہرہ بھی اس کے دل ہی جیسا ہے۔ میں حضرت نظام المشائخ کی اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ یہ شخص پاک دل اور پاک اعمال ہے۔‘‘

اس کے بعد سلطان نے ہردیو کے لیے ایک خلعت طلب کی اور اس کے لیے ملازمت کا اعلان کردیا۔ کہا۔ ''اس کو ملازم رکھ لیا جائے کیونکہ حضرت نظام الدین نے اس کو بے گناہ کہہ دیا ہے۔'' پھر کہا۔ ''ہاں، میں دیوگڑھ جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

کوتوال نے عرض کیا۔ ''مجھے حضرت نے بتایا ہے کہ ہردیو اپنے والدین سے ملنے کے لیے دیوگڑھ جانا چاہتا ہے۔''

سلطان نے کہا۔ ''یہ اپنے ماں باپ کو دہلی بلوالے۔'' پھر اپنا فیصلہ سنادیا۔ ''ملتان کے ہندوؤں کو بدایوں دروازے پر ہاتھیوں کے قدموں میں ڈال دیا جائے۔''

بادشاہ نے یہ فیصلہ ترکی زبان میں سنایا تھا۔ کوتوال نے ہردیو کو فارسی میں سمجھایا۔ ''اب جبکہ تو رہا ہو چکا ہے، ادب سے بادشاہ کے روبرو جھک جا۔''

پھر خلعت بھی آ گئی، وہ جسم پر موجود لباس ہی پر پہنادی گئی۔ ہردیو نے ادب سے جھک کر بادشاہ کا شکریہ ادا کیا۔

بادشاہ نے اپنے وزیر خطیر الدین کو حکم دیا۔ ''ہردیو کے مناسب حال کوئی اچھی سی نوکری دی جائے۔''

کچھ دیر بعد کوتوال ہردیو کے ساتھ باہر آ گیا مگر کوتوال نے ہردیو کو کھڑا کر کے دوبارہ دربار کا رخ کیا۔ جب واپس آیا تو ہردیو نے اس سے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟ دوبارہ دربار میں جانے کا مطلب؟''

کوتوال نے جواب دیا۔ ''میں اپنے نائب کی بابت سلطان کا فیصلہ سننا چاہتا تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ میرے نائب کو بھی ہندوؤں کے ساتھ ہی بدایوں دروازے کے سامنے ہاتھیوں کے آگے ڈال دیا جائے۔''

کوتوال ہردیو کو لے کر خواجہ نظام الدین کی خدمت میں پہنچا اور سارا واقعہ بیان کردیا۔

آپ کچھ پریشان ہو گئے، فرمایا۔ ''علاء الملک! تو سلطان کے پاس واپس جا اور میری طرف سے سلطان کو بتادے کہ سلطان کی حفاظت خود خدا کرے گا' سلطان ہر شر سے محفوظ رہے گا۔ رہ گیا انتقام، تو خدا خود منتقم حقیقی ہے وہ خود بدلہ لے لے گا۔ وہ ہندوؤں کو ہلاک نہ کرے، بس دہلی سے جلاوطن کردے اور ہندوؤں کے ساتھ تیرے نائب کو بھی معاف کردیا جائے۔''

کوتوال نے عرض کیا۔ ''میں حضور کا ارشاد بادشاہ تک اسی وقت پہنچادوں گا۔ بادشاہ جو جواب دے گا حضور تک پہنچادوں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں جواب نہیں چاہتا، تم سے جو کچھ کہا گیا ہے ویسا ہی ہوگا، میں عمل چاہتا ہوں۔''

کوتوال چلا گیا تو آپ نے ہردیو سے کہا۔ ''بادشاہ کی مرضی ہے کہ تم دہلی میں رہو، یہ بادشاہ کے لیے بھی ٹھیک ہے اور تمہارے لیے بھی۔ جاؤ سید محمد کے پاس رہو۔''

ہردیو نے عرض کیا۔ ''بادشاہ نے مجھے لباس بھی دیا ہے اور اشرفیاں بھی، ان کی بابت آپ کا کیا حکم ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''جو جس کا حصہ ہے اس کے پاس رہنا چاہیے۔ اشرفیاں اپنے والدین کو بھیج دو تاکہ وہ دہلی آجائیں۔''

بادشاہ نے خواجہ نظام الدین کی بات مان لی اور سب کو معاف کردیا۔

ہردیو کو کوئی ملازمت نہیں مل سکی۔

بادشاہ اپنے سپہ سالار ملک کافور سے بڑی محبت کرتا تھا۔ ملک کافور مذہباً ہندو تھا۔ اس نے سلطان کی صحبت میں رہ کر پورے ملک پر ہندو حکومت کا خواب دیکھا تھا۔ ملک کافور نے سلطان کو زہر دے کر ہلاک کردیا اور سلطان کے سات سالہ بیٹے شہاب الدین کو تخت پر بٹھادیا گیا۔ ملک کافور اس بچے کی آڑ میں پورے ملک پر خود حکومت کرنا چاہتا تھا لیکن وہ زیادہ دن حکومت نہیں کرسکا۔ علاء الدین خلجی کے بڑے بیٹے قطب الدین خلجی نے ملک کافور کو قتل کر کے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

ملک میں یہ سارے ہنگامے برپا تھے اور آپ ایک گوشے میں بیٹھے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

(جاری ہے)

ماخذات

سیر الاولیاء، امیر خورد۔ سیر العارفین، حامد بن فضل اللہ جمالی۔ اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث۔ فوائد الفواد، امیر حسن سنجری۔ گلزارِ ابرار، محمد غوث مانڈوی۔ خیر المجالس، ملفوظات چراغ دہلی

غیرملکی کہانیاں

منظر امام

ہر مصنف اپنے دور... اپنے معاشرے اور اپنی رسم وروایات کی عکاسی کرتا ہے... منظر امام نے بھی جانے کتنی ہی ایسی یادگار کہانیاں تخلیق کیں۔ زیرنظر تحریر میں بھی غیرملکی حالات ومعاشرت کی جھلک نمایاں ہے۔ دنیا میں قدم قدم پر کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ مصنف انہیں سمیٹنے اور محفوظ کرنے کا فریضہ انجام دیتے رہتے ہیں۔

انتہائی مختصر......مگر جامع پرلطف تحریر......ایک منفرد انداز

غیرملکی ادیبوں میں ویسے تو بے شمار نام ہیں جنہوں نے کمال کی تحریریں لکھی ہیں اور وہ انگریزی یا کسی اور زبان کے ادب میں کلاسک کا درجہ بھی رکھتی ہیں۔ میں نے ایسی ہی کچھ کہانیوں کے ترجمے اپنے باذوق قارئین کے لیے کیے ہیں۔ پہلی کہانی ہے ”سب وے“۔ یہ کہانی ہے انتھونی ماسٹرو کی۔ اس میں آپ کہانی کے انجام پر دکھی ہوجائیں گے اور آپ یہ جان لیں گے کہ موجودہ دور نے انسان کو کتنا بے بس اور کتنا مظلوم کردیا ہے۔

''سب وے ۔۔۔ انھوں نی ماسٹرڈ۔''

اس پہ ۔۔۔۔۔ بے شمار ذمے داریاں تھیں۔ ایک بیمار ماں، دو بہنیں، ایک بھائی جو ذہنی طور پر ابنارمل تھا اور ہر مہینے اس کی مہنگی دوائیں آیا کرتی تھیں۔

باپ کے مرنے کے بعد اس نے گھر کی یہ ساری ذمے داریاں سمیٹ کر اپنے دامن میں بھر لی تھیں۔

اس کے پاس کوئی خاص ملازمت بھی نہیں تھی۔ ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ کچھ مہینوں تک اس فیکٹری کی تنخواہ سے گھر کا کام چلتا رہا اور پچھلے دو مہینوں سے فیکٹری کی جاب بھی ختم ہوگئی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اب کیا کرے۔ گھر کی ذمے داریاں اس کی مجبوری دیکھ کر تو ختم نہیں ہوسکتی تھیں۔ انہیں تو ہر حال میں اپنی ڈیمانڈ پوری کروانی تھی۔

مکان کرائے کا تھا۔ اس لیے ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو کرایہ بھی درکار تھا۔ گیس اور بجلی کے بل بھی آیا کرتے اور وہ ان محکموں میں جاکر یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ دیکھو بھائیو۔ میں ایک بے روزگار انسان ہوں۔ ابھی میرے پاس کچھ نہیں ہے۔

ماں، دونوں بہنوں اور اس پاگل بھائی کو بھوک بھی لگتی تھی۔ مفلسی بڑھ جائے تو پھر کھانے کی ہوس بھی زیادہ ہوجاتی ہے اور خود اس کا بھی اپنا پیٹ تھا۔ اپنے اخراجات تھے، یہ سب کچھ کیسے پورے ہوتے۔ پھر ایک دن اچانک کسی فرم سے اس کے موبائل نمبر پر کسی کی کال آگئی۔

''مجھے مسٹر نعمان سے بات کرنی ہے۔''

''جی۔ میں نعمان ہی بول رہا ہوں۔''

''آپ کل صبح میڈورا پہنچ جائیں۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''یاد رکھیں ٹھیک نو بجے۔ ہمارے یہاں لیٹ ہونے والوں کو برداشت نہیں کیا جاتا۔''

''لیکن جناب۔ یہ میڈورا۔''

''آپ شاید بھول رہے ہیں۔ آپ نے دو مہینے پہلے اپنی سی وی بھیجی تھی۔ اس میں آپ کا موبائل نمبر بھی تھا۔''

''او ہاں۔ جی جناب۔'' نعمان کو اچانک یاد آگیا تھا۔ ''جی جناب، یاد آگیا۔''

''کل صبح نو بجے۔'' پھر کہا گیا۔ ''اور ہمارے منیجر درانی صاحب کو رپورٹ کریں۔''

نعمان چہک اٹھا تھا۔ یہ کیسی خبر تھی؟ اتنی بڑی خبر اچانک مل گئی تھی۔ وہ تو میڈورا والوں کو سی وی دے کر بھول ہی گیا تھا اور اب وہ اسے بلا رہے تھے۔

اس نے جب اپنے گھر والوں کو اس بارے میں بتایا تو ان سب کی بجھی ہوئی آنکھوں میں چراغ سے جل اٹھے تھے۔

اس کی ماں تو اسی وقت شکرانے کی نماز ادا کرنے بیٹھ گئی تھی۔ اس کی دونوں بہنوں نے گنگنانا شروع کردیا تھا۔ ایسے حالات میں اگر اچھی خبر مل جائے کہ اب گھر میں فاقے نہیں ہوں گے تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسے بارش کے بعد پودے لہلہانے لگتے ہیں۔ یہ مرجھائے ہوئے چہرے اس خبر ہی سے شاداب ہوگئے تھے۔ بس کچھ دنوں کی بات اور تھی۔ تنخواہ ملتے ہی سب ٹھیک ہوجاتا۔ اب ایک امید تو ہوچکی تھی اور جب امید زندہ ہوجائے تو پھر سب ٹھیک ہوجاتا ہے۔

دوسری صبح وہ سات بجے ہی گھر سے نکل گیا۔ پہلا دن تھا اور اسے بڑی سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ نو بجے تک اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جائے۔

نو بجنے میں ابھی بہت دیر تھی، وہ بہت آرام آرام سے پہنچ سکتا تھا۔ اس وقت بس اسٹاپ پر صرف دو آدمی تھے اور اب وہ تیسرا ان میں جاکر شامل ہوگیا تھا۔

اچانک اس کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔

اس نے موبائل جیب سے نکال کر نمبر دیکھا۔ یہ فون افشاں کا تھا۔ اس کی دوست، جس کے ساتھ مل کر اس نے زندگی کے خواب دیکھے تھے۔

افشاں کو یہ امید تھی کہ بہت جلد نعمان کے حالات درست ہوجائیں گے۔ اسے کوئی اچھی سی نوکری مل جائے گی اور پھر سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔

نعمان کو یاد آیا کہ وہ افشاں کو اپنی جاب کی خبر دینا تو بھول ہی گیا تھا۔ وہ ان دونوں آدمیوں سے ہٹ کر کچھ فاصلے پر ایک درخت کے پاس آگیا اور اچانک اس درخت کی آڑ سے ایک شخص نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ نعمان اسے نہیں دیکھ پایا تھا۔

وہ شخص سیدھا نعمان کے پاس آگیا۔ وہ بہت جلدی میں اور گھبرایا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ نعمان نے اس کے ہاتھ میں تیز چمکتے ہوئے چاقو کی جھلک دیکھ لی تھی۔

''لا جلدی یہ موبائل دے۔'' وہ آدمی کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔

''کیا......!'' نعمان ہکا بکا رہ گیا۔ وہ اس ناگہانی سچویشن کو سمجھ ہی نہیں پایا تھا اور سب کچھ اچانک ہی ہوگیا۔

اس آدمی نے وہ تیز چمکتا ہوا چاقو نعمان کے بازو میں اتار دیا تھا۔ نعمان ایک چیخ کے ساتھ گرنے لگا۔

صرف ایک لمحہ۔ اس ایک لمحے میں اس شخص نے نعمان کے ہاتھ سے موبائل چھین کر ایک طرف دوڑ لگادی۔

اسٹاپ پر کھڑے ہوئے وہ دونوں شخص بھی صورتِ حال کو سمجھ نہیں پائے تھے۔ نعمان کی چیخ نے انہیں متوجہ کیا تھا۔

نعمان کی پوری قمیص خون آلود ہورہی تھی۔ خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔ بے پناہ تکلیف کی شدت سے اس کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ اس نے بہت مضبوطی سے اپنے زخم کو زور سے پکڑلیا تھا۔

''ارے کیا ہوا؟'' ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''وہ۔ وہ میرا موبائل۔ چاقو مار کرلے گیا۔''

''او خدا۔ ایسے لوگ غارت کیوں نہیں ہوجاتے۔'' دوسرے نے کہا۔

اس دوران اور بھی دو چار لوگ وہاں آگئے تھے۔ اس حادثے نے ان سب کو ہی پریشان کردیا تھا۔ وہ سب اس سے ہمدردی کا اظہار کررہے تھے۔

نعمان کا خون رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اب اندھیرا چھانے لگا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اپنے خون کو اس بے دردی سے ضائع ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

''پولیس کو بلاؤ جلدی۔'' کوئی زور سے چیخا۔

''ارے۔ ایمبولینس کو فون کرو۔ اس کو اسپتال پہنچاؤ۔ اس کا خون ضائع ہورہا ہے۔'' اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرے اور گاڑھے ہونے لگے۔

اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن یہ اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ لہراتا ہوا ڈھیر ہوگیا اور اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا۔ صرف ایک پریشانی تھی۔

اگر اسے دفتر میں دیر ہوگئی تو پھر...... پھر کیا ہوگا؟

یہ تھی ایک کہانی۔ انسان کے ساتھ کیسی مجبوریاں ہوتی ہیں۔

اب یہ ہے دوسری کہانی۔ نیویارک ٹائمز نے اس کہانی کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ خوب صورت کہانی ہے۔

اس کہانی کا عنوان ہے ''شور'' اور اسے لکھا ہے ''گرین۔ بے'' نے۔

وہ ایک چھوٹا سا گھر تھا اور اس گھر کا وہ ایک چھوٹا سا لاؤنج تھا۔ اس لاؤنج کے ساتھ دو کمرے تھے۔

وہ آواز ایک کمرے سے آرہی تھی۔ چیخنے چلانے کی آواز۔ کسی عورت کے رونے کی آواز...... پھر ایسی آواز جیسے کوئی کسی کو مار رہا ہو۔

وہ بارہ تیرہ برس کا ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ وہ چھپ جانا چاہتا تھا۔ کہاں؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ دوسرے کمرے سے عورت کے رونے اور چیخنے کی آوازوں میں شدت آگئی تھی۔ وہ بلبلا رہی تھی اور مرد دہاڑ رہا تھا۔ وہ عورت کو غلیظ... گالیاں دے رہا تھا۔

وہ بچہ ایک صوفے کے پیچھے چھپ گیا۔ شاید یہاں کوئی اس کو نہ دیکھ سکے لیکن وہ یہ جانتا تھا کہ وہ یہاں بھی زیادہ دیر تک چھپ نہیں سکے گا۔ پہلے وہ عورت چیختی، روتی ہوئی باہر نکلے گی۔ پھر وہ آدمی دہاڑتا ہوا اس کے پیچھے کمرے سے برآمد ہوگا۔ اس آدمی کے ہاتھ میں چمڑے کی بیلٹ ہوگی جس سے وہ عورت کو بری طرح مار رہا ہوگا۔ پھر اس آدمی کی نگاہ صوفے کے پیچھے جائے گی اور وہ اسے دکھائی دے جائے گا۔ وہ اس عورت کو چھوڑ کر اس کی طرف لپکے گا اور بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا لاؤنج کے وسط میں لے آئے گا اور اب چمڑے کی بیلٹ سے اسے مارنا شروع کردے گا۔ بہت بری طرح مارے گا۔

وہ مار کھاتا جائے گا اور روتا جائے گا۔ اس کو بچانے کے لیے وہ عورت بے تاب ہوکر آگے بڑھے گی لیکن وہ شخص اسے پھر سے مارنا شروع کردے گا۔ وہ مار کھانے اور چیخنے والی عورت اس بچے کی ماں ہے اور یہ بے رحم شخص اس کا سوتیلا باپ ہے۔

اپنے پہلے شوہر کی موت کے بعد اس عورت نے بہت مجبور ہوکر اس شخص سے شادی کرلی تھی کیونکہ اس کے پاس خود کھانے اور اس بچے کو کھلانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔

شروع کے چند دنوں تک وہ دوسرا شوہر ٹھیک ٹھاک رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی بے رحمی سامنے آتی چلی گئی تھی۔ اس نے بے تحاشا شراب نوشی شروع کردی۔ پھر مار دھاڑ شروع کردی تھی۔

ہفتے میں کم از کم تین چار دن ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ ان دونوں کو بری طرح مارتا اور گالیاں دیتا ہوا گھر سے باہر چلا جاتا۔ اس کے جانے کے بعد وہ عورت بچے کو لپٹا لیا کرتی۔ دونوں روتے اور سسکتے رہتے۔ آج بھی ایسا ہی ہونے والا تھا۔

وہ لڑکا بہت بری طرح خوفزدہ تھا۔ کمرے سے شور کی آواز بلند ہوتی جارہی تھی۔ کسی وقت بھی وہ دونوں باہر آجاتے۔ پھر وہی سب کچھ ہوتا۔

اس لڑکے کے لیے چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی سوائے اس دوسرے کمرے کے۔ اس سے پہلے کہ کمرے کا دروازہ کھلتا، وہ دوڑتا ہوا دوسرے کمرے میں داخل ہوگیا۔

اور یہاں آتے ہی وہ آوازیں اچانک ختم ہوگئیں۔

سناٹا اور تنہائی۔ سامنے ایک بڑا آئینہ تھا۔ اس نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا۔ وہ اب ساٹھ سال کا بوڑھا تھا......

جس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ جس کے کپڑے اس کے نحیف جسم پر جھول رہے تھے۔ وہ آوازیں اس کے ماضی کی تھیں۔ جب وہ بارہ تیرہ برس کا تھا اور اس کے ساتھ یہی سب کچھ ہوا کرتا تھا۔ وہ اب ساٹھ برس کا ہو چکا تھا لیکن وہ آوازیں اس کے تعاقب میں آج بھی تھیں۔ وہ جب بھی کام سے شام کو گھر واپس آتا، گزرے ہوئے دن زندہ ہو کر اس کے سامنے آجاتے۔ وہ ساٹھ برس کا بوڑھا نہیں، بارہ تیرہ برس کا بچہ ہو جاتا۔ ڈرا اور سہما ہوا بچہ۔ کمرے سے ماں کے چیخنے اور اس کے سوتیلے باپ کے دہاڑنے کی آوازیں آنے لگتیں اور وہ خوفزدہ ہو کر صوفے کے پیچھے چھپ جایا کرتا۔

''بے وقوف۔ مار تھا۔''

دونوں ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ خاص طور پر لڑکا۔ جس کی زندگی وہ لڑکی ہو کر رہ گئی تھی۔ دن بھر میں جب تک وہ ایک بار اسے دیکھ نہیں لیتا، اسے سکون نہیں ملتا تھا۔

دونوں الگ الگ دفتروں میں کام کرتے تھے۔ پانچ بجے دفتر آف ہوتے ہی دونوں اپنے مقررہ مقام پر پہنچ جاتے۔

ایسا بہت کم ہوتا کہ لڑکا کبھی دیر سے پہنچا ہو۔ عام طور پر وہ لڑکی سے پہلے موجود ہوتا تھا۔ پھر دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر قریبی پارک کی طرف چلے جاتے۔ بہت دیر تک پارک کی سیر کرتے رہتے۔ پھر اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیتے۔

دونوں کی آنکھوں میں ایک خواب تھا۔

ایک چھوٹا سا اپنا فلیٹ، خوبصورت فرنیچر، ہلکی پھلکی پیار بھری زندگی۔ اسی لیے دونوں اپنی اپنی جگہ کام کیے جا رہے تھے۔ ایک بہتر آنے والے کل کے لیے۔

یہ بات طے ہو چکی تھی کہ ان دونوں کی شادی ہونے والی ہے لیکن کب؟ اس کی تاریخ ابھی طے نہیں ہوئی تھی۔ ابھی تک آشیاں کے لیے تنکے اکٹھے کیے جا رہے تھے۔

پھر اچانک کچھ ہو گیا۔

ایک ایسا واقعہ جو اس لڑکی کے مقدر میں ہی نہیں ہوگا۔ شاید اس لڑکی نے یہی سوچا ہوگا کہ وہ کب تک اس کے انتظار میں رہے گی۔

اس نے کسی اور سے دوستی کر لی۔ اب وہ کسی اور پارک میں کسی اور کے ساتھ جایا کرتی کیونکہ اس لڑکے کا مستقبل شاندار تھا۔ وہ انجینئر بننے جا رہا تھا۔

وہ لڑکا اس لڑکی کی بے وفائی سے بکھر کر رہ گیا۔ اس بے چارے کی زندگی میں بس وہی ایک خوشی تھی اور اب وہ خوشی بھی اس سے چھن گئی تھی۔ اس نے کہا کچھ بھی نہیں۔ کوئی شکوہ نہیں کیا۔ کوئی اظہار نہیں کیا۔ بس اندر ہی اندر سلگتا چلا گیا۔ چھ مہینے گزر گئے اور اس دوران اس لڑکی نے یہ محسوس کر لیا کہ اس کی زندگی میں آنے والا یہ نیا لڑکا اتنا مخلص نہیں ہے جتنا مخلص وہ تھا۔ جو اس کی ذرا ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جاتا تھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ محبت کہتے کسے ہیں۔

اس نے بہت جھجکتے ہوئے اس لڑکے کو فون کیا۔

''سنو۔ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اس نے لڑکے سے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''تم سے ملنا بہت ضروری ہے۔'' لڑکی نے کہا۔ ''پلیز۔ اسی پارک میں آجاؤ جہاں ہم ملا کرتے تھے۔''

''ٹھیک ہے، میں آجاؤں گا۔''

پہلے کی طرح آج بھی وہ لڑکا وقت سے پہلے آیا ہوا تھا۔ لڑکی اس کے سامنے شرمندگی سے گردن جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

''ہاں بتاؤ، کیا بات ہے؟'' لڑکے نے پوچھا۔

''میں بہت شرمندہ ہوں۔'' لڑکی نے کہا۔ ''مجھے تمہاری محبت کی طاقت کا احساس ہو گیا ہے۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔''

لڑکا حیرت زدہ سا ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ لڑکی بولے جا رہی تھی۔ ''مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ میں جان گئی ہوں کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ تم نے مجھ سے کتنی محبت کی ہے۔''

''سنو۔'' لڑکا کچھ دیر بعد بولا۔ ''تم نے اپنے جس کردار اور جس قسم کی بے وفائی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے بعد کوئی بے وقوف ہی تم پر بھروسا کر سکتا ہے۔ سمجھیں؟''

لڑکی سکتے میں رہ گئی۔ لڑکے کا جواب اس کی توقع کے خلاف تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ وہ جانے لگی تھی کہ لڑکے نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ ''اور ایک بات اور سنتی جاؤ۔''

لڑکی رک گئی۔ وہ لڑکے کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ لڑکا اس کے پاس آگیا۔ ''میں نے کہا تھا کہ کوئی بے وقوف ہی تم پر بھروسا کر سکتا ہے اور وہ بے وقوف میں ہوں۔ سمجھیں؟''

لڑکی نے حیران ہو کر لڑکے کی طرف دیکھا۔ اب اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے اور دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر روئے جا رہے تھے۔

کال بیل کے جواب میں اپارٹمنٹ کا بیرونی دروازہ ذرا سا کھلا۔ ایک رنگین آنچل کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی اور پھر ایک نسوانی آواز آئی۔

''کون صاحب ہیں؟''

''بھابی! میں ظہیر احمد ہوں، الیاس کیسے ہیں؟''

''اوہ، ظہیر بھائی!'' ایک دبی ہوئی سسکی سی ابھری۔

''اتنے دن بعد آئے آپ!''

دروازہ پوری طرح کھل گیا۔ میرے سامنے ثریا کھڑی تھی۔ بال بکھرے، لباس اچھا خاصا لیکن بے ترتیب۔ اندازہ ہوتا تھا کہ تین چار دن سے تبدیل نہیں کیا۔ چہرہ زرد اور پریشانی کا مظہر، آنکھوں میں نمی کی جھلک۔ میں نے بہ غور اس کا جائزہ لیا۔ بیوی کی حالت، خاوند کی حالت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ثریا کو دیکھ کر مجھے فوراً ہی الیاس کی حالت کے بارے میں اندازہ ہو گیا۔

''آیئے!'' ثریا نے آنسو صاف کرنے یا چھپانے کی ناکام سی کوشش کی۔ ''وہ اندر ہیں۔''

میں خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ لاؤنج عبور کر کے ہم اندر دائیں جانب والے کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ ثریا نے پردہ ہٹایا اور اندر چلی گئی۔ میں نے بھی اس کے عقب میں کمرے میں قدم رکھا۔ سامنے بستر پر میرا دوست لیٹا ہوا تھا، پروفیسر الیاس صدیقی۔ کمرے کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کا مکین شدید علالت سے دوچار ہے۔ بیڈ سائڈ ٹیبل پر دواؤں کی شیشیوں کا انبار تھا۔ کمرے میں وہی بے ترتیبی اور بوجھل پن تھا جو کسی بیمار کے گھر میں ہوتا ہے۔ ثریا چند لمحے چپ چاپ کھڑی رہی، پھر بہت دھیمی آواز میں بولی۔

آبِ حیات

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

آبِ حیات پانے کے لیے انسان کو مقصدِ حیات پر توجہ دینا ہوتی ہے۔ تب کہیں جاکر انسان دائمی زندگی حاصل کر پاتا ہے۔ کیونکہ مرنے کے بعد ہر ایک کا نام زندہ نہیں رہتا مگر جس کا رہتا ہے وہ یقیناً منزل پانے کی جستجو میں ایک لمبی مسافت طے کرتا ہے۔

موت کے بعد زندگی پانے والے ایک حساس دل کا قصہ

”اب تو گھنٹوں سوتے رہتے ہیں کچھ ہوش نہیں رہتا۔“

میں نے ثریا کو چپ رہنے کا اشارہ کیا، میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے بیمار دوست کے آرام میں خلل آئے۔

اسی دوران میں ثریا نے ”وہ میں چائے لاتی ہوں آپ کے لیے۔“ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھی۔ مجھے اسے روکنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ شاید وہ اپنے آنسو چھپانا چاہتی تھی۔ مجھے یہ خوبی اندازہ تھا کہ وہ کچن میں جا کر پہلے دل بھر کر روئے گی پھر چائے بنا کر لائے گی۔ لہٰذا میں ذرا جم کر بیٹھ گیا اور گہری نیند سوئے ہوئے الیاس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔

پروفیسر الیاس صدیقی ...... عمر کے ڈھلتے ہوئے حصے میں تھا۔ نحیف ونزار تو وہ گویا پیدائشی تھا۔ کالج کے شریر لڑکوں نے اس کا نام ”پروفیسر سینک سلائی“ رکھ چھوڑا تھا۔ یہ نام سب کو معلوم بھی تھا لیکن جب ”پروفیسر سینک سلائی“ کو اپنے اس لقب پر اعتراض نہیں تھا تو مجھے کیا ہوتا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس وقت اس کے چہرے پر جو سکون اور اطمینان تھا وہ بے حد غیر معمولی تھا، ورنہ بہت سے لوگ تو ذرا بھی بیمار پڑتے ہیں تو چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتے ہیں لیکن پروفیسر الیاس صدیقی کے پُرسکون اور گہری طمانیت میں ڈوبے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خون کے سرطان میں مبتلا ہے اور اس کی زندگی شاید سال بھر سے زیادہ کی نہیں رہ گئی تھی۔

ثریا کو بھی احساس تھا کہ اس کا سہاگ زندگی کے آخری کنارے پر ہے لیکن اس مرحلے پر دعا کے سوا اور کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں پہنچ کر انسان کو اپنی وقعت معلوم ہو جاتی ہے۔ پروفیسر الیاس صدیقی کا نہایت پرسکون اور معصوم سا چہرہ، میرے سامنے تھا اور میں خود نقشِ حیرت بنا اسے تک رہا تھا۔

ہم دونوں یعنی میں ظہیر احمد طبیعیات (فزکس) کا پروفیسر اور الیاس صدیقی، کیمیا (کیمسٹری) کا پروفیسر ایک ہی کالج میں تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ہمارے شعبے بالکل مختلف تھے لیکن کالج کی دن بھر کی رفاقت اور آپس میں ایک خاص قسم کی ذہنی قربت اور ہم آہنگی نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔ یوں تو کالج میں اور بھی پروفیسرز تھے لیکن میری زیادہ دوستی، الیاس سے ہی تھی، یہی وجہ تھی کہ بہت سارے معاملات جن میں الیاس کسی اور سے بات کرتے ہوئے کتراتا تھا، مجھ سے بلا تکلف بیان کر دیتا تھا یہی صورت حال میری تھی، ہماری دوستی کسی ہم رازی کی حدود میں پہنچ چکی تھی۔

...... الیاس ...... ایک قابل کیمیا دان تھا۔ اس کا بیشتر وقت تدریس کے بعد کیمیا کی تجربہ گاہ میں گزرتا تھا۔ وہ اپنے نت نئے تجربات سے مجھے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا تھا جو کبھی میری سمجھ میں آتے، کبھی بالکل نہیں۔ بہرحال میں اپنے دوست کی حوصلہ افزائی ضرور کرتا تھا کہ یہ بھی دوستی کے فرائض میں سے ایک ہے۔

الیاس ایک محبت کرنے والی، وفادار اور سلیقہ شعار بیوی کا خاوند بھی تھا۔ البتہ اس کی زندگی میں ایک کمی تھی کہ اس کے ہاں ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ ثریا کو عورت ہونے کے ناتے، اس کا شدید احساس تھا لیکن بہرحال وہ خاوند کے ساتھ خوش تھی اور وہ اس کے ساتھ شاید اس خلا کو پر کرنے کے لیے وہ لکھنے لکھانے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا یا پھر شاید خود اس کے اندر خداداد صلاحیت نے سر ابھارا تھا۔ اکثر و بیشتر وہ مجھے اپنے افسانے اور کہانیاں پڑھنے کے لیے دیتا جن میں سے بعض ادبی رسائل و اخبارات میں بھی چھپیں۔ اس لحاظ سے وہ تھوڑا بہت جانے پہچانا جانا لگا لیکن باضابطہ طور پر کسی ادبی حلقے میں نہ وہ خود گیا، نہ اس نے کسی ادبی جریدے سے وابستگی اختیار کی۔ اسے وقت گزاری کا ایک مشغلہ کہا جا سکتا تھا۔ یہ تھا اس کی کل زندگی کا خاکہ۔

ایک سیدھا سادہ بلکہ آج کل کے حساب سے بدھو قسم کا پروفیسر جس میں کوئی نیا پن، کوئی رنگینی، کوئی رعنائی کم ہی تھی۔

اس کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی تھا جو شاید صرف مجھے ہی معلوم تھا۔ غالباً ثریا کو بھی اپنے خاوند کی شخصیت کے اس پہلو کا پوری طرح اندازہ نہ ہوا ہوگا۔ کیونکہ وہ شاید اس موضوع پر اپنی بیوی سے بھی بات نہیں کرتا ہوگا۔ وہ پہلو یہ تھا کہ اس کی سوچ کا دھارا اکثر فطرت کی مخالف سمت بہتا تھا۔ اسی وجہ سے کالج کے دوسرے ساتھی اساتذہ اسے خبطی سمجھتے تھے۔ ممکن تھا کہ میں بھی اسے ایسا ہی سمجھتا لیکن اس سے میری ذہنی قربت مجھے اس بات پر مجبور کرتی تھی کہ میں اسے خبطی نہ سمجھوں، بلکہ اس کی گفتگو کی تہ میں اتر کر دیکھوں جو عام لوگوں سے ہٹ کر ہوتی تھی۔

شاید پورے کالج میں، میں ہی واحد شخص تھا جو اس... پُراسرار سے الجھے ہوئے پیچیدہ شخص کی گفتگو غور سے سنتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ پروفیسر الیاس صدیقی میرا دوست جو اپنی ذات میں شاید کسی پیچیدہ کیمیائی فارمولے کی طرح ہی تھا جو ایک نظر میں ممکن ہے بہت سے لوگوں کی سمجھ میں ہی نہ آئے۔ لیکن جب گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو اس میں کسی انوکھی تخلیق کے اجزائے ترکیب پاتے نظر آ جائیں، شرط صرف حسن نظر کی ہوتی ہے اور یہ خود میری ہی کمزوری تھی کہ میں ابھی

تک اس کے بھید کو نہیں پا سکا تھا۔ ہاں اس کی تہ میں اترنے کی کوشش ضرور کرتا تھا جبکہ باقی لوگوں کے لیے وہ ایک خبطی پاگل اور سودائی تھا۔

اسے مزید سمجھنے کے لیے میں نے اس کی تحریریں بھی پڑھی تھیں۔ اس کی لکھی ہوئی کہانیاں میری سمجھ میں آجاتی تھیں مگر افسانے تو میرے سر سے گزر جاتے تھے، یا پھر شاید میری اپنی ذہنی سطح اس مقام تک نہیں پہنچی تھی، تاہم اس ضمن میں اس کا کہنا تھا کہ ہمارے ادبی جگادریوں نے علامتی افسانے کو ملامتی بنا کر ہی چھوڑا اور اس میں کہانی ڈال دی، جبکہ دیکھا جائے تو ہمارا اردو ادب علامتی افسانے سے مشہور ہوا۔ اس کے استعاروں میں آگہی، شعور اور وسعتِ خیال کی جھلک ملتی ہے۔ منشی پریم چند کا افسانہ کفن، ندیم کا الحمدللہ اور ''ابا پہلے کیوں نہیں مرگئے'' جیسے افسانوں کی بھی اس نے مجھے مثالیں دیں مگر مجھے اردو ادب سے کہاں دلچسپی تھی۔ میں اس کی باتوں پر سر ہی دھنتا۔

ثریا چائے لے کر آگئی۔ اتنی دیر میں، میں یہ سب کچھ گویا پل بھر میں سوچ چکا تھا۔

الیاس بہ دستور محوِ خواب تھا۔ ثریا نے چائے بنا کر ایک پیالی مجھے تھما دی اور دوسری خود سنبھال لی۔ میں نے ایک نظر اسے دوبارہ دیکھا اس کا چہرہ غم واندوہ اور فکر سے ستا ہوا تھا۔ میں نے رسمی تسلی کے چند کلمات ادا کرنے کے بجائے اس کے گھرانے یعنی میکے کی باتیں شروع کردیں۔ توقع کے مطابق پہلی بار اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی اور وہ مجھے اپنی والدہ اور بھائیوں کی مصروفیات کے بارے میں بتانے لگی۔

چائے کے بعد ثریا برتن سمیٹ کر لے گئی تو میں الیاس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اسی طرح گہری نیند سو رہا تھا۔ مجھے سرما کی وہ صبح یاد آگئی جب گرم دھوپ میں ہم دونوں کالج کے ایک الگ گوشے میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے اور وہ ہمیشہ کی طرح کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میرے توجہ دلانے پر گفتگو کا آغاز اسی نے کیا تھا۔

''یار ظہیر! زندگی واقعی بہت خوب صورت ہے۔'' ہمیشہ کی طرح وہ عجیب سے انداز میں بولا۔ اس کا گہری سوچ میں ڈوبا ہوا چہرہ کسی انوکھے تاثر کا حامل تھا۔

''بے شک۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''لیکن ظہیر! اگر اس خوب صورت زندگی کو دوام مل جائے تو کیا اس کے حسن میں مزید اضافہ نہیں ہوجائے گا۔'' اس نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''قطعی نہیں۔'' میں نے بلاتعویق و تامل کہا۔ ''پھر یہ زندگی حسین نہیں بلکہ سنگین ہوجائے گی۔''

اس نے بہ غور مجھے دیکھا اور بولا۔ ''ظہیر...... تم نے زندگی کو اس طرح محسوس نہیں کیا، جس طرح میں کرتا ہوں مگر اس میں تمہارا کوئی دوش نہیں ہے۔ تم فزکس کے پروفیسر ہو نا اس لیے زندگی کو بھی ایک مادے...... ٹھوس مادے کی طرح سمجھتے ہو۔'' اتنا کہہ کر وہ چپ ہو رہا اور میں اس کی بات سے کچھ اخذ کرنے کی سعی میں لگ گیا۔

مجھے خاموش پا کر وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اب تم یہی دیکھ لو...... میں کیمسٹری کے شعبے سے وابستہ ہوں اور اپنی ذاتی رائے اور نظریے کے مطابق زندگی کے لیے ایک الگ تعریف رکھتا ہوں جس کے تحت زندگی کچھ ایسے عناصر کی ترتیب کا نتیجہ ہے جو باہم مل کر کمپاؤنڈ بناتے ہیں اور پھر ایک مضبوط اور مکمل بانڈ بناتا ہے۔''

میں نے اس کی الجھی ہوئی سی گفتگو کو کسی نتیجے پر پہنچانے کی غرض سے کہا۔ ''چلو...... بہ قول تمہارے، زندگی کو دوام مل جائے تو یہ اور حسین ہوجائے گی...... مگر یہ کس طرح ممکن ہے کہ زندگی ہمیشگی پالے؟''

''ممکن ہے...... میں اسے ممکن بناؤں گا۔'' وہ بے ساختہ بولا اور میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ پُرجوش لہجے میں بول رہا تھا۔

''میں کچھ ایسے طاقتور عناصر کو کمبائن کرنا چاہتا ہوں جن سے انسانی زندگی کو ہمیشگی عطا ہوجائے اسے کبھی موت نہ آئے...... میں ایک ایسے ہی سربستہ راز سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں...... ایک انوکھی ایجاد کرنا چاہتا ہوں جو میری زندگی کو دائمی بنادے اور مجھے کبھی موت نہ آئے۔''

''گویا تم آبِ حیات قسم کی کوئی چیز ایجاد کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''قطعی طور پر۔'' وہ یکدم بولا اور میں اس کی اس نامعقول بات سے آج کے جدید اور سپر سائنسی دور کا موازنہ کرنے لگا۔ میرے اندر کھد بدی ہونے لگی تھی۔ میں نے اسے چھیڑا۔

''یار! کیا بات کررہے ہو تم، خود تم سائنس کے پروفیسر ہو اور ایسی بات پر بھی یقین رکھتے ہو...... یہ مقام حیرت نہیں؟ یہ تو پرانے وقتوں کی قصے کہانیوں کا موضوع رہا ہے۔''

''نہیں...... قطعی نہیں۔'' وہ فوراً اختلاف کرتے ہوئے قدرے زوردار لہجے میں بولا۔

''ظہیر! دورِ آفرینش سے، جب انسان کی عقل نے ستاروں پر کمندیں نہیں پھینکی تھیں تو وہ سورج، چاند کو دیوتا مانتا تھا اور آگ کی بھی پوجا کرتا تھا، حتیٰ کہ کرۂ ارض پر ہونے والی

تبدیلی آب و ہوا کو بھی یوجتا...... لیکن پھر جیسے جیسے عقلِ انسانی شعور کی بلندیوں تک پہنچنے لگی تو کائنات کے رازہائے سربستہ اس کے سامنے بے نقاب ہوتے چلے گئے...... یہ آبِ حیات بھی بے شک گئے وقتوں کا ایک سربستہ راز ہے لیکن ہنوز آج تک اس پر سے پردہ نہیں اٹھایا جاسکا۔ اسے محض قصے کہانیوں کا موضوع سمجھتے ہوئے جھٹلایا جاتا رہا...... لیکن میں اسے ایک دن ضرور بے نقاب کروں گا۔''

چاروں طرف جیسے ایک گمبھیر خاموشی چھا گئی تھی۔ چند ثانیے بعد الیاس مجھ سے رازدارانہ لہجے میں بولا۔

''دیکھو دوست! اس بات کو ابھی اپنے تک ہی محدود رکھنا۔ اگر میں آبِ حیات بنانے میں کامیاب ہوگیا تو یقیناً تم بھی اس سے فائدہ اٹھا سکو گے...... کیونکہ تم میرے دوست ہو...... ایک اچھے اور سنجیدہ دوست۔''

وہ آخر میں عجیب سے انداز میں میری طرف دیکھ کر بولا اور پھر جانے کیوں مجھے اپنے اندر ایک سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی اور جب میں وہاں سے اٹھ کر جانے لگا تو عقب سے اس کے قہقہے کی آواز صاف سنائی دی تھی۔

زندگی اپنی پرانی ڈگر پر چلی جارہی تھی۔ وہی صبح کالج جانا، واپسی پر گھر کے فرائض...... پھر اگلے دن کا سورج وہی پیغام لاتا لیکن اب ایک تبدیلی دکھائی دے رہی تھی۔ الیاس اب کچھ زیادہ ہی مصروف اور مجھ سے بھی کچھ دور دور رہنے لگا تھا۔ دوسرے ساتھی اساتذہ پہلے ہی اسے زیادہ منہ لگانے کے لائق نہیں سمجھتے تھے۔ رسمی سلام دعا سے زیادہ اس کی بات چیت کسی سے بھی نہیں ہوتی تھی۔ اب تو وہ اکثر لیکچر دیتے ہی کالج سے گھر چلا جاتا۔ پھر ایک دن کالج سے لمبی رخصت لے کر چلا گیا اور اس دوران میں اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔

لگ بھگ دو ڈھائی ماہ کا عرصہ خاموشی سے گزر گیا پھر ایک دن الیاس کی شدید علالت کی اطلاع ملی اور یہ اطلاع ملتے ہی آج میں اس کے نزدیک بیٹھا تھا۔

☆☆☆

وہ گہرے سکوت کی چادر اوڑھے میرے سامنے لیٹا تھا۔ کچن سے برتن دھونے کی آواز خاموش ہوچکی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے الیاس کو جگانے کی ہمت نہیں ہو پارہی تھی لیکن صرف چپ رہ کر بھی تو عیادت نہیں کی جاسکتی۔

''ال...... الیاس......''

آخر میں نے اس کا شانہ ہولے سے ہلا کر اسے آواز دی۔ دو تین بار ہلانے اور آواز دینے پر اس نے اپنی خوابیدہ آنکھیں دھیرے سے کھولیں اور بے اختیاری کے عالم میں آنکھیں میچ لیں، میرے تیسری بار آواز دینے پر اس نے اب باقاعدہ آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کسی نامعلوم سے تاثر کا ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا پھر اس کی آنکھوں میں پہچان کی چمک ابھری اور وہ ''تم'' کہتے ہوئے کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے فوراً ہی اسے سہارا دے کر زبردستی لٹادیا۔

''الیاس! تم نے یہ کیا کیا...... مجھے بھی خبر تک نہیں دی تم تو ثریا کے ساتھ ایسے غائب ہوئے کہ میں جب بھی آیا تمہارے اپارٹمنٹ پر تالا ہی ملا۔ کوئی خط تک نہیں لکھا۔ ایسی بھی کیا بے مروتی!'' میں نے شکایات کا دفتر کھول دیا۔ وہ دھیرے سے مسکرا کر رہ گیا۔

''بس یار! معاف کردو، ایسے چکروں میں تھا کہ کسی کو کچھ نہیں بتاسکا۔ تم کچھ خیال نہیں کرنا۔'' اس نے رک رک کر کہا۔

''اور تم نے یہ اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے، ثریا کا خیال بھی نہیں کیا۔ اس کا کون ہے تمہارے بعد؟ اتنے بیمار تھے تو اطلاع کرتے، ہم لوگ کچھ کرتے......'' میں نے دوستانہ غصہ دکھایا۔

میری بات پر وہ نقاہت بھرے انداز سے مسکرا دیا۔

''ظہیر...... کچھ نہیں ہوا مجھے...... کچھ بھی نہیں ہوگا مجھے یار......!''

وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ مجھے اس کے لہجے میں وہی ہٹیلا پن اور اسی روایتی خوداعتمادی کی جھلک محسوس ہوئی جو اس کے مزاج کا حصہ تھی۔ میں نے سوچا کہ اس کی بیماری وغیرہ کے بارے میں اس سے استفسار کرنا محض روایتی اور فرسودہ ہی نہیں بلکہ بار بار اسے ایک ہی کڑوی گولی کھلانے کے مترادف ہوگا لہٰذا میں ماحول کی کدورت کو دور کرنے کی غرض سے موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

''ہاں...... ہاں یار! مجھے معلوم ہے تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ بھلا ایسے انسان کو کیا ہوسکتا ہے جس نے بذاتِ خود موت کو شکست دینے کی ٹھان رکھی ہو۔''

میں نے غیرمحسوس طریقے سے اسے ایک پرانے موضوع کی یاددلادی تھی اور شاید وہ بھی میرا اشارہ سمجھ چکا تھا۔ میں نے دیکھا اب اس کے پژمردہ چہرے پر زندگی کے اجلے رنگ بکھر گئے تھے۔

''میں جانتا تھا ظہیر کہ تم ضرور آؤ گے بلکہ میں یہ بھی دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تم میری عیادت کے لیے نہیں...... کسی اور مقصد کے لیے آئے ہو۔''

''ہاں! شاید تم درست کہہ رہے ہو۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''اچھا مجھے بتاؤ کہ وہ تمہارا ''آبِ حیات'' والا فارمولا کیا ہوا؟'' میں نے گہرے تجسس سے پوچھا۔

"ظہیر! میں چند دنوں کا مہمان ہوں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "مگر مجھے اس کی ذرا بھی فکر نہیں...... اس لیے کہ میں اپنا کام مکمل کر چکا ہوں۔ میں اب موت سے خائف نہیں ہوں۔"

"اچھا...... تو گویا یہ آبِ حیات بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔" میرے اندر کسی نے سرگوشی کی۔

"ہاں ظہیر! میں نے آبِ حیات کی تخلیق مکمل کر لی ہے۔" اس کا لہجہ سنسنی خیزی لیے ہوئے تھا۔ "بس! اب ایک تجربے کی دیر ہے۔ تم انشاء اللہ عنقریب میری کامیابی کی ایک حیران کن خبر سنو گے۔"

اس کی سانس پھولنے لگی تھی، اس لیے وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے دیکھا، جوش اور ایک خاص قسم کے تیقن نے اس کے زرد پڑتے چہرے کو توانا کر دیا تھا۔ میرا سویا ہوا تجسس ایک بار پھر جاگنے لگا تھا۔

"تو...... تو پھر تم اب تک اس تکلیف دہ حالت میں کیوں ہو...... تم اپنے فارمولے کو خود پر آخر کب آزماؤ گے؟ تمہیں تو واقعی اب کسی آبِ حیات ہی کی ضرورت ہے جو تمہیں فوراً زندگی کی طرف لوٹا سکے۔"

"دھیرج...... میرے ہم راز...... میرے دوست...... ہر دیرپا دوا کا اثر دیر ہی میں ظاہر ہوتا ہے۔"

میں سوچنے لگا۔ یہ پاگل تو نہیں ہو گیا یا واقعی اس سنکی اور خبطی کیمیا گر نے "آبِ حیات" تخلیق کر لیا ہے؟ بہرحال میں نے رسمی خوشی کا اظہار کیا۔

"یار میرے! اگر تم اپنے تجربے میں واقعی کامیاب ہو گئے ہو تو یقین جانو مجھے سب سے زیادہ خوشی تمہارے آبِ حیات کے فارمولے کی کامیابی پر نہیں بلکہ تمہارے زندگی کی طرف دوبارہ لوٹ آنے پر ہو گی...... میں تم جیسے دوست کو کھونا نہیں چاہتا۔"

یہ کہتے کہتے میں یکدم دل گیر سا ہو گیا تھا۔ اس پر مجھے خود بڑی حیرت تھی کہ اچانک یہ مجہول سا شخص مجھے کیوں بہت اچھا لگنے لگا تھا۔

"میرے دوست! مجھے ضرور کامیابی ہو گی، انشاء اللہ مجھے یقین ہے کہ موت کو بالآخر شکست کا سامنا ہی کرنا پڑے گا۔"

وہ پھولی ہوئی سانس اور یقین کے ساتھ بول رہا تھا۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ میں نے اس پر مزید بوجھ ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور تسلی و تشفی کے چند الفاظ کہہ کر رخصت لی۔ ثریا کی آنسو بھری آنکھیں دیر تک میرے خیالات پر چھائی رہیں۔

اس کے چند دن بعد مجھے الیاس صدیقی کے انتقال کی خبر ملی۔ میں اور کالج کے دیگر افراد اور لیکچرار اور بہت سے طلبا الیاس صدیقی کی تدفین میں شریک ہوئے۔ سوئم میں بھی کالج سے تعلق رکھنے والے افراد کی تعداد خاصی تھی۔ ایک دو روز تک الیاس صدیقی کا تذکرہ ہوتا رہا پھر ایسا لگا کہ لوگ اسے بھول بھال گئے۔ انسان کا حال یہی ہے، اپنے قریب ترین عزیز کی موت پر خوب روتا چلاتا ہے لیکن کچھ ہی دنوں بعد زندگی کی دیگر دلچسپیوں میں کھو کر گویا اپنا غم بھول جاتا ہے۔

☆☆☆

اس دن موسم خاصا خوشگوار تھا مگر میری طبیعت پر جانے کیوں قنوطیت سی طاری تھی۔ موسمِ گرما کی تعطیلات تھیں۔ فارغ بیٹھنے کے لیے ایک لگے بندھے معمول کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ اکتاہٹ مارے ڈالتی ہے۔

میں یونہی ایک دن شہر کے مرکزی بازار آ گیا۔ ایک بُک اسٹال سے کوئی اخبار خریدتے ہوئے اچانک نظر شیشے کے شیلف میں رکھی ایک کتاب پر پڑی اور میں چونک گیا۔ میں نے وہ کتاب نکلوائی اور بہ غور اس کے سرورق کو دیکھنے لگا جس پر جلی حروف میں کتاب کا عنوان "آبِ حیات" اور نیچے مصنف کا نام پروفیسر الیاس صدیقی تحریر تھا۔ یہ کوئی ضخیم ناول تھا جو میرے مرحوم دوست الیاس صدیقی ہی کا تحریر کردہ تھا۔ میں وہیں کھڑا ہو کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

مذکورہ ناول کا فلیپ ایک بڑے کہنہ مشق ادیب اور تنقید نگار کا تحریر کردہ تھا جس میں انہوں نے فاضل مصنف کی کتاب پر اپنی مستند رائے دیتے ہوئے لکھا تھا۔

"زیرِ نظر ناول "آبِ حیات" کو حال ہی میں اگرچہ ایک بڑے ادبی انعام سے نوازا گیا ہے، جو اپنی جگہ ایک بڑا اعزاز سہی...... لیکن میری ذاتی رائے کے مطابق بذاتِ خود یہ ناول اردو ادب کے لیے ایک بیش قدر انعام ہے جو مرحوم الیاس صدیقی کا رہین منت ہے۔ بے شک فاضل ادیب کا یہ ناقابلِ فراموش ناول خود مصنف کے لیے "آبِ حیات" کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، جسے پی کر وہ ہمیشہ کے لیے امر اور زندہ و جاوید ہو گیا۔"

میں نے کتاب بند کی، اس کی قیمت چکائی اور جب واپس گھر کی جانب لوٹنے لگا تو میری آنکھیں نم ہونے لگیں اور میں بے اختیار نمناک لہجے میں بڑبڑایا۔

"بے شک میرے دوست! تم اپنے تجربے میں کامیاب رہے...... تم نے واقعی "آبِ حیات" دریافت کر لیا۔ تمہارا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔"

رخِ تقدیر

سلیم فاروقی

بچپن، جوانی اور پھر بڑھاپا... ہر انسان مختلف دور میں مختلف حالات کا شکار رہتا ہے... یہ کوئی اتنی اچنبھے والی بات نہیں ہے مگر... اچانک گھپ اندھیرے میں کوئی ہزار واٹ کا بلب روشن کردے تو حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی چندھیا جاتی ہیں اور یہی حال اس کا بھی ہوا جس کی جیب میں ایک روٹی کے لیے بھی پیسے نہیں تھے اور اچانک ہی گویا اسے بیٹھے بٹھائے ”چھپن کروڑ کی ایک چوتھائی“ مل گئی... اب آنکھیں چندھیا چندھیا کر بند نہ ہونے لگیں تو کیا ہو اور بند آنکھوں سے کب کسی نے درست منزل پائی ہے... لہٰذا اسے بھی ٹھوکر لگی اور ایسی لگی کہ منہ کے بل گرتے ہوئے اس نے دنیا کے تمام رنگوں کو آپس میں گڈمڈ ہوتے دیکھ لیا۔ ہر رنگ کا کھوج لگاتے لگاتے وہ اس انتہا تک پہنچ گیا تھا جہاں ایک چوتھائی کیا پورے چھپن کروڑ بھی اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ بس جناب تقدیر اسی کو کہتے ہیں جیسے تیز ہوا میں کوئی پتنگ اونچی اڑان بھرتی جائے اور پھر اچانک ڈور کٹتے ہی وہ اِدھر اُدھر ڈولتی، بے سمت کسی بھی دروازے پر گر جائے۔

زمین سے اٹھ کر آسمان پر بیٹھنے والے ایک ذرے کی حقیقتوں کی عکاس داستان

آفتاب غنی ہوٹل سے باہر نکلا تو بری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کی نوجوان اور خوب صورت بیوی اسے سہارا دیے کرلے جارہی تھی۔ آفتاب غنی کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔ وہ خاصا خوبرو اور باوقار شخص تھا لیکن مسلسل شراب نوشی نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔

''جب برداشت نہیں کرسکتے ہو تو اتنی پیتے کیوں ہو؟'' اس کی بیوی نورین نے کہا۔

''شٹ اپ!'' آفتاب دہاڑا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو، میں تمہارے سہارے چل رہا ہوں۔ چھوڑو میرا ہاتھ۔ مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔'' آفتاب نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔

اچانک ہوٹل سے ارشد زبیری باہر نکلا اور ان کی طرف لپکا۔ وہ آفتاب غنی کا قانونی مشیر اور اس کا بے تکلف دوست تھا۔ ''آفتاب! تم ابھی تک یہیں ہو؟''

''ہاں، نورین کو اندر شاپس سے کچھ شاپنگ کرنا تھی۔'' آفتاب نے کہا۔ ''اسی میں دیر ہوگئی۔''

''تم کوئی ڈرائیور کیوں نہیں رکھ لیتے؟'' زبیری نے کہا۔ ''تم اس حالت میں ڈرائیونگ کر نہیں سکتے، نورین بھابی کو بھی ڈرائیونگ نہیں کرنے دیتے ہو۔ آخر تم نے سوچا کیا ہے؟''

''ارے یار اب تم بور مت کرو۔''

''او ہو!'' زبیری نے کہا۔ ''میں اپنا سیل فون اندر ہی بھول آیا۔''

وہ جانے کے لیے مڑا تو آفتاب طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''بھول آئے تو اب اسے بھول جاؤ۔ ان بڑے ہوٹلوں اور کلبوں میں آنے والے معزز لوگ ایماندار نہیں ہوتے۔''

اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی زبیری اندر جاچکا تھا۔ آفتاب نے طنزیہ قہقہہ لگایا اور پھر سڑک پار کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا کیونکہ اس کی گاڑی سڑک کے دوسری طرف پارک تھی۔ نورین نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی لیکن آفتاب نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور بولا۔

''میں پورے ہوش وحواس میں ہوں اور اپنا بوجھ خود اٹھا سکتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ سڑک کی طرف بڑھا۔

رات خاصی گزر چکی تھی۔ اس کے باوجود اچھا خاصا ٹریفک تھا۔ نورین اس سے چند قدم کے فاصلے پر چل رہی تھی اور غصے میں ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ آفتاب نے دونوں طرف دیکھا۔ دور سے ایک گاڑی کے ہیڈ لیمپس چمک رہے تھے لیکن وہ اس وقت خاصے فاصلے پر تھی۔

آفتاب ٹریفک دیکھ کر سڑک کراس کرنے لگا۔ اس کی رفتار اگر معمول کے مطابق ہوتی تو وہ آسانی سے سڑک پار کر لیتا لیکن وہ بہت آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا جارہا تھا تاکہ نورین کو یہ محسوس نہ ہو کہ اس کے قدم ڈگمگا رہے ہیں۔

آنے والی گاڑی کی رفتار بہت زیادہ تھی۔ وہ اچانک آفتاب کے سر پر آپہنچی۔ ڈرائیور نے پوری قوت سے بریک لگائے۔ سڑک پر ٹائروں کی رگڑ سے چرچراہٹ کی آواز آئی۔ اس کے باوجود ڈرائیور گاڑی پر کنٹرول نہ رکھ سکا۔

قریب تھا کہ آفتاب گاڑی سے کچلا جاتا، اچانک ایک نوجوان اس کی طرف جھپٹا اور اسے گاڑی کی زد سے بچالیا۔ اس کے باوجود گاڑی کا دایاں حصہ خفیف سا آفتاب سے ٹکرا گیا۔ گاڑی کی اس ہلکی سی ٹکر سے بھی آفتاب اچھل کر فٹ پاتھ پر جاگرا۔ اس کے ساتھ ہی وہ نوجوان بھی گرا لیکن فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور تیزی سے آفتاب کے پاس پہنچا۔ ''آپ ٹھیک ہیں سر؟'' اس نے پوچھا پھر اس کی نظر آفتاب کے پیر پر پڑی جس سے خون نکل رہا تھا لیکن آفتاب ہوش میں تھا۔ گاڑی والا آفتاب کو ٹکر مارنے کے بعد فرار ہوگیا تھا۔

''میں کوئی گاڑی دیکھتا ہوں۔'' نوجوان نے کہا۔ ''ایمبولینس کے آنے میں تو دیر لگے گی۔ آپ کا خون بہہ رہا ہے۔''

''ڈونٹ وری بوائے۔'' آفتاب نے نقاہت بھری آواز میں ہنسنے کی کوشش کی۔ ''وہ سامنے میری گاڑی کھڑی ہے۔'' اس نے ایک لینڈ کروزر کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟''

''جی سر!'' نوجوان نے جواب دیا۔

آفتاب نے جیب میں ہاتھ ڈال کر گاڑی کی چابی نکالی اور نوجوان کو دے دی۔ نورین ابھی تک سڑک کی دوسری جانب کھڑی ادھر آنے کا انتظار کررہی تھی۔ اس وقت تک زبیری بھی لوٹ آیا تھا۔

نوجوان نے پھرتی سے آفتاب کو اٹھایا اور گاڑی کی طرف دوڑا۔ اس نے آفتاب کو عقبی نشست پر لٹایا اور گاڑی کا انجن اسٹارٹ کردیا۔ نورین اور زبیری اسے آوازیں ہی دیتے رہ گئے لیکن نوجوان کے کانوں تک ان کی آوازیں نہیں پہنچیں۔ وہ لمحوں میں وہاں سے روانہ ہوگیا۔

''مجھے فوراً آغا خان اسپتال لے چلو۔'' نوجوان نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی انتہائی مہارت اور تیز رفتاری سے دوڑانے لگا۔

''گاڑی کی اسپیڈ کچھ کم کردو۔'' آفتاب نے کہا۔ ''مجھے جھٹکے لگنے سے تکلیف ہو رہی ہے۔''

''سوری سر!'' نوجوان نے کہا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' آفتاب نے پوچھا۔

''میرا نام اسد ہے سر۔'' نوجوان نے جواب دیا۔

''اسٹوڈنٹ ہو؟'' آفتاب نے پوچھا۔ شاید وہ باتیں کر کے تکلیف سے توجہ ہٹانا چاہتا تھا۔

''میں نے گریجویشن کیا ہے سر!'' اسد نے کہا۔ ''آج کل ملازمت کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔''

اس وقت تک وہ آغا خان پہنچ چکے تھے۔ آفتاب کو فوری طور پر ایمرجنسی وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ وہ اسپتال کے برآمدے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد آفتاب کو کمرے میں منتقل کر دیا گیا اور ڈاکٹر نے بتایا۔ ''پریشانی کی بات نہیں ہے۔ سیٹھ صاحب کی بائیں پنڈلی میں معمولی سا فریکچر ہے۔ آپ چاہیں تو ان سے مل سکتے ہیں۔''

اسد، آفتاب کے کمرے میں داخل ہوا۔ آفتاب بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔

''آؤ بھائی آؤ۔'' آفتاب نے ہنس کر کہا۔ ''تم نے تو بالکل فلمی ہیرو کے انداز میں انٹری دی ورنہ اس وقت میری لاش کسی سرکاری اسپتال کے مردہ خانے میں پڑی ہوتی۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

''سر! اس میں میرے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا بس اس وقت مجھے یہی خیال آیا کہ ایک انسانی جان خطرے میں ہے اور......''

''اگر میرے ساتھ ساتھ تم بھی گاڑی کی لپیٹ میں آجاتے تو......؟''

''تو پھر میری لاش بھی وہیں پڑی ہوتی۔'' اسد نے کہا۔ ''اور اچھا ہی ہوتا میں مر جاتا...... کم از کم اس دنیا کے مسائل سے تو جان چھوٹ جاتی۔''

''ارے بھئی، تم ابھی نوجوان ہو، قابلِ رشک صحت کے مالک ہو، تمہاری شخصیت بھی خاصی پرکشش ہے پھر ایسی مایوسی کی باتیں کیوں؟''

''سر! اس دنیا میں ماں کے سوا میرا کوئی بھی نہیں تھا۔ ماں نے محنت مشقت کر کے، لوگوں کے کپڑے سی کر اور گھر گھر برتن مانجھ کر مجھے پالا، پوسا، اچھی تعلیم دلائی لیکن میں ایسا بدنصیب بیٹا ہوں کہ اپنی ماں کی خدمت بھی نہ کر سکا۔ میں ملازمت ہی تلاش کرتا رہا اور وہ مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی۔ اب میں جیوں بھی تو کس کے لیے؟'' اسد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''مجھے افسوس ہوا۔'' آفتاب نے کہا۔ ''سوری بوائے، میں نے تمہیں افسردہ کر دیا۔''

''میں خوش ہی کب تھا جو آپ مجھے افسردہ کریں گے۔'' پھر وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو تکلیف ہو رہی ہو گی۔ مجھے کسی کا نمبر بتائیں تاکہ میں آپ کے گھر والوں کو اطلاع دے سکوں۔''

''کسی کو اطلاع دینے کی ضرورت نہیں ہے اسد میاں۔'' آفتاب نے کہا۔ ''جب وہ گاڑی مجھ سے ٹکرائی تھی تو میری بیوی سڑک کی دوسری جانب موجود تھی۔ اس نے بھی یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو گا لیکن اسے تو میری پروا ہی نہیں ہے، ورنہ وہ اب تک آ چکی ہوتی۔ وہ جانتی ہے کہ میں آغا خان اسپتال کے علاوہ اور کہیں نہیں جاتا۔''

اسی وقت دروازہ کھلا اور نورین اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے زبیری بھی تھا۔

''آپ خیریت سے تو ہیں آفتاب؟'' نورین نے تشویش سے پوچھا۔

''اگر خیریت سے نہ ہوتا تو اس وقت میں یہاں نہیں اسپتال کے آئی سی یو میں ہوتا۔ بس پیر میں ہلکا سا فریکچر ہے۔''

نورین، اسد کی جانب مڑی۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے میرے شوہر کی جان بچائی۔''

''شوہر؟'' اسد نے حیرت سے سوچا، یہ کم عمر اور خوب صورت لڑکی اس بوڑھے سیٹھ کی بیوی ہے؟

اچانک آفتاب نے کہا۔ ''ارے، تم بھی زخمی ہو۔ تمہاری ایک آستین خون میں تر ہے۔ میں بھی کیسا خود غرض ہوں، میں نے......''

''فٹ پاتھ پر گرنے سے میری کلائی میں معمولی سی خراشیں آئی ہیں۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

آفتاب اس وقت تک نرس کو بلانے کے لیے بٹن دبا چکا تھا۔ فوراً ہی نرس کمرے میں داخل ہوئی اور آفتاب کی ہدایت پر اسد کو باہر لے گئی۔

''اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟'' زبیری نے پوچھا۔

''طبیعت تو تمہارے سامنے ہے، میرے پیر پر پلاسٹر تو تمہیں بھی نظر آ رہا ہو گا؟'' آفتاب نے جواب دیا۔ ''تھینکس گاڈ! اگر وہ لڑکا تمہیں نہ گھسیٹتا تو......''

''تو میں اس گاڑی سے کچل کر مر جاتا۔'' آفتاب نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد اسد بھی پٹی وغیرہ کرا کے آ گیا اور

ہنس کر بولا۔ ”آپ نے فضول میں اتنی تکلیف کی سر...... ہاکی کھیلتے ہوئے، دوڑتے ہوئے تو اس سے زیادہ چوٹیں لگی ہیں مجھے۔“

زبیری نے جیب سے کچھ بڑے نوٹ نکالے اور اسد کی طرف بڑھا دیے۔ ”لو یہ رکھ لو۔“

”فور وھاٹ سر؟“ اسد نے پوچھا۔

”ارے بھئی رکھ لو، تم نے میرے دوست کی جان بچائی ہے۔“

”شکریہ سر۔“ اسد نے کہا۔ ”میں نے کسی لالچ میں سر کی جان نہیں بچائی۔“

”کم ہیں تو اور لے لو۔“ نورین نے کہا اور اپنا ہینڈ بیگ کھولا۔

”رہنے دو نورین۔“ آفتاب نے کہا پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر چیک بک نکالی، گھٹنے پر رکھ کر چیک لکھا اور اسد کو دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ لے لو۔ یہ میری جان بچانے کا معاوضہ نہیں ہے بلکہ میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں۔ دیکھو، اب انکار مت کرنا۔“

”لیکن سر......“ اسد نے کچھ کہنا چاہا۔

”نو۔“ آفتاب نے اسے ٹوک دیا۔ ”اسے رکھ لو۔“

اسد نے بے بسی سے آفتاب کو دیکھا پھر چیک لے کر جیب میں رکھ لیا۔

”تمہارا بہت شکریہ۔“ نورین نے کہا۔ ”بس اب تم جاؤ۔“

اسد خاموشی سے باہر نکل گیا۔ وہ کوریڈور سے نکل کر لفٹ میں سوار ہوا اور گراؤنڈ فلور کا بٹن دبا کر جیب سے چیک نکال کر دیکھنے لگا۔ چیک دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ پانچ لاکھ روپے کا چیک تھا۔ اس وقت اسد کی جیب میں صرف دس بارہ روپے پڑے تھے۔ گزشتہ ہفتے مالک مکان نے اس سے مکان بھی خالی کرالیا تھا۔ کیونکہ گزشتہ چھ مہینے سے اس نے کرایہ نہیں دیا تھا۔ اس نے اپنا مختصر سامان اٹھا کر اپنے ایک جاننے والے کے گھر میں رکھ دیا تھا اس کا مکان بھی چھوٹا سا تھا اس لیے وہاں سامان تو کسی نہ کسی طرح آ گیا تھا لیکن اسد کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اس نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔ اب اس کے پیٹ میں اینٹھن ہو رہی تھی اور مزید چلنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ یوں بھی گزشتہ کئی دن سے وہ فٹ پاتھوں اور مختلف پارکوں میں سو رہا تھا۔ اس کے جسم پر جینز اور گہرے نیلے رنگ کی ٹی شرٹ تھی اس لیے اس کا لباس زیادہ برا نہیں لگتا تھا۔ شیو تو آج کل اچھے گھرانوں کے لڑکے بھی نہیں بناتے تھے، یہ بھی فیشن تھا۔

اس نے سوچا، رات یہیں اسپتال کے پارک میں گزار دوں۔ کوئی سیکیورٹی گارڈ پوچھے گا تو کہہ دوں گا کہ میں سیٹھ آفتاب کے ساتھ ہوں۔

وہ ایک بینچ پر بیٹھ گیا لیکن اسے اپنے سوا کوئی فرد وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسپتال میں مریض کے ساتھ اٹینڈنٹ کے رہنے پر پابندی تھی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر ٹہلتا ہوا آ خان کے جنرل وارڈ کی طرف چلا گیا۔ وہاں پارک کی بینچوں پر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ بھوک کے مارے اس کا برا حال تھا۔

اسے اپنی حالت پر ہنسی آ گئی۔ اس کی جیب میں پانچ لاکھ روپے کا چیک تھا لیکن چیک کیش کرانے کے لیے اسے صبح تک انتظار کرنا پڑتا۔ اس نے موبائل نکال کر ٹائم دیکھا اس وقت تین بج رہے تھے۔ گویا صبح ہونے میں ابھی پانچ چھ گھنٹے تھے۔ اس وقت تک اسے بھوکا رہنا تھا۔

اس کے برابر میں بینچ پر موجود دو افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں کے چہروں پر پریشانی کے تاثرات تھے۔ ان کے لباس بھی معمولی تھے۔ جانے وہ اپنے مریض کو کتنے جتن کر کے اس مہنگے ترین اسپتال میں لے کر آئے ہوں گے۔

اچانک ان میں سے ایک بولا۔ ”چچا! یہاں تو نزدیک کھانے کا کوئی ہوٹل بھی نہیں ہے۔ اسپتال کے کیفے ٹیریا میں کھانا بہت مہنگا ہے۔“

”باہر دیکھو، شاید کوئی چنے والا کھڑا ہو؟“ چچا نے کہا۔

”چنے والا؟“ نوجوان نے منہ بنا کر کہا۔ ”یہاں تو سیکیورٹی والے زیادہ دیر تک رکشا اور ٹیکسی کو نہیں رکنے دیتے۔ میں موٹر سائیکل پر جاتا ہوں اور کھانا لے کر آتا ہوں۔“

”اس وقت کھانا ملے گا کہاں؟“

”کہیں نہ کہیں تو مل ہی جائے گا۔“ نوجوان نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”سنیے۔“ اسد نے کہا۔ ”ایک روٹی میرے لیے بھی لے آئیے گا۔“ اس نے دس روپے کا آخری نوٹ نکال کر نوجوان کو دے دیا۔

”اور سالن؟“ نوجوان نے پوچھا۔

”بازار کا سالن میں نہیں کھاتا۔ کسی نہ کسی طرح پانی سے روٹی نگل لوں گا۔“

نوجوان کی واپسی ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ نہاری اور روٹیاں لے آیا تھا۔ ان لوگوں نے اسد کو بھی کھانے میں شامل کر لیا۔ پھر کچھ اونگھتے اور جاگتے صبح ہو گئی۔

پُراثر تحریروں اور رنگارنگ سلسلوں سے مرصع ستمبر 2016ء کا دلہن نمبر حاضر ہے

پاکیزہ کراچی

رفعت سراج ...... یہ کہاں بچیں کہ دل ہے ...... کی نئی قسط

انجم انصار، دُرِ ثمن بلال کے پُرلطف ناولوں کی نئی اقساط

فاخرہ گل کا اثرانگیز مکمل ناول محبت ہے سمندر سی

نیلو فر عباسی ...... کی زندگی کے فسانے کا خوب صورت بیان رضوانہ پرنس کے مشاق قلم سے

دلہن نمبر کے لیے شائستہ زریں

پاکیزہ کے مہمان میں تعارف کرائیں

گی شگفتہ یاسمین اور ان کے دولہا کا

عقیلہ حق، نگہت اعظمی اورسعدیہ رئیس کی اچھوتی تحریریں دلہن نمبر کے لیے

اس کے علاوہ

عذرا فردوس، ہاجرہ ریحان، طیبہ عنصر مغل، ہالہ احمد، نظیر فاطمہ، سلمیٰ غزل، فرح طاہر قریشی ودیگر مایہ ناز مصنفات کی مسحور کُن تحریریں

اس کے ساتھ ساتھ پڑھیے دلچسپ مستقل سلسلے وہ بھی صرف آپ جیسے باذوق پڑھنے والوں کے لیے

بینک کھلنے میں ابھی دیر تھی۔ اسد نے سوچا، سب سے پہلے میں مالکِ مکان کا کرایہ اس کے منہ پر ماروں گا۔ پھر اس نے سوچا، اس منحوس کو بقیہ کرایہ دینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس نے جس توہین آمیز انداز میں اپنے مکان سے نکالا تھا، وہ انداز تو میں کبھی بھول ہی نہیں سکتا۔ لعنت بھیجو اس کے بقایاجات پر۔ میں کسی اچھے علاقے میں کوئی مکان لوں گا اور عیش سے زندگی گزاروں گا۔ لگے ہاتھوں کوئی سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل بھی خرید لوں گا۔ پھر اطمینان سے ملازمت تلاش کروں گا۔

پھر اسے خیال آیا کہ میں بھی کیا خیالی پلاؤ پکا رہا ہوں۔ اس سیٹھ نے صرف پانچ لاکھ تو دیے ہیں۔ یہ پانچ لاکھ کتنے دن کام آئیں گے؟ یہ سوچ کر اس کا جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

دن کا اجالا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ اس نے جیب سے چیک نکال کر دیکھا۔ وہ شہر کے ایک بڑے بینک کا چیک تھا۔ اچانک وہ چونک اٹھا۔ سیٹھ نے چیک کی رقم صرف ہندسوں میں درج کی تھی۔ الفاظ والا کالم سادہ تھا۔ وہ مجرمانہ ذہنیت کا حامل نہیں تھا لیکن حالات کی سختیوں اور لوگوں کے رویے کے باعث ذہن میں کبھی کبھی مجرمانہ خیالات بھی جنم لینے لگتے تھے۔

اس نے دوبارہ چیک پر نظر ڈالی۔ آفتاب نے چیک کا اندراج سیاہ پوائنٹر سے کیا تھا۔ یہ بات بھی اس کے حق میں تھی۔ اس کی جیب میں بھی ایک سیاہ پوائنٹر تھا۔ اس نے جیب سے پوائنٹر نکالا اور اپنی جیب سے پرس نکالا جس میں سوائے فضول کاغذات اور وزیٹنگ کارڈز کے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے ایک وزیٹنگ کارڈ کی پشت پر اپنا نام لکھا اور اپنے پوائنٹر کی انک سے چیک میں درج شدہ انک کا موازنہ کیا، دونوں کا رنگ یکساں تھا۔ اب اسے اس رقم میں صرف ایک صفر کا اضافہ کرنا تھا۔ آفتاب نے اندراج بھی اتنی بے پروائی سے کیا تھا کہ اس میں ایک چھوڑ دو دو صفر کی گنجائش تھی۔ اس نے کارڈ کی پشت پر آفتاب کی طرح صفر لکھنے کی کوشش کی اور دو تین بار لکھنے کے بعد وہ اسی کی طرح صفر لکھنے لگا۔

پھر اس نے دل کڑا کر کے رقم میں ایک صفر کا مزید اضافہ کر دیا۔ پھر اس نے آفتاب کے دستخط پر غور کیا۔ اس نے ''آفتاب'' لکھنے کے لیے الٹا ''الف'' لکھا اور دو چار دفعہ پریکٹس کی پھر ہمت کر کے چیک میں "fifty lac only" کا اضافہ کر دیا۔

اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا لیکن اس نے اپنے ضمیر کو تھپک تھپک کر سلا دیا کہ اگر اب میں نے یہ چیک کیش نہ کرایا تو اس پانچ لاکھ کی رقم سے بھی جاؤں گا جو مجھے ملنے والی ہے۔

پھر اس نے چیک جیب میں رکھا اور اسپتال سے باہر نکلنے کا ارادہ کیا پھر یہ سوچ کر آفتاب کے کمرے کی طرف بڑھ گیا کہ اگر وہ جاگ رہا ہو تو اس کی مزاج پرسی ہی کر لے۔ اسپتال کے پرائیویٹ ونگ میں ملنے والوں کے مخصوص اوقات نہیں ہوتے ہیں۔

اسد نے ڈرتے ڈرتے آفتاب کے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ فوراً ہی اندر سے آفتاب کی بھاری آواز سنائی دی۔ ''یس کم ان۔''

اسد اندر داخل ہو گیا۔ آفتاب حسبِ سابق تکیوں کے سہارے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔

وہ اسد کو دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ ''تم...... تم اب تک یہیں ہو؟''

''سر! میں آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا۔'' اس نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

''تم کیا رات بھر باہر لان میں بیٹھے رہے؟'' آفتاب نے حیرت سے پوچھا۔

''جی سر! یہاں وارڈ میں تو بیٹھنے کی کوئی جگہ ہے نہیں۔ ایک برآمدہ ہے جہاں سیکیورٹی گارڈز بیٹھنے نہیں دیتے۔''

''تم بہت اچھے لڑکے ہو۔'' آفتاب نے کہا تو وہ شرمندہ ہو گیا کہ یہی اچھا لڑکا آپ کے اکاؤنٹ سے پانچ لاکھ کے بجائے پچاس لاکھ نکلنے کا پلان بنا رہا ہے۔

''سر! اس وقت تو آپ کی طبیعت اللہ کے کرم سے بہت بہتر ہے، اب مجھے اجازت دیں۔''

''میرا چھوٹا سا ایک کام کرو گے؟'' آفتاب نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''ضرور سر! آپ حکم دیں۔'' آفتاب نے کہا۔

''تو پھر ایسا کرو، مجھے دو بوتلیں شراب کی لا دو۔ میں رات بھر بے چین رہا ہوں۔ مجھے ایک دن بھی یہ مشروب نہ ملے تو میری حالت غیر ہو جاتی ہے۔''

''سر! آپ شراب چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟'' اسد نے کہا۔

اس کی بات پر آفتاب نے قہقہہ لگایا۔ ''میری بیوی بننے کی کوشش مت کرنا۔ اب تو میں اس کا اتنا عادی ہو چکا ہوں کہ شاید میرے جسم میں خون کی جگہ بھی شراب ہی گردش

کر رہی ہوگی۔ مجھے دو بوتلیں لادو۔''

''سر! میں نے آج تک شراب نہیں خریدی۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں ہے کہ ملک میں اس پر پابندی کے باوجود یہ اب بھی کہاں فروخت ہوتی ہے۔''

''تم فکر مت کرو، ایڈریس میں تمہیں سمجھا دوں گا اور دکان کے مالک روفی کو کال بھی کر دیتا ہوں ورنہ اتنی صبح سویرے تو اس کی دکان بھی نہیں کھلتی لیکن وہ میرا نام سن کر تمہیں دکان کھول کر بوتلیں دے دے گا۔'' پھر اسے کچھ خیال آیا اور بولا۔ ''ایسا کرو، تم میری گاڑی لے جاؤ۔ پارک بھی تو تم نے ہی کی تھی۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ وہ کہاں کھڑی ہے۔ اس کا انٹری کوپن بھی شاید تمہارے پاس ہوگا یا گاڑی کے ڈیش بورڈ میں رکھا ہوگا تم نے۔''

آفتاب نے اس کی طرف گاڑی کی چابیاں بڑھا دیں اور اسے اس شخص کے گھر کا ایڈریس بھی سمجھا دیا جس سے اسے مطلوبہ مشروب لانا تھا۔

وہ گاڑی کی چابی لے کر دروازے کی طرف بڑھا تو آفتاب نے کہا۔ ''ٹھہرو، یہ پیسے اسے دے دینا۔'' اس نے ہزار ہزار کے کچھ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

''یہ سب پیسے انہیں دے دوں؟''

''نہیں، وہ بوتلوں کے پیسے لے کر باقی پیسے تمہیں دے دے گا۔ تم نے ابھی تک ناشتا بھی نہیں کیا ہوگا۔ واپسی میں ناشتا بھی کر لینا۔''

اسد پارکنگ میں پہنچا۔ گاڑی کا انٹری کوپن اس کی جیب میں تھا۔ اس کا تو اسے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ وہ گاڑی لے کر مطلوبہ سوسائٹی پہنچا۔ وہ شخص وہیں رہتا تھا اور بے وقت جگائے جانے پر جھلایا ہوا لگ رہا تھا لیکن شاید آفتاب اس کا مستقل گاہک تھا اس لیے اس نے اپنی جھلاہٹ کا اظہار نہیں کیا اور بولا۔ ''کچھ بوتلیں میں اس قسم کی ایمرجنسی کے لیے اپنے گھر میں بھی رکھتا ہوں۔ تم ٹھہرو، میں لے کر آتا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد وہ بوتلیں لے آیا۔ اس نے اسد سے صرف ساڑھے پانچ ہزار روپے لیے، رسمی طور پر آفتاب کی طبیعت پوچھی اور بوتلوں کا شاپر اس کے حوالے کر کے گھر میں چلا گیا۔

اسد نے واپسی پر طارق روڈ پر ایک ہوٹل پر گاڑی روکی اور ناشتا کرنے کے بعد اس نے سگریٹ کا ایک پیکٹ بھی خرید لیا۔ اسد سگریٹ کا عادی تھا لیکن تین دن سے اسے سگریٹ نہیں ملے تھے اس لیے اس نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے دو سگریٹ پھونک دیے پھر انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتا ہوا اسپتال پہنچ گیا۔

آفتاب بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسد نے بوتلوں والا شاپر اس کے حوالے کرنے کے بعد بقیہ رقم اسے دینا چاہی تو اس نے خوش دلی سے کہا۔ ''ارے رکھو یار، تم نے تو اس وقت لاکھ روپے کا کام کیا ہے۔''

اسد نے گاڑی کی چابی، گاڑی کا انٹری کوپن اس کے حوالے کیا اور بولا۔ ''اب مجھے اجازت دیں۔''

آفتاب اس وقت تک بوتل کھول چکا تھا۔ اس نے چونک کر اسد کی طرف دیکھا پھر بولا۔ ''اگر تم مائنڈ نہ کرو تو میری ایک آفر ہے۔''

''میں سمجھا نہیں سر۔''

''میں چاہتا ہوں کہ تم میرے پاس جاب کرو۔ میرے پرسنل اسسٹنٹ، ڈرائیور اور کیئر ٹیکر کی حیثیت سے۔ جب تک میرے پاؤں پر پلاسٹر ہے، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔ میں جانتا ہوں کہ تم پڑھے لکھے ہو، ذہین ہو اور یہ ملازمت تمہاری صلاحیتوں کے مطابق نہیں ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ رہو۔''

''سر! میں......''

''دیکھو، اگر تمہیں کوئی بھی جاب مل جائے تو یہ جاب چھوڑ دینا۔ میں فی الحال تمہیں پچاس ہزار ماہانہ دوں گا، تمہیں میرے بنگلے کے آؤٹ ہاؤس میں رہنا پڑے گا۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''تمہیں کھانا بنانا آتا ہے؟''

''جی سر! میں کام چلانے کے لیے تھوڑا بہت پکا لیتا ہوں۔''

''یہ مت سوچنا کہ میں تم سے اپنا کھانا بھی پکواؤں گا۔ اصل میں نورین کو ملازموں سے جانے کیوں الرجی ہے۔ وہ کھانا پکانے سے لے کر گھر کی صفائی بھی خود کرتی ہے۔ دو سال پہلے میں نے اس سے شادی کی تھی۔ وہ اس وقت اتنی تلخ مزاج نہیں تھی۔ گھر میں کئی ملازم بھی تھے۔ چھ مہینے پہلے اس نے ایک ایک کر کے تمام ملازمین کی چھٹی کر دی۔''

''کیوں سر؟'' اسد نے حیرت سے پوچھا۔

''میں تو اس کی وجہ جانتا ہوں۔ تم بھی جان جاؤ گے۔ وہ تمہاری بھی مخالفت کرے گی لیکن تم اس کے کہنے پر جاب چھوڑ کر چلے مت جانا۔''

اچانک اسد کو خیال آیا کہ اس نے آفتاب کے پانچ لاکھ کے چیک کو پچاس لاکھ میں تبدیل کر دیا ہے۔ اسے بینک سے معلوم ہو جائے گا کہ اس تاریخ کو اتنی بڑی رقم نکالی گئی ہے۔ وہ تو بری طرح پھنس جائے گا۔ اسے رہ رہ کر

اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔
"تم نے ابھی وہ چیک تو کیش نہیں کرایا ہوگا جو رات میں نے تمہیں دیا تھا؟"
"نہیں سر۔" اسد نے جواب دیا۔ اسے لگا جیسے آفتاب اس کا ذہن پڑھ رہا ہے۔
"وہ چیک مجھے واپس کر دو، مجھے ابھی خیال آیا ہے کہ اس اکاؤنٹ میں اتنی رقم نہیں ہے۔ تمہیں گھر جا کر دوسرے بینک کا چیک دے دوں گا۔"
"سر...... وہ چیک تو...... میں نے رات ہی میں پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔"
"کیوں بھئی؟" آفتاب نے حیرت سے پوچھا۔
"میں نے کل آپ کی مسز سے بھی کہا تھا اور وکیل صاحب سے بھی کہ میں نے آپ کی جان پیسوں کے لیے نہیں بچائی تھی۔ آپ کے اصرار پر میں نے چیک لے ضرور لیا تھا لیکن باہر جا کر اسے پھاڑ کر پھینک دیا۔"
"لیکن اب گھر جا کر جو چیک میں تمہیں دوں گا، وہ مت پھاڑ دینا۔" آفتاب نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔
"اب جاؤ، اپنا سامان لے کر آجاؤ۔"
"سر! میرا سامان ہی کیا ہے، دو تین جوڑے کپڑے اور کچھ برتن۔" اسد نے تلخی سے کہا۔
"نو پرابلم، تمہیں سب کچھ یہیں مل جائے گا۔"
اسد کا بھی یہی خیال تھا۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور نورین کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے نفرت بھرے انداز میں اسد کو دیکھا اور بولی۔ "تم ابھی تک یہیں ہو؟"
"اسے میں نے روکا ہے۔ میں نے اسے کیئر ٹیکر کی جاب دے دی ہے۔ یہ بہت اچھا ڈرائیور بھی ہے۔"
"ہمیں کسی کیئر ٹیکر یا ڈرائیور کی ضرورت نہیں ہے۔" نورین نے کہا۔
"لیکن مجھے ہے۔ اسد اب ہمارے بنگلے کے آؤٹ ہاؤس میں رہے گا۔"
"وھاٹ؟" نورین دہاڑی۔
"آہستہ بولو۔" آفتاب نے اسے جھڑک دیا۔ "یہ تمہارا بیڈروم نہیں ہے جو تم چیخ پکار کر رہی ہو۔"
"آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟" نورین نے فوراً موضوع بدل دیا اور پوچھا۔ "آپ نے ناشتا بھی کیا ہے یا نہیں؟"
"میں نے ناشتا کر لیا ہے۔" آفتاب نے کہا۔
"ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟" نورین نے پوچھا۔
"میں چاہوں تو ڈاکٹرز مجھے ابھی ڈسچارج کر دیں۔ مجھے اب صرف آرام کی ضرورت ہے۔"
"اور وہ آپ کریں گے نہیں۔"
"ارے، اب تو آرام ہی کروں گا۔" آفتاب نے کہا۔ "اب میں گالف کھیل سکتا ہوں، نہ ریس کورس جا سکتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ زبیری کے ساتھ شطرنج کھیل سکتا ہوں۔"
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور ایڈووکیٹ زبیری اندر آگیا۔ "ہیلو آفتاب، کیسے ہو؟"
"پہلے جیسا ہی ہوں۔" آفتاب مسکرایا۔ "بس اب کچھ دن تک دوسروں کے سہارے کا محتاج ہو جاؤں گا۔"
اچانک زبیری کی نظر اسد پر پڑی۔ وہ ناگواری سے بولا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"
"یہ اب میرا پرسنل اسسٹنٹ ہے۔" آفتاب نے کہا۔
"کیا!" زبیری نے بھی نورین کی طرح پوچھا۔
"ایک سڑک چلتے آدمی نے تمہاری جان کیا بچائی کہ تم نے اسے اپنا پی اے بنا لیا۔ تم اس کے بارے میں جانتے کیا ہو؟"
"جاننا ضروری نہیں ہے لیکن میں چند گھنٹوں میں اس کے بارے میں بہت کچھ جان گیا ہوں۔"
"چائے یا کافی پیو گے؟" آفتاب نے مسکرا کر پوچھا۔
"فارگاڈ سیک آفتاب! یہ تمہارا ڈرائنگ روم نہیں ہے بلکہ اسپتال ہے۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "میں ذرا ڈاکٹر سے مل کر آتا ہوں۔"
نورین نے اچانک پوچھا۔ "یہ بوتل تمہیں کہاں سے مل گئی؟"
"یہ تو ہر جگہ مل جاتی ہے، اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟"
زبیری لوٹ آیا تھا۔ اس نے بتایا۔ "ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں، فریکچر زیادہ پریشان کن نہیں ہے۔ بس دو ہفتے تک تمہیں اپنے اس پیر پر زور ڈالنے سے احتیاط کرنا ہو گی۔" پھر وہ گھڑی دیکھ کر بولا۔ "اوہو، دس بج رہے ہیں، مجھے کورٹ بھی جانا ہے۔ میں شام کو آؤں گا۔"
تھوڑی دیر بعد نورین بھی چلی گئی۔ اسد نے محسوس کیا کہ آفتاب اور نورین کے درمیان وہ بات نہیں ہے جو ایک شوہر اور بیوی کے درمیان ہوتی ہے۔ آفتاب اس کے ساتھ انتہائی تلخ لہجے میں بات کرتا تھا۔ نورین کے لہجے میں بھی آفتاب سے بات کرتے ہوئے سردمہری بلکہ ناگواری سی محسوس ہوتی تھی۔ آفتاب کے مقابلے میں نورین کم عمر، خوب صورت تھی۔ حسین اور پرکشش عورتوں کے تو لوگ ناز اٹھاتے ہیں لیکن اسد نے محسوس کیا تھا کہ آفتاب کو نورین کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں تھی۔

اب آفتاب کو صرف آرام کرنا تھا اس لیے وہ رات ہی کو اسپتال سے گھر روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگا۔

''میں گاڑی وارڈ کے سامنے لے کر آتا ہوں۔'' اسد نے کہا۔ اس نے آفتاب کا سامان پہلے ہی سمیٹ لیا تھا۔

وہ لوگ شام کو آٹھ بجے گھر پہنچ گئے۔ آفتاب کا بنگلا ڈیفنس میں تھا۔ بنگلے کی شان و شوکت دیکھ کر اسد کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اس قسم کے بنگلے تو اس نے صرف فلموں میں دیکھے تھے۔ بنگلے کا لان اتنا وسیع و عریض تھا کہ وہاں کرکٹ کھیلی جا سکتی تھی۔ لان کی دیکھ بھال ایک مالی کرتا تھا جو ہفتے میں ایک دن آتا تھا۔ بنگلے کے گیراج میں بھی تین گاڑیاں تھیں اور تینوں ہی انتہائی قیمتی اور شاندار تھیں۔ چوتھی گاڑی آفتاب کے استعمال میں تھی۔ اسپتال سے واپسی پر آفتاب نے ایک وھیل چیئر بھی خرید لی تھی۔

اس وقت نورین گھر میں موجود نہیں تھی۔ دروازے پر چوکیدار موجود تھا۔ اسی نے گیٹ کھولا۔ اسد کو حیرت ہوئی تھی کہ جب نورین نے ایک ایک کر کے تمام ملازمین کو نکال دیا تھا تو وہ چوکیدار کیسے موجود تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ بیگم صاحبہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنی گاڑی میں کہیں گئی ہیں۔

''کلب گئی ہوگی۔'' آفتاب نے تلخ لہجے میں اسد سے کہا پھر بولا۔ ''آؤ، میں تمہیں تمہارا کمرا دکھادوں۔''

آفتاب اس وقت وھیل چیئر پر بیٹھا تھا۔ اسد وھیل چیئر دھکیلتا ہوا آؤٹ ہاؤس کی طرف لے گیا۔ آؤٹ ہاؤس اصل عمارت کے دوسرے سرے پر تھا اور کافی فاصلے پر بنا ہوا تھا۔

اپنا کمرا دیکھ کر بھی اسد حیران رہ گیا۔ بیڈروم میں انتہائی قیمتی بیڈ تھا، کھڑکیوں پر قیمتی اور دبیز پردے تھے۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ خاصا قیمتی صوفہ سیٹ رکھا ہوا تھا۔ دیوار میں ایل ای ڈی ٹی وی نصب تھا۔ کمپیوٹر ٹیبل پر کمپیوٹر بھی موجود تھا۔ اس کے کمرے میں انٹرکام بھی موجود تھا۔ بیڈروم میں چھوٹا سا ایک فریج بھی تھا۔ باتھ روم میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

''اب تم مجھے میرے بیڈروم میں چھوڑ دو اور خود آرام کرو، تھک گئے ہوگے۔'' آفتاب نے کہا۔

اسد واقعی تھک گیا تھا۔ پوری رات اس نے اسپتال کے لان میں جاگ کر گزاری تھی، پھر صبح سے وہ آفتاب کے ساتھ مصروف تھا۔ اسے تو کمر ٹکانے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

آفتاب اسد کا سہارا لے کر اوپر اپنے بیڈروم میں پہنچا اور بیڈ پر نیم دراز ہوگیا۔ بنگلے کی طرح اس کا بیڈروم بھی بالی ووڈ کی کسی فلم کے بیڈروم کی طرح آراستہ تھا۔

اسد نے تکیے لگا کر آفتاب کو احتیاط سے بیڈ پر لٹا دیا اور اس کے کہنے پر اے سی بھی آن کر دیا۔ اسد جانے لگا تو آفتاب نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ اس نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور اس میں سے چیک بک نکال کر چیک لکھنے لگا۔ پھر وہ چیک اسد کو دیتے ہوئے بولا۔ ''یہ تمہاری امانت...... اب اسے بھی مت پھاڑ دینا ورنہ مجھے غصہ آجائے گا۔''

اسد نے چیک لے کر اس پر ایک نظر ڈالی۔ اس مرتبہ اس نے رقم ہندسوں میں بھی لکھی تھی اور الفاظ میں بھی۔ اس نے جھجکتے ہوئے آفتاب کو دیکھا۔

''کیا ہوا؟'' آفتاب نے بھاری آواز میں پوچھا۔ ''رقم کچھ کم لگ رہی ہے؟''

''نہیں سر! وہ اصل میں آپ سائن کرنا بھول گئے ہیں۔'' اسد نے کہا۔

''اوہ...... یہ میرا حافظہ۔'' آفتاب خوش دلی سے مسکرایا پھر چیک لے کر اس پر سائن کر دیے۔

''مجھے ایک بوتل کھول دو اور ڈرنک بنادو۔'' آفتاب نے کہا۔ ''آئس کیوبس فریج میں ہوں گے۔''

اسد نے گلاس تیار کیا، فریج سے آئس کیوبس نکال کر اس میں ڈالے اور گلاس آفتاب کی طرف بڑھا دیا۔

''تم نے کبھی ڈرنک کی ہے؟'' آفتاب نے ایک گھونٹ لے کر پوچھا۔

''نو سر! میں اب تک اس ''چیز'' سے محروم ہوں۔'' اسد نے کہا۔

''تو پھر آج ٹرائی کرو۔''

''آپ کی دیکھ بھال کے لیے میرا ہوش میں رہنا ضروری ہے۔'' اسد مسکرایا۔ ''ورنہ میں ضرور آپ کا ساتھ دیتا۔''

''یار! میں تو عرصے سے اکیلا ہی پی رہا ہوں۔ ہفتے میں ایک آدھ دفعہ زبیری آجاتا ہے تو وہ میرا ساتھ دے دیتا ہے لیکن جاتے ہوئے کم بخت نصیحت ضرور کرتا ہے کہ ڈرنک کو ڈرنک کی طرح پیا کرو، پانی کی طرح نہیں۔''

اچانک دروازہ کھلا اور نورین اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے اسکن ٹائٹ جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اسد نے پہلی دفعہ اسے غور سے دیکھا۔ وہ اتنی حسین تھی کہ بڑے بڑے پارسا کا بھی ایمان ڈانواں ڈول ہو سکتا تھا۔

اسے دیکھ کر آفتاب کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ لمحوں

میں اس کی شخصیت ہی بدل گئی اور وہ اچانک سیٹھ آفتاب غنی بن گیا۔ وہ درشت لہجے میں بولا۔ ''کہاں سے آرہی ہو اس وقت؟''

''میں آپ کو دیکھنے اسپتال گئی تھی۔'' نورین نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

''جھوٹ مت بولو۔'' آفتاب نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''جب تم جھوٹ بولتی ہو تو تمہاری یہ خوب صورت آنکھیں تمہارا ساتھ نہیں دیتیں۔''

''میں اصل میں جم کے لیے مڑ گئی تھی۔ میں نے وہاں سے اسپتال فون کیا تو معلوم ہوا کہ تم گھر جا چکے ہو۔'' نورین نے سرد لہجے میں کہا پھر اسد کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''وھاٹ ڈو یو مین، کیا کر رہے ہو؟'' آفتاب انتہائی سخت لہجے میں بولا۔ ''تم جانتی نہیں ہو کہ اسد میرا پی اے ہے اور......''

''اب تمہارے پاس ہے کیا جو تمہیں پی اے کی ضرورت پڑ گئی؟'' نورین نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میں نے تمہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اب تم کہہ رہی ہو کہ میرے پاس کیا ہے؟ نورین بیگم ہاتھی مر کے بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔''

نورین پیر پٹختی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ ''اب تم بھی جا کر آرام کرو۔ نورین اپنے کمرے میں بند ہو گئی ہو گی۔''

''اپنے کمرے میں؟'' اسد نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، گزشتہ ایک سال سے ہم لوگ الگ الگ کمروں میں سو رہے ہیں۔''

اسد نے اپنی کھوپڑی سہلائی اور کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

اسد نیچے لاؤنج میں پہنچا تو نورین کو دیکھا۔ وہ اس وقت ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر اور ڈھیلی سی ایک ٹی شرٹ میں ملبوس تھی اور صوفے پر نیم دراز کسی سے سیل فون پر بات کر رہی تھی۔ اس کی پشت اسد کی طرف تھی لیکن پشت سے بھی اس کا جسم اتنا ہیجان خیز لگ رہا تھا کہ اسد اسے دیکھتا رہ گیا۔

''ہاں، وہ ابھی کچھ دیر پہلے اسپتال سے گھر آیا ہے...... ہاں، کچھ سوچوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے سیل فون کا سلسلہ منقطع کیا اور زاویہ بدلا تو اس کی نظر اسد پر پڑی۔

اسد اسے دیکھ کر کچھ بوکھلا گیا۔ ایک تو اس کے چہرے کے تاثرات، پھر نورین نے ایسی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی کہ اسد کا ذہن سنسنا کر رہ گیا تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' نورین نے نخوت بھرے انداز میں پوچھا۔

''میں اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔'' اسد نے دھیرے سے جواب دیا۔ ''سیٹھ صاحب آرام کر رہے ہیں تو میں نے سوچا کہ......''

''آرام کر رہے ہیں یا ڈرنک کر رہے ہیں؟'' نورین کے لہجے میں تلخی تھی۔

اسد نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔

''ٹھہرو۔'' نورین کی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ وہ نورین کی طرف گھوما۔ ''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے خلافِ معمول نرم لہجے میں کہا۔ ''مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

اسد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''تم مجھے خاصے ذہین اور تعلیم یافتہ لگتے ہو۔'' نورین نے کہا۔ ''ہینڈسم بھی ہو۔''

''جی...... میں......''

''میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ تمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ اس جھکی آدمی کی باتوں میں آ کر تم اپنا مستقبل داؤ پر کیوں لگا رہے ہو۔ وہ شراب کے نشے میں بڑی بڑی باتیں کرتا ہے اور صبح کو سب کچھ بھول جاتا ہے۔''

''میں نے اس جاب کو کیریئر نہیں بنایا ہے میڈم۔'' اسد نے کہا۔ ''سیٹھ صاحب نے بھی کہا ہے کہ جب بھی تمہیں کوئی اچھا چانس ملے، تم یہ جاب چھوڑ سکتے ہو۔''

''تمہارے گھر میں کتنے افراد ہیں؟'' نورین نے پوچھا۔

''کوئی بھی نہیں۔'' اسد نے جواب دیا۔ ''ماں کے انتقال کے بعد سے میں بالکل تنہا ہوں اور نزدیک کا کوئی رشتے دار بھی نہیں ہے۔''

''اوہ، ویری سیڈ۔'' نورین نے کہا۔ ''تمہاری کوئی گرل فرینڈ تو ہو گی؟'' نورین نے قدرے بے تکلفی سے پوچھا اور صوفے کے ہتھے پر اس انداز میں نیم دراز ہوئی کہ اسد نے گھبرا کر بے اختیار اپنی نظریں جھکا لیں۔

''میری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے......'' اسد نے جواب دیا۔

"حیرت ہے۔" نورین بڑبڑائی۔ "تم خاصے خوبرو اور پرکشش آدمی ہو۔ لڑکیاں تو تم پر مرتی ہوں گی؟"

"مجھے حالات نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ مجھے کسی کے مرنے اور جینے کا علم ہوتا۔"

"اس وقت تم خاصے تھکے ہوئے لگ رہے ہو، جاؤ جاکر آرام کرو۔"

اسد اپنے کمرے میں آگیا اور جوتے اتار کے بیڈ پر گر گیا۔ واقعی اسے بہت تھکن محسوس ہو رہی تھی۔

انٹرکام کی مسلسل بجنے والی گھنٹی پر اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی نظر دیوار گیر گھڑی پر پڑی۔ شام کے سات بج رہے تھے۔ گویا وہ مسلسل چھ گھنٹے تک سوتا رہا تھا۔ اس نے جھپٹ کر انٹرکام کا ریسیور اٹھا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ہیلو۔"

"اسد!" دوسری طرف سے آفتاب کی آواز آئی۔

"فریش ہو کر میرے پاس پہنچو۔"

"او کے سر!" اسد نے جلدی سے کہا۔

"ہاں، میں نے نورین سے کہہ دیا تھا۔ وارڈ روب میں تمہارے لیے کپڑے موجود ہوں گے۔" یہ کہہ کر آفتاب نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اسد نے وارڈ روب کھول کر دیکھی، اس میں کئی جوڑے موجود تھے۔ شوز ریک میں انتہائی مہنگے جوتے بھی موجود تھے۔

"حیران مت ہو۔" اسد، نورین کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ "ان سب چیزوں کی رسیدیں میرے پاس موجود ہیں۔ ان کی قیمت تمہاری تنخواہ میں سے کاٹ لی جائے گی۔" یہ کہہ کر وہ ٹہلتی ہوئی لان کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

آفتاب خاصا ہشاش بشاش لگ رہا تھا اور اس وقت وہ خلاف توقع شراب نہیں بلکہ کافی پی رہا تھا۔

"مجھے نیچے لان میں لے چلو۔" اس نے اسد سے کہا۔ "میں کچھ دیر کھلی فضا میں وقت گزارنا چاہتا ہوں۔"

اسد اسے سہارا دے کر نیچے لایا، پھر وہیل چیئر میں بٹھا کر باہر لان میں لے گیا۔ اسے لان میں چھوڑ کر اسد پلٹ کر واپس آیا، کچن کے ایک ریک میں انتہائی مہنگے مشروب کے کئی کریٹ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک بوتل اٹھا کر ٹرے میں رکھی، ایک باؤل میں آئس کیوبس لیے، ٹرے میں ایک گلاس رکھا اور دوسری پلیٹ میں تلی ہوئی مونگ پھلی، کاجو اور نمکو وغیرہ لے کر باہر نکلا۔ لاؤنج میں رکھی ہوئی چھوٹی میز پر اس نے ٹرے رکھی اور میز اٹھا کر باہر لان میں لے گیا۔

پھر اس نے وہاں سے جانا چاہا لیکن آفتاب نے اسے روک لیا اور بولا۔ "بیٹھو۔" اسد خاموشی سے بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد نورین اندر سے نکلی، اس وقت وہ لمبی فراک اور ٹائٹس میں ملبوس تھی۔ اس پر یہ لباس سجتا تھا۔

"آفتاب! میں کلب جارہی ہوں۔ واپسی میں دیر ہوجائے گی۔ آپ کھانا کھا لیجیے گا۔ میں نے بنا کر فریج میں رکھ دیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنا پرس جھلاتی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

آفتاب نے برا سا منہ بنایا اور مشروب کا ایک گھونٹ لے کر نورین کی گاڑی کو دیکھنے لگا جو پورچ سے باہر نکل رہی تھی پھر وہ اسد سے مخاطب ہوا۔ "نورین سے تمہاری بات ہوئی؟"

پہلے تو اسد نے سوچا کہ جھوٹ بول دے لیکن اس جھوٹ کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "جی سر! جب میں دوپہر کو سونے جارہا تھا تو وہ مجھے لاؤنج میں ملی تھیں۔"

"تمہیں اس نے برا بھلا تو نہیں کہا؟ وہ اوپر سے جتنی خوب صورت ہے، اندر سے اتنی ہی زہریلی ہے۔"

"نو سر! برا بھلا کہنے کے بجائے وہ مجھے سمجھا رہی تھیں کہ تم ذہین اور تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود یہاں جاب کر کے اپنا مستقبل برباد کر رہے ہو۔"

آفتاب طنزیہ انداز میں ہنسا اور بولا۔ "اگر تم مجھے پانچ سال پہلے ملے ہوتے تو میں تمہیں اپنی گروپ آف کمپنیز میں بہترین جاب دے دیتا۔ اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

"میں سمجھا نہیں سر؟" اسد نے حیرت سے پوچھا۔

"میری اربوں روپے کی دولت ریس کے گھوڑے، حسین عورتیں اور شراب کھا گئی۔"

"ریس کے گھوڑے؟" اسد نے پھر حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"ہاں، ریس کے گھوڑے۔" آفتاب نے ایک لمبا گھونٹ لے کر گلاس خالی کر دیا اور اسد کو دوسرا پیگ بنانے کا اشارہ کیا۔ "تم کبھی ریس کورس گئے ہو؟"

"یہ تو دولت مندوں کے شوق ہیں سر! میں نے تو ریس کورس کا صرف نام سنا ہے یا پھر فلموں میں گھوڑوں کو دوڑتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"میں ریس تو کھیلتا ہی تھا، میں نے اپنے ذاتی گھوڑے بھی رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ایک گھوڑا لاکھوں روپے کا تھا۔ ان کی دیکھ بھال پر بھی لاکھوں روپے ماہانہ خرچ ہوتے تھے۔ میرے دس بہترین گھوڑے

تھے...جو مقابلے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ پھر میری
زندگی میں حسین عورتوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ایک جاتی تو
دوسری آجاتی تھی۔ میں ان عورتوں کو قیمتی تحائف دیتا، نئی
اور شاندار گاڑیاں گفٹ کرتا اور دل بھرنے کے بعد انہیں
چھوڑ دیتا۔ آہستہ آہستہ میرا بینک بیلنس سکڑتا چلا گیا۔ اب
بڑے بڑے بینکوں میں میرے اکاؤنٹس تو ہیں لیکن ان
میں بیلنس نہیں ہے۔ مشکل سے میرے تمام اکاؤنٹس میں
مجموعی طور پر ڈیڑھ کروڑ روپے ہوں گے۔ میں نے ایک
ایک کرکے کمپنی کے شیئرز بھی بیچ دیے اس لیے اب اپنی ہی
گروپ آف کمپنیز پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔''

''لیکن سر! آپ کا رہن سہن، آپ کے اخراجات اور......''

''سب کچھ قرض پر چل رہا ہے۔'' آفتاب تلخ لہجے
میں بولا۔ ''کاروباری حلقوں میں آج بھی میری گڈول
ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آفتاب غنی ایک مرتبہ پھر اپنا کھویا ہوا
مقام حاصل کرلے گا۔ اسی گڈول پر نہ صرف بڑے بڑے
بزنس مین بلکہ بینکس بھی مجھے قرض دے دیتے ہیں۔ انہیں تو
شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ میرا یہ شاندار بنگلا بھی کئی کروڑ میں
گروی ہے۔''

''سر! آپ اب بھی ہمت کریں تو سب کچھ دوبارہ
حاصل کرسکتے ہیں۔'' اسد نے کہا۔ ''میں نے بزنس مینجمنٹ
میں گریجویشن کیا ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میرے
پاس بہت سے آئیڈیاز ہیں۔ اگر میرے پاس ایک لاکھ
روپے بھی ہوتے تو میں ان سے اب تک پچاس لاکھ بنا چکا
ہوتا۔ آپ کو تو بینک اب بھی قرض دے دیں گے۔''

اس کی بات سن کر آفتاب نے زوردار قہقہہ لگایا اور
بولا۔ ''میں نے اپنی زندگی کی ہر خواہش پوری کرلی، دنیا گھوم
لی۔ دنیا بھر کی حسین عورتوں کا قرب بھی حاصل کرلیا۔ اب
مجھے کچھ بھی کرنے کی تمنا نہیں ہے۔ ہاں، میں تمہیں اتنا پیسا تو
دے ہی سکتا ہوں کہ تم اپنا چھوٹا موٹا بزنس شروع کرسکو۔''

''مجھے اپنی پروا نہیں ہے سر۔'' اسد نے کہا۔ ''مجھے تو
کہیں نہ کہیں کوئی معقول ملازمت مل ہی جائے گی۔ پھر
موقع ملا تو میں کوئی بزنس بھی شروع کرلوں گا لیکن آپ نے
میڈم نورین کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

''اس سے شادی ہی تو میری زندگی کی سب سے
بڑی غلطی ہے۔ میں اس کے غیر معمولی حسن پر پاگل ہوگیا
تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ اگر وہ مس ورلڈ کے مقابلے میں
حصہ لیتی تو مس ورلڈ بن سکتی تھی۔ وہ میری ایک پروڈکٹ
کی ماڈل تھی۔ میں اس کے حسن پر مرمٹا تو وہ میری اربوں
روپے کی دولت پر ریجھ گئی۔ شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ
ایک معروف گروپ آف کمپنیز کا ارب پتی چیئرمین اب
اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے۔ اس نے اپنی محنت سے کمائی
ہوئی دولت ریس کے گھوڑوں اور حسین عورتوں پر نچھاور کر
دی ہے اور جو ہر ماہ لاکھوں روپے کی شراب پی جاتا ہے۔
اس حسین عورت کو کوئی بھی خوبرو... اور دولت مند نوجوان
اچک سکتا تھا۔ میں نے اس شاطر لڑکی سے شادی کرلی۔
سال بھر تک تو ہماری زندگی جنت بنی رہی۔ ہم نے دنیا
بھر کی سیر کی، میں نے جی بھر کے نورین کو شاپنگ کرائی،
اس کے ناز اٹھائے لیکن جیسے ہی اسے یہ معلوم ہوا کہ میں
گلے گلے تک قرض کی دلدل میں ڈوبا ہوا ہوں تو اس کا رویہ
بھی مجھ سے بدل گیا۔ ہمارے درمیان تلخیاں بڑھتی گئیں
اور آج یہ حالت ہے کہ ہم دونوں الگ الگ کمروں میں
سوتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ نورین اب مجھ سے شدید
نفرت کرتی ہے۔ اس کا بس چلے تو وہ مجھے جان سے بھی مار
دے لیکن مار نہیں سکتی۔''

''سر! مجھے آپ کے ذاتی معاملات میں بولنے کا حق
تو نہیں ہے لیکن......''

''کہو کہو...... تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں بالکل برا نہیں
مانوں گا۔''

''آپ میڈم نورین کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟''

''دو باتیں ہیں۔'' آفتاب نے مشروب کا گھونٹ لے
کر کہا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ میں نہیں چاہتا کہ وہ میرے بعد
میرے ہی سامنے کسی دوسرے کے ساتھ رنگ رلیاں
منائے۔ دوسری بات یہ کہ اگر میں اسے طلاق دوں گا تو خود
فٹ پاتھ پر آجاؤں گا۔ جانتے ہو اس کا حق مہر کتنا ہے؟ دس
کروڑ روپے۔ وہ حق مہر کا مطالبہ کرے گی تو میں اسے دس
کروڑ روپے کہاں سے دوں گا؟ آخر کورٹ اسے میرا اچھا کھا
بینک بیلنس دلا دے گی۔ میرا جو بھرم دنیا کی نظروں میں
اب تک قائم ہے، وہ ٹوٹ جائے گا اور مجھے اس بنگلے سے
اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے گا۔ پھر میں کسی فٹ پاتھ پر
فقیروں کی طرح سسک سسک کر مر جاؤں گا۔'' پھر وہ گھڑی
دیکھ کر بولا۔ ''رات بہت ہوگئی ہے۔ تم مجھے کمرے میں پہنچا
دو اور خود بھی جا کر آرام کرو۔''

''سر! آپ نے تو کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ آپ کمرے
میں چلیں، میں آپ کے لیے کھانا گرم کرکے لاتا ہوں۔''

☆☆☆

دوسرے دن اچانک ہی شدید بارش ہوگئی۔ کراچی

کی سڑکیں تو ذرا سی بارش میں جل تھل ہو جاتی ہیں۔ اس دن نورین گھر ہی پر تھی۔ اسد، آفتاب کو لان میں لے کر گیا تھا لیکن بارش کی وجہ سے وہ لاؤنج میں آ گیا تھا۔ اسد نے اسے صوفے پر بٹھا دیا۔

''مجھے ذرا رائٹنگ پیڈ اور پین دے دو۔'' اسد نے اسے رائٹنگ پیڈ، پین اور کلپ بورڈ دے دیا اور آفتاب انہماک سے کچھ لکھنے لگا۔ وہ تقریباً دس، بارہ منٹ تک لکھتا رہا پھر لفافہ لے کر وہ کاغذ اس میں رکھا، اس پر کسی کا نام لکھا اور اسد سے بولا۔ ''تم یہ خود ایڈووکیٹ زبیری تک پہنچا دینا۔''

اسد نے لفافہ اس کے ہاتھ سے لیا اور اسے جیب میں رکھ کر جانے کے لیے پلٹا تو آفتاب نے کہا۔ ''ابھی نہیں، اسے بعد میں پہنچا دینا۔ تم بیٹھو، میں تمہیں ایک تماشا دکھانا چاہتا ہوں۔''

اسد الجھے ہوئے انداز میں بیٹھ گیا۔ آفتاب نے چند لمحے توقف کیا پھر چیخ کر بولا۔ ''نورین!...... نورین......!''

''کیا بات ہے؟'' اوپر سے نورین کی آواز سنائی دی۔

''نیچے آؤ۔'' آفتاب نے گرج کر کہا۔

''میرے سر میں شدید درد ہے۔ میں اس وقت......''

''نورین!'' اس مرتبہ آفتاب پہلے سے بھی زیادہ بلند آواز میں چیخا۔ ''ابھی اور اسی وقت نیچے آؤ، کم آن۔''

نورین اسی ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر اور ڈھیلی شرٹ میں نمودار ہوئی۔ وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے کچھ بڑبڑا رہی بھی رہی تھی۔

''کیا پرابلم ہے؟'' نورین نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''ادھر بیٹھو، مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

نورین نے اسد کی طرف دیکھا۔ ''یہ یہیں رہے گا۔'' آفتاب نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

نورین تلملاتی ہوئی بیٹھ گئی۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم میری موت چاہتی ہو۔ تمہارا بس چلے تو تم کسی دن مجھے اپنے ہاتھوں سے گولی مار دو لیکن تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اب تک میری محبت میں نہیں، اپنی مجبوری میں میرے ساتھ گزارہ کر رہی ہو۔''

''یہ ان باتوں کا کون سا موقع ہے؟'' نورین بگڑ کر بولی۔ ''وہ بھی ایک ملازم کے سامنے۔''

''شٹ اپ۔'' آفتاب گرج کر بولا۔ ''اسد میرا پی اے ہے اور پی اے کو ہر بات معلوم ہونا چاہیے۔'' آفتاب نے جیب سے چیک بک نکالی اور ایک چیک لکھ کر اسد کو دے دیا۔ ''یہ تمہاری چھ مہینے کی تنخواہ کا چیک ہے۔ بعد میں جانے حالات کیا رخ اختیار کریں۔''

''اٹس او کے سر۔'' اسد نے کہا۔ ''مجھے فوری طور پر ان پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اب میری بات غور سے سنو۔ دس سال پہلے میں نے لندن میں ایک انشورنس کمپنی سے پچاس کروڑ کی پالیسی لی تھی۔ اس وقت شائستہ میرے ساتھ تھی۔ میں نے وہ پالیسی اس کے نام کر دی تھی لیکن بعد میں جب نورین میری زندگی میں آئی تو میں نے اس کی حسن اور اداؤں سے متاثر ہو کر وہ پالیسی اس کے نام کر دی۔ اس پالیسی کے تحت اگر میں نورین کے ہاتھوں مارا جاؤں گا تو اسے ایک پائی بھی نہیں ملے گی، ہاں جیل کی ہوا ضرور کھانا پڑے گی۔ اگر میں خودکشی کر لوں تب بھی اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ اب میری موت کی دو ہی صورتیں اس کے حق میں جاتی ہیں۔ یا تو کوئی مجھے قتل کر دے یا میں طبعی موت مر جاؤں یا کسی حادثے کا شکار ہو جاؤں۔ لیکن میں اس پالیسی میں سے ایک پیسا اسے دینے کا روادار نہیں ہوں کیونکہ میں خودکشی کروں گا۔''

''سر! آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ تو بے تحاشا ڈرنک کرنے کے بعد بھی نہیں بہکتے پھر......''

''میں نشے میں نہیں ہوں بلکہ پورے ہوش وحواس میں یہ کہہ رہا ہوں۔'' آفتاب نے کہا۔ ''میں خودکشی کر لوں گا تو اسے یہ مکار اور شاطر عورت قتل ثابت کرنے کی کوشش کرے گی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ پیسے کے لیے آخری حد تک جا سکتی ہے۔ یہ میری خودکشی کو قتل ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دے گی۔ ممکن ہے یہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو بھی جائے لیکن اس کے امکانات بہت کم ہیں۔ میں نے زبیری کے نام جو خط لکھا ہے، اس میں صاف صاف لکھا ہے کہ میں خودکشی کر رہا ہوں، اس کا ذمے دار میں خود ہوں۔ اس سے یہ فائدہ ہو گا کہ یہ حرام زادی اور تم، دونوں قتل کے الزام سے بچ جاؤ گے۔ اس کے بچنے سے زیادہ مجھے یہ فکر ہے کہ یہ اپنی مکاری سے کہیں تمہیں اس قتل میں ملوث نہ کر دے اور خود پچاس کروڑ جیسے کی رقم ہڑپ کر لے۔ یہ خط اس بات کا ثبوت ہو گا کہ میں نے خودکشی کی ہے۔''

''یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے...... آپ......؟''

آفتاب نے ایک دم جیب میں ہاتھ ڈال کر پستل نکال لیا۔

''سر! پلیز ایسا نہ کریں۔'' اسد نے کہا۔

''ایسا مت کریں آفتاب۔'' نورین چیخی۔ ''ابھی حالات اتنے نہیں بگڑے ہیں کہ......''

''گڈ بائے۔'' آفتاب نے کہا اور پسٹل کی نال اپنی کن پٹی پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ اس دوران ... ہی بادل زور سے گرجے۔ اس کی آواز میں فائر کی آواز دب گئی۔

ویسے بھی اس کی آواز کو سننے والا کون تھا۔ ڈیفنس کا وہ علاقہ ابھی اتنا آباد نہیں تھا۔ چوکیدار مین گیٹ پر ہوتا تھا جو اقامتی حصے سے خاصے فاصلے پر تھا۔ اس تک آواز پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ یوں بھی اس وقت وہ شدید بارش کی وجہ سے اپنی کوٹھری میں ہوگا۔ آفتاب بری طرح تڑپا اور صوفے سے لڑھک کر فرش پر گر گیا۔ فوراً ہی اس کی موت واقع ہوگئی۔

''اوہ مائی گاڈ......!'' نورین بڑبڑائی۔ ''یہ کیا ہو گیا؟''

''میں پولیس کو ٹیلی فون کرتا ہوں۔'' اسد ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

''نہیں۔'' نورین چیخی۔ ''ابھی پولیس کو کال مت کرو، مجھے کچھ سوچنے دو۔''

اسد خود بھی سوچ رہا تھا پھر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آہی گئی۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''میری ذہن میں اسے قتل ثابت کرنے کا ایک آئیڈیا ہے۔''

''کیسا آئیڈیا؟'' نورین نے پوچھا۔

اسد کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ''آئیڈیا تو ہے لیکن پہلے ہمیں ایک ڈیل کرنا پڑے گی۔''

''ڈیل کیسی؟'' نورین چونک کر بولی۔

''انشورنس کی رقم ففٹی ففٹی ہوگی۔'' اسد نے سنجیدگی سے کہا۔ ''پچیس کروڑ تمہارے اور پچیس کروڑ میرے۔''

''پچیس کروڑ تمہارے؟'' نورین نے ناگواری سے کہا۔ ''تم رہنے دو، میں خود ہی کچھ سوچ لوں گی۔''

''تم سوچتی رہو، میں پولیس کو ٹیلی فون کرنے جا رہا ہوں۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''پاگل ہوگئے ہو۔'' نورین نے کہا۔ ''تم شاید بھول گئے کہ آفتاب کے ہاتھ سے پسٹل تم ہی نے نکالا تھا۔''

''ہاں تو؟ وہ پسٹل تو اب بھی میری جیب میں ہے۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''پولیس کو تم کیا ٹیلی فون کرو گے، میں خود ٹیلی فون کروں گی اور بتاؤں گی کہ تم نے میرے شوہر سے بلینک چیک پر سائن لیے، پھر اسی کے پسٹل سے اسے ہلاک کر دیا۔ پسٹل تمہارے قبضے میں ہے۔ اس پر تمہاری انگلیوں کے نشانات بھی ہوں گے اور میرے پاس آفتاب کا دستخط کیا ہوا ایک بلینک چیک بھی ہے۔ میں پولیس کو بتاؤں گی کہ میں نے تم سے وہ چیک چھین لیا۔ اب تم میری جان بھی لینا چاہتے ہو۔ میں نے اپنے کمرے میں بند ہو کر اپنی جان بچائی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے فاتحانہ انداز میں اسد کی طرف دیکھا۔

''ویری گڈ!'' اسد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم تو بہت اچھی کہانی کار ہو۔ تم فلموں اور ٹی وی ڈراموں کے لیے کوشش کیوں نہیں کرتیں؟ لیکن تمہاری کہانی میں دم نہیں ہے۔ پولیس یہ ضرور پوچھے گی کہ تم نے مجھ سے وہ بلینک چیک کیسے چھینا؟ آفتاب کا پسٹل تو اس وقت بھی میرے ہاتھ میں تھا، میں اسی وقت تمہیں بھی ہلاک کر سکتا تھا۔'' اسد مسکرایا۔ ''اور میڈم! آپ یہ کیوں بھول گئیں کہ میرے پاس آفتاب کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ہے جو اس نے زبیری کے نام لکھا ہے جس میں اس نے اپنی خودکشی کا اعتراف کیا ہے۔ تم پولیس کو کال کرو، میں زبیری سے بات کرتا ہوں۔''

نورین غصے اور بے بسی سے اپنے ہونٹ چبانے لگی۔

''یو بلڈی بلیک میلر۔'' وہ غصے میں چیخی۔

''یہ بلیک میلنگ نہیں بلکہ ڈیلنگ ہے۔ تمہیں پچیس کروڑ کم لگ رہے ہیں؟ ویسے تم غصے میں زیادہ حسین لگتی ہو۔''

''بکواس کرو گے تو تھپڑ مار دوں گی۔''

''زیادہ ستی ساوتری بننے کی کوشش مت کرو ڈارلنگ! ممکن ہے تمہارے اس قیامت خیز حسن سے متاثر ہو کر میں اپنے حصے کے پچیس کروڑ تمہیں دے ہی دوں۔''

''ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ میں کہیں بھاگی نہیں جا رہی ہوں۔ میرے حسن کی تعریف بعد میں کرتے رہنا۔''

''صرف تعریف؟'' اسد مسکرایا۔

''ارے پہلے اس لاش کا تو کچھ کرو۔''

اسد اٹھ کر کچن کے کوریڈور میں آیا۔ وہاں بڑا سا ایک ڈیپ فریزر رکھا تھا۔ اس نے نورین سے پوچھا۔ ''اس ڈیپ فریزر میں کیا ہے۔ کچھ ہے تو اسے خالی کرو۔''

''یہ خالی ہی ہے۔'' نورین نے کہا۔

''ہم آفتاب کی لاش کو اس فریزر میں رکھ دیں گے۔ فریزر میں رکھنے کے بعد پوسٹ مارٹم رپورٹ میں قتل کا وقت ثابت نہیں ہو سکے گا۔ پھر ہم کسی مناسب موقع کا انتظار کریں گے اور آفتاب کی موت کو قتل ثابت کرنے کے لیے

اسے کہیں اور پھینک دیں گے۔ یہ سب کچھ کیسے ہوگا، یہ بعد میں سوچیں گے۔ فوری طور پر تو ہمیں لاش کو اس فریزر میں رکھ دینا چاہیے تاکہ وہ خراب ہونے سے محفوظ رہے۔''

نورین اور اسد نے آفتاب کی لاش اٹھانے سے پہلے اس کے سر پر ایک تولیا لپیٹ دیا تاکہ خون کسی دوسری جگہ نہ گرے۔ خون ابھی جمنا شروع نہیں ہوا تھا۔ آفتاب کی لاش کو ڈیپ فریزر میں رکھنے کے بعد اسد نے آفتاب کے چہرے کے گرد لپٹا ہوا تولیا نکال لیا جو خون میں تر تھا۔ نورین نے ڈیپ فریزر آن کر دیا اور اسے لاک کرنے لگی۔

''اسے لاک مت کرو۔'' اسد نے کہا۔ ''اگر خدانخواستہ پولیس گھر تک آ گئی یا کوئی بھی یہاں آیا تو وہ اس ڈیپ فریزر کو لاک دیکھ کر خوامخواہ تجسس میں مبتلا ہو جائے گا اور ضرور پوچھے گا کہ اس میں کیا ہے۔ وہ اسے کھولنے پر اصرار کرے گا۔''

''اور لاک نہ ہوا تو؟'' نورین نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''وہ آرام سے ڈیپ فریزر کھولے گا اور آفتاب کی لاش برآمد کر لے گا۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' اسد مسکرایا اور اردگرد دیکھا۔ اسے شراب کی خالی بوتلوں کا ایک انبار نظر آیا۔ اس نے ایک ایک کر کے ڈیپ فریزر میں بوتلیں بھر دیں اور بولا۔ ''اب کوئی بھی ڈیپ فریزر کھولنے سے پہلے بوتلوں کے اس انبار کو ہٹائے گا۔ جب اسے بتایا جائے گا کہ یہ ڈیپ فریزر خالی ہے تو وہ بوتلوں کے اس انبار کو ہٹانے کی مشقت نہیں کرے گا۔''

''تم تو بہت ذہین ہو۔'' نورین نے توصیفی انداز میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ پچاس کروڑ میں سے تیس کروڑ میں لوں اور......''

''زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش مت کرو۔'' نورین منہ بنا کر بولی۔ ''میں کافی بناتی ہوں۔ اس محنت میں خاصی تھکن ہو گئی ہے۔''

''او میڈم!'' اسد نے چٹکی بجا کر کہا۔ ''ابھی کام ختم نہیں ہوا۔ صوفے اور فرش پر آفتاب کے خون کے دھبے موجود ہیں۔ پہلے فرش اور صوفہ اچھی طرح صاف کرو۔ میں پیٹرول کا کین لے کر آتا ہوں۔ صوفہ اور فرش پانی سے صاف کرنے کے بعد اسے پیٹرول سے بھی رگڑ کر صاف کرنا ہوگا تاکہ معمولی سا دھبا بھی نہ رہنے پائے۔''

آدھے گھنٹے کی مشقت کے بعد ان دونوں نے مل کر ہر وہ جگہ صاف کر دی جہاں خون کا معمولی سا قطرہ بھی تھا۔

''بس، اب مجھ سے مزید محنت نہیں ہوگی۔'' نورین نے کہا۔

''پچیس کروڑ اتنی آسانی سے نہیں ملتے میڈم۔'' اسد ہنس کر بولا پھر وہ اچانک بولا۔ ''اپنے کپڑے اتارو۔''

''کک...... کیا مطلب؟'' نورین گھبرا کر بولی۔

''اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ......''

''ارے لعنت بھیجو مطلب پر۔'' اسد جھنجلا گیا۔ ''تمہارے کپڑوں پر بھی خون کے دھبے ہیں۔ یہ اس وقت لگے ہوں گے جب ہم نے آفتاب کی لاش کو ڈیپ فریزر میں رکھا تھا۔ کپڑے مجھے دو تاکہ میں انہیں جلا دوں۔''

کپڑے اور خون میں تر تولیا جلانے کے بعد اسد دیر تک گرم پانی سے نہاتا رہا۔ وہ باتھ روم سے نکلا تو نورین بھی نہا دھو کر فریش ہو چکی تھی۔

''اب کافی لاؤ۔'' اسد نے یوں کہا جیسے نورین اس کی ملازمہ ہو۔

نورین نے گھور کر اسے دیکھا۔

''بلکہ کافی چھوڑو۔'' اسد نے کہا۔ ''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ پہلے ہم کھانا کھا لیتے ہیں، پھر اطمینان سے کافی پئیں گے اور سوچیں گے کہ آفتاب کی خودکشی کو قتل کیسے ثابت کیا جائے۔''

''وہ خط مجھے دے دو جو آفتاب نے زبیری کے نام لکھا ہے۔'' نورین نے کہا۔

''کیا میں شکل سے تمہیں اتنا ہی احمق نظر آ رہا ہوں؟'' اسد نے کہا۔ ''یا تمہارے خیال میں میرا دماغ ماؤف ہو چکا ہے؟ میڈم جی، وہ خط ہی تو ہماری اور خاص طور پر میری بے گناہی کا ثبوت ہے، کل کلاں خدانخواستہ پولیس معاملے کی تہ تک پہنچ گئی تو وہ خط ہی ہماری بے گناہی کا ثبوت ہوگا پھر یہ کہ وہ ایک طرح سے میرا ضمانت نامہ بھی ہے۔ اگر آفتاب کا قتل ثابت ہو جائے تو انشورنس کی رقم تو تمہیں ملے گی۔ تم مجھے میرا حصہ دینے سے انکار کرو گی تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ ہاں، وہ خط میرے پاس ہوا تو میں وہ خط انشورنس کمپنی کے حوالے کر دوں گا، پھر تمہیں وہ لوگ ایک پائی بھی نہیں دیں گے۔''

''تم انتہائی کمینے آدمی ہو۔'' نورین نے کہا۔

''اس تعریف کا شکریہ لیکن تم بھی کم ذلیل اور گھٹیا نہیں ہو۔ چلو اب کھانا لاؤ لیکن اس سے پہلے مجھے ایک ڈرنک بنا دو تاکہ میرے اعصاب کو کچھ سکون مل سکے۔''

کھانے کے بعد برتن سمیٹتے ہوئے نورین نے کہا۔

"تم نے ایڈووکیٹ زبیری کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ وہ کسی بھی وقت نازل ہو سکتا ہے اور وہ آفتاب سے ملنے کی کوشش بھی کرے گا۔"

"ہم کہہ دیں گے کہ آفتاب کسی سلسلے میں لاہور یا اسلام آباد گیا ہے۔ شہر سے باہر تو وہ جاتا ہی ہوگا؟"

"وہ گزشتہ چھ، سات مہینے سے کراچی سے باہر نہیں نکلا۔" نورین نے کہا۔

"اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اب بھی نہیں نکلے گا۔ میں نے اسے دوبارہ بزنس اسٹیبلش کرنے پر قائل کر لیا تھا اور اس سلسلے میں وہ اسلام آباد چلا گیا۔"

"زبیری بہت تیز اور ذہین آدمی ہے۔" نورین نے کہا۔ "وہ ہماری اس بات پر یقین نہیں کرے گا۔ پھر یہ کہ آفتاب اپنے جانے کی اطلاع اسے ضرور دیتا اور وہ کون سا پروجیکٹ ہے جس کے لیے آفتاب کا اسلام آباد جانا ضروری تھا؟ وہ تمہارے مشورے پر اسلام آباد گیا ہے اور تمہیں یہیں چھوڑ گیا؟" نورین کے لہجے میں طنز تھا۔

"ایکسپورٹ بیورو کے چیف سیکریٹری سے اس کی میٹنگ طے ہو چکی تھی۔ عین وقت پر میں بیمار پڑ گیا اس لیے وہ مجبوراً اکیلا ہی چلا گیا۔"

"مجھے تو اس کہانی میں جھول نظر آ رہا ہے۔ اب زبیری سے تم ہی نمٹنا۔" نورین نے کہا اور برتن سمیٹ کر کچن میں چلی گئی۔ وہ دونوں مزید کچھ دیر بیٹھے منصوبہ بندی کرتے رہے، پھر نورین بولی۔ "میرے خیال میں اب سو جانا چاہیے۔"

"بارش ابھی تک تھمی نہیں ہے۔" اسد نے کہا۔ "آؤٹ ہاؤس تک جاتے جاتے میں بھیگ جاؤں گا اور میں اس وقت بھیگنے کے موڈ میں نہیں ہوں اس لیے یہیں سو جاتا ہوں۔"

"جو مرضی آئے کرو۔" نورین نے کہا اور سیڑھیاں چڑھ کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ اسد اسے سیڑھیاں چڑھتے دیکھتا رہا، پھر کچھ سوچ کر وہ بھی اٹھا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا اور نورین کے بیڈ روم میں داخل ہو گیا۔

نورین باریک نائٹی پہنے واش روم سے نکل رہی تھی۔ وہ اسد کو دیکھ کر چونکی اور بولی۔ "اب کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" اسد نے مسکرا کر کہا۔ "میں بھی سونے آیا ہوں۔"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" نورین بگڑ کر بولی۔ "تم یہاں سوؤ گے، میرے بیڈ روم میں؟"

"ہاں بلکہ اس بیڈ پر۔" اسد نے سنجیدگی سے کہا۔

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلو باہر نکلو یہاں سے۔"

"دیکھو، مجھے پیسے سے اتنی دلچسپی نہیں ہے جتنی تمہیں ہے۔ میں یہاں سے نکل کر پولیس کو ٹیلی فون کر دوں گا اور زبیری کو بھی بلا لوں گا۔"

"تم بہت ہی گھٹیا درجے کے بلیک میلر ہو، اس وقت میں مجبور ہوں۔ کر لو اپنی من مانی لیکن پہلے کمرے کی لائٹ آف کر دو۔"

"آفتاب ٹھیک ہی کہتا تھا۔ تم انتہائی گھٹیا درجے کی عورت ہو۔ پیسے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہو۔ میں صرف تمہیں آزما رہا تھا ورنہ مجھے تمہارے اس حسین تھوبڑے سے کوئی دلچسپی تھی بھی تو اب نہیں رہی۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اپنی اس توہین پر نورین غصے اور بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی، پھر بستر پر گر گئی۔ وہ تھوڑی دیر لیٹی پیچ و تاب کھاتی رہی پھر اپنا سیل فون اٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کیا اور بولی۔ "ہیلو ڈیئر...... ہاں، میں اس وقت بہت تھکی ہوئی ہوں۔ بس تمہاری آواز سننے کو ٹیلی فون کیا تھا۔"

اسد وہاں سے نکل کر آفتاب کے بیڈ روم میں چلا گیا۔ اچانک اس کی نظر آفتاب کے سیل فون پر پڑی۔ اس نے چونک کر ٹیلی فون اٹھا لیا۔ اس پر کوئی بھی مس کال یا ایس ایم ایس نہیں تھا۔ اسد نے سکون کا سانس لیا اور سیل فون آف کر دیا۔ پھر اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرا خاصا بے ترتیب تھا۔ اسد نے اسے جوں کا توں چھوڑ دیا پھر اچانک اس کی نظر الماری میں رکھے ہوئے ہینڈ کیری پر پڑی۔ اس نے ہینڈ کیری میں آفتاب کے کچھ کپڑے رکھنے کا ارادہ کیا، پھر اسے خود ہی مسترد کر دیا۔ زبیری جانتا ہوگا کہ آفتاب کون سا سامان لے کر شہر سے باہر جاتا ہے۔ ہینڈ کیری پر تو ایک معروف ائرلائن کا ٹیگ موجود تھا۔ اس کے علاوہ ایک سوٹ کیس پر بھی اسی ائرلائن کا ٹیگ تھا۔ اس نے وہ سوٹ کیس اور ہینڈ کیری اٹھایا اور اسے لے کر آؤٹ ہاؤس کی طرف چلا گیا۔ پھر اس نے فلائٹ انکوائری کو فون کر کے اس ائرلائن کی فلائٹ کے بارے میں معلوم کیا۔ اسے بتایا گیا کہ ائرلائن کی وہ فلائٹ صبح دس بجے اسلام آباد جاتی ہے۔ وہ یہ ساری معلومات زبیری کے سوالات کے لیے اکٹھی کر رہا تھا۔ وہ وکیل تھا اور یہ ضرور پوچھتا کہ آفتاب کس ائرلائن سے اسلام آباد گیا ہے اور کس وقت؟

ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اسد آؤٹ ہاؤس میں اپنے بیڈروم میں آ گیا۔ آفتاب کی خودکشی کے بعد وہ خود بھی ذہنی طور پر منتشر ہو گیا تھا۔ اس نے فضول میں اس خطرناک کام میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اسے آفتاب نے اب تک آٹھ لاکھ روپے دیے تھے۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ پولیس کو اطلاع کرتا اور خاموشی سے نکل جاتا۔ آٹھ لاکھ کی رقم سے وہ کوئی چھوٹا موٹا بزنس تو کر ہی سکتا تھا۔ اب پچھتانا بے کار تھا۔ اب تو وہ بھی اس معاملے میں ملوث ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا، پچیس کروڑ روپے کی رقم بھی تو کم نہیں ہوتی۔ میں یہ رقم لے کر امریکا یا کینیڈا شفٹ ہو سکتا ہوں اور اپنی ایک نئی اور تابناک زندگی کا آغاز کر سکتا ہوں۔

اسے پوری طرح نیند نہیں آئی تھی کہ ہلکی سی ایک آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی اس کے بیڈروم کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آفتاب کا پسٹل اس کے پاس تھا۔ اس نے تکیے کے نیچے سے پسٹل نکالا اور اسے ہاتھ میں لے کر دائیں طرف چھپا لیا۔

دروازہ کھلا تو اسے نورین کا ہیولا نظر آیا کیونکہ کمرے میں نائٹ بلب جل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اسد نے آنکھیں موند لیں اور یوں ظاہر کیا جیسے وہ گہری نیند سو رہا ہے۔

نورین دبے پاؤں اس کے بیڈ کی طرف بڑھی۔ غور سے اس کا جائزہ لیا پھر کمرے میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ اسد کی جیکٹ سامنے ہی کرسی پر پڑی تھی۔ اسد نے خفیف سی آنکھیں کھول کر دیکھا، وہ اس کی جیکٹ کی تلاشی لے رہی تھی۔ اسد دل ہی دل میں ہنسا، نورین کو یقیناً اس خط کی تلاش تھی جو آفتاب نے زبیری کے نام لکھا تھا۔ اسد اتنا بے وقوف نہیں تھا۔ وہ خط اس نے بیڈ کے گدے کے نیچے چھپا رکھا تھا۔

نورین نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اسے خط نہ ملا تو اس نے وہ دونوں چیک نکال لیے جو آفتاب نے اسے دیے تھے اور جنہیں کیش کرانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

نورین دونوں چیک لے کر دروازے کی طرف پلٹی تو اسد نے کہا۔ ”ہیلو میڈم!“

نورین یوں چونک کر پلٹی جیسے اس کا پیر دہکتے ہوئے انگارے پر پڑ گیا ہو۔

”مجھے اتنا بے وقوف سمجھتی ہو کہ میں وہ خط جیکٹ کی جیب میں رکھوں گا۔ تمہاری اس خوب صورت کھوپڑی میں دماغ ہے ہی نہیں لیکن میرا دماغ ابھی کام کر رہا ہے۔ خاموشی سے وہ دونوں چیک میرے حوالے کر دو۔“

”اور کیا تیسرا چیک میں لے جاؤں؟“ نورین نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ ابتدائی جھٹکے سے سنبھل چکی تھی۔

اسد کو خیال آیا کہ اس نے وہ چیک بھی ابھی تک ضائع نہیں کیا تھا جسے اس نے پانچ لاکھ سے پچاس لاکھ میں تبدیل کیا تھا۔

”میرا مطلب ہے کہ تم نے جو کچھ بھی میری جیب سے نکالا ہے، وہ میرے حوالے کر دو ورنہ وہ چیک پچیس کروڑ سے زیادہ تو نہیں ہیں۔“

”یو بلڈی بلیک میلر۔“ نورین نے بھنا کر کہا اور چیک اس کے بیڈ پر پھینک دیے۔

”رک جاؤ......“ اسد غرا کر بولا۔

نورین جھنجلا کر پلٹی تو اس کی آنکھیں خوف سے کھلی رہ گئیں۔ اسد کے ہاتھ میں پسٹل تھا اور اس کا رخ نورین کی طرف تھا۔ وہ ہکلا کر بولی۔ ”تت...... تم...... مجھے......“

”ہاں، اگر تم نے آئندہ اپنی یہ گندی زبان قابو میں نہ رکھی تو میں تمہیں گولی مار کے یہاں سے نکل جاؤں گا بلکہ گولی بھی ضائع نہیں کروں گا۔ تمہاری گردن مروڑ کے تمہیں بھی ڈیپ فریزر میں ٹھونس دوں گا۔ حرام زادی، مجھے گالیاں دیتی ہے۔ جو بدچلن عورت پیسے کے لیے خود کو کسی دوسرے کے حوالے کرنے کے لیے آمادہ ہو، میرے نزدیک وہ جانور سے بھی بدتر ہے۔ اب دفع ہو جا یہاں سے۔“

”صبح ہوتے ہی میں بھی یہاں سے نکل جاؤں گا، پھر تو جانے اور آفتاب کی لاش جانے۔ تو کم سے کم مجھ پر تو قتل کا الزام نہیں لگ سکتا ہے کیونکہ میرے پاس آفتاب کا خط موجود ہے۔“

”سنو اسد!“ نورین نے نرم لہجے میں کہا۔ ”آئی ایم سوری، آئندہ میں ایسی کوئی بات نہیں کروں گی۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔ ہم دونوں کو مل کر کام کرنا ہے تو پھر ہم آپس میں کیوں لڑیں جھگڑیں۔“

”یہ بات بہت دیر سے تمہاری سمجھ میں آئی میڈم۔“ اسد نے کہا۔ ”او کے اب جاؤ اور مجھے سونے دو۔ چوکیدار نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو وہ جانے ہمارے بارے میں کیا سوچے؟“

”چوکیدار یہاں کہاں سے آئے گا۔ گیٹ بالکل مخالف سمت میں ہے اور یہاں سے اس کا فاصلہ بھی بہت ہے۔“ نورین نے کہا اور تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔

اسد نے تینوں چیک اٹھا کر دوبارہ جیب میں رکھے اور اس مرتبہ دروازہ اندر سے بولٹ کر کے سو گیا۔ صبح اس کی

آنکھ دیر سے کھلی۔ وال کلاک میں دس بج رہے تھے۔ وہ تیار ہوکر بنگلے کے لاؤنج میں پہنچا تو نورین پہلے سے نکھری نکھری بیٹھی تھی۔ وہ اسد کو دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ ''لگتا ہے، رات بہت زیادہ تھک گئے تھے۔ چلو، اب ناشتا کرلو۔ تمہارے انتظار میں ابھی تک میں نے بھی ناشتا نہیں کیا۔''

وہ دونوں ناشتے کے بعد کافی پی رہے تھے کہ گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ ''زبیری آگیا۔'' نورین بوکھلا کر بولی۔

''ٹیک اٹ ایزی بے بی۔'' اسد نے کہا اور اپنا کافی کا کپ اٹھا کر کچن میں لے گیا اور خود واپس آکر نورین سے کچھ فاصلے پر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی، پھر زبیری اندر داخل ہوا۔ اس کے جسم پر اس وقت سیاہ کوٹ تھا۔

''ہیلو مسز آفتاب۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''کیسی ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' نورین نے سنبھل کر جواب دیا۔

''السلام علیکم سر!'' اسد نے کہا۔

''وعلیکم السلام۔'' زبیری نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں ناگواری تھی۔ زبیری نے اسد کو نظرانداز کر کے متلاشی نظروں سے اردگرد دیکھا پھر بولا۔ ''ویئر از دیٹ اولڈ ینگ مین؟'' وہ ہنس کر بولا۔ ''کیا وہ اب تک سو رہا ہے؟'' یہ کہہ کر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

''وہ اسلام آباد میں ہیں زبیری صاحب۔'' نورین نے جلدی سے کہا۔

''کیا؟'' زبیری نے حیرت اور بے یقینی سے نورین کو دیکھا۔ ''اسلام آباد کیوں گیا ہے وہ؟''

''سر! انہیں ایکسپورٹ ڈیپارٹمنٹ کے چیف سیکریٹری سے ملنا تھا۔ اصل میں انہیں میں نے ہی مشورہ دیا تھا کہ وہ دوبارہ اپنی لائف ایکٹو کریں۔''

''تم نے مشورہ دیا تھا...... تم نے؟'' زبیری نے حقارت سے کہا۔ ''تم جیسا ڈرائیور بھی آفتاب کو کوئی مشورہ دے سکتا ہے؟''

''سر! میں ڈرائیور نہیں ہوں۔'' اسد نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں آفتاب سر کا پی اے ہوں اور بزنس مینجمنٹ کی ڈگری ہے میرے پاس۔''

''بزنس مینجمنٹ؟'' زبیری نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اور وہ مشورہ کیا تھا؟''

''سر! آپ ایڈووکیٹ ہیں، صرف قانونی نکات ہی سمجھ سکتے ہیں۔ میں آپ کو کیسے سمجھا سکتا ہوں۔'' اسد کا لہجہ بھی تلخ تھا۔ اسے زبیری کے طرزِ تخاطب پر طیش آگیا تھا۔

''وہاٹ ڈو یو مین؟'' زبیری بھنا کر بولا۔ ''کیا میں اتنا ہی جاہل ہوں کہ بزنس کے کسی پلان کو نہ سمجھ سکوں۔ میں آفتاب کا لیگل ایڈوائزر بھی ہوں۔''

''ابھی ہمیں کوئی لیگل پرابلم نہیں ہے۔'' اسد نے کہا۔ ''ویسے میں نے انہیں گاربیج کی ایکسپورٹ کا مشورہ دیا ہے۔''

''گاربیج کی ایکسپورٹ؟'' زبیری نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ کون سی ایکسپورٹ ہے پی اے صاحب؟''

''سر! شاید آپ کو علم نہیں ہے کہ صرف کراچی میں ہی ٹنوں کے حساب سے گاربیج ہوتا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں کوریا کی ایک کمپنی سے رابطہ کیا تھا۔ وہ لوگ اس پر راضی ہیں۔ اب مسئلہ ہے صرف ایکسپورٹ لائسنس کا۔ آفتاب صاحب اسی سلسلے میں اسلام آباد گئے ہیں۔'' اسد نے کہا۔

اس نے دیکھا کہ اس جواب سے زبیری کچھ مرعوب ہوگیا ہے۔ اس نے کہا۔ ''پھر تو پی اے کی حیثیت سے تمہارا جانا بھی ضروری تھا؟''

''میں بھی جا رہا تھا لیکن کل اچانک مجھے تیز بخار ہوگیا۔ اس وقت تو مجھے اپنی سدھ بدھ نہیں تھی۔ سر کا جانا ضروری تھا اس لیے وہ مجھے ساتھ لیے بغیر ہی چلے گئے۔''

''وہ کسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوگا۔'' زبیری نے کہا پھر سیل فون نکالتے ہوئے بولا۔ ''میں آفتاب ہی کو کال کر لیتا ہوں۔''

''کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' نورین نے کہا۔ ''صبح سے کئی مرتبہ میں کوشش کر چکی ہوں۔ ان کا نمبر مسلسل آف ہے۔ یا تو وہ میٹنگ میں ہیں یا پھر ان کے سیل فون کی بیٹری لو ہوگئی ہے۔ چارجر تو وہ یہیں بھول گئے ہیں۔''

''یہ کوئی ایشو نہیں ہے بھابی۔'' زبیری نے کہا۔ ''آفتاب کسی جنگل میں نہیں ہے۔ وہ سیل فون کا چارجر ہی کیا سیل فون بھی خرید سکتا ہے۔ اتنی معمولی سی بات تو اس کی عقل میں بھی آجانا چاہیے تھی۔''

''زبیری بھائی! آپ ان کی عادت تو جانتے ہیں۔ کہیں جاکر انہیں گھر کی فکر کب ہوتی ہے۔ اب کوئی ضرورت پڑے گی تو وہ کال کرنے کے لیے چارجر بھی خرید لیں گے اور نیا سیل فون بھی۔ وہ تو لینڈ لائن پر بھی کال کر سکتے ہیں۔'' نورین کے لہجے میں تلخی تھی۔

''ہاں، اس کی عادت تو میں جانتا ہوں۔'' زبیری نے

طویل سانس لے کر کہا۔ ''گزشتہ بیس سال سے اسے جانتا ہوں۔ خدا کرے کہ اس کا موجودہ پروجیکٹ کامیاب رہے۔''

''ہاں، اگر اسد ان کے ساتھ رہا تو ممکن ہے وہ پھر سنبھل جائیں۔'' نورین نے کہا۔

''او کے بھابی۔'' زبیری نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ابھی ہائی کورٹ جانا ہے۔ آفتاب اگر رابطہ کرے تو مجھے ضرور بتائیے گا۔''

''آپ چائے تو پی لیں۔'' نورین نے کہا۔ ''میں ابھی لے کر آتی ہوں۔''

''ارے بھابی! چائے کو چھوڑیں، میں اس وقت ذرا جلدی میں ہوں اور میں کوئی مہمان تو ہوں نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے میز سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی اسد نے کچن سے ڈسٹر اٹھا کر اسے پانی سے گیلا کیا اور لاؤنج کی طرف دوڑا۔ نورین اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ جس صوفے پر آفتاب نے خودکشی کی تھی، اس کے پائے پر بہت خفیف سا دھبا تھا۔ وہ دھبا بہت غور سے دیکھنے کے بعد ہی نظر آرہا تھا۔ اسد نے رگڑ رگڑ کر وہ دھبا پانی سے صاف کر دیا۔ پھر بہت غور سے صوفے کے ایک ایک حصے کا جائزہ لیا۔ فرش کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر دوبارہ کچن میں چلا گیا۔ اسد نے وہ کپڑا بھی کچن میں جا کر جلا دیا۔

وہ دوبارہ لاؤنج میں آکر بیٹھا تو نورین نے کہا۔ ''اب اس مصیبت کا کیا کریں گے؟ زبیری تو کل پرسوں پھر نازل ہو جائے گا۔ اب جلد ہی کچھ سوچو ورنہ زبیری آفتاب کو تلاش کرنے میں زمین آسمان ایک کر دے گا۔ وہ اسلام آباد میں موجود اپنے دوستوں سے مدد کرنے کو کہے گا۔ ممکن ہے وہ خود بھی اسلام آباد چلا جائے۔ کچھ سوچو اسد...... کچھ سوچو۔''

''تم خاموش ہو گی تو میں کچھ سوچوں گا نا۔'' اسد نے کہا۔ ''اگر سوچنے کی تھوڑی سی زحمت تم بھی کر لو تو کوئی حرج نہیں ہے۔'' اسد کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ''خودکشی کی ہے تمہارے شوہر نے...... انشورنس کی رقم تمہیں ملے گی، میرا اس میں کیا فائدہ ہے؟''

''تمہیں پچیس کروڑ تو رہے ہیں۔'' نورین نے کہا۔

''میں اب تیس کروڑ روپے لوں گا۔ زبیری جیسے گھاگ انسان سے نمٹنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ابھی تو میں نے جھوٹ بول کر اسے ٹہلا دیا ہے۔'' پھر اسد کو خود ہی ہنسی آگئی۔ ''گاربیج کی ایکسپورٹ...... ایسی کسی ایکسپورٹ کا وجود نہیں ہے۔ کوریا، چائنا اور دوسرے ملکوں کی کمپنیز گاربیج ٹھکانے لگانے اور صاف کرنے کے ٹھیکے ضرور لیتی ہیں لیکن وہ اس کا معاوضہ لیتی ہیں۔ وہ ہم سے کوڑا خریدتی نہیں ہیں۔''

اسد کی بات پر نورین بھی ہنسنے لگی۔

''دانت مت نکالو۔'' اسد نے چڑ کر کہا۔ ''وہ اگر ایکسپورٹ کے کسی آدمی سے بات کرے گا تو میرا جھوٹ فوراً پکڑ لے گا۔ ایک تو وہ آدمی مجھے پسند نہیں ہے کیونکہ بہت ذہین ہے، اوپر سے وہ وکیل بھی ہے۔''

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ کچھ سوچو۔'' نورین نے کہا۔

اسد کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ ''ایک پلان تو ہے لیکن اس کے لیے ہم دونوں کے علاوہ کسی تیسرے آدمی کی ضرورت پڑے گی گواہی کے لیے۔''

''تیسرا آدمی۔'' نورین نے چونک کر کہا۔ ''نو وے، اس کی وجہ سے کوئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔''

''پہلے تم پلان سن لو، تیسرا فرد اس کے لیے لازمی ہے۔ کوئی ایسا سیدھا سادہ اور گاؤدی لڑکا یا لڑکی جو عقل سے پیدل بھی ہو۔''

''پلان کیا ہے؟'' نورین نے پوچھا۔

''کل آفتاب صاحب اسلام آباد سے واپس آجائیں گے بلکہ آج ہی لوٹ آئیں تو بہتر ہے۔'' اسد نے کہا۔

''اس سے کیا ہوگا؟'' نورین نے کہا۔

''یار! پوری بات سنے بغیر مت ٹوکا کرو۔''

''اچھا بولو، اب نہیں ٹوکوں گی۔'' نورین نے کہا۔

''آفتاب صاحب اسلام آباد سے لوٹیں گے تو ان کی طبیعت بہت خراب ہوگی۔ نزلہ، بخار، کھانسی اور کچھ دوسری شکایات۔ وہ زیادہ وقت سو کر گزاریں گے۔ خاص طور پر زبیری کی آمد کے وقت وہ سو رہے ہوں گے اور انہیں زبیری صاحب سے ملنے نہیں دیا جائے گا۔ البتہ وہ اس ملازم یا ملازمہ کی موجودگی میں جاگ رہے ہوں گے اور انتہائی چڑچڑے ہوں گے۔ چیخیں گے، چلائیں گے، برتن اٹھا کر پھینک دیں گے۔ دوا کھانے سے انکار کریں گے اور تمہیں دھکے دے کر اپنے کمرے سے نکال دیں گے۔ ایسا صرف اس لیے ہوگا کہ وہ ملازمہ یا ملازم ان کے زندہ ہونے کی تصدیق کر سکے۔ پھر ہم ایک رات انہیں آغا خان اسپتال لے جائیں گے کیونکہ ان کی حالت بہت بگڑ جائے گی۔ اس کی گواہی بھی وہ تیسرا فرد دے گا جو یہاں موجود ہوگا۔''

''لیکن آفتاب صاحب ہیں کہاں؟ کیا انہیں ڈیپ

فریزر سے نکال کر لے جاؤ گے؟''

اسد نے ایک طویل سانس لیا اور بولا۔ ''تم اگر خاموش بیٹھی رہو تو زیادہ حسین لگتی ہو اور دل میں بہت اچھے اچھے خیالات آتے ہیں۔'' اسد کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''سوری...... اب نہیں بولوں گی۔''

''آفتاب صاحب کا گیٹ اپ میں کروں گا اور تم مجھے سہارا دے کر سیڑھیوں سے اتاروگی۔ ان کی چال میں لڑکھڑاہٹ ہوگی۔ تم نے بتایا تھا کہ رات کو سوتے وقت روشنی ان کی آنکھوں کو چبھتی ہے۔ لائٹ آن ہو تو وہ بہت غصہ کرتے ہیں۔''

''اس بات کی گواہی تو زبیری بھی دے گا۔'' نورین نے کہا۔ ''وہ بھی آفتاب کی اس عادت سے واقف ہے۔''

''اس لیے ہم زینے میں اندھیرا رکھیں گے۔ گھر میں موجود گواہ کے مطابق میں یعنی آفتاب صاحب کا پی اے تم سے اجازت لے کر اپنے کسی ذاتی کام سے نکل جاؤں گا۔ آفتاب کی طبیعت بگڑے گی تو تم مجھے بلاؤ گی لیکن میری گاڑی کا ٹائر برسٹ ہو جائے گا اور مجھے آنے میں تاخیر ہو گی۔ گھبرا کر تم خود ہی آفتاب کو اسپتال لے جاؤ گی، ٹوکنا مت۔'' اسد نے نورین کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کہا۔ ''میں یہاں سے کچھ فاصلے پر کسی ایسی جگہ گاڑی پارک کردوں گا جہاں دوسری گاڑیاں بھی پارک ہوں گی، پھر میں کسی ٹیکسی یا رکشا کے ذریعے یہاں پہنچوں گا اور ایک بلاک پہلے ہی اتر کے پیدل یہاں تک آؤں گا۔ بنگلے کے عقبی حصے سے باؤنڈری وال پھلانگ کے میں اندر آؤں گا اور سیوریج پائپ کے ذریعے آفتاب کے بیڈروم کی کھڑکی تک پہنچوں گا۔ تم کمرے کی کھڑکی اندر سے کھلی رکھنا بس پھر میں آفتاب کا میک اپ کروں گا اور تم مجھے آفتاب بنا کر یہاں سے لے جانا۔ کوشش کرنا کہ گواہ تمہیں اور آفتاب صاحب کو واضح طور پر دیکھ سکے۔ تم مجھے وہیں چھوڑو گی جہاں میں نے دوسری گاڑی پارک کی ہوگی۔ ہم دونوں الگ الگ گاڑیوں میں ایک اسکول تک جائیں گے۔ وہ اسکول بھی میں نے منتخب کر لیا ہے۔ وہاں چوکیدار بھی نہیں ہوتا ہے۔ چوکیدار صبح ڈیوٹی پر آتا ہے اور صفائی وغیرہ کراتا ہے۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں باندھ کر تمہیں اسکول کے ایک کمرے میں ڈال دوں گا اور وہاں سے واپس آجاؤں گا۔ صبح ہوتے ہی اسکول کا چوکیدار وہاں پہنچ جائے گا۔ تمہاری کہانی یہ ہوگی کہ تم آفتاب صاحب کو لے کر اسپتال کے لیے نکلی تھیں۔ راستے میں تم لوگوں کو گن پوائنٹ پر اغوا کر کے اس اسکول میں لایا گیا اور ڈاکو تمہارے ہاتھ پیر باندھ کر تمہیں وہیں چھوڑ گئے اور آفتاب صاحب کو لے گئے۔ اب یہ معما پولیس حل کرے گی کہ ڈاکوؤں نے آفتاب صاحب کو کیوں اغوا کیا؟ وہ یہی سمجھیں گے کہ انہیں تاوان کے لیے اغوا کیا گیا ہے۔ جب تم گھر آجاؤ گی تو میں تمہیں کہیں سے کال کروں گا اور دس کروڑ روپے تاوان کا مطالبہ کروں گا۔ جو ظاہر ہے کہ تمہارے پاس نہیں ہیں۔ ڈاکو تاوان نہ ملنے پر آفتاب صاحب کو ہلاک کر کے کہیں پھینک دیں گے، کچھ گھنٹے یا ایک آدھ دن بعد پولیس کو آفتاب صاحب کی لاش مل جائے گی۔ لاش ڈیپ فریزر میں رکھی ہے اس لیے پوسٹ مارٹم رپورٹ میں وقت کا تعین نہیں ہو سکے گا کہ موت کب واقع ہوئی۔ ہاں، میں ان کا یہ پسٹل بھی کہیں پھینک دوں گا تاکہ آلۂ قتل بھولے سے بھی یہاں سے دستیاب نہ ہو سکے۔ ان کا قتل ثابت ہوتے ہی تم انشورنس کمپنی کو کلیم کر سکتی ہو۔ پھر ہم اپنے اپنے حصے کی رقم لیں گے اور الگ ہو جائیں گے۔''

''اپنی اپنی رقم یعنی ففٹی ففٹی؟'' نورین نے وضاحت چاہی۔

''چلو ففٹی ففٹی ہی سہی۔'' اسد نے فراخ دلی سے کہا۔ ''تمہیں بھی آفتاب کی بیوی کا کردار نبھانے کے لیے بہت محنت کرنا پڑے گی۔ رونا دھونا پڑے گا، پولیس کو قائل کرنا پڑے گا۔''

''او کے۔'' نورین نے کہا۔ ''پلان تو قابلِ عمل ہے لیکن اسلام آباد سے واپسی پر آفتاب کی بیماری ذرا ٹیڑھا مسئلہ ہے۔ زبیری پوچھے گا کہ جب آفتاب کی طبیعت اتنی خراب تھی تو اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر کیوں نہیں گئے؟''

''میں شہر کے ایک معروف ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا اور اسے آفتاب کی حالت کے بارے میں بتاؤں گا پھر اسے ساتھ چلنے پر مجبور کروں گا بلکہ ڈاکٹر کو تم لے کر آنا۔ مجھے تو یہاں آفتاب کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ میں آفتاب کے گیٹ اپ میں اس کے بیڈ پر لیٹ جاؤں گا۔ میں ڈاکٹر سے بھی بدسلوکی کروں گا۔ اسے گالیاں دوں گا اور بے ہوش ہو جاؤں گا۔ تم شدید کھانسی کی شکایت کرنا، بلڈ پریشر ہائی رہنے کی بات کرنا اور اس قسم کی دوسری شکایات بیان کرنا۔ ڈاکٹر مجھے سکون آور اور کچھ اینٹی بایوٹک دوائیں دے گا اور اپنی فیس لے کر گالیاں کھاتا ہوا چلا جائے گا۔ اس کے بعد اس تیسری ہستی کی آمد ہوگی۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ کیسی اداکاری کرتی ہو۔ آفتاب کے کمرے میں برتن توڑنا، شراب کی بوتل دیوار سے دے مارنا اور کمرے سے باہر نکل کر اس کی خوشامدیں کرنا کہ پلیز دوا تو لے لیں۔ گواہ یہ سمجھے

گا کہ صاحب نے بے عزت کر کے بیگم صاحبہ کو کمرے سے نکال دیا ہے۔ ایسے میں زبیری ضرور آئے گا۔ اسے کمرے میں جانے سے روکنا اور ہینڈل کرنا تمہارا کام ہے۔ کہہ دینا کہ آفتاب رات بھر سوئے نہیں ہیں، ابھی سوئے ہیں اور ڈاکٹر نے کہا ہے کہ انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔"

"او کے، میں سمجھ گئی۔" نورین نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "لیکن آفتاب تو ڈیپ فریزر میں پڑا ہی رہ جائے گا۔"

"نہیں، تمہارے اغوا کے بعد میں دو تین دن بعد مناسب موقع دیکھ کر اسے یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا اور کسی کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دوں گا۔ کوڑے کا وہ ڈھیر آبادی کے نزدیک ہوگا تاکہ پولیس کو فوراً ہی اس کی لاش مل جائے۔"

"او کے ڈن۔" نورین نے کہا۔

"تو پھر تم ابھی کسی ڈاکٹر کو لے آؤ۔ میں آفتاب کا گیٹ اپ کر لیتا ہوں۔"

"پہلے تم گیٹ اپ تو کر لو۔" نورین نے کہا۔

اسد، آفتاب کے کمرے میں آیا۔ آفتاب کا قد اسد کے مقابلے میں کچھ کم تھا۔ اسد نے اس کا سلیپنگ گاؤن پہنا، سر پر اونی ٹوپی پہنی، کلائی پر آفتاب کی قیمتی رولیکس گھڑی باندھی اور کمرے میں نائٹ بلب روشن کر دیا۔ اس نے شراب کی آدھی بوتل اور گلاس نہ صرف رکھ لیا بلکہ ایک پیگ بھی لے لیا۔

نورین مطمئن ہو کر ڈاکٹر کو بلانے چلی گئی۔ اسد سوچ رہا تھا کہ یہ ایک جوا ہے۔ اگر کامیاب ہو گئے تو پچیس کروڑ ورنہ دھوکا دہی کے الزام میں چند ماہ کی جیل اور صرف اٹھاون لاکھ۔ وہ چیک اسد کی جیب میں اب بھی موجود تھے۔ اس نے سوچا کہ کل موقع ملتے ہی اسے بینک سے کیش کرا لے گا۔

اگر منصوبہ ناکام بھی ہو گیا تو جیل سے رہا ہونے کے بعد اس کے ذہن میں بزنس کے کئی پلان تھے۔ اس سے پہلے بھی اسے ملازمت کی نہیں بلکہ کسی فنانسر کی تلاش تھی جو اس کے بزنس میں سرمایہ لگا سکے۔ وہ اپنی ماں کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانا چاہتا تھا لیکن وہ اس کے کسی بھی منصوبے کے شروع ہونے سے پہلے ہی چل بسی۔ اسد مجرمانہ ذہنیت کا مالک تو نہیں تھا لیکن ہاتھ آیا ہوا یہ موقع گنوانا بھی نہیں چاہتا تھا۔

وہ دیر تک سوچوں میں گم رہا، اس نے وقت گزاری کے لیے شراب کا ایک اور پیگ لے لیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا ذہن ہواؤں میں اڑنے لگا۔ اسی وقت اس نے پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز سنی۔ پھر زینے پر قدموں کی آہٹ ہوئی اور اس کے کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھلا۔ دوسرے ہی لمحے نورین کی آواز آئی۔ "آیئے ڈاکٹر صاحب! پیشنٹ کو دیکھ لیں۔"

"یہاں آپ نے اتنا اندھیرا کیوں کر رکھا ہے؟" اسے ڈاکٹر کی آواز سنائی دی۔

"میرے ہسبینڈ کو بیماری میں روشنی سے الرجی ہو جاتی ہے۔"

"ہو از دیئر؟" اسد نے بالکل آفتاب کے انداز میں چیخنے کی کوشش کی۔

"میں ہوں ڈارلنگ!" نورین نے محبت کرنے والی بیوی کی طرح کہا۔

ڈاکٹر آگے بڑھا اور بولا۔ "ہیلو سر! آئی ایم ڈاکٹر اشفاق۔"

"گیٹ لاسٹ ڈاکٹر، میں مر نہیں رہا ہوں۔"

"سر! پلیز مجھ سے کوآپریٹ کریں۔ میں آپ کو زیادہ دیر ڈسٹرب نہیں کروں گا۔" ڈاکٹر نے ہمت کر کے اسد کی نبض پکڑ لی۔

اسد جانتا تھا کہ شراب کے دو پیگ بی کر اس کا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے اس لیے وہ کبھی ایک پیگ سے زیادہ نہیں پیتا تھا۔ اسد اس وقت تکیے کے سہارے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر شراب کا گلاس اٹھایا اور تیسرا پیگ بھی ایک سانس میں خالی کر دیا۔

ڈاکٹر نے حیرت سے اسے دیکھا، پھر نورین سے بولا۔

"اس حالت میں ڈرنک کرنا ان کے لیے مناسب نہیں ہے۔"

"اس حالت میں؟" نورین نے مغموم لہجے میں کہا۔ "یہ تو گزشتہ کئی سال سے مسلسل پی رہے ہیں۔ ہر وقت نشے میں رہنا چاہتے ہیں۔"

"آپ ان کی شراب نوشی کی عادت چھڑا نہیں سکتیں؟"

"شٹ اپ یو راسکل۔" اسد چیخا۔ "تم کون ہوتے ہو میری شراب چھڑانے والے۔ ایڈیٹ...... اپنی فیس لو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

"آپ کا چیک اپ کر لوں تو یہاں سے چلا جاؤں گا۔" ڈاکٹر نے ضبط کر کے کہا۔ نورین نے راستے میں شاید ڈاکٹر کو بریف کر دیا تھا۔ اس نے اسٹیتھو اسکوپ نکال کر کان سے لگایا اور اسد کی پیٹھ پر رکھ کر بولا۔ "ذرا گہری سانس لیں۔"

اسد نے اس کا بندوبست بھی پہلے ہی سے کر رکھا تھا۔

اس نے شرٹ کے نیچے سینے سے لے کر کمر تک ایسا شاپر لپیٹ لیا تھا جس میں سے ہاتھ لگاتے ہی کھڑ کھڑ کی آوازیں آتی ہیں۔

اسد نے لمبا سانس لیا تو ڈاکٹر نے گھبرا کر پہلے اسد کی طرف پھر نورین کی طرف دیکھا۔ دوبارہ اس نے اسٹیتھو اسکوپ اسد کے سینے پر رکھا۔ پھر وہی کھڑ کھڑ کی تیز آوازیں سنیں تو ڈاکٹر چکرا کر رہ گیا۔

''لگتا ہے، نزلے کی وجہ سے ان کا سینہ بالکل جکڑ گیا ہے۔ اینٹی بائیوٹک دینا پڑے گی اور آپ انہیں نیبولائزر بھی لگوالیں۔''

''نیبولائزر میرے پاس ہے۔ آپ پلیز جلدی کریں۔ انہیں پھر غصہ آ گیا تو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔''

ڈاکٹر نے جلدی سے اسد کا بلڈ پریشر چیک کیا۔ اس کا بلڈ پریشر بھی بڑھا ہوا تھا۔ اس کا چیک اپ کر کے ڈاکٹر کمرے سے نکل گیا اور بولا۔ ''ان کی حالت تو واقعی بہت خراب ہے۔ میں کچھ دوائیں اور انجکشن لکھ رہا ہوں۔ انجکشن لگانے کے لیے میں اپنے ڈسپنسر کو بھیج دوں گا۔''

''آپ زحمت نہ کریں ڈاکٹر۔'' نورین نے کہا۔ ''مجھے آئی ایم اور آئی وی دونوں طرح کے انجکشن لگانے آتے ہیں۔ میں انہیں انجکشن خود لگا لوں گی۔''

''اوکے، آپ فوری طور پر دوائیں منگوالیں۔''

نورین نے ڈاکٹر کا پرچہ اپنے بیگ میں رکھا اور بولی۔ ''آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔ میرا ڈرائیور اصل میں ان ہی کے ایک ضروری کام سے گیا ہوا ہے۔''

نورین کے جاتے ہی اسد نے اونی ٹوپی اتار پھینکی۔ آفتاب کا سلیپنگ گاؤن اتار کر اپنے کپڑے پہنے اور کمرے سے باہر آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد نورین بھی لوٹ آئی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ''ویری گڈ پرفارمنس اسد۔ تم نے تو دل خوش کر دیا۔''

''اب تمہاری پرفارمنس کی باری ہے۔'' اسد نے کہا۔ ''تمہیں بھی بھرپور اداکاری کرنا پڑے گی۔''

''میں کر لوں گی۔ میں نے کئی سال ماڈلنگ کی ہے۔''

''ماڈلنگ میں اور اداکاری میں بہت فرق ہے مائی ڈیئر نورین۔'' اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر نورین کا نرم و گداز ہاتھ پکڑ لیا۔ اس مرتبہ نورین نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی۔

''یار! اب کچھ کھلاؤ پلاؤ گی یا میں تمہارا ہاتھ پکڑے ہی بیٹھا رہوں۔''

نورین بہت ادا سے مسکرائی اور نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر کچن کی طرف چلی گئی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں کافی پی رہے تھے کہ زبیری آ گیا۔ نورین کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''آفتاب کی کوئی خیر خبر؟'' اس نے آتے ہی پوچھا۔

''واپس آ گئے ہیں لیکن شدید بیمار ہیں۔'' نورین نے کہا۔ ''انہیں شدید نزلہ ہے، بخار ہے۔ ابھی ابھی ڈاکٹر انہیں دیکھ کر گیا ہے۔ اسد دوائیں لینے جا رہا تھا۔''

''کس ڈاکٹر کو دکھایا ہے؟''

''ڈاکٹر اشفاق احمد کو..... نوجوان ڈاکٹر ہے لیکن ہائی کوالیفائڈ ہے۔ اس کے پاس مریضوں کا رش تھا، بہت مشکل سے میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوا۔ اسد کے ساتھ تو وہ آنے سے ہی انکار کر دیتا لیکن میری خوشامد پر آ گیا۔''

نورین نے اسے دواؤں کا پرچہ دکھایا۔

زبیری نے بہت غور سے دواؤں کا پرچہ دیکھا۔ پھر بولا۔ ''میں ذرا اس سے مل لوں۔'' وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

''زبیری صاحب!'' اسد نے کہا۔ ''لگتا ہے وہ کل سے نہیں سوئے تھے، ڈاکٹر نے انہیں نیند کا انجکشن دیا ہے۔''

''ڈاکٹر نے کہا ہے کہ انہیں بالکل ڈسٹرب نہ کیا جائے۔'' نورین نے کہا۔

''اوکے، اوکے۔'' زبیری نے کہا۔ ''میں اب دو دن تک تو شاید نہ آسکوں۔ مجھے ایک کیس کے سلسلے میں لاہور جانا ہے۔ بھابی آپ میری طرف سے پوچھ لیجیے گا اور ان کا خیال رکھیے گا۔''

''میں سوچ رہی ہوں کہ عارضی طور پر کوئی ملازمہ رکھ لوں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ آفتاب بیماری میں کتنے چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ مجھے ایک پل کے لیے بھی نہیں چھوڑیں گے۔''

''ہاں، میں تو کب سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کوئی ملازمہ رکھ لیں۔''

''میں دوائیں لے کر آتا ہوں۔'' اسد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں بھی اب چلوں گا۔'' زبیری نے کہا۔

''ارے، آپ تو بیٹھیں۔'' نورین نے کہا۔ ''میں آپ کے لیے کافی لے کر آتی ہوں۔''

''ہاں، کافی تو میں ضرور پیوں گا۔'' زبیری نے کہا۔

اسد دوائیں لینے چلا گیا۔ نورین نے اسے دواؤں کے پیسے بھی دیے تھے۔ وہ دوائیں لے کر واپس آیا تو بنگلے

کا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ زبیری چوکیدار پر برس رہا تھا۔

''تم یہاں چوکیداری کرتے ہو یا چرس پیتے ہو۔ تمہاری آنکھیں چڑھی ہوئی ہیں اور کمرے میں چرس کا دھواں بھرا ہوا ہے۔''

''کیا کرے صاحب، یہ خانہ خراب پیچھا ہی نہیں چھوڑتی۔'' پھر وہ اکڑ کر بولا۔ ''لیکن صاحب! ام چرس پی کر بھی بالکل ہوش میں ہوتا ہے۔''

''شٹ اپ!'' زبیری چیخا۔ ''اپنا بوریا بستر سمیٹو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

''اس دفعہ معاف کردیو صاحب! ام......''

''بکواس بند کرو۔'' زبیری چیخا۔ ''اور نکلو یہاں سے۔''

چوکیدار بوجھل قدموں سے اپنی کوٹھری میں گیا اور تھوڑی دیر بعد ٹین کا ایک ٹرنک لے کر باہر نکلا۔

''کتنے پیسے بنتے ہیں تمہارے؟'' زبیری نے پوچھا۔

''امارا تنخواہ تو بیس ہزار ہے لیکن...... ابھی......''

''کوئی بات نہیں۔ ابھی مہینا پورا ہونے میں بارہ دن باقی ہیں۔'' اس نے جیب سے اپنا پرس نکالا اور بیس ہزار روپے گن کر چوکیدار کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

''ام کو بھیک مت دیں صاحب۔'' چوکیدار نے کہا اور پیسے...... زبیری کو واپس کر دیے۔ ''ہمارا سامان کا تلاشی بھی لے لیو، بھی آپ یہ سوچے کہ نور خان ادھر سے کچھ چوری کر کے لے گیا۔''

''ٹھیک ہے۔'' زبیری نے کہا۔

چوکیدار تیزی سے باہر نکل گیا۔ زبیری نے نورین سے کہا۔ ''بھابی، آپ فکر مت کریں۔ میں واپس آتے ہی کسی دوسرے چوکیدار کا بندوبست کردوں گا۔''

''یہ ہمارا بہت پرانا ملازم تھا اور......''

''چرس پی کر چوکیداری کرتا تھا۔'' زبیری نے طنزیہ لہجے میں کہا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ پھر جاتے جاتے نورین سے بولا۔ ''بھابی پریشان مت ہوئیے گا اور آفتاب کا خیال رکھیے گا۔ میں دو روز بعد لوٹ آؤں گا۔ مجھے امید ہے کہ آفتاب اس وقت تک صحت یاب ہو چکا ہوگا۔'' اس نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا اور گیٹ سے باہر نکل گیا۔

اسد نے گیٹ بند کر دیا اور بولا۔ ''اس وکیل نے تو ہمارا کام آسان کر دیا۔ ہمیں چوکیدار کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا پڑتا۔ زبیری نے خود ہی اسے نکال دیا۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''میری نظر میں ایک لڑکی ہے۔ پڑھی لکھی لیکن بالکل بونگی ہے۔ خوب صورت چہرے اور جسم کی مالک ہے لیکن کھوپڑی میں دماغ کی جگہ بھوسا بھرا ہوا ہے۔ اسے ملازمت کی ضرورت بھی ہے۔ میں کل ہی اسے لے آؤں گا۔''

''تم اسے کیسے جانتے ہو؟'' نورین نے چونک کر پوچھا۔

''وہ میرے محلے میں رہتی ہے اور مجھ سے عشق کرتی ہے۔''

''لڑکی تیز طرار تو نہیں ہے نا؟''

''اسے عشق کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں آتا۔ ہمیں اس سے کون سا عقل کا کام لینا، صرف گواہ ہی تو چاہیے۔ پسماندہ علاقے میں رہتی ہے اس لیے اتنے بڑے گھر میں آکر وہ یوں بھی مرعوب ہو جائے گی۔ پھر تم بھی اس کے ساتھ اپنا رویہ ذرا سخت رکھنا تو سہمی ہوئی رہے گی۔''

''لیکن وہ کچن کے ساتھ والے چھوٹے کمرے میں سوئے گی۔'' نورین نے کہا۔

''اس کا وہاں ہونا ضروری ہے ورنہ وہ گواہی کیسے دے گی؟'' اسد مسکرایا۔ ''دن میں کسی وقت وہ آؤٹ ہاؤس میں آجایا کرے گی۔ آخر وہ مجھ سے عشق بھی کرتی ہے۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' نورین نے کہا۔

''کیوں؟'' اسد نے پوچھا۔ ''کیا اسے عشق کرنے کا حق نہیں ہے۔ پھر یہ بھی سوچو کہ وہ عشق میں الجھ کر بالکل ہی عقل سے پیدل ہو جائے گی۔''

نورین اسے صرف گھور کر رہ گئی۔ دوسرے دن اسد اس لڑکی کو گھر لے آیا۔ اس کا نام تو شبانہ تھا لیکن وہ شبو کے نام سے مشہور تھی۔

نورین نے اسے دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔ لڑکی واقعی حسین تھی۔ پرکشش چہرہ، سانچے میں ڈھلا ہوا جسم اور ریشمی سیاہ بال جو اس کی سفید رنگت پر بہت بھلے لگ رہے تھے۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' نورین نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''میرا نام شبانہ ہے جی...... لیکن...... سب مجھے شبو کہتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کچھ پڑھی لکھی بھی ہو؟'' نورین نے پوچھا۔

''میٹرک پاس ہوں بیگم صاحبہ۔'' شبو نے جواب دیا۔ ''کھانا پکانا، کپڑے دھونا اور صفائی ستھرائی کرنا تو مجھے خوب آتا ہے کیونکہ اماں نے بچپن سے ان ہی کاموں میں لگا دیا تھا۔''

''تمہارا کام ہے کھانا پکانا، برتن دھونا اور صفائی کرنا۔ صاحب آج کل بیمار ہیں، اوپر مت جانا۔ وہ غصے کے بہت تیز ہیں۔ ان سے بچ کر رہنا۔''

"جی بیگم صاحبہ.... تنخواہ کتنی ملے گی؟" شبو نے بھول پن سے پوچھا۔

"بیس ہزار ملے گی لیکن تمہیں یہیں رہنا ہوگا۔ ہفتے میں ایک دن کی چھٹی ملے گی۔ تمہارا کوئی رشتے دار یہاں نہیں آئے گا۔"

"مجھے اسد نے ساری باتیں پہلے ہی سمجھا دی ہیں۔" اس نے محبت پاش نظروں سے اسد کو دیکھا پھر بولی۔ "میں اپنا سامان لے آؤں؟"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔" نورین نے کہا۔ "میرے پاس بہت کپڑے ہیں، ان میں سے جو بھی پسند آئے لے لینا۔ ضرورت کی ہر چیز تمہیں یہاں مل جائے گی۔"

"آپ کا بہت شکریہ بیگم صاحبہ۔" پھر وہ چونک کر بولی۔ "لیکن کھانا...... میں......"

نورین کو ہنسی آگئی۔ "بھئی جب تم یہاں رہوگی تو کھانا بھی یہیں کھاؤ گی۔"

"پھر تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔" شبو خوش ہو کر بولی۔

اب انہیں اپنے دوسرے اور سب سے بڑے پلان پر عمل کرنا تھا۔ اسد چاہتا تھا کہ یہ کام زبیری کے آنے سے پہلے ہی ہو جائے۔ اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ شبو اس وقت کچن کی صفائی میں مصروف تھی۔

"یہ بوتلیں ڈیپ فریزر پر کیوں رکھی ہیں بیگم صاحبہ؟" شبو نے اس ڈیپ فریزر کی طرف اشارہ کیا جس میں آفتاب کی لاش تھی۔ یہ کہہ کر وہ ایک ایک کر کے بوتلیں ہٹانے لگی۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟" نورین چیخ کر بولی۔

شبو سہم کر رہ گئی۔ گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ سے ایک بوتل گر کے ٹوٹ گئی۔

"معاف کر دیں بیگم صاحبہ، میں......"

"کوئی بات نہیں۔" نورین نے کہا۔ "یہ بوتلیں صاحب نے رکھی ہیں۔ وہ انہیں ہمیشہ یہیں رکھتے ہیں۔ انہیں یہاں سے ہٹانے کی کوشش مت کرنا۔"

"نہیں کروں گی بیگم صاحبہ۔" شبو نے کہا۔ "لیکن ڈیپ فریزر کھولنے کے لیے تو انہیں ہٹانا ہی پڑتا ہوگا نا؟"

"ڈیپ فریزر خالی ہے شبو۔" اسد نے کہا۔ "پھر موضوع بدل کر بولا۔ "تمہیں کافی بنانا آتی ہے؟"

"یہ بات تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟" شبو نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ "میں نے کئی دفعہ تو تمہیں بھی کافی بنا کر پلائی ہے۔" پھر وہ نورین سے بولی۔ "بیگم صاحبہ! میں نے کچھ دن ایک بنگلے میں بھی کام کیا ہے۔ کافی بنانا میں نے وہیں سیکھی ہے۔ ایسی کافی بناؤں گی کہ آپ کو بھی بہت پسند آئے گی۔"

"چلو، پھر بناؤ۔" نورین نے ہنس کر کہا۔

دس منٹ کے اندر اندر شبو کافی بنا کر لے آئی۔ اس نے واقعی بہترین کافی بنائی تھی۔

"دوپہر کے کھانے میں آپ کیا کھائیں گی بیگم صاحبہ؟" شبو نے پوچھا۔

"دوپہر میں تو صرف میں کچھ سلائس اور کافی لیتی ہوں۔ اسد صاحب البتہ کھانا کھاتے ہیں۔ ان سے پوچھو، یہ کیا کھائیں گے؟"

"میں جانتی ہوں جی ان کی پسند۔" شبو ہنس کر بولی۔ "میں بھی وہی کھا لوں گی جو اسد کھائے گا۔"

"یہ تمہارا محلہ نہیں ہے شبو۔" نورین نے سرد لہجے میں کہا۔ "اسد صاحب ہمارے صاحب کے پی اے ہیں۔ ان کا نام یہاں عزت سے لو۔"

"غلطی ہوگئی اسد صاحب۔" شبو نے فوراً ہاتھ جوڑ دیے۔

"تم ایسا کرو، پہلے اچھی طرح نہا دھو کر کپڑے بدل لو۔" نورین نے کہا۔ "آؤ میں تمہیں کپڑے دے دوں۔"

دوپہر کے کھانے کے بعد اسد نے کہا۔ "اب ہمارا کام تو رات تک شروع ہوگا۔"

"اتنی جلدی مت کرو اسد۔" نورین نے کہا۔ "یہ کام ہم کل کریں گے۔" پھر وہ انگریزی میں بولی۔ "اس گھامڑ کو بھی یہاں کے ماحول سے مانوس ہونے دو۔ ابھی تو اسے یہ یقین بھی دلانا ہے کہ آفتاب اپنے کمرے میں موجود ہے۔ زبیری کی فکر مت کرو۔ وہ تین دن سے پہلے نہیں آئے گا اور آ بھی گیا تو میں اسے اوپر نہیں جانے دوں گی۔"

"او کے۔" اسد نے کہا۔ پھر نورین کے تاثرات معلوم کرنے کے لیے اس نے شبو سے کہا۔ "نہا دھو کر اور بیگم صاحبہ کے کپڑے پہن کر تو تم پہچانی ہی نہیں جا رہی ہو۔ تم تو کچھ زیادہ ہی خوب صورت نظر آ رہی ہو۔"

شبو نے سر جھکا لیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ نورین کی تیوریوں پر البتہ بل پڑ گئے تھے لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔

"شبو۔" اسد نے کہا۔ "ذرا میرے کمرے کی صفائی بھی کر دو۔ بیگم صاحبہ تو اب سوئیں گی۔"

"تمہارا...... میرا مطلب ہے کہ آپ کا کمرا کون سا ہے اسد صاحب؟" شبو نے پوچھا۔

"آؤ، میں تمہیں اپنا کمرا دکھا دوں۔" اسد نے اٹھتے

ہوئے کہا۔
''لڑکی بہت معصوم ہے اسد۔'' نورین نے کہا۔
''اس کی عزت کا خیال رکھنا۔'' اس نے یہ جملہ انگریزی میں ادا کیا تھا۔
''اس کی عزت کا خیال رکھوں، تم مجھے اپنے برابر کا نہیں سمجھتی ہو، میں آخر کروں کیا؟''
''میں نے کب تمہیں برابر کا نہیں سمجھا؟'' نورین نے کہا۔
''تو پھر مجھے وہاں کیوں جانا پڑتا ہے؟'' اسد نے کہا۔
''تم اپنی مرضی سے وہاں سوتے ہو یار۔'' نورین ہنس کر بولی۔ ''تم چاہو تو یہاں سو جاؤ۔'' نورین نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
''میں مذاق کر رہا تھا۔'' اسد نے کہا۔ ''مجھے کہیں بھی سونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے زندگی نے کبھی عیاشی کا موقع ہی نہیں دیا۔ میں تو فرش پر بھی سو کر خوش رہتا ہوں۔'' اسد سنجیدہ ہو گیا۔
''تمہیں زندگی نے موقع نہیں دیا؟'' نورین نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم ڈرنک کرتے ہو، محلے کی لڑکیوں سے فلرٹ کرتے ہو اور......''
''میں نے زندگی میں صرف دو تین بار ہی پی ہے۔'' اسد نے کہا۔ ''دو دفعہ کالج کے زمانے میں چند دوستوں کے مجبور کرنے پر اور تیسری دفعہ یہاں۔ میری ماں اس معاملے میں بہت سخت تھی۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا تو وہ تو صدمے سے مر جاتی۔ لڑکیاں چاہتی ہیں کہ میں ان سے فلرٹ کروں لیکن میں نے کبھی کسی لڑکی کو دھوکا نہیں دیا۔''
''واؤ......'' نورین ہنسی۔ ''تم تو بہت پارسا ہو۔''
''تم تو خوب انگریزی بولتے ہو۔'' شبو نے کہا۔ وہ حیرت سے منہ پھاڑے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ ''مجھے بھی انگریزی پڑھا دیا کرو۔''
''تم یہاں کام کرنے آئی ہو۔'' نورین نے آنکھیں نکالیں۔
''آؤ، میں تمہیں اپنا کمرا دکھا دوں۔'' اسد نے شبو سے کہا اور آؤٹ ہاؤس کی طرف روانہ ہو گیا۔
اس نے شبو کو آؤٹ ہاؤس دکھایا تو وہ حیرت سے بولی۔ ''یہ تو پورا گھر ہے اسد۔ ہمارے گھر سے بھی بڑا ہے۔ تم یہاں کیا جاب کرتے ہو؟ تمہاری تنخواہ تو بہت زیادہ ہو گی۔ تمہارے پاس گاڑی بھی ہے۔''
''وہ گاڑی میری نہیں ہے۔ میں کام کے لیے استعمال کرتا ہوں بس اب تم کام کرو۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکلا تو اسے نورین نظر آئی جو تیزی سے اقامتی عمارت کی طرف جا رہی تھی۔
''عجیب عورت ہے۔'' اسد نے سوچا۔ ''ابھی یہ بیوہ ہوئی ہے اور اسے ذرہ برابر افسوس نہیں ہے۔ ایسی عورتیں صرف ہوس کی غلام ہوتی ہیں۔ مجھ سے بھی صرف اس لیے لگاوٹ سے بات کرتی ہے کہ اسے پچیس کروڑ کا لالچ ہے......اونہہ۔''
اسد دوبارہ لاؤنج میں پہنچا تو نورین صوفے پر بیٹھی کسی سے سیل فون پر بات کر رہی تھی۔ اس نے اتنی ٹائٹ جینز پہن رکھی تھی کہ اس میں اس کا جسم نمایاں ہو رہا تھا۔
ٹیلی فون سے فارغ ہو کر اس نے اسد کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''تم واپس کیوں آ گئے؟ تم تو سونے گئے تھے۔''
''تم وہاں میری ٹوہ لینے گئی تھیں؟'' اسد نے درشت لہجے میں پوچھا۔
''مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔'' نورین نے آہستہ سے کہا۔ ''کہ تم کسی اور لڑکی کے ساتھ......''
''کیوں......؟'' اسد نے اسے گھورا۔
''اس لیے...... کہ...... میں...... تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔'' نورین نے کہا۔
اس کی بات پر اسد نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''تمہارے منہ سے یہ لفظ اچھا نہیں لگتا۔''
''میں جانتی ہوں کہ تم میری بات کا یقین نہیں کرو گے۔'' نورین نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں تم سے جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''
''اچھا۔'' اسد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''پھر ایسا کرو، آفتاب کے انشورنس کی پوری رقم مجھے دے دو۔''
ایک لمحے کے لیے نورین کے چہرے کا رنگ بدلا، پھر وہ محبت بھرے لہجے میں بولی۔ ''چلو، یہ بھی منظور ہے۔ پوری رقم تم لے لو بلکہ میرے پاس لاکھوں روپے کے جو زیورات ہیں وہ بھی لے لو لیکن میری بات کا یقین کرو۔ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔''
لاکھوں روپے پر اسد کو یاد آیا کہ اس نے ابھی تک آفتاب کے دیے ہوئے چیک کیش نہیں کرائے ہیں۔ اس نے نورین سے کہا۔ ''میں آفتاب کے دیے ہوئے چیک کیش کرا کے آتا ہوں۔ اس وقت تک شبو فارغ ہو جائے گی۔ تم اسے سنانے کو کچھ ایسا ڈراما کرنا کہ اسے آفتاب کی

کمرے میں موجودگی کا یقین ہو جائے۔''

اسد نے آفتاب کا بہترین سوٹ پہنا، ٹائی لگائی اور وہ تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو نورین اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس کے ہاتھ میں خوب صورت سا ایک بریف کیس بھی تھا۔ وہ بینک والوں کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ رقم اس کے لیے معمول کی بات ہے۔

وہ چیک تین مختلف بینکوں کے تھے۔ وہ ڈیفنس کے کمرشل ایریا میں پہنچا تو کچھ فاصلے پر اسے وہ بینک نظر آ گئے۔ پہلے بینک میں اس نے پانچ لاکھ کا چیک دیا جو چند منٹ میں کیش ہو گیا۔ وہاں سے رقم لے کر اسد دوسرے بینک میں گیا۔ وہاں سے تین لاکھ روپے کا چیک بھی کیش ہو گیا۔ اس کے بریف کیس میں آٹھ لاکھ روپے کی خطیر رقم موجود تھی۔ اس نے اتنی رقم کبھی ایک ساتھ نہیں دیکھی تھی۔

پچاس لاکھ روپے کے لیے وہ تیسرے بینک میں داخل ہوا اور سیدھا منیجر کے کمرے میں پہنچ گیا۔

''یس سر!'' منیجر نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ ''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''مجھے ایک چیک کیش کرانا ہے۔'' اسد نے کہا اور جیب سے پچاس لاکھ روپے کا چیک نکال کر منیجر کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ تو مسٹر آفتاب کا چیک ہے۔'' منیجر نے چیک دیکھتے ہی کہا۔

''جی ہاں، میں ان کا پی اے ہوں۔''

''او کے، آپ تشریف رکھیں۔ کیا لیں گے آپ...... کولڈ ڈرنک یا کافی؟''

''نو تھینکس۔'' اسد نے کہا۔ ''میں ذرا جلدی میں ہوں۔ مجھے ایک ضروری میٹنگ میں جانا ہے۔''

منیجر نے انٹرکام پر کسی کو بلایا اور بولا۔ ''آفتاب صاحب نے تو بہت دن سے چکر ہی نہیں لگایا، کیا وہ آج کل بہت مصروف ہیں؟''

''مصروف تو وہ ہمیشہ ہی ہوتے ہیں۔'' اسد نے انگریزی میں جواب دیا۔

اسی وقت بینک کا کوئی ملازم اندر داخل ہوا۔ ''خالد! یہ چیک فوراً کیش کرا دو۔'' منیجر نے کہا۔

اس کے جانے کے بعد اس نے پوچھا۔ ''لگتا ہے آفتاب صاحب نے کوئی نیا پروجیکٹ شروع کیا ہے ورنہ وہ یہ چیک نہ دیتے۔''

''جی ہاں۔'' اسد نے کہا۔ ''ایک دو پروجیکٹ پائپ لائن میں ہیں اور فوری طور پر ایک پروجیکٹ شروع ہو چکا ہے۔''

''اس لیے وہ اپنا فکس ڈیپازٹ ختم کر رہے ہیں۔'' منیجر نے کہا۔

اس دوران میں خالد مطلوبہ رقم لے کر آ گیا۔ اس نے رقم منیجر کی ٹیبل پر رکھ دی۔

''سر! ہماری کچھ فارملٹیز ہوتی ہیں، آپ بھی جانتے ہوں گے۔ ہمیں آپ کے این آئی سی کی ایک کاپی اور چیک کی پشت پر آپ کے سائن بھی چاہئیں۔''

''شیور۔'' اسد نے کہا اور جیب سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر منیجر کے حوالے کر دیا۔ ''اس وقت میرے پاس کاپی نہیں ہے۔'' اسد نے کہا۔

''نو پرابلم۔'' منیجر نے کہا۔ ''میں ابھی کاپی کرواتا ہوں۔'' اس نے اسد کا دیا ہوا چیک اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنا پین بھی دے دیا۔

اسد نے چیک کی پشت پر اپنے دو سائن کیے اور چیک منیجر کے حوالے کر دیا۔ اسی وقت پیون اسد کا شناختی کارڈ لے آیا۔ اسد نے رقم بریف کیس میں رکھی اور منیجر کا شکریہ ادا کر کے بینک سے باہر نکل آیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آفتاب کا کوئی فکس ڈیپازٹ بھی تھا۔ شاید اس لیے اس نے مجھے دوسرے بینک کا چیک دیا تھا۔ وہ فکسڈ ڈیپازٹ ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یقیناً وہ رقم بھی کروڑوں میں ہوگی جبھی تو یہ چیک کیش ہو گیا۔ وہ منیجر سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کہ فکسڈ ڈیپازٹ میں کتنی رقم ہے؟

وہ واپس پہنچا تو شبو سہمی ہوئی لاؤنج میں کھڑی تھی اور اوپر سے نورین کی آواز آ رہی تھی۔ ''آفتاب، پلیز دوا لے لو...... ورنہ......'' اس کے ساتھ ہی چھناکے کی آواز آئی۔ شاید نورین نے گلاس دیوار پر دے مارا تھا۔ وہ غصے میں کمرے سے باہر نکلی اور چیخ کر بولی۔ ''اب میں تمہیں زبردستی دوا کھلاؤں گی۔ تم کیا سمجھتے ہو، تمہارے غصے سے میں ڈر جاؤں گی۔ میں ابھی اسپتال سے دو میل نرسوں کو بلاتی ہوں۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی نیچے آ گئی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے نورین کو دیکھا۔ وہ اس وقت غضب کی اداکاری کر رہی تھی۔ شبو ابھی تک سہمی ہوئی کھڑی تھی۔

''ہونا کیا ہے؟'' نورین نے کہا۔ ''وہ موصوف دوا نہیں کھا رہے ہیں۔ پانی کا گلاس مجھ پر دے مارا۔ میں اگر بچ نہ جاتی تو میری پیشانی زخمی ہو جاتی۔''

''آپ فکر مت کریں میڈم!'' اسد نے کہا۔ ''میں

انہیں دوا کھانے پر راضی کرلوں گا۔"

"تمہیں تو وہ تھپڑ مار دیں گے۔"

"نو پرابلم۔ وہ بیمار ہیں اور اس وقت غصے میں ہیں۔انہیں دوا کھلانا تو ضروری ہے، لائیے مجھے دیں۔"

"تمہیں اپنا سر تڑوانے کا زیادہ شوق ہے تو ضرور جائو۔" نورین نے منہ بنا کر کہا اور پلیٹ میں رکھی ہوئی دو تین ٹیبلٹس اور پانی کا ایک گلاس اس کے حوالے کر دیا۔

"اسد...... صاحب...... ذرا سنبھل کر جائیے گا۔" شبو نے کہا۔

اسد سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا، کمرے کا دروازہ کھولا اور بولا۔ "سر! کل آپ کو اسلام آباد جانا ہے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی تو آپ جا نہیں سکیں گے۔"

پھر وہ آفتاب کی طرح آواز نکال کر چیخا۔ "شٹ اپ، اینڈ گیٹ لاسٹ۔"

"دوا تو میں آپ کو کھلا کر جاؤں گا۔ پلیز سر۔" اندر پھر ایک گلاس ٹوٹا، کچھ کھسر پھسر کی آوازیں آئیں۔ اسد نے کہا۔ "گڈ، اب پانی بھی پی لیں۔" اس نے ٹیبلٹس ڈسٹ بن میں پھینکیں۔ پانی کی بوتل اٹھا کر کچھ پانی اپنے چہرے اور کپڑوں پر ڈالا، بال بکھرائے اور آفتاب کے کمرے سے باہر نکل کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ تھکا تھکا سا نیچے آ گیا۔

"کیا ہوا؟" نورین نے پوچھا۔ شبو اب بھی وہاں سہمی ہوئی کھڑی تھی۔

"دوا کھلا کر آیا ہوں۔ بہت مشکل سے دوا کھلائی ہے۔ میں نے انہیں دھمکی دی تھی کہ اگر انہوں نے دوا نہ کھائی تو میں ابھی اور اسی وقت ملازمت چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ بس اس بات پر وہ رام ہو گئے۔" اسد نے نورین کی طرف فاتحانہ انداز سے دیکھا۔

نورین نے شبو کی طرف دیکھا۔ پھر درشت لہجے میں بولی۔ "تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟ اپنا کام کرو۔"

شبو جلدی سے کچن میں چلی گئی۔

"یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔" نورین نے احتیاطاً انگلش میں کہا۔ "اب وہ قسمیں کھا کر بتائے گی کہ کل تک صاحب گھر میں موجود تھے۔" پھر وہ اسد سے بولی۔ "تمہارا کام ہوا؟"

"نہیں یار! آفتاب کے اکاؤنٹ میں رقم ہی نہیں ہے۔ تینوں چیک واپس ہو گئے۔"

"تمہیں فی الحال کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟" نورین نے پوچھا۔

"میں کچھ دن صبر کرلوں گا، پھر تو تم پورے پچاس کروڑ مجھے دے ہی دو گی۔" یہ کہہ کر اس نے نورین کے تاثرات جاننے کی کوشش کی۔

"ہاں، ہاں...... وہ پورے پچاس کروڑ تم لے لینا لیکن مجھے......"

"اب تم نے یہ لیکن اور اگر مگر کیا شروع کر دیا؟" اسد نے منہ بنا کر کہا۔

"میں صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں کہ تمہارے دل میں بھی میرے لیے کوئی جگہ ہے؟"

اسد نے پہلی دفعہ اس نظر سے نورین کو دیکھا۔ نورین کے چہرے پر اس وقت معصومیت تھی۔ اس نے سوچا، نورین جھوٹ نہیں بول سکتی۔ وہ پچاس کروڑ تو مجھے دے ہی دے گی لیکن کیا واقعی وہ میری محبت میں اتنی پاگل ہو چکی ہے؟

"کیا سوچ رہے ہو اسد؟" نورین نے پوچھا۔

"مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم......"

"میرے پاس تقریباً ستر اسّی لاکھ کے زیورات اور میرے اکاؤنٹ میں بھی اتنی ہی رقم ہے۔" وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ "آؤ میرے ساتھ۔" وہ اسد کے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے الماری کھول کر اپنی چیک بک نکالی اور بلینک چیک پر سائن کر کے چیک اسد کو دے دیا، پھر بینک لاکر کی چابی نکالی اور بولی۔ "ذرا میرے ساتھ بینک تک چلو۔"

"کیوں؟" اسد نے حیرت سے پوچھا۔

"چلو تو سہی۔" نورین نے کہا۔

وہ دونوں نیچے آئے۔ شبو کچن میں تھی۔ نورین نے اسے آواز دے کر بلایا اور کہا۔ "شبو! میں اسد صاحب کے ساتھ ایک ضروری کام سے جا رہی ہوں۔ تم صاحب کے کمرے کی طرف مت جانا اور کوئی آئے تو کہہ دینا کہ میم صاحب کام سے باہر گئی ہیں۔" پھر وہ اسد سے بولی۔ "ایک منٹ! میں ابھی آتی ہوں۔" وہ اوپر گئی اور فوراً ہی واپس آ گئی۔ "کسی کا ٹیلی فون آئے تو مت اٹھانا" اس نے شبو سے کہا اور وہ دونوں باہر نکل گئے۔

بینک پہنچ کر اسد وزیٹنگ ایریا میں بیٹھا رہا۔ نورین منیجر کے کمرے میں چلی گئی۔ آتے وقت وہ ایک بڑا بیگ لے کر آئی تھی۔ چند منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی اور اس نے اسد سے کہا۔ "میں نے منیجر سے معلوم کر لیا ہے۔ میرے اکاؤنٹ میں اس وقت تقریباً چالیس لاکھ روپے ہیں۔ لاؤ

وہ چیک مجھے دو۔‘‘

اسد نے نورین کا دیا ہوا چیک اسے واپس کر دیا۔ ایک مرتبہ پھر وہ منیجر کے کمرے کی طرف چلی گئی اور چند منٹ بعد لوٹ آئی۔

☆☆☆

جب وہ گھر پہنچے تو شبو جھاڑ پونچھ میں مصروف تھی۔ اس نے بتایا کہ نہ کوئی آیا تھا، نہ ہی کوئی ٹیلی فون آیا۔ صاحب کے کمرے سے کوئی آواز بھی نہیں آئی۔ میں نے سوچا کہ دیکھوں صاحب سو رہے ہیں یا جاگ رہے ہیں۔ میں نے ان کے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو دروازہ کھلا نہیں۔ شاید صاحب نے اندر سے لاک کر لیا ہے۔

’’تم اوپر کیوں گئی تھیں؟‘‘ نورین نے بپھر کر کہا۔

’’وہ...... جی...... میں نے...... سوچا......‘‘

’’شٹ اپ۔‘‘ نورین غصے میں دہاڑی۔ ’’تم منع کرنے کے باوجود اوپر گئیں...... کیوں؟‘‘

’’معاف کر دیں بیگم صاحبہ، غلطی ہو گئی۔ میں تو صاحب کے لیے سوپ......!‘‘

’’صاحب وہی سوپ تمہارے سر پر الٹ دیتے اور غصے میں تمہاری گردن دبوچ لیتے۔‘‘ پھر وہ اسد سے بولی۔ ’’اس لڑکی کو فارغ کرو، اس کا حساب کرو اور اسے گھر چھوڑ آؤ۔‘‘

’’اس دفعہ معاف کر دیں بیگم صاحبہ!‘‘ شبو خوشامد بھرے لہجے میں بولی۔ ’’آئندہ آپ جو کہیں گی میں وہی کروں گی۔‘‘

’’میڈم!‘‘ اسد نے کہا۔ ’’شبو غلط لڑکی نہیں ہے۔ اس دفعہ اسے معاف کر دیں۔ آئندہ اگر یہ کوئی ایسی حرکت کرے گی تو میں خود اسے گھر چھوڑ آؤں گا۔‘‘

’’او کے۔‘‘ نورین نے کہا۔ ’’اب جا کر ہمارے لیے کافی بناؤ۔‘‘

نورین، اسد کو لے کر اپنے کمرے میں آ گئی اور بیگ میں سے زیورات کے ڈبے نکال کر اسد کے سامنے ڈھیر کر دیے۔

’’ان کا کیا کرنا ہے؟‘‘ اسد نے حیرت سے کہا۔

’’یہ سب تمہارا ہے اسد۔‘‘ پھر اس نے بیگ سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر اسد کے حوالے کر دیں۔ ’’میں نے اپنی جمع پونجی تمہارے حوالے کر دی۔ میں تمہیں یقین دلانا چاہتی ہوں کہ مجھے دولت کی نہیں، تمہاری ضرورت ہے۔ کیا تم اب بھی میری محبت کا یقین نہیں کرو گے؟‘‘

اسد نے پہلی مرتبہ اپنے دل میں اس کی محبت محسوس کی۔ اس کے لہجے کی سچائی نے بھی اسد کو بہت متاثر کیا تھا۔

’’اگر تمہیں اب بھی میری بات کا یقین نہیں ہے تو اوپر چھت پر چلو، میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔‘‘ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

اسد الجھن آمیز انداز میں اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ نورین کی اشتعال انگیز چال ایک مرتبہ پھر اسد کے دل میں اتھل پتھل کرنے لگی۔

چھت کے اوپری حصے میں چار فٹ کی باؤنڈری وال بنی ہوئی تھی۔ نورین باؤنڈری وال کے ایک سرے پر ٹھہر گئی۔ اسد الجھن آمیز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا کہ اب نورین اسے کیا دکھانے والی ہے؟

’’اس کی بلندی زمین سے کتنی ہو گی اسد؟‘‘ نورین نے پوچھا۔

’’کیا اوٹ پٹانگ سوالات کر رہی ہو؟‘‘ اسد جھنجلا گیا۔

’’یہ اوٹ پٹانگ سوال نہیں ہے۔‘‘ نورین نے سنجیدگی سے کہا۔ ’’مجھے بتاؤ، یہ چھت زمین سے کتنی بلندی پر ہے؟‘‘

’’میرا اندازہ ہے کہ پینتالیس فٹ تو ہو گی۔‘‘

’’اب اگر کوئی یہاں سے کسی کو دھکا دے دے تو کیا وہ زندہ بچے گا؟‘‘ نورین نے دوسرا سوال کیا۔

اسد نے نیچے دیکھا۔ وہ بنگلے کا عقبی حصہ تھا جہاں وہ دونوں کھڑے تھے۔ وہاں نیچے کی طرف پختہ فرش تھا۔ اس نے کہا۔ ’’اگر تم یہ سوچ رہی ہو کہ ہم آفتاب کی لاش اوپر لا کر یہاں سے پھینک دیں تو اس کے زندہ بچنے کے امکانات بالکل نہیں ہیں لیکن......‘‘

’’میں آفتاب کی بات نہیں کر رہی ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ باؤنڈری وال پر چڑھ گئی۔ ’’میں اپنے زیورات اور تمام جمع پونجی تمہیں دے چکی ہوں۔ اب میرے پاس صرف میری جان ہے اگر تمہیں اب بھی میری محبت کا یقین نہیں ہے تو میں ابھی یہاں سے کود جاؤں گی۔ بولو، تم مجھ پر یقین کرتے ہو یا نہیں؟ مجھے صرف ہاں یا نہ میں جواب دو۔‘‘

’’تم اس دیوار سے تو نیچے اترو۔‘‘ اسد گھبرا کر بولا۔ ’’گر جاؤ گی۔‘‘

’’میری بات کا جواب دو اسد، یس یا نو۔‘‘ نورین کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ ’’اگر تم نے فوراً ہی جواب نہ دیا تو میں تمہارا جواب سنے بغیر ہی کود جاؤں گی۔‘‘

اسد نے بوکھلا کر اسے دیکھا۔ اس نے عجیب سے

لہجے میں کہا۔ ''مجھے معاف کر دینا اسد، خدا حافظ۔'' اس نے اپنا رخ موڑا اور کودنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے۔

دوسرے ہی لمحے اسد اگر اسے پکڑ نہ لیتا تو وہ نیچے گر کے مر چکی ہوتی۔ اس نے چھلانگ لگا دی تھی۔ اگر اس کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ نہ آجاتا تو واقعی مر چکی ہوتی۔ اسد نے اسے بمشکل تمام گھسیٹ کر نیچے اتارا اور بولا۔ ''نورین...... میں بھی تم سے محبت کرنے لگا تھا لیکن مجھے ڈر لگتا تھا کہ تم میری محبت کو ٹھکرا نہ دو۔ آئی لو یو...... آئی لو یو۔''

نورین نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

''چلو، اب نیچے چلو۔'' اسد نے کہا۔

نورین یوں بوجھل قدموں سے چل رہی تھی جیسے اس کے ہاتھ پیر قابو میں نہ ہوں۔ وہ دونوں پھر نورین کے بیڈ روم میں آگئے۔ اسد نے ہمدردی سے کہا۔ ''میں تمہارے لیے ڈرنک بناتا ہوں۔''

''تم پیو گے تو میں بھی پیوں گی۔'' نورین نے کہا۔ ''ورنہ نہیں۔''

اسد اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا پھر نورین سے بولا۔ ''چلو، اب نیچے چلو۔ لاؤنج میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ وہ شبو نہ جانے ہمارے بارے میں کیا سوچے گی؟''

''سوچتی رہے۔'' نورین نے بے پروائی سے کہا۔

''لیکن وہ جو کچھ سوچے گی اگر اس نے پولیس یا زبیری کے سامنے بک دیا تو فضول کا شک پیدا ہو جائے گا۔''

نورین نے بھی اس کی بات سے اتفاق کیا اور دونوں نیچے آگئے۔ اسد نے ڈرنک تیار کی اور دونوں ایک ساتھ پینے لگے۔

تھوڑی دیر بعد وہاں نورین کے سریلے قہقہے گونجنے لگے۔ اسد بھی ہنس رہا تھا لیکن اسے اپنی ہنسی پر کنٹرول تھا۔ نورین نے مزید ڈرنک کی فرمائش کی لیکن اسد نے سختی سے اسے روک دیا۔ ''بس کافی ہے، تم سے تو یہ دو پیگ بھی برداشت نہیں ہو رہے ہیں۔''

''میں...... آج بہت...... خوش ہوں۔''

سرور تو اسد کے رگ و پے میں بھی تھا لیکن وہ ہوش و حواس میں تھا۔ وہ بوتل اور گلاس وہاں سے اٹھا کر کچن میں لے گیا۔ شبو اس دوران میں کئی بار وہاں سے گزری تھی اور حیرت سے ان دونوں کو دیکھتی ہوئی چلی گئی تھی۔

''دیکھو نورین، اب اردو میں بات مت کرنا۔'' اسد نے کہا۔ اسے خدشہ تھا کہ نورین کوئی ایسی ویسی بات نہ کر دے جو شبو کے کانوں تک پہنچ جائے۔ شبو کم عقل ضرور تھی لیکن پاگل نہیں تھی کہ ان کی باتیں نہ سمجھ سکتی۔

''او کے باس...... ایز یو وش۔'' نورین جھوم کر بولی۔

پھر نورین نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کرتی رہی لیکن انگلش میں۔ اس نے اسد کی بات کو گویا گرہ میں باندھ لیا تھا۔

''میں نے جب پہلی دفعہ تمہیں دیکھا تھا تو مجھے تم سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔'' نورین ترنگ میں بولی۔

''کیوں؟'' اسد نے چونک کر پوچھا۔

''آفتاب اس وقت اچھا خاصا مر رہا تھا۔ وہ اس وقت مر جاتا تو میرے لیے کوئی پرابلم ہی نہ رہتی۔ اس کی حادثاتی موت کے بے شمار گواہ ہوتے لیکن تم نہ جانے کہاں سے انسانیت کا درد لے کر وہاں آگئے اور آفتاب کو مرنے سے بچا لیا۔ پھر جب آفتاب نے تمہیں ملازم رکھ لیا تو مجھے تم سے مزید نفرت ہو گئی لیکن پھر یہ نفرت نہ جانے کب محبت میں تبدیل ہوئی۔ تم آہستہ آہستہ میرے دل میں گھر کرتے چلے گئے۔ آفتاب کی خودکشی کے بعد تم نے جس انداز میں میرا ساتھ دیا، اس نے تو مجھے تمہارا غلام بنا دیا۔''

''میرے خیال میں اب تم آرام کرو نورین۔'' اسد نے کہا۔ ''گزشتہ آدھے گھنٹے سے بول رہی ہو۔''

''نہیں اسد، مجھے بولنے دو۔ میں جانتی تھی کہ تم مجھے ایک لالچی اور خود غرض عورت سمجھتے تھے اور میں تھی بھی ایسی لیکن تمہاری محبت نے مجھے بدل دیا۔ اب تک بہت سے مردوں سے سابقہ پڑا ہے میرا۔ وہ سب میرے جسم کے طلب گار تھے۔ جس نے بھی مجھ پر نظر ڈالی، بری ہی نظر ڈالی۔ حتیٰ کہ آفتاب بھی میرے حسن کا خریدار تھا۔ وہ بھی مجھے کھلونا سمجھتا تھا۔ نہ جانے وہ کون سا لمحہ تھا جب اس نے اپنی انشورنس پالیسی میرے نام کر دی تھی۔ وہ ذہنی مریض تھا۔ عورتوں پر ظلم کر کے نہ جانے اس کے کون سے جذبے کی تسکین ہوتی تھی۔ میں اس کی تیسری بیوی تھی۔ اس کی پہلی بیوی نے خودکشی کر لی تھی، دوسری بیوی پاگل خانے میں ہے۔ اپنے اسی ذہنی مرض میں ہر وقت شراب کے نشے میں دھت رہتا تھا۔ اس کا اربوں کا کاروبار بہت تیزی سے سکڑ رہا تھا اور اس کے منیجرز، ڈائریکٹرز اور پارٹنرز دونوں ہاتھوں سے اسے لوٹ رہے تھے۔ وہ ڈپریشن کا مریض ہو گیا تھا۔ اس پر کروڑوں روپے کا قرض ہے، یہ بنگلا بھی گروی ہے۔ اس ڈپریشن میں اس نے خودکشی کر کے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ خود تو کتے کی موت مر گیا لیکن مجھے بھی

کنگال کر گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی انشورنس پالیسی مجھے ملے۔ وہ جاتے جاتے مجھے بھی ذہنی مریض بنانا چاہتا تھا۔ تم وہ پہلے مرد ہو اسد جس نے اپنے مرد ہونے کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ میں اس وسیع و عریض بنگلے میں کب سے تمہارے ساتھ تنہا ہوں لیکن تم نے آج تک بری نیت سے میری طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔"

"رات بہت ہو گئی ہے نورین۔" اسد نے کہا۔

"اب جا کر سو جاؤ۔"

"آج تم بھی آؤٹ ہاؤس کے بجائے میرے بیڈ روم......"

"نہیں نورین۔" اسد نے کہا۔ "ابھی نہیں، پہلے اس آفتاب کی مصیبت سے فارغ ہو جائیں، پھر میں تم سے شادی کر لوں گا......؟"

"تم...... مجھ سے شادی کرو گے؟" نورین خوشی سے بولی۔

"ہاں نورین! میں تم سے شادی کروں گا۔ ہم اس منحوس جگہ کو چھوڑ کر اپنا چھوٹا سا خوب صورت گھر بنائیں گے۔ میں بزنس کروں گا اور تم میرا گھر سنبھالو گی۔ میرے بچوں کو سنبھالو گی۔" اسد جذباتی ہو گیا۔

نورین خوشی سے جھومتی، لہراتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اسد بھی سوچ رہا تھا کہ عورت کو سمجھنا بہت مشکل ہے جو عورت دولت کی ہوس میں اپنے شوہر کی خودکشی کو قتل ثابت کرنا چاہتی ہے، وہی عورت سب کچھ مجھ پر نچھاور کرنے پر آمادہ ہے بلکہ کر چکی ہے۔

"اب تم بھی جا کر سو جاؤ۔"

"ویسے اتنی انگریزی بول کر تمہاری زبان ٹیڑھی نہیں ہوئی؟"

اسد بھی اٹھ گیا۔

☆☆☆

دوسرے دن ناشتے کے بعد نورین نے پھر اصرار کیا کہ میرے تمام زیورات اور کیش تم لے لو۔

"نورین!" اسد نے کہا۔ "یہ زیورات اور کیش تمہارے پاس رہیں یا میرے پاس، بات تو ایک ہی ہے۔"

"تو پھر لیتے کیوں نہیں؟" نورین نے منہ بنا کر کہا۔

"بات تو ایک ہی ہے۔" اس نے زیورات کے ڈبے اور کیش کی رقم ایک بیگ میں رکھ کر اس کے حوالے کر دی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی نورین کے اصرار پر اس نے وہ بیگ لے لیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر جانے کو تیار ہو گیا۔

نورین نے پوچھا۔ "تم اس وقت کہاں جا رہے ہو؟"

"آج ہمارے پلان کا آخری مرحلہ ہے۔ مجھے اس کے لیے تھوڑی سی شاپنگ کرنا پڑے گی کچھ ضروری چیزیں خریدنا ہوں گی۔ میری واپسی تک تم شبو کو ایک مرتبہ پھر آفتاب کے زندہ ہونے کا یقین دلا دینا۔"

"ویسے ایک بات بتاؤں۔" نورین نے کہا۔ "شبو اتنی بوڑم اور احمق ہے نہیں جتنی نظر آتی ہے۔ اس سے محتاط رہنا۔"

اسد وہاں سے نکل کر سیدھا ایک معروف بینک کی اس برانچ میں پہنچا جہاں اس کا دوست منیجر تھا۔ اس نے وہاں اپنا اکاؤنٹ کھولا اور تین لاکھ رکھ کر باقی تمام کیش بینک میں جمع کرا دیا۔ اس نے اسی بینک میں ایک لاکر بھی لیا اور اس میں نورین کے تمام زیورات رکھ دیے۔ آج کل کراچی کے حالات خراب تھے۔ اتنا کیش اور زیورات رکھنا مناسب نہیں تھا۔ کسی بھی وقت ڈکیتی ہو سکتی تھی۔

"اتنا پیسا کہاں سے آیا یار؟" اس کے دوست نے پوچھا۔

"یار! تم تو جانتے ہو کہ میں کافی عرصے سے کسی فنانسر کی تلاش میں تھا۔ میرے ذہن میں بزنس کے کئی بہترین آئیڈیاز تھے۔ اب مجھے فنانسر بھی مل گیا ہے تو بزنس ہی کروں گا۔"

بینک سے فارغ ہو کر وہ بلا مقصد شام تک اِدھر اُدھر گھومتا رہا، کبھی وہ لینڈ کروزر کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر سوچا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ لینڈ کروزر نہ سہی، اسے کوئی چھوٹی موٹی مہران ہی دلا دے۔ بسوں کے دھکے کھانے سے اسے الرجی تھی۔ اب اس کے پاس جدید ماڈل کی لینڈ کروزر بھی اور ایک نہیں، کئی قیمتی گاڑیاں تھیں۔ وہ سب اس کی ہونے والی تھیں۔ وہ نورین کی جنونی محبت سے بھی خوف زدہ تھا اس لیے گھر جانے سے احتراز کر رہا تھا۔

وہ شام ڈھلے گھر پہنچا تو نورین کا منہ پھولا ہوا تھا۔

"تم تو تھوڑی دیر کے لیے باہر گئے تھے اور پورا دن لگا کر واپس آئے ہو۔ آخر تم گئے کہاں تھے؟"

"تم نے ابھی سے بیویوں والا برتاؤ شروع کر دیا۔" اسد ہنس کر بولا۔

"اچھا لاؤ، ایک ایک ڈرنک پی لیں، پھر کھانا کھائیں گے۔"

"نہیں۔" اسد نے سختی سے انکار کر دیا۔ "آج نہیں، آج ہمارے پلان کا سب سے مشکل اور اہم مرحلہ

ہے۔ میں پوری طرح ہوش میں رہنا چاہتا ہوں۔ تم بھی ہوش میں رہو تو بہتر ہے۔ ہم ابھی تھوڑی دیر میں کھانا کھائیں گے، پھر میں گاڑی لے کر نکل جاؤں گا۔ اب تو چوکیدار کا کانٹا بھی نکل چکا ہے۔ بس تم ذہنی طور پر تیار رہو۔''

اچانک ٹیلی فون کی کرخت گھنٹی بجنے لگی۔ نورین نے شبو سے ٹیلی فون سیٹ نزدیک لانے کو کہا پھر ریسیور اٹھا کر بولی۔ ''ہیلو...... ارے زبیری صاحب، کیسے ہیں آپ؟...... ہاں، آفتاب کی طبیعت اب بہتر ہے لیکن انہیں شدید ڈپریشن کے دورے پڑ رہے تھے اس لیے ڈاکٹر نے انہیں مسلسل ٹرنکولائزر پر رکھا ہوا ہے...... اب بھی وہ شاید سو رہے ہیں...... نہیں ابھی ابھی سوئے ہیں...... آپ کب واپس آئے؟...... اچھا کل شام کو آئیں گے...... او کے، پھر کل شام کو آپ سے ملاقات ہوگی...... خدا حافظ۔'' اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور بولی۔ ''یہ منحوس بھی نکل آ جائے گا۔ یہ انتہائی کائیاں شخص ہے۔ اگر ہم نے اسے جل دے دیا تو سمجھو کہ منزل ہمارے نزدیک ہوگی۔''

کھانے کے بعد شبو کافی لے آئی۔ کافی پی کر اسد نے کہا۔ ''اب میں نکلتا ہوں۔ گاڑی چھوڑ کر تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گا۔ اس وقت تک تم شبو کو یہ یقین دلا دینا کہ صاحب کی طبیعت بگڑ رہی ہے اور انہیں اسپتال لے جانا ضروری ہے۔ تم بار بار مجھے کال کرنا اور جھنجلا کر کہنا کہ جلدی پہنچو، صاحب کی حالت خراب ہے۔''

''سمجھ گئی بابا، سمجھ گئی۔'' نورین نے ہنسنے کی کوشش کی لیکن اپنے اضطراب کو نہ چھپا سکی۔

اسد گاڑی لے کر نکلا اور اسے نزدیک ہی ایک کمرشل ایریا کے پارکنگ لاٹ میں کھڑا کر دیا۔ واپسی کے لیے اس نے ٹیکسی پکڑی اور پروگرام کے مطابق اسے دو بلاک پہلے ہی چھوڑ دیا۔ وہاں سے وہ پیدل ہی بنگلے کی طرف روانہ ہوا۔ اس دوران میں نورین اسے مسلسل کال کر رہی تھی اور وہ اس کی اداکاری پر مسکرا رہا تھا۔ وہ مین گیٹ سے اندر آیا لیکن شبو کی وجہ سے اسے سیوریج پائپ سے چڑھ کر آفتاب کے کمرے تک پہنچنا پڑا۔

آہٹ سن کر نورین بھی کمرے میں آ گئی اور بولی۔ ''جلدی کرو۔''

''تم باہر جا کر ایک مرتبہ پھر مجھے کال کرو۔ میں اس وقت تک آفتاب کا گیٹ اپ کر لوں گا۔ فکر مت کرو، میرا سیل فون سائلنٹ پر ہے۔''

اس نے بہت تیزی سے آفتاب کا سوٹ پہنا۔ آفتاب بیماری کی حالت میں بھی سلیپنگ سوٹ یا کسی عام لباس میں باہر نہیں نکلتا تھا۔ اس نے آفتاب کا جوتا پہننے کی کوشش کی لیکن وہ اس کے پاؤں میں تنگ تھا۔ اس نے اپنا ہی جوتا دوبارہ پہن لیا، سر پر اونی ٹوپی پہنی اور روشنی سے بچنے کے لیے نہ صرف ڈارک شیشوں کا چشمہ لگا لیا بلکہ ایک تولیا بھی سر پر ڈال لیا۔

اسی وقت اسد کے سیل فون میں وائبریشن ہوئی اور نورین کی آواز سنائی دی۔ ''اسد! صاحب کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ میں خود ہی انہیں لے کر اسپتال جا رہی ہوں۔ تمہاری گاڑی کا ٹائر بھی ابھی پنکچر ہونا تھا۔''

یہ کہہ کر وہ اوپر آتے ہوئے شبو سے چیخ کر بولی۔ ''یہ زینے کی روشنی کیوں جلائی ہے، بند کرو اسے۔ جانتی نہیں ہو صاحب کو روشنی سے الرجی ہے۔''

فوراً ہی زینے میں اندھیرا چھا گیا۔ نورین نے کمرے میں آ کر اسد کا جائزہ لیا اور بولی۔ ''ویری گڈ! اب تم میرا سہارا لے کر لڑکھڑاتے ہوئے چلو۔ زینے میں اندھیرا ہے اس لیے شبو تمہیں نہیں پہچان پائے گی، پھر تمہارا چہرہ تو لیے اور اونی ٹوپی میں چھپا ہوا ہے۔''

وہ اسد کو سہارا دے کر زینے پر لائی اور بولی۔ ''سنبھل کر ڈارلنگ!...... ہاں، بس اسی طرح آہستہ آہستہ چلو...... یہ اسد تو نہ جانے کہاں رہ گیا...... ہاں سنبھل کر۔''

''بیگم صاحبہ!'' شبو کی آواز آئی۔ ''میں آپ کی کچھ مدد کروں؟''

''تم اسد کے آنے تک گھر کا خیال رکھنا۔'' نورین نے سخت لہجے میں کہا اور سہارا دے کر اسد کو لاؤنج میں لے آئی۔

شبو بہت غور سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ نورین، اسد کو آہستہ آہستہ گاڑی تک لے گئی اور اسے احتیاط سے عقبی سیٹ پر لٹا دیا۔ پھر شبو سے مین گیٹ کھولنے کو کہا اور جاتے جاتے بولی۔ ''گھر کا خیال رکھنا۔'' اس نے تیزی سے گاڑی باہر نکال لی۔

کچھ دور آنے کے بعد اسد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے آفتاب کا سوٹ، اوورکوٹ، ٹوپی اور تولیا سب کچھ اتار کر ایک طرف پھینک دیا۔

وہ اپنی گاڑی تک آیا اور نورین سے کہا۔ ''میرے پیچھے چلی آؤ۔'' کچھ دور جانے کے بعد اسد نے اپنی گاڑی روکی، نورین کی گاڑی ایک غیر آباد بنگلے کے سامنے کھڑی کی اور نورین کو بھی اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ اس نے آفتاب کے

کپڑے وغیرہ بھی اپنی گاڑی میں رکھ لیے۔ وہ نورین کو لے کر اس اسکول پر پہنچا جو اس نے پہلے ہی دیکھ رکھا تھا۔ وہاں چوکیدار نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ دونوں احتیاطاً اسکول کی عقبی سمت سے باؤنڈری وال پھلانگ کر اندر داخل ہوئے۔

ایک خالی کلاس روم میں لے جا کر اسد نے نورین کو ایک کرسی کے ساتھ مضبوطی سے باندھا اور اس کے چہرے پر کئی زوردار تھپڑ رسید کر دیے پھر بولا۔ ''سوری، یہ ضروری تھا ڈارلنگ...... اس واردات میں حقیقت کا رنگ بھی تو بھرنا ہے۔ تم بعد میں مجھے اس سے دگنے تھپڑ مار لینا۔''

''اٹس آل رائٹ۔'' نورین نے کہا۔ اس کے چہرے پر اسد کے تھپڑوں کے نشانات تھے۔ اسد نے دستانے پہن رکھے تھے تاکہ اس کی انگلیوں کے نشانات کہیں نہ رہ جائیں۔

نورین کو اچھی طرح باندھنے کے بعد اس نے جیب سے ایک رومال نکالا اور نورین کے منہ میں ٹھونس دیا۔ نورین ''اوں اوں'' کی آوازیں نکالتی رہی لیکن اسد بولا۔ ''یہ بھی ضروری ہے ڈارلنگ۔'' پھر اس نے جیب سے ٹیپ نکالا اور نورین کے ہونٹوں پر مضبوطی سے چپکا دیا۔ ''اب بنا پرفیکٹ سین۔'' وہ ہنس کر بولا۔ ''سوری اگین۔'' یہ کہہ کر اس نے نورین کی کنپٹی پر ہلکا سا ہاتھ مار دیا۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کے فوراً ہی بے ہوش ہوگئی۔

اسد نے جھک کر اس کی نبض دیکھی، دل کی دھڑکن سنی، سانس کا جائزہ لیا۔ ہر چیز نارمل تھی۔ وہ صرف بے ہوش ہوئی تھی۔ اس نے پیار سے نورین کے گال تھپتھپائے، اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسی راستے سے باہر نکل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ صبح جب اسکول کھلے گا تو صفائی کرنے والا ملازم نورین کو یہاں دیکھے گا اور اسے آزاد کر کے پولیس کو اطلاع دے دے گا۔

اس نے آفتاب کے کپڑوں اور دوسری چیزوں کو ایک شاپر میں بھرا اور روانہ ہوگیا۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے واپس گھر پہنچا۔ گیٹ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ اس کم بخت شبو نے گیٹ بند نہیں کیا تھا۔

شبو گاڑی کی آواز سن کر باہر آگئی۔ اسد گاڑی سے اترا اور بھاگ کر برآمدے میں پہنچا، پھر شبو سے بولا۔

''صاحب کہاں ہیں؟ ان کی حالت اب کیسی ہے؟''

''بیگم صاحبہ انہیں اسپتال لے گئی ہیں۔'' شبو نے کہا۔

وہ لاؤنج ہی میں بیٹھ گیا۔ اسی وقت تیز بارش شروع ہوگئی۔ اس نے خود ہی اپنے سیل فون کی گھنٹی بجائی اور اسے کان سے لگا کر بولا۔ ''جی بیگم صاحبہ...... ہاں، میں گھر پہنچ گیا ہوں...... صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے...... اچھا ٹھیک ہے، میں...... او کے۔'' اس نے سیل فون رکھ دیا اور شبو سے بولا۔ ''وہ لوگ ابھی راستے میں ہیں۔ اسپتال پہنچے ہی والے ہیں۔ بیگم صاحبہ نے بتایا ہے کہ صاحب کی طبیعت اب خاصی بہتر ہے، انہیں اسپتال ایڈمٹ کر کے وہ وہیں ایک دوسرا کمرا لے کر رہ جائیں گی۔ تم ایسا کرو، مجھے ایک گرما گرم کافی پلا دو۔''

شبو کافی لے کر آئی تو اسد کافی پیتا رہا اور کچھ سوچتا رہا، پھر وہ شبو سے بولا۔ ''شبو! میں بہت بڑی مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔''

''کیسی مصیبت؟'' شبو گھبرا کر بولی۔

''ابھی واپس آتے ہوئے میں بہت تیز رفتاری سے آرہا تھا۔ اچانک ایک طرف سے ایک موٹر سائیکل والا نکل کر میرے سامنے آگیا۔ میں بری طرح گھبرا گیا اور گاڑی کی ٹکر سے اس کی موٹر سائیکل اڑتی ہوئی دور جا گری۔ وہ بے چارہ خود بھی کہاں بچا ہوگا۔ اب اگر کوئی پوچھے تو تم یہی کہنا کہ اسد تو گھر میں تھا، کہیں گیا ہی نہیں تھا۔''

''لیکن بیگم صاحبہ...... وہ تو......''

''میں انہیں بھی سمجھا لوں گا اور صاحب کو بھی...... تم ان کی فکر مت کرو۔''

''اگر تم ان لوگوں کو سمجھا لو گے تو میں بھی یہ کہہ دوں گی کہ تم یہیں موجود تھے، جب بیگم صاحبہ، صاحب کو لے کر گئیں، تب بھی تم یہیں موجود تھے۔''

''تھینک یو، تھینک یو ویری مچ۔'' اس نے شبو کا ہاتھ پکڑ لیا۔

شبو نے بھی اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ اس رات اسد آؤٹ ہاؤس کے بجائے بنگلے میں ہی سویا۔ نیچے بھی مہمانوں کے لیے دو بیڈ رومز تھے۔

شبو رات میں اس کا سر دبانے کے بہانے آئی لیکن اسد نے نیند کا بہانہ کر کے اسے چلتا کر دیا۔ صبح جب شبو اس کے لیے چائے لے کر آئی تو اس نے کہا۔ ''تم اسپتال ٹیلی فون کر کے صاحب کی طبیعت تو معلوم کرو۔''

''ہاں، میں ابھی کال کرتا ہوں۔'' اس نے اسپتال کال کی اور پوچھا۔ ''دیکھیے میں مسٹر آفتاب غنی کا پی اے بول رہا ہوں۔ وہ رات وہاں ایمرجنسی میں آئے تھے۔ آپ ان کی مسز سے بات کرا دیں۔''

''آفتاب صاحب!'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''لیکن وہ تو رات یہاں پہنچے ہی نہیں۔''
''پہنچے نہیں، پھر وہ کہاں گئے؟'' اس نے تشویش زدہ لہجے میں کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔
''صاحب اسپتال نہیں پہنچے۔'' شبو تشویش سے بولی۔ ''کہیں خدانخواستہ ان کا ایکسیڈنٹ تو نہیں ہو گیا۔''
''اس وقت کیا ٹائم ہوا ہے؟'' اسد نے پوچھا۔
''سات بج رہے ہیں۔'' شبو نے بتایا۔
''اور تم نے مجھے...... ہاں تم نے اچھا کیا کہ مجھے جلدی اٹھا دیا۔ میں پولیس کو کال کرتا ہوں۔''
اسے امید تھی کہ ابھی کچھ دیر بعد جب اسکول کھلے گا تو پولیس کی طرف سے خود ہی کال آجائے گی لیکن جب ساڑھے آٹھ بجے تک کال نہیں آئی تو اسد واقعی پریشان ہو گیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے علاقے کے پولیس اسٹیشن کا نمبر ملایا اور پولیس کو ٹیلی فون کر دیا۔ پھر وہ زبیری کو کال کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا ٹیلی فون آگیا۔ اسد نے اسے بھی بتا دیا کہ آفتاب صاحب اور مسز آفتاب رات سے غائب ہیں۔
زبیری اور پولیس دونوں آگے پیچھے بنگلے پر پہنچے۔ پولیس انسپکٹر شکل سے سخت گیر اور ذہین لگ رہا تھا۔ معاملہ چونکہ ایک ارب پتی سیٹھ کا تھا اس لیے انچارج خود ہی دوڑا چلا آیا تھا۔
''جب مسز آفتاب انہیں اسپتال لے گئیں تو تم کہاں تھے؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔
''میں گھر میں ہی تھا۔'' اسد نے جواب دیا۔
''پھر تم ان کے ساتھ کیوں نہیں گئے؟ میں نے سنا ہے کہ تم ان کے ڈرائیور بھی ہو۔''
''میرا ہاتھ گاڑی کے دروازے میں آکر بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔'' اسد نے اپنا دایاں ہاتھ دکھاتے ہوئے کہا جس پر واقعی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ''ایسے میں میرے لیے ڈرائیونگ کرنا مشکل ہوتا۔ اس کے باوجود میں نے صاحب کو لے جانے کی کوشش کی لیکن بیگم صاحبہ نے منع کر دیا۔''
''تم نے صاحب اور بیگم صاحبہ کو جاتے ہوئے دیکھا تھا؟'' انسپکٹر نے شبو سے پوچھا۔
''جی...... دیکھا تھا۔''
''اس وقت صاحب کی حالت کیسی تھی، ان کے چہرے سے کیسا محسوس ہو رہا تھا؟''
''ان کی حالت بہت خراب لگ رہی تھی سر...... میں ان کا چہرہ صاف نہیں دیکھ سکی کیونکہ زینے پر اندھیرا تھا۔''

''کیوں؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔
''آفتاب کو تیز روشنی سے الرجی تھی۔ بیماری کی حالت میں تو ان سے معمولی روشنی بھی برداشت نہیں ہوتی تھی۔'' زبیری نے جواب دیا۔
''اوہ۔'' انسپکٹر نے کہا پھر وہ شبو سے بولا۔ ''اس وقت اسد صاحب کہاں تھے؟''
''اسد صاحب یہیں تھے صاحب جی۔'' شبو نے کہا۔
''تم نے مسز آفتاب سے کوئی رابطہ نہیں کیا؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔
''نہیں، انہوں نے خود ہی کال کی تھی اور بتایا تھا کہ وہ راستے میں ہیں، پھر اس کے بعد ان کی کال نہیں آئی۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں بھی اسپتال میں کوئی کمرا لے کر رات وہیں رہ جاؤں گی۔''
''کمرا لے کر کیوں؟''
''آغا خان میں اٹینڈنٹ کو رکنے نہیں دیتے اس لیے اکثر لوگ وہاں دوسرا کمرا لے کر رہ جاتے ہیں۔'' زبیری نے بتایا۔
''پھر تم نے کیا کیا؟'' انسپکٹر نے اسد سے پوچھا۔
''میں نے صبح اٹھتے ہی اسپتال کال کی تو معلوم ہوا کہ مسٹر اور مسز آفتاب تو رات میں وہاں پہنچے ہی نہیں۔''
''عبدالرحیم!'' انسپکٹر نے ایک سب انسپکٹر سے کہا۔ ''تم گاڑی لے کر آغا خان کے راستے پر جاؤ اور معلوم کرو کہ رات کوئی ایکسیڈنٹ تو نہیں ہوا؟''
اس کے جانے کے بعد انسپکٹر آفتاب کے کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔
''مسٹر آفتاب کب سے بیمار تھے؟''
''وہ گزشتہ چار پانچ دن سے بیمار تھے۔''
انسپکٹر نے کچھ سوالات زبیری سے بھی کیے اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ان کی کوئی بھی اطلاع ملے تو فوراً مجھے بتانا اور یہیں موجود رہنا۔ ممکن ہے، بعد میں بھی تمہاری ضرورت پڑے۔'' پھر وہ زبیری سے بولا۔ ''مسٹر زبیری! آپ بھی میرے رابطے میں رہیے گا۔''
''شیور انسپکٹر خان۔'' زبیری نے کہا۔ ''میں تو آفتاب کا لیگل ایڈوائزر بھی ہوں۔''
انسپکٹر کے جانے کے بعد زبیری نے شبو کو گھور کے دیکھا تو وہ سہم گئی اور جلدی سے بولی۔ ''صاحب، آپ کے لیے کافی لاؤں؟''
''ہاں، لے آؤ۔'' زبیری نے کہا۔ اب بارہ بج رہے

تھے اور نورین کا کوئی پتا نہیں تھا۔ اس وقت تک تو اسے آجانا چاہیے تھا۔ اب وہ واقعی پریشان ہوگیا تھا۔

زبیری نے اس سے پوچھا۔ ''تمہارا ہاتھ واقعی زخمی ہے یا تم نے یونہی پٹی باندھ رکھی ہے؟''

اسد نے گھور کر اسے دیکھا اور بولا۔ ''میں نے یونہی شوقیہ پٹی باندھ رکھی ہے۔''

''شٹ اپ، یو ایڈیٹ۔''

''یو شٹ اپ۔'' اسد بپھر کر بولا۔ ''اینڈ گیٹ لاسٹ۔''

''تمہارا مطلب کیا ہے؟''

''تم سمجھ رہے ہو کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔'' اسد چیخا۔ ''میں نے یونہی پٹی باندر کھی ہے؟''

''ارے تو اتنی سی بات پر ناراض کیوں ہو رہے ہو۔ یہی سوال تم سے انسپکٹر خان بھی کرے گا۔''

''تو میں اسے پٹی کھول کر اپنا زخم دکھا دوں گا۔''

کافی پی کر وہ بھی کھڑا ہوگیا اور بولا۔ ''میں بھی چلتا ہوں۔ تمہیں آفتاب یا بھابی کی کوئی اطلاع ملے تو مجھے بھی بتانا۔'' زبیری چلا گیا لیکن فوراً ہی دوبارہ آگیا اور بولا۔ ''میری گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوگیا ہے۔ میرے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے کہ میں ٹائر تبدیل کرنے کا انتظار کروں۔ تم اگر مجھے کورٹ تک چھوڑ دو تو......''

''ہاتھ میں تکلیف اب کم ہے میں آپ کو کسی ایسی جگہ چھوڑ دوں گا جہاں سے آپ کو آسانی سے ٹیکسی مل جائے۔ انسپکٹر خان نے مجھے گھر پر رہنے کا مشورہ دیا تھا۔'' اسد نے کہا۔

وہ زبیری کو چھوڑ کر واپس آیا تو پولیس اسٹیشن سے کوئی کال نہیں آئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسکول جا کر دیکھے کہ وہاں کیا ہوا ہے مگر اس کی ہمت نہ ہوئی۔ اسے انسپکٹر خان کا چہرہ یاد آگیا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی ذہانت تھی اور اسد کو اس کی آنکھوں سے بہت ڈر لگا تھا۔

اس نے زبیری کی گاڑی کا ٹائر تبدیل کیا، پھر ڈکی بند کر کے خود ہی مسکراتا ہوا اندر آگیا۔

شام کے سات بجے تک نورین کا کچھ پتا نہیں چلا تو اسد بے چین ہوگیا کہ آخر نورین گئی کہاں؟ کیا اسے واقعی ڈاکوؤں نے تو اغوا نہیں کرلیا؟

دوسرا دن بھی یونہی گزر گیا۔ اسد نے کئی مرتبہ پولیس اسٹیشن ٹیلی فون کیا۔ کئی مرتبہ زبیری اور انسپکٹر خان نے اسے کال کی لیکن نہ نورین کا کوئی سراغ ملا نہ آفتاب کا۔

تیسرے دن تو اسد بالکل مایوس ہوگیا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ نورین کسی حادثے کا شکار ہوگئی ہے یا اسے واقعی اغوا کرلیا گیا ہے۔ اس نے یونہی بے خیالی میں ٹی وی آن کر دیا۔

اچانک ٹی وی پر بریکنگ نیوز شروع ہوگئی۔ ''آج صبح سن رائز گرامر اسکول سے کسی عورت کی لاش ملی ہے۔ عورت کے ہینڈ بیگ سے جو کاغذات برآمد ہوئے ہیں، ان کے مطابق وہ معروف صنعت کار اور بزنس مین آفتاب غنی کی اہلیہ مسز نورین غنی کی لاش ہے۔ آج دو دن کی چھٹی کے بعد جب اسکول کھلا تو صفائی کرنے والے ملازم نے سب سے پہلے وہ لاش دیکھی۔ اس نے فوری طور پر پولیس کو اطلاع دی۔ اب پولیس جائے واردات پر موجود ہے۔ واضح رہے کہ جمعے کی رات کو مسز آفتاب اپنے شوہر کو آغا خان لے کر روانہ ہوئی تھیں۔ اس کے بعد سے ان کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ پولیس مزید تفتیش کر رہی ہے۔ مسٹر آفتاب ابھی تک لاپتا ہیں۔''

ٹی وی پر نورین کی لاش بھی دکھائی گئی تھی۔ اسد کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ نورین اس کی وجہ سے مری تھی۔ اسے خیال ہی نہیں رہا کہ اس دن جمعہ تھا اور اسکول دو دن بند ہوتا ہے۔ وہ تو دم گھٹنے سے مرگئی ہوگی۔ نورین کو یاد کر کے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف انسپکٹر خان تھا۔ وہ اسے اسی وقت سن رائز اسکول بلا رہا تھا تاکہ لاش کو شناخت کر سکے۔

☆☆☆

''اس عورت کو پہچانتے ہو؟'' انسپکٹر خان نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' اسد نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ جواب دیا۔ ''یہ میڈم نورین ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس کے آنسو بہنے لگے۔ وہ بری طرح سسک سسک کر رونے لگا۔

''دیکھو، حوصلہ رکھو۔ اتنا مضبوط اور لمبا چوڑا تو جوان عورتوں کی طرح آنسو بہاتا ہوا اچھا نہیں لگتا۔'' انسپکٹر خان نے نرم لہجے میں کہا پھر وہ زبیری سے مخاطب ہوا۔ ''آپ کیا کہتے ہیں؟''

''یہ مسز آفتاب ہی ہیں۔'' اس نے کہا اور اسد کو گھورا۔

''حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مقتولہ کا ہینڈ بیگ بھی موجود ہے اس میں اچھی خاصی رقم بھی ہے۔ ان کے ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں اور کڑے بھی موجود ہیں لیکن اغوا کرنے والوں نے ان چیزوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ان کی انگلی میں ڈائمنڈ کی قیمتی انگوٹھی ہے۔ وہ بھی اسی طرح موجود ہے۔ وکیل صاحب! آپ کے خیال میں اغوا کرنے والوں کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟''

زبیری نے شانے اچکا دیے۔ ''آئی ڈونٹ نو انسپکٹر۔''

''شہزاد خان! یہاں سے تمام نشانات اٹھاؤ اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دو۔ میرا خیال ہے کہ ان کی موت سر کی چوٹ کی وجہ سے ہوئی ہے۔ انہوں نے کرسی سے آزاد ہونے کے لیے زور آزمائی کی ہوگی۔ کرسی لڑھک گئی ہوگی اور ڈیسک کا نکیلا سرا ان کے سر میں لگا ہوگا۔ پھر ان کا منہ بھی بند تھا۔ انہیں سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی ہوگی یہاں بہت سا خون بھی جما ہوا ہے۔ چوٹ لگنے سے ان کا خون بھی ضائع ہوا ہے۔ حتمی وجہ تو پوسٹ مارٹم کے بعد ہی معلوم ہوگی۔'' پھر وہ زبیری سے مخاطب ہوا۔

''وکیل صاحب! آپ آفتاب صاحب کے بہت نزدیک تھے۔ میں آپ کو بھی ایک بار پھر زحمت دوں گا۔'' پھر وہ اسد سے مخاطب ہوا۔ ''اور تم بھی وہ گھر چھوڑنے کی کوشش مت کرنا۔ کہیں جانا ضروری ہو تو مجھے ضرور انفارم کرنا، اب اس واقعے کی نوعیت بدل گئی ہے۔ اب یہ ایک قتل کی واردات میں تبدیل ہو گیا ہے۔''

☆☆☆

''تم یہاں کب سے ملازم ہو؟'' انسپکٹر خان نے اسد سے پوچھا۔

''مجھے ایک مہینے سے زیادہ نہیں ہوا۔'' اسد نے جواب دیا اور اسے وہ داستان سنا دی جس کی وجہ سے اسے یہاں ملازمت ملی تھی۔

''تمہارا کام کیا تھا؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''میں آفتاب صاحب کا ڈرائیور، پی اے، سب کچھ تھا۔'' اسد نے جواب دیا۔

''اور یہاں کب سے ملازم ہو؟'' انسپکٹر نے شبو سے پوچھا۔

''مجھے تو ابھی صرف ایک ہی ہفتہ ہوا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''مسز آفتاب کو واقعی ملازمہ کی ضرورت تھی یا انہوں نے تمہاری سفارش پر اس لڑکی کو ملازم رکھا تھا؟'' انسپکٹر نے اسد سے پوچھا۔

''انہیں واقعی ملازمہ کی ضرورت تھی۔ آفتاب صاحب ... کے بیمار ہونے کے بعد وہ زیادہ وقت ان ہی کے کمرے میں گزارتی تھیں۔''

''مسز آفتاب نے مجھ سے بھی کسی ملازمہ کے لیے کہا تھا۔'' زبیری نے کہا۔ ''انہیں واقعی ملازمہ کی ضرورت تھی۔''

''یہاں تم دونوں کے علاوہ کوئی اور ملازم نہیں ہے؟ مالی، کک، چوکیدار وغیرہ۔'' انسپکٹر خان نے پوچھا۔

''یہاں ایک مالی ہے جو ہفتے میں دو دفعہ آ کر لان کی صفائی اور دیکھ بھال کرتا ہے۔ چوکیدار تھا جسے مسٹر زبیری نے بے عزت کر کے یہاں سے نکال دیا۔''

''وہ نشہ کرنے لگا تھا۔'' زبیری نے جواب دیا۔ ''ایسے آدمی کو بے عزت نہ کرتا تو کیا انعام دے کر نکالتا۔ میں آفتاب کا بہت پرانا دوست اور اس کا لیگل ایڈوائزر ہوں۔ میرا اتنا حق تو ہے کہ میں نشے کے عادی اس چوکیدار کو نکال سکوں۔ میں دوسرے چوکیدار کا بندوبست کر دیتا لیکن مجھے ایک کیس کے سلسلے میں لاہور جانا پڑا۔''

''احمد خان!'' انسپکٹر نے ایک سپاہی کو مخاطب کیا۔ ''تم یہیں رہو۔ ممکن ہے مسز آفتاب کی کوئی اطلاع موصول ہو۔''

''جی سر۔'' سپاہی نے کہا۔

انسپکٹر خان ان لوگوں سے پوچھ گچھ کر کے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد زبیری بھی وہاں سے چلا گیا۔ اب خطرہ اسد کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ انسپکٹر کسی بھی وقت ڈیپ فریزر کھول کر دیکھ سکتا تھا۔ وہ آفتاب کی لاش کو آج رات ہی ٹھکانے لگانے کا ارادہ کر چکا تھا۔

رات کا کھانا اس نے مشکل سے زہر مار کیا۔ پولیس کے سپاہی احمد خان کو بھی باہر کھانا بھجوا دیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ شبو بھی سہی ہوئی تھی۔ وہ بھی اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔

تھوڑی دیر بعد اسد اٹھا۔ اس نے چائے بنائی، ایک کپ میں اس نے نشے کی دو گولیاں ڈالیں اور کپ لے کر احمد خان کے پاس پہنچا۔ ''لو یار! تم بھی چائے پی لو۔ بیٹھے بیٹھے تھک گئے ہو گے۔'' اس نے چائے کا کپ احمد خان کی طرف بڑھا دیا۔

''بہت شکریہ جناب۔'' سپاہی نے کہا۔

اسے چائے دے کر وہ اندر آیا اور کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد باہر جھانکا۔ سپاہی بینچ پر لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ اس نے شبو کے کمرے کا دروازہ کھول کر جھانکا۔ وہ بھی بہت گہری نیند سو رہی تھی۔

اس نے جلدی جلدی ڈیپ فریزر سے بوتلیں ہٹانا شروع کر دیں۔ ساری بوتلیں ہٹانے کے بعد وہ ایک چادر لایا تا کہ آفتاب کی لاش کو اس میں لپیٹ کر لے جا سکے۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے ڈیپ فریزر کا ڈھکنا کھولا تو اس کی نظر آفتاب کی لاش پر پڑی۔ اس کی لاش جوں کی توں پڑی تھی، بالوں اور چہرے پہ برف کی ہلکی سی تہ تھی۔

وہ ابھی لاش کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک کسی کی

آواز آئی۔ ''خبردار۔''

اسد بری طرح چونک اٹھا۔ وہ گھبرا کر مڑا۔ اس کے پیچھے زبیری کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں پسٹل تھا۔

''اس کا مطلب ہے، تم نے آفتاب کو قتل کیا ہے؟''

''نہیں، میں نے انہیں قتل نہیں کیا۔ انہوں نے تو خودکشی کی ہے۔''

''خودکشی کی ہے؟'' زبیری نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تو پھر ان کی لاش ڈیپ فریزر میں کیا کر رہی ہے؟'' زبیری نے پوچھا۔

''یہ میڈم نورین کا پلان تھا۔ وہ اس خودکشی کو قتل ثابت کرنا چاہتی تھیں۔''

''بکومت۔''

''میرے پاس اس کا ثبوت ہے کہ مسٹر آفتاب نے خودکشی کی ہے۔'' اسد نے گھبرا کر کہا۔

''کیسا ثبوت؟'' زبیری چونکا۔

''انہوں نے آپ کے نام ایک خط لکھا تھا کہ وہ خودکشی کر رہے ہیں، اس کے ذمے دار وہ خود ہیں۔''

''کہاں ہے وہ خط؟'' زبیری نے کہا۔

''ابھی لے کر آتا ہوں۔'' اسد نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں وہی لفافہ تھا جس میں آفتاب کا خط تھا۔

زبیری نے وہ لفافہ لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور سانپ کی طرح پھنکارا۔ ''اب تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ آفتاب نے خودکشی کی ہے۔ اب اس کے قتل کے الزام میں تم جیل جاؤ گے۔''

''نہیں، ایسا مت کرنا۔ مجھے تو لمبی سزا ہو جائے گی۔''

''لمبی سزا؟'' زبیری نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تمہیں پھانسی بھی ہو سکتی ہے ایڈیٹ۔''

''پھر...... پھر میں کیا کروں؟ آپ ہی میری مدد کریں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے آفتاب صاحب کو قتل نہیں کیا۔''

''میں تمہارے ساتھ ایک رعایت کر سکتا ہوں۔'' زبیری نے مکاری سے کہا۔ ''تمہیں یہاں سے فرار ہونے کا موقع دے دوں۔''

''ہاں، یہ ہو سکتا ہے لیکن...... میں قانون سے کب تک بھاگوں گا؟''

''یہ تمہارا مسئلہ ہے۔'' زبیری نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' آفتاب نے سوچا کہ اس کے پاس بینک میں تقریباً ایک کروڑ روپے... نقدی اور ستر اسّی لاکھ کے زیورات ہیں۔ وہ اس رقم سے کہیں بھی جا سکتا ہے۔ امریکا، کینیڈا، دبئی۔

''تو پھر میں جاؤں؟'' اسد نے کہا۔ ''وقت بہت کم ہے۔ باہر پولیس کا ایک سپاہی بھی سو رہا ہے۔''

''ایسے نہیں بچے۔'' زبیری نے کہا۔ ''پہلے جو کچھ میں کہوں، وہ لکھو اور اس پر سائن بھی کرو۔''

اسد نے وہاں رکھا ہوا ایک پیڈ اٹھا لیا اور پین لے کر بولا۔ ''بتایئے کیا لکھوں؟''

''رہنے دو۔'' زبیری مکاری سے مسکرایا۔ ''میرے پاس ٹائپ کیا ہوا ایک ڈرافٹ موجود ہے۔ تم اس پر سائن کر دو اور چلے جاؤ۔''

اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اسد کی طرف بڑھا دیا۔

اسد نے اس کی تحریر پڑھنے کی کوشش کی۔

''پڑھنے میں وقت ضائع مت کرو۔'' زبیری نے درشت لہجے میں کہا۔

''میں اسے پڑھے بغیر سائن نہیں کروں گا۔ یہ کورٹ کا اسٹیمپ پیپر ہے۔''

''چلو جلدی پڑھو۔'' اسد نے وہ پیپر پڑھا اور بولا۔ ''یہ تو میری طرف سے آپ کے نام پاور آف اٹارنی ہے۔ یعنی میں آپ کو یہ اختیار دے دوں کہ میرے بدلے آپ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔''

''ہاں، اس کا یہی مطلب ہے۔'' زبیری نے کہا۔ ''پھر ہم اس لاش کو ابھی ٹھکانے لگا دیں گے اور تم بھی قتل کے الزام سے بچ جاؤ گے۔''

''لیکن میں اس پر سائن کیوں کروں؟ جبکہ میں نہ وارث ہوں اور نہ ہی بااختیار۔''

''سائن کرو ورنہ میں گولی مار دوں گا، آفتاب نے اپنی تمام جائداد تمہارے نام کر دی ہے اس لیے۔''

''اوہو پھر تو میں سائن نہیں کروں گا۔'' اسد چیخ کر بولا۔

''مار دو گولی، باہر پولیس کا سپاہی سو رہا ہے۔ وہ گولی کی آواز سے جاگ جائے گا۔ پھر تم کہاں ہو گے مسٹر ایڈووکیٹ؟''

اسی وقت شبو کمرے سے نکل کر باہر آ گئی اور چیخ کر بولی۔ ''یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

زبیری نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا اور بولا۔ ''سائن کرو ورنہ پہلے میں اسے ماروں گا، پھر تمہیں گولی ماروں گا۔ تم آفتاب کی لاش ٹھکانے لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس ملازمہ کی آنکھ کھل گئی۔ تم نے اسے گولی مار دی۔ اسی وقت

میں یہاں پہنچ گیا۔ تم نے مجھے بھی مارنے کی کوشش کی لیکن میں نے اپنی جان بچانے کے لیے تمہیں گولی ماردی، جلدی سائن کرو۔" اس نے شبو کی کنپٹی پر گن رکھ دی۔

"ہینڈز اپ!" باہر سے انسپکٹر خان کی آواز آئی۔

"اپنی گن پھینک دو زبیری۔"

"انسپکٹر! اس مردود نے میرے دوست کو ہلاک کر دیا ہے۔" زبیری نے کہا۔ "اس کی لاش ڈیپ فریزر میں موجود ہے۔"

"مجھے تو کچھ معلوم نہیں انسپکٹر صاحب۔" اسد نے کہا۔ "آفتاب صاحب کو بھی وکیل صاحب نے ہلاک کیا ہو گا۔ وہ ان کی لاش نکال کر لے جا رہے تھے کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تو انہوں نے مجھ پر گن تان لی اور جیب سے یہ کاغذ نکال کر کہا کہ اس پر سائن کردو اور فرار ہو جاؤ۔"

"یہ بکواس کررہا ہے انسپکٹر۔" زبیری بھڑ کر بولا۔ "میں نے آفتاب کو قتل نہیں کیا بلکہ اس نے خودکشی کی ہے۔ اس نے مجھے خط لکھا تھا کہ وہ خودکشی کررہا ہے۔ اس کا ذمے دار وہ خود ہے۔"

"وہ خط کہاں ہے؟" انسپکٹر خان نے پوچھا۔

"وہ خط میرے پاس ہے۔" زبیری نے کہا اور وہ لفافہ نکال کر انسپکٹر کو دے دیا جو اسد نے اسے دیا تھا۔

"تم نے آفتاب صاحب کی وصیت کا بھی تذکرہ کیا تھا، وہ کہاں ہے؟"

"وہ میرے پاس ہے۔" زبیری نے کہا۔ "اور وہ وصیت بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ اسد نے آفتاب کو قتل کیا ہے اور اس کا الزام مجھ پر لگا رہا ہے کیونکہ آفتاب نے اپنی انشورنس پالیسی اور تمام جائداد کا وارث اسی مردود کو بنایا ہے۔"

"کہاں ہے وہ وصیت؟"

"میرے پاس ہے۔" زبیری نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالا اور انسپکٹر کو دے دیا۔

انسپکٹر نے پہلے اس وصیت کی ورق گردانی کی پھر لفافے میں سے وہ خط نکالا جو آفتاب نے اس کے نام لکھا تھا۔ خط دیکھ کر انسپکٹر بھڑ گیا۔ "یہ کیا بکواس ہے۔ سادہ کاغذ! تم کیا پولیس کو بالکل ہی الو سمجھتے ہو۔ تم ایک بے قصور نوجوان کو قتل جیسے سنگین جرم میں پھنسا رہے ہو، کیوں؟ اور اس سے یہ پاور آف اٹارنی کیوں لے رہے تھے؟ میں تمہیں آفتاب غنی کے قتل میں گرفتار کرتا ہوں۔ تم نے پہلے چوکیدار کی چھٹی کی، پھر آفتاب صاحب کو قتل کیا اور مسز آفتاب کے ساتھ مل کر اسپتال جانے کا ڈراما اسٹیج کیا۔ آفتاب کی وصیت کے بارے میں صرف تم جانتے تھے کہ اس نے پوری جائداد اسد کے نام لکھ دی ہے۔ اس لیے تم نے مسز آفتاب کو بھی راستے سے ہٹا دیا۔ تمہارا پلان تھا کہ آفتاب کی لاش کو کہیں پھینک دو گے اور اسد سے پاور آف اٹارنی لے کر ساری جائداد اور انشورنس پالیسی پر قبضہ کرلو گے۔"

"یہ جھوٹ ہے...... انسپکٹر...... یہ غلط ہے۔ یہ لڑکا بہت حرامزادہ ہے...... قتل اس نے کیا ہے۔" زبیری چیختا رہا۔

انسپکٹر اسے گرفتار کرکے باہر کی طرف چلا، پھر بولا۔

"تمہاری گاڑی کی چابی کہاں ہے؟"

"میری جیب میں ہے۔"

اس نے سپاہی سے کہا۔ "احمد خان! اس کی جیب سے گاڑی کی چابی نکالو اور اس کی تلاشی لو۔"

احمد خان نے گاڑی کی تلاشی لی پھر ڈکی کھولی تو اس میں سے آفتاب کے کپڑے برآمد ہوئے۔ اس میں اونی ٹوپی، اوورکوٹ، سوٹ اور تولیا بھی تھا۔

زبیری نے نفرت اور غصے سے اسد کو دیکھا۔

"احمد خان! ان سب چیزوں کو سیل کرو اور پولیس اسٹیشن پہنچو۔" انسپکٹر نے زبیری کو پولیس موبائل میں بٹھایا اور روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

اسد بنگلے پر نیا رنگ کرا رہا تھا۔ اس نے انشورنس کی رقم ملتے ہی اس بنگلے کا قرض ادا کرکے اس کے کاغذات واپس لے لیے تھے۔ اب وہ بنگلا اس کا تھا۔ نہ صرف وہ بنگلا بلکہ پچاس کروڑ روپے اور تین کاریں بھی۔

اچانک وہاں ایک رکشا آکر رکا۔ اس میں سے شبو اتری اور بولی۔ "اوہو، نیا رنگ و روغن ہورہا ہے؟"

اسد بری طرح چونک اٹھا کیونکہ اس نے یہ جملہ انگریزی میں ادا کیا تھا۔

"حیران مت ہو۔" اس نے کہا۔ "میں نے انگلش لینگویج کا کورس کر رکھا ہے اور انگلش اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم اور میڈم جو باتیں کرتے تھے میں سب سنتی تھی۔ تم کیا سمجھتے ہو، تم یہ سب کچھ اکیلے ہڑپ کر جاؤ گے۔"

"نہیں، تم بھی میرے ساتھ ہی ہڑپ کرو گی۔" اسد مسکرایا اور بولا۔ "مجھ سے شادی کروگی؟"

"اب تم خوشامد کررہے ہو تو مجبوری ہے۔" یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اسد بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگا۔